ماہنامہ
نئے اُفق
کراچی
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

اگست 2016 کے شمارے کی ایک جھلک
چراغ جاناں
رفعت سراج کا سلسلے وار ناول
موم کی محبت
راحت وفا کا سلسلے وار ناول
شب ہجر کی پہلی بارش
نازیہ کنول نازی کا سلسلے وار ناول
تیرے نام کردی زندگی
عائشہ نور محمد کا مکمل ناول
عید کے رنگ اناڑی پیا کے سنگ
صائمہ قریشی کا منفرد ناولٹ
ذرا مسکرا میرے گمشدہ
فاخرہ گل کے قلم سے خوب صورت ناولٹ
راشدہ رفعت، طلعت نظامی، رضوانہ پرنس
نزہت جبین ضیاء، عروسہ عالم، سباس گل، نظیر فاطمہ، حرا قریشی
women.magazine
womenmagazine
aanchalpk.com
مستقل سلسلوں میں پڑھیے
آپ کی صحت، ڈش مقابلہ، بیوٹی گائیڈ، غزلیں
نظمیں، بیاض دل، دوست کے پیغام آئے ودیگر

www.paksociety.com

ماہنامہ

نئے اُفق

مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی

مدیر
عمران احمد

مدیر معاون
اقبال بھٹی

مدیر مسئول
طاہر احمد قریشی

مستقل معاون
نورالدین

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رکن چیمبر آف کامرس

NAEYUFAQ
PUBLICATION

پاکستان (فی پرچہ)..........50روپے
پاکستان (سالانہ)..........500روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242

جلد	40
شمارہ	09
اگست	2016

aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchal.com.pk/blog
onlinemagazinepk.com/recipes
editorufaq@aanchal.com.pk

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

خط وکتابت کا پتہ: ”نئے افق“ پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 ایک از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل editorufaq@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

ایدھی تو نعمت الٰہی تھے

آج ایدھی صاحب نہیں بلکہ انسانیت کا انتقال ہوا ہے۔ ایدھی تو انسانیت کا استعارہ تھے‘ انسانیت کی علامت تھے وہ ایک شخصیت نہیں ایک ادارہ تھے‘ پاکستان ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر انعام الٰہی تھے۔ انہیں اللہ نے جو وصف عطا کیا وہ اس میں اپنی مثال آپ ہی تھے اللہ نے کیسا دل و دماغ دیا تھا کہ ہزاروں نہیں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں‘ کیا اربوں کے اثاثے ہاتھ میں ہونے کے باوجود وہی سادا لباس وہی سادی زندگی کئی لوگوں نے اپنے قیمتی محل نما عمارتوں کو اپنے ذاتی استعمال کیلئے وقف رکھا۔ نہ کپڑے بدلے نہ اپنا حلیہ بدلا‘ وہی رہائش جس میں وہ رہتے آئے تھے وہیں رہتے رہے‘ نہ کبھی اپنے یا اپنے بچوں کیلئے کوئی کار خریدی ہمیشہ ایمبولینس میں سفر کیا۔ اپنے پیچھے وہ اربوں نہیں کھربوں کی املاک چھوڑ گئے ہیں۔ لوگ انہیں لاکھوں کے عطیات دیتے جو رقم جس مد میں آتی وہ اسی مد میں صرف ہوتی‘ وہ بڑے امانت دار شخص تھے۔

جب کبھی کسی مد میں رقم ختم ہو جاتی تو وہ کسی سے چندے کی اپیل نہیں کرتے تھے نہ ہی کسی اپنے کارندے سے کہتے تھے ایمبولینس لے کر خود نکل جاتے‘ کسی پر ہجوم سڑک پر کھڑے ہو جاتے بطور بھکاری کے خود اپنا دست سوال دراز کر کے لوگوں سے بھیک مانگتے۔ لوگوں نے کبھی انہیں مایوس نہیں کیا‘ مالی طور پر کروڑ پتی یا ارب پتی ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی ایک پیسے کی کرپشن یا بدعنوانی نہیں کی۔ یہ ان کی فطرت میں ہی نہیں تھا نہ کسی بھی قسم کا تکبر نہ کوئی غرور وہ ایک سادہ‘ سچے اور کھرے انسان تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی کئی اور لوگ بھی ان کے کار خیر کو آگے بڑھانے میں سامنے آئے۔ چھیپا‘ سیلانی اور بھی کئی تنظیمیں میدان میں آئیں‘ ایدھی صاحب کی کوشش کے صلے میں خصوصاً کراچی کے غریب و نادار افراد کو عزت سے دو وقت اچھا کھانا کھانے کو ملنے لگا۔ ہر روز

ہزاروں لوگ مستفید ہو رہے ہیں یوں تو ان کی پیروی میں کئی ادارے قائم ہو چکے ہیں لیکن کسی ادارے کے کسی سربراہ کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ وہ گلی سڑی لاشوں کو خود اپنے ہاتھ سے غسل دیتے' اسے کفنائے دفنائے۔ یہ کام بھی اب تک صرف ایدھی صاحب کرتے تھے' وہ فقیر منش درویش تھے انہوں نے پاکستان کر پرچم دنیا میں سربلند کیا' انسانیت کی روشن مثال بن کر سبق دے گئے کہ انسانیت کیا ہے اور دراصل کسے کہتے ہیں۔

ایدھی صاحب کے جنازے میں لاکھوں لوگوں نے شرکت کی' کراچی کیا پاکستان کا تاریخی اجتماع تھا۔ لوگ دہاڑیں مار مار کر رو رہے تھے جیسے ان کے کسی بزرگ کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا ہے۔ ایک عظیم شخص اور ایک نعمت ہم سے رخصت ہوگئی ہے' انہوں نے اپنے بچوں کی تربیت اپنی نگرانی میں اپنی طرح کی ہے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ ایدھی صاحب کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے اس کے باوجود ایدھی صاحب' ایدھی صاحب ہی تھے۔ ان کی جگہ اور اس مرتبہ کو پہنچنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں' اللہ ان کی مغفرت کرے' ان کے درجات بلند کرے' آمین۔

صحن چمن میں ایک یہی آفتاب تھا
اس آدمی کی لاش کو اعزاز سے اٹھا

عبیداللہ کلیم......

گفتگو

عمران احمد

"حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
جس جوان نے کسی بوڑھے شخص کی اس کے بڑھاپے کی وجہ سے تعظیم وتکریم کی تو اللہ تعالیٰ
اس کے بڑھاپے کے وقت ایسے شخص کو مقرر کرے گا جو اس کی تعظیم کرے گا۔" (الترمذی)

عزیزانِ محترم...... سلامت باشد

تمام قارئین کو عید الفطر اور عید آزادی مبارک ہو۔

ابھی ماہ رمضان اپنی تمام تر برکتوں اور نعمتوں کے ساتھ رخصت ہوا تھا اور لوگ عید کی خوشیوں سے لطف اندوز ہی ہو رہے تھے کہ اچانک اک مرد قلندر اور محسن پاکستان لوگوں کے دکھوں کا درمان کرنے والے محترم عبدالستار ایدھی کے انتقال پر ملال کی خبر آ گئی مرحوم ایک عرصہ سے گردوں کے عارضہ میں مبتلا تھے آج دنیا ان کے بارے میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے میں مصروف ہے لیکن ہم اس مست والست آدمی کے لیے ایک جملہ کہیں گے وہ انسان کے روپ میں فرشتہ تھے ہم کسی سے ان کے لیے دعائے مغفرت کی اپیل نہیں کریں گے بھلا نیکی کے فرشتے کو ہم گناہ گاروں کی دعاؤں کی کیا ضرورت۔

رواں ماہ عورت زاد کی آخری قسط شائع ہو رہی ہے آئندہ ماہ سے عشنا کوثر سردار کی معرکتہ الآرا قسط وار کہانی "ایک سو سولہ چاند کی راتیں" جو تقسیم برصغیر پاک و ہند کے پس منظر میں ہے شامل اشاعت ہوگی، گزشتہ ماہ ہم نے غلطی سے اس کی اشاعت کا ماہ اگست تحریر کر دیا تھا لیکن یہ کہانی ستمبر کے شمارہ میں شائع ہوگی۔ اس کے بعد پل صراط عشق کے خاتمہ پر محترمہ زریں قمر کی زندہ و جاوید تحریر "اوتار" شائع ہوگی۔

اب چلتے آپ کے محبت ناموں کی طرف لاہور سے محترمہ ریحانہ سعیدہ رقم طراز ہیں۔

محترم جناب عمران احمد صاحب السلام علیکم۔ ماہ صیام کی مبارکباد اور عید کی ایڈوانس مبارکباد کے ساتھ حاضرِ خدمت ہوں۔ اس دفعہ دل چاہا کہ اپنی حاضری آپ کی محفل میں دے دوں، سو حسبِ معمول اپنی کچھ تلخ شیریں باتوں کے ساتھ حاضرِ خدمت ہوں، روزے کی برکتوں سے سب مسلمان فائدہ اٹھا رہے ہوں گے یہ تزکیہ نفس کی وہ عبادت ہے جسے ہم درست طریقے سے کر لیں تو باقی سال کے گیارہ مہینے بھی اپنے نفس پر قابو پا سکتے ہیں اسی لئے اللہ نے تمام عبادتوں کا اجر و ثواب بتایا ہے لیکن روزے کے لئے فرمایا: روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا اجر دوں گا۔ اللہ ہم سب کو اس کی برکتوں اور رحمتوں سے فیض یاب کرے۔ عمران بھائی شروع میں کچھ تبدیلیاں اور کہانیوں کا معیار اچھا تھا پر اب یہ رسالہ اپنی انفرادیت کھو رہا ہے۔ اس دفعہ کے رسالے پہ تبصرہ سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا سرورق پہ چہرے پہ کسی قدر سختی لئے دوشیزہ کا چہرہ اور مشتاق صاحب کی دستک واقعی دل پر دستک دیتی محسوس ہوئی، پہلی کہانی نقشِ پا بہت اچھی کہانی تھی ضمیر کی خلش نے جس طرح ان دونوں اشخاص کو سیدھا رکھا کاش ہمارے بیورو کریٹس اور سیاست دان بھی ضمیر کی اس خلش کا شکار ہوں۔ اور ملک میں کچھ بہتری آئے، کے ایم خالد صاحب نے مستقبل کے پاکستان کی درست نمائندگی کی ہے۔ اسلام میں محبتوں کا جو محرم رشتوں کے علاوہ ہوں کوئی وجود نہیں رکھتی جب کہ شوہر کے حقوق قرآن و سنت سے واضح ہیں۔

ریاض بٹ صاحب نے اچھا کیا جو طلعت کا نام بھی لکھوا دیا۔ دل نہ مانے تو انسان شادی نہ کرے شادی کرے تو شوہر کے لئے اسی طرح وفادار ہو جیسا اللہ نے حکم دیا ہے۔ امجد جاوید صاحب کی عورت زاد اس وقت نئے افق کی سب سے اچھی کہانی ہے ویل ڈن جناب۔ دل جانی کوئی خاص متاثر نہ کر سکی، آغاز اچھا تھا پر انجام پھر لو سٹوری۔ عورت کے کردار کو مضبوط دکھایا کریں۔ ایک عورت ایک نسل کی محافظ ہوتی ہے، ہر ایک کو دل جانی بنا لینا مسلم لڑکی کے وقار کے خلاف ہے۔ گندی نسل اچھے تھیم کے ساتھ اچھی کہانی ہے آفرین صاحبہ ڈن گڈ جاب۔ رذیل پڑھ کے تو پنجابی فلم آنکھوں کے سامنے آ گئی ایک فلمی اسٹوری سلطان راہی ولن صائمہ ہیروئن اور شان ہیرو اور اچھا اینڈ اچھا جناب فیلنگس اینڈ فگر پہ لکھا کریں، پل صراط عشق انتہائی بوگس کہانی، نکاح کے بول مرد و عورت میں اللہ کے حکم سے محبت پیدا کرتے ہیں محترم ریاض صاحب منگنی جیسے ٹوٹ جانے والے رشتے پہ آپ یہ کیسا معاشرہ دکھا رہے ہیں جہاں ماں اپنی بیٹی کی محبت کی داستان ایک لڑکے کو سناتی ہے جو اتنا منگیتر مرید ہے کہ ماموں کی وفات پر وقت پر نہیں جا سکا سو کالڈ منگیتر کو چھوڑ کر، شہناز آپی کی بہت اچھی قسط وار کہانی ہوتی تھی۔ یہ آپ نے کیا معیار بنا دیا ہے قسط وار کہانیاں رسالے کی جان ہوتی ہیں اور آپ نئے افق کو بے جان کر رہے ہیں۔ مشرف بہ اسلام چودھویں صدی کے علماء پہ بہترین فوکس ہے اب یہ مسلک کی لڑائیاں دو دو اینٹ کی مسجدیں ان کی اپنی بنائی ہوئی ہیں کباڑیا مزے کی تھی باقی کہانیاں اس میں سو سو تھیں، خوشبوئے سخن ایک پلیٹ فارم تھا جس سے آپ کئی نئے سخنور پیدا کر رہے تھے پر اب پرانے شعراء کا انتخاب جنہیں ہم کتابوں کی صورت میگزین رسالوں میں کئی سالوں سے پڑھ رہے ہیں سو ان کی بجائے نئے افق کے لکھاریوں کو موقع دیں تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ سفینہ کی پہلی قسط متاثر کن تھی اس کے بعد اس کا کوئی سر پیر نہیں رہا۔ ایک بندہ جو یادداشت کھو چکا ہے اس پہ راتوں کو حملے پھر آصف کا کردار بھی شو ہوا پر ختم ہو گیا، اینڈ اچھا کر دیا پر کہانی میں بہت زیادہ جھول تھے اور اوٹ پٹانگ فینٹسی بھی، اس سے پہلے نئے افق میں لگاتار دوست کی ماں کے ساتھ غلط تعلقات کی کہانیاں چھپتی رہی۔ معاشرے کے ایسے پہلو کی عکاسی ضرور کریں پر بار بار ایسی باتوں کی تکرار اچھی نہیں لگتی۔ اس بات کا خیال رکھا کریں۔ میرا تبصرہ صرف کہانیوں پر ہے کسی شخصیت کی دل آزاری نہیں آپ سب لکھنے والے میرے لئے محترم ہیں سب اچھی سی عید منائیں اور اس رسالے کو اپنی تحریروں سے جگمگائیں۔

☆ ریحانہ آپ کی تنقید سر آنکھوں پر آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے آپ نے اپنے خط میں پیشتر تحریروں کی تعریف بھی کی ہے تو پورا پرچہ برا کیسے ہو گیا اشعار نئے ہوں یا پرانے یہ ہمارے قارئین ہی بھیجتے ہیں اور ہم اسے شائع کرنے کے پابند ہیں اور ہاں آپ اپنی تحریر کب بھیج رہی ہیں۔

صائمہ نور...... ملتان شریف۔ السلام علیکم! گرمیوں کے گرم موسم میں اُمید ہے خوشحال زندگی گزار رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین! ہر پل سلامتی کی دُعائیں ورنہ یہاں تو ایسا لگتا ہے گھر کی چار دیواری میں بھی محفوظ نہیں رہے۔۔۔ اِنسان ہی انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر رہے ہیں۔ موت صرف ایک گولی کی مسافت پر ہے۔ ایک اشارے کی محتاج ہے۔۔۔ آنکھ جھپکی اور انسان زندگی سے محروم۔۔۔ کیا ہمارے آباؤ اجداد نے ایسا کبھی سوچا تھا کہ ہماری نسل بے مول موت کے حوالے ہو جائے گی۔۔۔ جس ملک کو قربانیاں دے کر حاصل کیا گیا تھا آج وہی وطن قربان گاہ بنا ہوا ہے۔۔۔ امراء کو جوڑ توڑ سے فرصت نہیں ہے اور غریب عوام، گرمی، مہنگائی اور دہشت گردی سے مر رہی ہے اور پانی ختم ہوتا جا رہا ہے۔۔۔ کہیں پانی کا قحط ہے تو کہیں پانی کا ضیاع ہو رہا ہے۔۔۔ میرٹ والے سڑکوں کی خاک چھان رہے ہیں اور سفارشی اعلیٰ عہدوں پہ بیٹھے غریب کے گلے کاٹ رہے ہیں۔۔۔ انصاف کہاں ہے۔۔؟ اب کوئی انصاف کے لئے کورٹ کچہری کی طرف رُخ کرتا نہیں ہے۔۔۔ خود ہی مجرم اور خود ہی منصف بنے ہوئے ہیں۔۔۔ میرے اللہ۔۔۔ کرم فرما۔ ماہ جولائی کا نئے افق سرورق میں خوبصورتی نہیں تھی۔ صرف ایک چہرے کو

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل وضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

پورے صفحے پر بکھیر دیا گیا ہے۔۔۔سرورق پرکشش نہیں تھا۔اس طرف خصوصی توجہ ہونی چاہیے۔۔۔ماہ رمضان الوداع ہونے کو ہے۔۔آہ یہ رمضان بھی گزر گیا۔ہم اس کی خدمت نہیں کر سکے۔۔اس مہمان کی مہمان نوازی نہیں کر پائے۔یا اللہ! ہمیں معاف فرما۔قارئین ،لکھاریوں ،اسٹاف،کو عید الفطر کی خوشیاں بہت بہت مبارک ہوں۔اپنے اردگرد بسنے والوں کو اپنی خوشیوں میں شریک کر لیا کریں۔۔۔تمام اہل وطن کو جشن آزادی مبارک ہو۔۔۔حالانکہ ہم آزاد نہیں ہیں۔۔مہنگائی نے ہماری خوشیوں کو ہتھکڑیاں لگا رکھی ہیں۔میڈیسن نے زندگی دینے کے بہانے ہمیں موت کی نیند سُلانے کی قسم اُٹھا رکھی ہے اور رہی سہی کسر ہمارے حکمرانوں نے پوری کر رکھی ہے۔۔۔خلقت کی خدمت کرنے والا کراچی کے چھوٹے سے اسپتال میں زیر علاج ہے اور ملک کا وزیر اعظم لندن میں مکمل پروٹول کے ساتھ علاج کروا رہا ہے۔۔۔یہ ہے انصاف۔۔۔۔عبدالستار ایدھی کے لئے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے صحت یابی کی دُعائیں۔اس کی شجاعت ،دلیری کی مثال اور کیا ہوگی کہ بھارت کے وزیر اعظم کی امداد کو ٹھکرا دیا تھا۔۔۔عبدالستار ایدھی تیری عظمتوں کو سلام۔۔۔دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب حسینہ واجد کے خاندان کی ظلم کی داستان سُنا رہے تھے۔۔۔بنگلہ دیش کی قسمت بھارت کے ہاتھوں میں ہے وہ جب چاہے کٹھ پتلی کی طرح اس کو نچائے۔۔۔سازشی یہی تو کر رہے ہیں۔گفتگو میں انعامی خط کسی کا بھی نہیں تھا۔۔۔۔یہ کیا ماجرا ہوا؟ اتنے پیارے پیارے خطوط تھے۔۔۔حسین جاوید،ریاض بٹ،محمد رفاقت،ریاض حسین قمر،عمیر فاروق ارشد،ممتاز احمد جاوید احمد صدیق،اعجاز حسین راحیل،بہت شکریہ۔گفتگو کی محفل خوبصورت تبصروں سے سجی تھی۔اقراء میں طاہر انکل اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کا ذکر کر رہے تھے۔ان ناموں میں بڑی برکت ہے اگر اس کا ورد رکھا جائے تو کایا پلٹ جائے گی۔ملاقات میں امجد جاوید کے انٹرویو نے دل جیت لیا۔۔۔یاسمین صدیق کے لئے دلی دُعائیں۔۔اُن کی محنت ہی سے ہم بہت کچھ جاننے کے قابل ہوئے۔۔انٹرویو کا ہر سوال خاص تھا اور جواب اُس سے اعلیٰ۔سچی کھری باتیں بہت پسند آئیں۔آخر میں قارئین کے سوالوں کے جوابات بھی زبردست تھے۔۔کہانیوں میں ''زندہ باد'' نے پہلے حیران کر دیا کہ 2098 کی کہانی جبکہ ہم 2016 میں سانس لے رہے ہیں لیکن آگے بڑھے تو لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی،لکھاری نے خوبصورتی سے طنز کے تیر چلائے ہیں۔پاکستانی قوم کا حال چار صدیوں بعد بھی یہی رہے گا۔۔۔عورت ذات خوبصورتی سے آگے بڑھ رہی ہے۔۔۔''گندی نسل'' حقیقت سے پردہ اٹھاتی اچھوتی تحریر تھی۔۔۔دل جانی میں بابر کا کردار اچھا لگا۔۔۔آج کے دور میں کسی کے ساتھ بھلا نہیں کرنا چاہیے۔مفاد پرست لوگ موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔۔۔شاہینہ کے چچا نے واقعی بُرا کیا تھا۔۔۔بدلہ لینے کا بہترین ذریعہ عدالت ہے۔۔۔دُشمن کو عدالت کے چکر پہ چکر لگوا کر کنگال کیا جاتا ہے۔اور ہمارے دیہاتوں میں یہی سب چل رہا ہے۔تعلیم کی کمی ،جہالت کی وجہ سے اپنا وقت اور پیسا برباد کیا جا رہا ہے۔۔۔چور کی داڑھی،زبردست کہانی تخلیق کی۔ریاض بٹ صاحب بہت بہت مبارک۔فن پارے کی تحریریں پسند آئی اور خوشبوئے سخن،ذوق آگہی بھی زبردست رہے۔

جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی۔ مدیران کرام سلامت تا قیامت۔السلام علیکم سپاٹ سا مگر پرکشش چہرے والی حسینہ سمیت نیا پرچہ ملا خوشی تو ہوئی جب فہرست کا مطالعہ کیا کہ ہمارے میگزین میں نامور ریگولر اور عمدہ لکھنے والوں کی اب آمد ہی آمد ہوئی آرہی ہے ایک سے بڑھ کر ایک لکھاری کو ہمارے مدیران کرام نے لکھنے کی مثبت دعوت دے رکھی ہے کچھ قارئین نے میگزین کی تعریف کا بھی لکھا ہے اچھی چیز اور اس زمانے میں اتنی کم قیمت میں کہاں ملتی ہے یہ ان لوگوں کی بڑائی ہے کہ حال من مزید کے بقول اپنے پیٹ موٹے کرتے چلیں۔قارئین کا خیال کر کے دنیا کی نعمتیں تو حاصل ہوتی ہیں بلکہ آخری ٹھکانے کے لیے زادراہ صحیح کر لی جائے جو اصل مدد کرے گی بہر حال زبردست۔دستک میں تو محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نے بنگلہ دیش کی پوری کہانی ظالم ترین وزیر اعظم حسینہ کے اردگرد گھومتی ہوئی بڑی تفصیل سے قارئین کی نذر کر دی بہت معلومات حاصل ہوئیں اور آپ کے آخری جملے ہی حاصل مطالعہ ہیں کہ اسی سیکولر اور

سوشلسٹ حسینہ نام کی اس عفریت سے بنگلہ دیش کے مسلمانوں کو جلد از جلد نجات دلائے اور اس کا انجام اپنے والد سے بھی زیادہ ہولناک اور عبرتناک ہو، آمین۔ اقرا تو ایک انمول تحریر ہوتی ہے اور اللہ کے ناموں کا مختلف معنوں میں بلند ترین مطلب بتاتی ہے سبحان اللہ یہ کتاب ہر قاری کو خریدنی چاہیے جناب طاہر قریشی جزاک اللہ مبارکباد۔ گفتگو میں حدیث شریف دل جان پر سبحان اللہ اور عمران جی کا اداریہ رمضان کے حوالے سے چشم کشا تھا پچھلے اداریہ میں ناول کا حوالہ تھا کہاں کب ملے گا اور یہ نسیم سکینہ صدف کے افسانے کب ہمیں میسر ہوں گے؟ گفتگو میں پہلا خط علی اصغر انصاری کا، انعامی خط کون سا ہے، انہوں نے تو عام سا خط لکھا ہوا ہے۔ ریاض بٹ کی کہانی زبردست اور تبصرہ بھی خوب تر آپ کی میرے تبصرہ کی تعریف (قیمت کے حوالے سے) اور ویسے بھی کرنے کا بے حد شکریہ۔ خوب تفصیلی اور گہرا تبصرہ تھا پڑھ کر مزہ آ گیا جناب اس سے پہلے کہ اگلے تبصرہ پر بات کی جائے میں تمام قارئین کو بتانا چاہتا ہوں کہ جو سمجھتے ہیں کہ میں تعریفوں میں لگا ہوا تھا ذرا امجد جاوید نامور لکھاری کا انٹرویو پڑھیں جہاں انہوں نے مدیران کے رویہ کا ذکر کیا ہے مختلف رسائل کا ذکر کرنے کے بعد عمران قریشی صاحب کی ذات کو سراہا ہے یعنی بات کرنے کا انداز اور دوستانہ رویہ اور اقبال بھٹی صاحب کہ وہ تو درویش بندے ہیں عاجز اور انتہائی مٹے ہوئے (یعنی عاجز اور ڈاؤن ٹو) طاہر قریشی بھائیوں جیسے بھی مدیروں والی بات نہیں کی بہرحال اچھائی وہ اور تعریف وہ جو دوسرے کریں اور پتا لگتا ہو کہ وہ کتنا ہر دل عزیز اور اچھا فرد ہے بہرحال یہ تو تذکرہ اور اپنی خوشی کے لیے یہ پیرا لکھ دیا۔ حسنین جاوید خوب تبصرہ لکھا مگر یہ مجلس میں سرور شاذ تو آ جاتے ہیں مگر ہماری گفتگو کی محفل میں حاضری لگواتے کیا شرماتے ہیں ارے یہ منچن آباد سے خواجہ حسین جی آپ کو کیا ہوا، بڑے چھوٹے شہر کا کوئی تعلق نہیں ہوتا یہ دل و دماغ میں اللہ اور رسول ﷺ کی محبت کی کتنی شدت بستی ہے انسان سب کیا مزدور کیا کمشنر اور یا وزیراعظم اور میرا تبصرہ ذرا ہاں مشکل پیرائے میں ہوتا ہے مگر بڑک والی ہرگز نہیں۔ مجید احمد جائی یاد کرنے کا بے حد شکریہ۔ آپ کے تبصرہ کو میں قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں ضرور آیا کریں عمر فاروق ارشد جی سخت گیر تبصرہ اور صاف ستھری بے دھڑک تنقید اور معاشرے کی برائیاں خوب بیان کرتے ہیں صاحب لگتا ہے آپ کے اندر ایک دردمند دل ہے اور یہ بھی کہوں گا کہ فلسفیانہ طرز کا تبصرہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی بڑی سوچ اور معاشرے کو ٹھیک کرنے کی تڑپ خدا آپ کو سلامت رکھے اور صحت دے آمین، احسان سحر پورا تبصرہ ہی خوب صورت اور بامعنی فقروں سے بھرپور ہر بات میں آگے فلسفیانہ تجزیہ یعنی پھول ہاتھوں میں بھی سجتا ہے اور ٹہنی پر بھی بھئی آپ ضرور بہ ضرور کہانیاں لکھنے کی طرف آ جائیں بڑی پزیرائی ملے گی واہ ویری گڈ اور بے تحاشہ دعائیں۔ ایم اے راحیل امید ہے آپ کو انعامی رقم مل چکی ہوگی ہے نا، افسوس ناک خبر منگلا سے محترم ریاض قمر نے دی شکر اللہ کا کہ اتنے بڑے حادثے سے بچ گئے اور گھر پہنچ گئے۔ ٹریفک بے تحاشہ اور بے ہنگم ہونے کی وجہ سے ایکسٹرا احتیاط برتا کریں بچوں کو لے کر اور بے حد دعائیں، بھابی صاحبہ اور آپ کو سلامتی کی دعائیں اور ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتائیں گا، باقی تبصرے بھی قابل ستائش تھے سید عبداللہ توفیق نے پرانے قلمی نام لکھ کر بہت سی یادیں یاد کرا دیں شکریہ اور اعجاز احمد راحیل ون وکٹ تبصرہ یعنی عورت زاد پر خوب تجزیہ کیا ہے ایسے تبصرے بھی اچھے لگتے ہیں۔ سلسلے وار اور دوسری کہانیاں سب ہی معیاری اور دلچسپ تھیں سچی لگن کہانی شائع فرما کر مدیران کا شکرگزار و بس اور مواد بھی بھیج رہا ہوں۔ نقش پا بھی شاہدہ صدیقی کا ایک اور شاہکار ہے زبردست، زندہ باد بھی کے ایم خالد کی زبردست کاوش رہی دل جانی، چور کی داڑھی گندی نسل، رذیل، مشرف بہ اسلام اور سفینہ دلچسپ مواد تھا دونوں سلسلے وار انوکھی اور خوب صورت ترین کہانیاں ہیں فن پارے ہمارے میگزین کی جدید ترین جدت، نہایت کامیاب اور کامران اس کے لیے بھی مدیران کرام بے حد مبارکباد کے مستحق ہیں سب سے بہترین کباڑیا کی کہانی رہی، پھر ایوارڈ اور آخر میں چودھویں کا چاند باقی دونوں بھی قابل ستائش تھیں۔ تعارف میں ایم حسن نظامی کا بیان اور اپنی کہانی خوب رہی ان کی جو شاعری شائع ہوئی ہے قابل مطالعہ اور معیاری ہے، ذوق آگہی، انعام یافتہ زبردست رہی باقی تمام انتخاب ہی

زبردست قابل تعریف کہ بڑی عرق ریزی سے انتخاب کیا جاتا ہے میرے دو اقتباس دریا بُرد ہوئے تل خشک ہو گیا اور برتاؤ شائع کرنے کا شکریہ میں نے سیرت النبی ﷺ کی کتاب جو بغیر نقطے کے لکھی گئی ہے سے اقتباس بھیجا تھا کیا ہوا محترمہ سباس گل صاحبہ اگر ملا نہ تو دوبارہ بھیج دوں خوش بوئے سخن نوشین صاحبہ کے بہترین معیار کا عکاس ہے انعام یافتہ سمیت بہترین کلام رہا خاص کر اے خدا ریاض حسین قمر صاحب کا، مبارکباد دوسرے عروج فاطمہ کی آزاد نظم خوب تو جناب مجموعی لحاظ سے بہترین میگزین رہا اجازت دعاؤں کے ساتھ دعاؤں کے لیے۔

احسن ابرار رضوی...... ساہیوال۔ سلام اُلفت! اُمید ہے خیریت سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے شاد اور آباد رکھے۔ امن بھری زندگی گزرے، خوشیاں ہی خوشیاں ہوں، دُشمنوں کی دُشمنی اور دوستوں کی مطلبی دوستی سے محفوظ رکھے۔ آمین ثم آمین۔ ماہ رمضان رخت سفر باندھ چکا، عید کی آمد آمد ہے، ذخیرہ اندوزی کرنے والوں نے تو کب کی عید منا بھی لی ہے اور اب اللہ کے بندوں نے عید کی خوشیاں منانی ہیں۔ اللہ کرے سدا خوشیاں رہیں۔ زندگی میں ہر پل خوشیاں ہوں تب بھی زندگی بے مزہ ہو جاتی ہے۔۔۔ زندگی خوشی اور غم کا نام ہے۔۔ بس اللہ تعالیٰ ہر حال میں خوش وخرم رکھے آمین۔ اہل اسلام، اہل پاکستان، اہل نئے اُفق، لکھاری، قاری، ٹیم سب کو من جملہ عید الفطر کی ڈھیروں ڈھیر مبارک باد۔۔۔۔ پیشگی اہل وطن کو جشن آزادی مبارک۔۔ اللہ کرے ہم انسانی غلامی سے نکل کر رب رحمان کی غلامی میں داخل ہو جائیں۔ آمین۔ ماہ جولائی کا نئے اُفق جلدی مل گیا۔ سرورق زبردست تھا، اگر پرچے میں موجود اچھوتی تحریر پہ سرورق بنایا جائے تو سونے پہ سہاگہ ہوگا۔ دستک میں محترم مشتاق احمد قریشی نے ڈائن حسینہ اور قاتل خاندان کا ذکر کیا۔۔ اس ڈائن نے مسلمانوں پہ بربریت کا بازار گرم کر رکھا ہے اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلا رکھی ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب اس کے اپنے کارندے موت کے گھاٹ پہ لے جائیں گے۔۔۔ تاریخ میں ایسے ظالموں کے عبرت ناک قصے ملتے ہیں۔ گفتگو میں کوئی بھی خط انعام یافتہ نہ پا کر شاک سا لگا۔۔ کیا یہ سلسلہ بند کر دیا گیا ہے۔ خطوط میں ریاض بٹ، محمد رفاقت، عمر فاروق ارشد، ریاض حسین قمر، ممتاز احمد، احسان سحر، جاوید احمد صدیقی، کے تبصرے بہترین تھے۔ اقراء میں طاہر احمد قریشی نے اللہ تعالیٰ کے ناموں کی فضیلت بیان کی، اللہ تعالیٰ عمل کرنے کی توفیق دے آمین۔ ملاقات میں یاسین صدیق نے امجد جاوید سے ملایا۔۔ بہت خوب۔۔ بہت اعلیٰ۔۔۔ جن کو عرصے سے پڑھ رہے تھے اُن کے بارے جان کر دل بہت خوش ہوا اور بہت کچھ سیکھنے اور جاننے کو ملا۔۔ بہت شکریہ یاسین صدیق بھائی۔۔ شاہدہ صدیقی نے پانامہ لیکس کے پس منظر میں خوب لکھا۔ زندہ باد نے حیران کر دیا۔۔ کمال کی تحریر۔۔ دل جانی نے متاثر کیا۔ ہمارے دیہات کی پس منظر میں لکھی خوبصورت تحریر۔۔۔ ہمارے دیہاتیوں کی وجہ سے کچہریاں آباد ہیں اور وکیلوں کی جیبیں گرم رہتی ہیں۔۔ یہاں سے جہالت ختم ہو جاتی اور یہ اپنا پیسا اور وقت ضائع کرنے سے بچ جاتے۔۔ کیا اب ان کے لئے کوئی اور قائداعظم آئے گا، یا علامہ محمد اقبال ان کے ضمیروں کو جھنجوڑنے آئے گا۔۔ گندی نسل بھی یہی کچھ بیان کر رہی ہے۔ ہمارے معاشرے کو یورپ نے یرغمال کر لیا ہے۔۔ خاندانی سسٹم ختم ہوتا جا رہا ہے۔ باقی سب تحریریں بھی اچھی رہیں۔ فن پارے سجائے گئے اور خوشبوئے سخن، ذوق آگہی بے مثال ہیں۔۔ خود کو خوش رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ دوسروں کو خوشیاں دیں۔۔ فکر زندگی کی نہیں موت کی کرنی چاہیے۔

علی حسنین تابش...... چشتیاں۔ تمام مدیران حضرات، تمام اسٹاف اور میرے تمام دوستوں کو سلام مسنون۔ اُمید کامل ہے مزاج بخیر وعافیت ہونگے۔ بندہ ناچیز بھی خدا بزرگ و برتر کی رحمتوں، برکتوں، عنایتوں کی بدولت خیریت سے ہے اور اپنے خدا بزرگ و برتر کا نہایت عاجزانہ سپاس گزار ہے۔ در و دیوار وادی سکوت میں خواب خرگوش کی نیند کے مزے لے رہے تھے۔ سکوت اس قدر کہ دل کی دھڑکن اور سانسوں کی رفتار با آسانی سماعتوں سے ٹکراتی ہوں۔ میں اپنے مخصوص تخلیقی حجرے میں بیٹھا کچھ لکھنے میں محو تھا۔ اچانک سے موبائل کی لائٹ روشن ہوئی اور ساتھ میں ہی بیل

بجنے لگی۔ اسکرین پہ رونما ہونے والا نمبر میرے پیارے دوست کا تھا۔ حال احوال کے بعد معلوم پڑا کہ محترم خواجہ صاحب نے ہمیں گمشدہ قرار دے دیا ہے۔ لبوں پہ ایک مسکراہٹ نے رقص کرنا شروع کر دیا۔ ارے مٹھو بھائی میں کہیں گم نہیں ہوا۔ کچھ مصروفیت کی بنا پر محفل سے غیر حاضر رہا۔ برائے کرم بندہ ناچیز کی اس گستاخی کو درگزر فرمایا جائے۔ انشاء اللہ اب حاضری کی پابندی ہوگی۔ خواجہ صاحب یاد آوری کا بے حد شکریہ۔ اللہ پاک آپ کو خوش رکھے۔ مصروفیت سے ہٹ کر ایک اور وجہ بھی تھی جس کی وجہ سے میں احوال نہیں لکھ پار ہا تھا۔ گذشتہ چند ماہ سے احوال کی محفل میں کچھ گرم جوشی کا اک موسم طاری تھا۔ ارے بھائی جون کی گرمی تو چھوڑ یئے۔ اللہ پاک نے یہ جو ایک آتش دان ہمارے سینوں میں پابند سلاسل کر رکھا ہے۔ اس کی آتش تو شاید دوزخ کی آگ سے بھی زیادہ تپش کی مالک ہے۔ یہ دنیاوی گرمی تو کچھ بھی نہیں۔ خورشید کی تپش اس کے آگے ساگر میں بارش کی ایک بوند برابر ٹھہری۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ جب ہمارا دین ایمان ہے کہ عزت اور ذلت رب کریم کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے۔ عزت سے نوازتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت سے نواز دیتا ہے۔ یہ سب مالک کے کام ہیں۔ تو کیوں ہمارے دلوں میں جلن بغض، منافقت حسد نے آکر ڈیرہ جمالیا ہے۔ نفرت کے شجر حسد کے خاروں نے سلطنت قلب کو تباہ کر دیا ہے۔ ہم شکل وصورت سے تو بے حد خوبصورت ہیں۔ ہمارے چہرے چمکتے آفتاب کی مانند ہیں۔ ہماری کشادہ جبیں پر محراب سجے ہوئے ہیں۔ مگر ہم اندر سے اتنے کالے کیوں ہیں۔ ہمارے اندر کی سیاہی کو ہم کیوں مٹا نہیں سکتے۔ کیوں کسی کی کامیابی پر اسے دعائیں نہیں دیتے۔ رب کریم کا ارشاد ہے۔ ”تو اوروں کی خوشی مانگ میں تیری جھولی خوشیوں سے بھردوں گا“ لیکن یہاں تو معاملہ ہی اُلٹ ٹھہرا۔ بہرکیف بات کہاں نکل گئی۔ میرے بھائیو کبھی سوچا ہے کہ ایک دن میں 24 گھنٹے ہیں۔ ایک گھنٹہ بھی اپنی ذات کے لیے نکالا ہے کبھی؟ کبھی سوچا کہ آج کا دن گزرا آج میں نے کتنے حقوق اللہ کی ادائیگی کی کتنے حقوق العباد کی ادائیگی کی ہے؟ ارے ہم تو جو اپنے ساتھ ہی مخلص نہیں کسی اور کے ساتھ کیا خاک مخلص ہوں گے۔۔۔۔؟ نماز کا فائدہ ہمیں ہوگا مگر پڑھتے نہیں ہیں۔ نیکی کا ثواب ہمارے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا۔ مگر ہم کیوں کریں؟ کہیں دوسرے کا بھلا نہ ہو جائے کہیں وہ ہمیں سچے دل سے دعا نہ دے دے۔ کہیں ہماری آخرت نہ سنور جائے۔ میرے پیارو حسد کی آگ انسان کو راکھ راکھ کر دیتی ہے۔ بہرکیف معاملہ کچھ بڑھ نکلا۔ کوئی بات بری لگی تو معذرت چاہتا ہوں جی جناب تو سنایئے سب کا رمضان المبارک کیسا گزرا۔۔۔۔؟ سب اہل اسلام کو میری طرف سے عید الفطر کی ہزاروں خوشیاں مبارک ہوں۔ مگر شاید یہ عید بھی اشکوں کے سیلاب میں بہہ گئی۔ گذشتہ ماہ جون میں پیارے بھائی امجد صابری صاحب خالق حقیقی سے جا ملے۔ پاکستان کا ایک اہم اور ناپورا ہونے والا نقصان پیارے بھائی پاکستان کی شان تھے۔ یہ خبر سنتے ہی جیسے یقین نہ ہوا! اور شاید ابھی بھی نہیں ہو رہا۔ ایک سچا عاشق رسول ﷺ نعت خواں ٹارگیٹ کیلنگ کا نشانہ بنا۔ اس معصوم کا کیا قصور تھا۔ کس کو قصور وار ٹھہرائیں۔ کون کرے گا مداوا غم؟ یہ خلا صدیوں میں پورا نہ ہو سکے گا۔ رب کریم سے دعا گو ہوں کہ مرحوم بھائی امجد صابری کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین) اور مرحوم کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ انشاء اللہ اب میں حاضری کو یقینی بناؤں گا۔ اب اجازت دیں۔ زندگی نے وفا کی تو دوبارہ حاضر ہونگا۔ تب تک کے لیے اللہ نگہبان

ایم اے راحیل...... ملتان۔ آداب! اُمید کرتا ہوں خوشیوں کے جھرمٹ میں زندگی بسر کرتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ حاسدین کے شر سے بچائے اور عزت وتکریم والی زندگی جینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ماہ جولائی کا نئے اُفق بروقت مل گیا۔۔۔ سرورق اچھا تھا۔ دستک میں محترم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے حسینہ واجد اور اُس کے خاندان کا تاریخی پس منظر پیش کیا۔ اس طرح اُن کے کالے کرتوتوں کی فہرست سامنے آگئی۔۔۔ یہ حسینہ قاتل ہی ہے جو سچے کھرے مسلمانوں کا قتل عام کر رہی ہے۔ جس کی پرورش غیر مسلم معاشرے میں ہوئی ہو وہ مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک کہاں کرے گی اور اُدھر بھارت پاکستان کا پیدائشی دشمن ہے۔ پاکستان کی ترقی اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔۔۔ لیکن ایک

بات اٹل ہے یہ دونوں مل کر بھی پاکستان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ اس وطن کے پاس بہادر افواج، دلیری قوم موجود ہے
۔۔۔گفتگو میں حسین جاوید کا مختصر خط پہلے نمبر پہ تھا وہ بھی بغیر انعام کے۔۔۔ریاض بٹ کا خط بھی زبردست رہا، مجید احمد
جائی مدلل خط کے ساتھ تشریف لاتے ہیں۔ اسی طرح احسان سحر، احسن ابرار رضوی، ممتاز احمد، ریاض حسین قمر، عمر فاروق
ارشد، اعجاز حسین راحیل، محمد رفاقت بہترین خطوط کے ساتھ جلوہ گر تھے اور۔۔۔اور۔۔۔میرے خط کا کچومر بنا دیا گیا۔
ساری محنت اور عرق ریزی کا جنازہ نکال دیا جاتا ہے خیر اس بار گفتگو کی محفل خوب مہک رہی تھی۔ ملاقات میں امجد جاوید
کا انٹرویو عمدگی سے پیش کیا گیا۔۔۔یاسین صدیق نے واقعی محنت کی ہے۔۔۔نئے اُفق میں ایک سے بڑھ کر ایک انٹرویو
آرہا ہے۔۔۔اقراء میں طاہر احمد قریشی نے اللہ تعالیٰ کے ناموں کی خوبیاں بیان کر کے ہمارے اوپر احسان کر دیا۔۔۔اللہ
عمل کرنے کی ہمت عطا فرمائے آمین۔ ملاقات میں یاسین صدیق نے امجد جاوید سے خوب سوالات کئے اور ہمیں
بہترین انٹرویو پڑھنے کو ملا۔ امجد جاوید واقعی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔۔۔کہانیوں میں چور کی داڑھی، ریاض بٹ نے
بہترین کہانی صفحہ قرطاس پر بکھیری۔ دل جانی، جس طرح کا نام تھا میں سمجھا کہانی لواسٹوری ہو گی لیکن پڑھنے کے بعد پتا
چلا کہ لوگ کس طرح جھوٹے مقدمات میں پھنسواتے ہیں۔۔۔آج کے زمانے میں اپنا دامن بچانے میں ہی عافیت
ہے۔ گندی نسل، بہترین کہانی تھی۔۔۔مائیں اس دور سے بھی گزریں گی۔ سوچا نہ تھا۔۔۔تصویر کا دوسرا رخ دکھایا گیا
ہے لیکن دونوں رُخ کا جائزہ لیا جائے تو حالات ہی قصوروار ٹھہرتے ہیں۔۔۔بحرحال کہانی بہترین رہی۔ زندہ باد
۔۔۔طنز کے نشتر چلاتی خوبصورت کہانی تھی۔۔۔واہ مزہ آگیا۔۔۔قسط وار دونوں کہانیاں خوب چل رہی ہیں۔۔۔سفینہ
اختتام پذیر ہوئی۔۔۔فن پارے، خوشبوئے سخن، ذوق آگہی، بہترین رہے۔

مجید احمد جائی ...... ملتان شریف۔ مزاج گرامی! اُمید واثق ہے خیر بانٹتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ تمام
جہانوں کی آسانیاں پیدا فرمائے صحت کی بادشاہی، ایمان کی سلامتی کے ساتھ سلامت رکھے آمین ثم آمین۔ تمام
لکھاریوں، اسٹاف، اور قارئین کو تہہ دل سے عید الفطر بہت بہت مبارک۔ یقیناً جب اگست کا پرچہ آئے گا تو عید گزر چکی
ہو گی۔ اللہ کرے تمام عالم اسلام کے لئے یہ عید مسرت بھری ہو۔۔۔مجھے تو عرصہ ہوا ہے عید نہیں منائی۔۔۔کیسے
مناؤں۔ ہر طرف دہشت ہی دہشت ہے، مہنگائی کا طوفان اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ امیری غریبی کا تضاد ہر سو
ہے۔ غریب بھوک سے مر رہے ہیں تو امیر بیماری کے ڈر سے کھانا چھوڑے ہوئے ہیں۔ حسد کینہ پروری عروج پر ہے
۔ نفسا نفسی کا عالم ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد، کس کو فرصت ہے، اس طرف توجہ دے۔۔۔جب انسان خود کے لئے
جینے لگے تو انسانیت مر جاتی ہے۔۔۔اللہ کرم کرے اور وطن عزیز کو امن کا گہوارہ بنائے آمین۔۔۔تمام پاکستانیوں کو جشن
آزادی بہت بہت مبارک ہو۔ ماہ جولائی 2016 کا نئے اُفق تمام تر رعنائیوں کے ساتھ تھوڑا لیٹ ملا۔ پہلے پندرہ
تاریخ کو مل جاتا تھا اب کی بار بیس تاریخ کو ہماری دسترس میں آیا۔۔۔سرورق دیدہ زیب تھا۔ دستک میں جناب مشتاق
احمد قریشی صاحب نے قاتل حسینہ کا ذکر کیا واقعی حسینہ واجد نے وحشی حسینہ کا کردار ادا کیا ہے اور اس میں بھارت کی کارستانی
بھی ہے۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو کہ حسینہ واجد نہ گھر کی رہے نہ گھاٹ کی اور بھارت بھی اپنے پاؤں پہ خود کلہاڑی مارے گا۔
یہ اپنے منہ کی کھائے گا۔ گفتگو میں عمران احمد قریشی نے حدیث مبارکہ کی روایت برقرار رکھی ہوئی ہے اللہ تعالیٰ عمل کرنے
کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ محترم عبد الغفار عابد کی والدہ محترمہ کے انتقال کی خبر سن کر دل غمگین ہوا اللہ تعالیٰ اُن کے
درجات بلند فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ پہلا خط علی اصغر انصاری کا تھا۔ مختصر سا خط اچھا لگا۔ ریاض
بٹ آپ کی محبتوں کا مقروض ہوں۔ آپ جس طرح میرے اُٹھائے گئے سوالوں کا جواب دیتے ہیں، دل جیت لیتے ہیں
۔ محمد رفاقت سے ٹیلی فونک بات ہوئی، دل خوش ہوا۔ اللہ تعالیٰ سلامت رکھے۔ آمین حسین جاوید بہت شکریہ، عمر فاروق
ارشد، احسان سحر بہت شکریہ ممنون ہوں۔ آپ کے تبصرے شاندار تھے۔ نسیم سکینہ صدف کی حاضری اچھی رہی۔ اقراء میں

طاہر قریشی صاحب اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کے ساتھ حاضر تھے۔ اللہ تعالیٰ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور طاہر قریشی صاحب کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔ ملاقات میں امجد جاوید صاحب سے گپ شپ خوب رہی۔ انٹرویو شاندار رہا، محمد یاسین صدیق نے خوب محنت کی ہے۔ ہنستے مسکراتے سوالات اور حقیقت پسندانہ جوابات مزہ آگیا۔۔۔ کہانیوں میں ''چور کی داڑھی'' پلاٹ اچھا تھا، ایک بات سمجھ نہیں آئی کہ برآمدے تو کھلے ہوتے ہیں، برآمدوں کے دروازے میں نے تو نہیں دیکھے۔۔۔۔ بٹ صاحب اس کی وضاحت فرمادیں۔۔۔ چند جگہوں پر کمپوزنگ کی اغلاط تھیں، جس سے کہانی کا مزہ کرکرا ہو رہا ہے،، جیسے ''حاصل'' کو ''حامل'' لکھا گیا۔ زندہ باد میں میرے قلمی بھائی نے خوبصورت موضوع پہ قلم اُٹھایا ہے۔۔۔ طنز و مزاح کے تیر سینے میں پیوست کرتے نظر آتے ہیں۔ اُنہوں نے پاکستانیوں کی منظر کشی خوب کی ہے۔ سو سال بعد بھی یہ قوم ایسی ہی رہے گی۔۔۔ دل جانی میں یاسین صدیق نے دلیری کے ساتھ سچ بیانی کو پیش کیا۔۔۔ ہمارے دیہات میں آج بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔۔۔ اور ہاں تھانے سے بابر بھاگا تو جس کی موٹر سائیکل چھین کر گیا تھا۔۔۔ کیا وہ واپس ہوئی کہ نہیں۔۔۔ تلخ حقیقت سے پردہ اٹھاتی خوبصورت تحریر تھی۔۔۔ بابر نے جہاں شادی کی اُس کا مختصر ذکر کر دیتے تو مزہ دوبالا ہو جاتا۔۔۔ گندی نسل میں آفرین اعوان نے خوبصورت موضوع کو چھیڑا ہے۔ وہ مائیں اب کم ہی ملتی ہیں جو بچوں کی دین اسلام کے اُصولوں پر تربیت کرتی تھیں۔ اب جدید دَور نے مغربی یلغار کو اپنا لیا ہے۔۔۔ مسلم تو ہیں مگر کام یورپ سے بھی کہیں آگے کے ہیں۔۔۔ معاشرے میں بگاڑ انہی کی وجہ سے ہے۔ اگر آج کی ماں دین اسلام کی مکمل پیروکار بن جائے تو معاشرہ سدھر جائے گا۔ باقی تحریریں بھی خوب رہیں۔ اس کے علاوہ فن پارے کی تمام تحریریں بہترین تھیں۔ خوشبوئے سخن بھی خوب رہے۔ انعام یافتگان کو بہت بہت مبارک۔ سفینہ اختتام پذیر ہوا۔۔۔ زبردست تحریر تھی۔۔۔ اس علاوہ ایڈیٹر صاحب سے التماس ہے کہ (عذابِ مسلسل) اپریل میں روانہ (بذریعہ میل) کی تھی، مہربانی فرما کر آگاہی سے نوازیں۔۔۔ تا کہ انتظار کی شدت ختم ہو سکے۔۔۔ اس کے ساتھ اجازت زندگی رہی تو ہو گی پھر ملاقات، ورنہ خطائیں معاف، بخشش کی دُعائیں۔ اللہ حافظ!

ناظم بخاری...... لودھراں۔ محترم عمران احمد قریشی صاحب! السلام علیکم۔ کیسے ہیں آپ؟ امید ہے کہ بفضل خدا بخیریت ہوں گے۔ مجھے یاد ہے، میں نے کہانیاں لکھنے کا آغاز نئے افق سے کیا تھا۔ یہ دو ہزار نو کی بات ہے۔ ایک دو سالوں تک یہ سلسلہ چلنے کے بعد رک گیا تھا۔ اب دوبارہ دو ہزار پندرہ میں نثر کی طرف لوٹا ہوں۔ کل ڈاک سے نئے افق کا تازہ شمارہ اور اعزازیہ ملا۔۔۔ بے حد خوشی ہوئی۔ "مشرف بہ اسلام" کی اشاعت کے لیے شکرگزار ہوں۔ پچھلے چند ماہ سے نئے افق میں آپ نے جو تبدیلیاں کی ہیں، وہ بہت خوش آئند ہیں۔ نئے افق کا معیار بھی اب پہلے سے بہت بہتر ہو گیا ہے۔۔۔ امید ہے کہ یہ معیار برقرار رہے گا۔۔۔ سب سے پہلے امجد جاوید صاحب سے ملاقات کی۔۔۔ ان کا تعارف بہت اچھا لگا۔ بہت دلچسپ سوال و جواب تھے۔ خطوط کی محفل میں بھی تمام دوستوں کے خطوط بہترین تھے۔۔۔ رسالے میں، ایم حسن نظامی صاحب۔۔۔ کی کچھ غزلیں نظروں سے گزریں۔۔۔ ان کا مختصر تعارف بھی پڑھنے کو ملا۔۔۔ موصوف بہت پرانے لکھنے والے ہیں مگر۔۔۔ شاعری کے حوالے سے ابھی انہیں بہت محنت کی ضرورت ہے۔ ان کے کلام میں جگہ جگہ وزن کا مسئلہ دکھائی دیا۔ ان سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ وہ کسی استاد سے اصلاح لیں اور اپنی وزن کی خامیوں پر قابو پائیں۔۔۔ تا کہ ان کے کلام میں بہتری آئے۔۔۔ رسالے میں ایک اور چیز جو مجھے قابل اعتراض نظر آئی ہے اس پر بھی بات کرتا چلوں۔۔۔ خوشبوئے سخن میں اس بار جو کلام انعام یافتہ قرار پایا، وہ سرے سے وزن میں ہی نہیں ہے۔۔۔ نوشین صاحبہ کا ذوق اچھا ہوتا ہے مگر اس بار ان سے اور ادارے سے بہت مسٹیک ہوئی ہے۔۔۔ پلیز انعام یافتہ کلام اسے قرار دیا کریں، جو اس قابل بھی ہو۔۔۔ میں کیونکہ عروض اور وزن سے وابستہ ہوں، اس لیے ان باتوں کو سمجھتا ہوں۔۔۔ اور اس تنقید کا مقصد اپنی علمی برتری جھاڑنا نہیں ہے۔۔۔ بلکہ ان خامیوں کو

دور کرنا ہے، جوادارے سے نادانستگی میں ہو جاتی ہیں۔۔۔تاکہ ہمارا نئے افق بہتر سے بہترین ہو کر ہم سب کے دلوں پر راج کرے۔ کہانیوں میں صرف کے ایم خالد کی تحریر پڑھ سکا ہوں۔۔۔ بہت ہی عمدہ اور بہترین تحریر ہے۔۔۔ بہت ہی الگ تھلگ اور منفرد۔۔۔ان کے لیے بہت داد اور دعائیں۔۔۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں، امید ہے وہ بھی بہترین ہوں گی۔ جاوید احمد صدیقی اور ریاض بٹ صاحب کی خدمت میں سلام خلوص کہ وہ ناچیز کو نہیں بھولے ہوں گے۔ والسلام

محمد رفاقت...... **واہ کینٹ**۔ محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم، جناب ماہ جولائی کا شمارہ ملا ملتے ہی پڑھنے لگا یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میرا خط اور اقوال زریں شائع ہو گئے میرا دل خوش کر دیا، میں آپ کا تہہ دل سے مشکور ہوں، اس بار مشتاق احمد قریشی صاحب شیخ مجیب کا اصلی روپ دکھاتے نظر آئے میرے پسندیدہ رائٹر ریاض بٹ کی کہانی چور کی داڑھی خوب تھی سب سے پہلے اسے پڑھا یہ کہانی خوب صورت ہے سود کا کاروبار کرنے والوں کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا کہانی نے مزہ دیا، اس کے بعد ناظم بخاری کی کہانی مشرف بہ اسلام پڑھی واقعی اس کہانی کے کیا کہنے نام نہاد ملاؤں نے لوگوں کو تفرقے میں ڈالا ہوا ہے، یہ بھی مسلمانوں کے خلاف ایک سازش ہے کہ ان کو نفرتوں میں بانٹ کر ان کا اتحاد پارہ پارہ کر دیا جائے اور اپنی اجارہ داری قائم رکھی جائے۔ ناظم بخاری بھائی ویل ڈن، زریں قمر صاحبہ کی سفینہ نے بھی متاثر کیا یہ قسط اچھی اور جاندار تھی اور میری نظر میں اس دفعہ آفرین اعوان کی کہانی سب پر نمبر لے گئی ہے انہوں نے جس مسئلہ کو لکھا ہے وہ بہت نازک مسئلہ ہے، گندی نسل ایسی کہانی ہے جو کہ اس معاشرے میں جنم لے رہی ہے، اس طرح کے اور بہت سے کردار بھی ہیں جو کہ لکھنے کے قابل ہیں ماں کے پاؤں تلے جنت ہوتی ہے مگر کچھ لوگ اس کی قدر و قیمت نہیں جانتے اور اپنے ذرا سے فائدہ کے لیے اس کو پامال کر ڈالتے ہیں، اس انداز کی ایک کہانی میں نے بھی لکھی ہے جلد ہی پیش خدمت کروں گا، اس ماہ کی سب سے اچھی کہانی ہے اس دفعہ نئے افق میں بہت جان تھی اور اس سے پہلے میں نے کبھی بھی نئے افق میں اتنی اچھی کہانیاں اکٹھی نہیں دیکھیں اس دفعہ کے رسالے کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے ایک بات یہ کہ سرورق کی تصویر اگر رمضان کی مناسبت سے ہوتی تو بہت اچھا تھا، باقی انتخاب میں کسب حلال کی فضیلت، تھوڑی سی وفا، محبت، روح سے محبت اور دریائے نیل خشک ہو گیا پسند آئیں، اس بار کترنیں بھی کافی تھیں اور پسند بھی آئیں، سب لکھنے والے اب زیادہ محنت سے لکھ رہے ہیں میری طرف سے سب کو بہت بہت مبارک باد قبول ہو، ملاقات میں امجد جاوید صاحب کو پڑھا اور معلومات میں بھی اضافہ ہوا، خوب ملاقات رہی، زندہ یاد ایسی کہانی ہے کہ جس نے ہم انسانوں کو خیالات میں ڈال دیا اگر ایسا ہوا تو کیا ہوگا کے ایم خالد صاحب اچھی کہانی ہے، بہت خوب بھائی امجد جاوید کی عورت زاد بھی ابھی چل رہی ہے دیکھیں آئندہ کیا ہوتا ہے میرے خط کی تعریف کی محترم مجید احمد جائی، علی اصغر انصاری، صائمہ نور صاحبہ حاضری مختصر مگر حاضر تو ہیں باقی، ریاض حسین قمر، اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی فیملی کو جلد از جلد صحت دے، آمین، والسلام۔

عنبرین اختر...... **لاہور**۔ محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم جولائی کا نئے افق موصول ہوا نئے افق پڑھا اس کا انداز تکلم منفرد لگا اس سے محو گفتگو ہوئی تو آخری صفحے تک پہنچ کر دم لیا اور احساس ہوا کہ آپ نے اس کو سنوارنے اور سجانے میں اس صورت میں پیش کرنے میں کیسے کیسے پل صراط پار کیے ہوں گے، نوازشات کو حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں، سرورق بظاہر خوب صورت مگر ٹھنڈک کا تاثر چھوڑ گیا، تمام سلسلے جن میں دستک، اقرا، ملاقات، نقش پا، عورت زاد، چور کی داڑھی، دل جانی، گندی نسل، رذیل، پل صراط عشق، مشرف بہ اسلام، سچی لگن، فن پارے، سفینہ، ذوق آگہی اور خوش بوئے سخن اچھے اور معیاری سلسلے ہیں۔ میری نظم شائع کرنے پر آپ کی بہت ممنون ہوں میں اپنی ایک اور نظم ارسال کر رہی ہوں، امید ہے نئے افق میں سما پائے گی اگر آپ نے میری حوصلہ افزائی کی تو میں آئندہ بھی اس سے رشتہ جوڑے رکھوں گی، میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو ہمیشہ ہنستا مسکراتا رکھے آپ کو لمبی زندگی دے آپ کے کاروبار میں برکت عطا فرمائے،

آمین۔

ایم حسن نظامی...... **قبولہ شریف۔** سلام خلوص امید ہے آپ اور نئے افق سے وابستہ سبھی احباب بخیر ہوں گے پرچہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا، اچھا معیاری اور منفرد پایا اس کے تمام سلسلے انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ پائے اور یہی آپ جیسے کامیاب و کامران ایڈیٹر کی مرہون منت ہے اور آپ کی بیکراں کوششوں کا نتیجہ ہے۔ آپ نے میرے دوستی کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو تھاما مجھے جی آیا نوں کہا شاعری کو اپنے خوب صورت جریدے کے سنہری صفحات پر جگہ دی اس کے لیے بے حد شکریہ۔ آخر میں قارئین کا میری شاعری پسند فرمانے اور اسے سراہنے پر ڈھیروں شکریہ۔ خداوند کریم ہمارے سدابہار جریدے کو یونہی آکاش کی بلندیوں پر ستاروں کی مانند جگمگاتا رکھے، آمین۔

فلک شیر ملک...... **رحیم یار خان۔** جناب مدیران نئے افق، سلام محبت شمارہ ایک دن لیٹ ملا بہر کیف اس دفعہ ٹائٹل کے علاوہ سب کچھ ٹھیک تھا۔ عید کے لحاظ سے ٹائٹل پر چاند ستارے نظر نہیں آئے دستک ایم اے قریشی نے حسینہ واجد کے خلاف برحق لکھا، ظلم جب بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے ان شاءاللہ اسلام کے نام لیوا ہی سرخرو ہوں گے، گفتگو میں عمران صاحب نے یہود و نصاریٰ کی سازش بے نقاب کی بڑی قابل ستائش بات ہے، خطوں میں کچھ خط بہت طویل تھے گزارش کروں گا کہ میرے محترم قارئین کرام خط میں اختصار اختیار کرو تا کہ باقی لوگوں کے خط بھی چھپ سکیں اب دیکھیں تا 290 صفحات پر مشتمل یہ جریدہ کیا کیا شائع کرے دو ناول پہلے چل رہے ہیں تیرے ناول کی آمد آمد ہے بے چارے نئے رائٹرز کہاں جائیں، خواجہ حسین نے میری رائے کی تائید کی شکریہ، یاسر اعوان کی رائے پر میں متفق ہوں ٹائٹل پر جاندار کی تصویر نہ ہو تو بہتر ہے رسالے کے اندر مواد بھرپور ہونا چاہیے عمر فاروق ارشد کو انعام یافتہ ہونے پر مبارک کلام اچھا تھا۔ صائمہ نور، جاوید احمد صدیقی اور ریاض بٹ کے تبصرے خوب رہے، حسین جاوید نے تو کمال کر دیا، قارئین کے بارے میں اتنا خوب صورت انداز میں لکھا واہ واہ آپ کے اس انداز پر آپ کو سیلوٹ کرتا ہوں جناب، ممتاز احمد سرگودھا آپ غلطی کھا گئے اقتباس میرا انعام یافتہ تھا مبارک بادیاں کسی اور کو کوئی بات نہیں۔ ملاقات میں امجد جاوید کا انٹرویو زبردست تھا مزہ آیا اس دفعہ پرنٹنگ میں کچھ تبدیلی کی گئی جو کہ اچھی بات ہے طاہر قریشی صاحب اللہ کی صفات پر زبردست لکھ رہے ہیں ایم حسن نظامی کا کلام سچے موتیوں جیسا شفاف تھا اور بے قراری میں حصہ لینے والی بہنوں کو خصوصی مبارکباد پیش کرتا ہوں ریاض بٹ نے اپنی اس تحریر جو کی داڑھی میں کافی حد تک تبدیلی کی ہے جو کہ خوش آئند بات ہے بہترین تحریر تھی۔ زندہ باد، مزاح کے علاوہ ایک سبق آموز کہانی تھی لوگ پاکستان آنے سے کیوں ڈرتے ہیں یہ ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے امید ہے عوام آئندہ الیکشن میں اچھے نمائندے چنیں گے، گندی نسل پر کیا کہوں آفرین اعوان نے تو واقعی سچ لکھا ہے مگر مسئلہ ایک ماں کا ہے جس کے قدموں تلے جنت ہے ذوق آگہی اور خوشبوئے سخن بہترین ادب کا نمونہ تھے نادیہ خان بلوچ اور عروج فاطمہ سیدہ کا کلام سپرہٹ تھا انمول موتی، نائمہ غزل کراچی کے بہت ہی خوب صورت تھے جو کہ دل پر گہرے نقوش چھوڑ گئے آخر میں گزارش کروں گا عمران بھائی سے کہ میں نے کچھ تحریریں آپ کی نذر کی تھیں ناقابل اشاعت میں بھی ان کا نام نہیں آیا کیا وہ قابل اشاعت ہیں یا نہیں۔ پلیز ضرور بتائے گا، شکریہ۔

ریاض بٹ...... **حسن ابدال۔** السلام علیکم ماہ جولائی 2016ء کا شمارہ اس وقت نگاہوں کے سامنے ہے سرورق پر ایک نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھے گیسٹوفل کا غائبانہ ایک چمچ پیا اور میڈورا کی خوشبوؤں میں چند لمحے گزارنے کے بعد دستک تک پہنچے، اس بار مشتاق احمد قریشی صاحب شیخ مجیب کا اصل روپ دکھاتے نظر آئے یہ روپ کچھ لوگ پہلے سے جانتے تھے لیکن نئی نسل شاید اتنی گہرائی سے نہ جانتی ہو بہر حال اس کی بیٹی حسینہ اس وقت اسلام کا نام لینے والوں کو اپنے اقتدار کی چھتری تلے ختم کر رہی ہے، لیکن وہ یہ بھول رہی ہیں کہ اسلام ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے ہے اسے کوئی ختم نہیں کر سکتا ان شاءاللہ۔ لگتا ہے تاریخ اپنے آپ کو دہرانے کے لیے بے تاب ہے اور اس کا انجام بہت بھیانک ہونے والا

ہے۔ کیونکہ عشق کسی بھی وقت آتش نمرود میں کودنے کے لیے پرتول رہا ہے۔ اب بڑھتے ہیں اپنی پیاری محفل گفتگو کی طرف پہلا خط ہے جناب علی اصغر انصاری کا مختصر لیکن جامع خط ہے، حسین جاوید خوش آمدید آئندہ بھی آتے رہیے گا، محمد رفاقت صاحب اس بار اتنی کنجوسی، یعنی اتنا مختصر خط، بھرپور تبصرے کے ساتھ آئیں تو مزہ آئے بہر حال آپ میرے فین ہیں اس لیے یہ مشورہ دے رہا ہوں خواجہ حسین بھائی آپ کا تبصرہ بھی خوب ہے، محمد یاسر اعوان آپ کی باتیں قابل غور ہیں مجید احمد جائی بھائی مجھے بھی آپ کی شخصیت نے متاثر کیا ہے اور قفس میں رقص ایک اچھی کاوش ہے میں قارئین کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ خرید کر ضرور پڑھیں آپ کی یہ باتیں بھی ایک ٹھوس حقیقت ہیں کہ رمضان میں مہنگائی کے جن کو آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے ہر چیز عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہو جاتی ہے خط ہمیشہ کی طرح اچھا ہے، عمر فاروق ارشد بھائی حوصلہ رکھیں انسان کو کسی صورت حوصلے کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے، خدا آپ کی مشکلیں آسان کرے اور مصیبتوں سے نجات دے آمین۔

خزاں رکھے گی درختوں کو بے ثمر کب تک
گزر ہی جائے گی یہ رت بھی حوصلہ رکھنا

احسان سحر بھائی کیسے ہو، اس بار آپ مجھے بالکل بھول گئے آپ کا خط مدلل اور خوب صورت ہے اچھے لفظوں کی مالا بنتے ہیں نسیم سکینہ صدف آپ آداب عرض والی ہی ہیں نا آپ کا مختصر خط پرچے کی شان بڑھا رہا ہے۔ بہن صائمہ نور کیسی ہو، اس بار آپ کا خط ذرا طویل اور اچھا ہے تبصرہ بھی خوب ہے اس بار میری کہانی اور خط موجود ہے پچھلی بار شاید خط ڈاک کے ڈبے میں رہ گیا تھا بہر طور یاد کرنے کا شکریہ، ایم اے راحیل بھائی آپ کا خط بھی محنت اور لگن سے لکھا ہوا ہے، ادارے والوں نے اس بار شاید انعامی خط کا سلسلہ ختم کر دیا ہے احسان ابرار رضوی آپ نے کہانیوں اور دیگر سلسلوں پر خوب تبصرہ کیا ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ شجاع بخاری اتنا مختصر تبصرہ مختار احمد بھائی آپ نے بالکل صحیح باتیں لکھی ہیں ملک میں لوگ پانی بجلی اور دوسری ضروریات زندگی کو ترس رہے ہیں اور ہمارے حکمرانوں نے پیسہ باہر ملکوں میں رکھا ہوا ہے لیکن کیا کیا جائے انہیں ہم نے خود ہی اپنے اوپر مسلط کیا ہے کیا خیال ہے ریاض حسین قمر بھائی آپ اس باری تعالیٰ کا جتنا بھی شکریہ ادا کریں کم ہے کیونکہ آپ اور آپ کی فیملی کو کوئی زیادہ سیریس چوٹ نہیں لگی، ایکسیڈنٹ کا نام ہی برا ہے۔ میں تہہ دل سے خدائے بزرگ و برتر سے دعا گو ہوں کہ وہ باری تعالیٰ جلد آپ کو اور آپ کی فیملی کو صحت کاملہ عطا فرمائے آمین اور آپ کو اس امتحان میں سرخرو کرے جاوید احمد صدیقی بھائی اس بار مختصر کیوں، ویسے آپ ٹھیک تو ہیں نا، خدا آپ کو خوش و خرم رکھے، آمین، پرنس افضل شاہین، سید عبداللہ شاہد میرا مطلب توفیق اور اعجاز احمد راحیل بھائی آپ نے بھی مختصر تبصرے کیے بہر حال جو لکھا خوب ہے امجد جاوید سے ملاقات بھی خوب ہے شاہدہ صدیقی کی نقش پا ایک اچھی تخلیق ہے پس منظر اچھے طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ کے ایم خالد نے زندہ باد لکھ کر چونکا دیا ہے پاکستان کے متعلق خوب تجزیہ کیا ہے، بہر حال انسان اپنی تباہی کا سامان خود بنا رہا ہے کیا پتا 2100ء میں حالات اس سے بدتر ہوں جیسے بتائے گئے ہیں خیر جو کچھ بویا جاتا ہے وہی کاٹنا ہوتا ہے جاوید احمد صدیقی بھائی آپ نے سچی لگن لکھ کر لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے بڑا اچھا موضوع ہے واقعی لگن سچی ہو تو سب خود بن جاتا ہے ریاض حسین شاہد کی پل صراط عشق کی یہ قسط بھی شاندار رہی، آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے، تفسیر عباس کی رذیل دل کو چھو لینے والی تحریر ثابت ہوئی آخر کار سچی محبت جیت گئی گندی نسل آفرین اعوان کی ایک چبھتی ہوئی تحریر ہے واقعی جو مائیں ایسی حرکتیں کرتی ہیں وہ ایسے ہی انجام سے دوچار ہوتی ہیں واقعی عورت ایک پہیلی ہے دل جانی یاسین صدیق کی اچھی کاوش ہے اسے اس بار ناظم بخاری صاحب بھی ایک کہانی مشرف بہ اسلام لے کر آئے بھائی اس کہانی کی تعریف کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں ایسی سبق آموز اور منفرد موضوع پر لکھی ہوئی کہانی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے۔ نام نہاد ملاؤں نے واقعی لوگوں کو اسلام سے دور کر دیا ہے اسلام تلوار کے زور پر نہیں پھیلا بلکہ

عمل سے پھیلا جو عورت حضور ﷺ پر کوڑا کرکٹ پھینکتی تھی بیماری کی وجہ سے جب وہ کوڑا کرکٹ پھینکنے کے قابل نہ رہی تو ہمارے پیارے آقا ﷺ اسے دیکھنے اس کے گھر گئے اور جب اس کو یہ پتا چلا کہ جن پر میں کوڑا کرکٹ پھینکتی تھی یہ وہی ہیں تو وہ آپ کے کردار سے اتنی متاثر ہوئی کہ فوراً اسلام قبول کرلیا، بہر حال ناظم بخاری بھائی آپ کی کہانی نے آنکھوں میں آنسو بھر دیے، بہت خوب خدا بزرگ و برتر آپ کو ایسی ہی کہانیاں لکھنے کی توفیق عطا فرمائے آمین، خوش بوئے سخن اور ذوق آ گہی میں سارا انتخاب اپنی مثال آپ ہے، صفحہ صفحہ بکھری کترنیں بھی پرچے کی شان بڑھا رہی ہیں، اب اجازت یار زندہ صحبت باقی۔

عبدالجبار رومی انصاری...... لاہور۔ سیاہ گھنے بالوں میں دمکتا دوشیزہ کا چہرہ تو خوب صورت تھا ہی لیکن موڈ جارحانہ تھا بادلوں میں گھرے پُر اسرار محلات بھی دوشیزہ کے ساتھ مل کے ٹائٹل کو خوب صورت بنا رہے تھے ما شاء اللہ رمضان المبارک شروع ہو چکا ہے اور سب کو بہت بہت مبارک ہو گرمی کے موسم رمضان المبارک کی فیوض و برکات سمیٹنا مسلمانوں کے لیے اجر عظیم ہے حضرت علیؓ نے فرمایا مجھے گرمی کے روزے اور سردیوں کی رات کی عبادت اچھی لگتی ہے اور یہی وہ عبادت ہوتی ہے جس میں انسان اپنے آپ کو سنوار کر فکر آخرت میں مگن ہوتا ہے اور جذبہ عاجزی اور انکساری سے لوگوں کے درمیان محبت و بھائی چارے کی فضا قائم ہوتی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کے دروازے کھلے ہوتے ہیں تو پاکستان میں خود ساختہ مہنگائی اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے کتنے افسوس اور حیرانی کی بات ہے کہ پورا سال جو نارمل مہنگائی ہوتی ہے وہ تو ہوتی ہے مگر صرف رمضان جیسے بابرکت مہینے میں ہی لوٹ مار کا بازار کیوں گرم ہوتا ہے بہر حال کسی کے کان پر جوں تو رینگنے والی نہیں جو کوئی سمجھ سکے جیسے دستک میں میاں صاحب کی خبر لی گئی آ کر کب تک ان کی میں نہ مانوں کی تکرار چلے گی خیر اب تو وہ باہر علاج کے لیے گئے ہیں اللہ انہیں صحت و تندرستی عطا فرمائے، گفتگو میں اپنا انعام یافتہ خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور ادارے کے لیے ڈھیروں دعائیں دل سے نکلیں جن احباب کو میرے خط اچھے لگے ہیں ان کی حوصلہ افزائی کا میں تہہ دل سے مشکور ہوں مجید احمد جائی ملتان کی گرمیاں انجوائے کر رہے ہیں اور میرے خیال سے تو لوگ کلبلا رہے ہیں ہر طرف سے ہیٹ اسٹروک سے بچنے صدا آ رہی ہے آپ کا بھرپور خط اچھا لگا بے شک صائمہ نور جی سب کو آپس میں خوشیاں اور محبتیں ہی بانٹنی چاہیے ویسے آپ بھی چھا گئی ہیں تبصرہ نگاری میں ویلڈن جی جاوید احمد صدیقی کی حسابی تعریف و تنقید بے حد اچھی لگی عبدالحمید اور ابرار حسین رضوی بھی بھرپور تبصرے کے ساتھ اچھے گئے ایم اے راحیل اور غلام یاسین بھی زبردست رہے پرنس افضل شاہین شعر کے ساتھ بیسٹ ہے تبصرہ عمدہ رہا، سیدہ حجاب فاطمہ آپ بھی صفحہ قرطاس پر اپنے رنگ بکھیریں خوش آمدید بشریٰ کنول اور ممتاز احمد کی لفاظی ایک دم سے اچھی لگی، ریاض حسین قمر کی باتیں بہت اچھی لگیں ویسے ہمارے سیاستدان کسی بھی طوفان کے متحمل نہیں ہو سکتے اگر ضامن کرنا بھی پڑ جائے تو دبئی، لندن، یا جدہ میں جا کر پناہ ڈھونڈتے ہیں گل مہر کا ٹائٹل حسینہ کا مشورہ اچھا لگا باقی تبصرہ نگاری میں نپا تلا انداز بہترین تھا حسین خواجہ، علی اصغر انصاری اور فلک شیر ملک بھی بہترین رہے، اس دفعہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی شاعری بہتر لگی، ذوق آ گہی میں فلک شیر کو مبارکباد۔ بشیر احمد بھٹی، ارم وڑائچ اور شگفتہ خان کی تحریریں عمدہ رہیں، خوشبوئے سخن عارف علی سندھو کو مبارک باد باقی سیدہ مدین صادق جیلانی، عمر فاروق ارشد اور مالا راجپوت کا انتخاب بے حد اچھا لگا اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف اس دفعہ عورت زاد نے تو اچھا خاصا کھڑاک کر دیا۔ مٹھن خان کے ساتھ ساتھ پولیس کو بھی چکرا کے رکھ دیا آخر میں نسوانی آواز تو تاجاں سرائیکی کی لگتی ہے باقی دیکھو عورت زاد کے روپ تو ان گنت ہیں نایاب اور معیز کا خالد سے ملنا مہنگا پڑ گیا جس سے نایاب بری طرح اپ سیٹ ہوگئی اور اسے باہر کے ملک منتقل کرنا پڑا دوسری طرف مہک کی مما معراج نے بھی مہمانوں کو بلا کر خفت ہی اٹھائی اور مہک، اور فریال کی محبت کو اور شہ مل گئی۔ زریں قمر کا سفینہ بھی جیسے ادھورا رہ گیا تمیز الدین کو اس حال تک کس نے پہنچایا اور سفینہ کا تعاقب کون کر رہا تھا کہانی تو زبردست ہے اب پتا

نہیں یہ ختم ہوگئی یا اس کا اور حصہ بھی باقی ہے ادھورے مرد نے بہت افسردہ کیا گل جان نے تو دونوں طرف قربانی ہی دی ہے ایسی عورت کا درد جان کر دل بے چین نہ ہو تو پھر کیا ہو، خلیل جبار کی پراسرار پھندا بھی پراسرار ہی رہی عرفان لالچی تھا تو اسے محبت کہاں دینا بے چاری زرینہ تو نہ گھر کی رہی نہ گھاٹ کی اس نے لڑکی پیدا کی تو اس کے طعنے الگ سے سننے پڑے حالانکہ لڑکیوں کے دم سے ہی خوشیاں بھی ملتی ہیں تبھی جا کر تصویر کائنات میں رنگ بھرتے ہیں مگر جاہلیت میں یہ کون سمجھے قبر کی گواہی بھی بہترین مگر عبرت اثر تحریر تھی جس نے مروہ کا برا حال کیا تھا وہ خود کوڑھ کے مرض میں بدترین حالات کو پہنچا اور امانت کو اپنی مروہ کی بے گناہی کا ثبوت مل گیا، جیسا دیس ویسا بھیس نئی نسل جو ٹی وی ڈراموں میں خاص کر غیر ملکی ڈرامے دیکھتی ہے تو پھر ان کی تقلید میں بھی آگے آگے نظر آتی ہے لیکن پھر نقصان ہی ملتا ہے جب انجانے میں ینگ جنریشن کوئی گل کھلا بیٹھتی ہے طلعت نفیس کی عشق حقیقی مردہ ضمیر کو جگانے کی اک سعی ہے شبیر سومرو کی ہر تحریر لائق تحسین ہوتی ہے اور غور سے پڑھی جاتی ہے، جنہوں نے سندھ دھرتی سے جڑی بے مثال تحریریں دی ہیں ایسے ہی نوری جام تماچی نے بھی بہت محظوظ کیا ہے، تماچی جام اور نوری کی الفت وہ افسانہ نہیں تھا حقیقت ہاں یاد آیا یہ خط میں نے جلدی میں تحریر کیا ہے کیونکہ اب سے دو دن بعد ان شاء اللہ میرے سر پر بھی سہرا سجنے والا ہے مطلب 6 جون کو میری شادی ہے۔ سو دعاؤں میں یاد رکھنا اب اجازت دیں پھر ملاقات ہوگی، والسلام۔

اویس اویسی...... رحیم یار خان۔ جناب عمران صاحب آپ کی محفل میں پہلی بار شریک ہو رہا ہوں امید کرتا ہوں کہ آپ جگہ عنایت فرمائیں گے، عمران صاحب میں نئے افق کے ساتھ عرصہ ایک سال سے منسلک ہوں اور دل میں ایک دبی خواہش تھی کہ میں بھی گفتگو میں کبھی شریک ہوں اور آج میں اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا ہوں۔ شمارہ ہمیشہ کی طرح جاذب نظر تھا اور جو دوست احباب محفل کو چار چاند لگاتے ہیں ان کی تو کیا ہی بات ہے وہ عظیم لوگ ہیں میں اپنی شاعری کی پیاس خوش بوئے سخن سے مٹاتا ہوں اور سلسلہ ذوق آگہی میں سے مجھے سنہرے موتی ملتے ہیں ماہ جولائی کے انعام یافتہ علی اصغر انصاری باجی سلمیٰ اور عمر فاروق ارشد کو بہت بہت مبارکباد خواجہ حسین، یاسر اعوان، مجید احمد جائی، احسان سحر، باجی صائمہ نور، ایم اے راحیل کے تبصرے بہت خوب تھے۔

حسین جاوید...... منچن آباد۔ ہر دل عزیز محترم جناب عمران احمد صاحب آپ کی خدمت میں عقیدت مندانہ سلام عرض ہے۔ نئے افق کا ماہ جولائی کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے جس میں محترم مشتاق احمد قریشی صاحب آپ نے دستک میں قاتل حسینہ کے بارے میں بتا کر یقیناً بہت سے لوگوں کو بالخصوص مجھے حقیقت سے روشناس فرمایا، محترم بھائی علی اصغر انصاری کو انعام یافتہ خط پر مبارکباد پیش کرتا ہوں جناب بڑے خوش اسلوب ہیں پڑھ کر اچھا لگا جناب سید عبداللہ توفیق صاحب حیدر آباد والے ویلکم بیک اور آپ تو بابائے نئے افق نکلے آپ نے واپسی کا فیصلہ لے کر بہت اچھا کیا۔ انکل جاوید احمد صدیقی اس بار آپ کا تبصرہ بہت مختصر تھا بہر حال پڑھ کر اچھا لگا پرنس افضل شاہین آپ بہت اچھا لکھتے ہیں ریاض حسین قمر، شجاع بخاری، احسن ابرار رضوی اور ایم اے راحیل بہن صائمہ نور کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ وقت کی قلت کے بارے بقیہ احباب پر تبصرہ کرنے سے محروم ہوں مجھے کچھ دیر بعد رحیم یار خان کے لیے روانہ ہونا ہے وہاں ہمارا قیام تقریباً پانچ چھ دن تک رہے گا اور آپ کا ساتھ پورا ماہ رہے گا ایک دفعہ پھر دوست احباب سے معافی کی درخواست عمران صاحب امید کرتا ہوں کہ میرے پہلے خط کی طرح اس خط کو بھی محفل میں جگہ عنایت فرمائیں گے۔

علی اصغر انصاری...... منچن آباد۔ جناب محترم و مکرم بھائی عمران احمد صاحب آپ کا مشکور ہوں کہ آپ نے اپنی بے حد محنتی ٹیم کے ساتھ مل کر بندہ ناچیز کے ٹوٹے پھوٹے لفظوں کو ماہ جولائی کے شمارہ میں انعام یافتہ خط میں جگہ عنایت فرمائی۔ خدا آپ کا اور نئے افق کی پوری ٹیم کا حامی و ناصر ہو، جناب عمران احمد صاحب آپ نے میرے دل کی بات اپنے خوب صورت الفاظ میں بیان کی ہے ماہ صیام یعنی رمضان المبارک مہینے میں جہاں پر مقامی اور ملکی

چیزوں کی قیمتیں آسمانوں سے باتیں کرتی دکھائی دیتی ہیں تو دوسری طرف غیر ملکی مضر صحت یعنی کولڈ ڈرنکس رمضان کا مہینہ شروع ہوتے ہی سستی ہوجاتی ہیں سارا دن بھوک اور پیاس لیے روزہ دار جب افطار کے وقت جیسے ہی بھولے سے کولڈ ڈرنک پی لے تو نہ صرف اس کو وقتی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ اس کے گردے معدہ کا السر اور سینے کے درد کا بھی موجب بنتی ہے اللہ سے دعا ہے کہ تمام احباب کو عقل سلیم عطا فرمائے آمین، اعجاز احمد راحیل، پرنس افضل شاہین، جاوید احمد صدیقی، محمد رفاقت اور بلخصوص شجاع بخاری آپ احباب نے بہت ہی زیادہ مختصر تبصرہ کر کے اپنی مصروفیت کا ثبوت دیا ہے جناب ریاض بٹ، مجید احمد جائی، عمر فاروق ارشد، احسان سحر، بہن صائمہ نور، احسن ابرار رضوی، ریاض حسین قمر کے تبصرے اپنی مثال آپ تھے پڑھ کر بہت اچھا لگا ریاض حسین قمر صاحب آپ کے حادثے کے بارے میں جان کر بہت دکھ ہوا۔ پروردگار عالم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ محفوظ رہے، اپنے حالات زندگی کے متعلق ہمیں آگاہ فرمائیں اور ہمیں بھی موقع دیا کہ آپ کے دکھ میں شریک ہوسکیں اس کے علاوہ تمام قارئین کرام اور رائٹر حضرات کو میری طرف سے پیشگی عید مبارک خاص طور پر نئے افق کی محنتی ٹیم کو بھائی حسین خواجہ اس دفعہ حاضری سے قاصر تھے خیریت تو تھی جو سلسلہ ذوق آگہی میں شرکت نہ کرسکے اور بہن سلمٰی کو مبارکباد خوش بوئے سخن میں عمر فاروق ارشد کو بھی مبارک تمام قارئین کرام اور نئے افق کے ساتھ منسلک تمام حضرات سے عید کی مبارک خوشیوں کے موقع پر یاد رکھنے کی گزارش سپرد رب ذوالجلال۔

ناظم حسین شاھد...... حویلی لکھا۔ عزیز من عمران احمد صاحب محترم مشتاق احمد قریشی صاحب اور بقیہ تمام ٹیم کو میری طرف سے محبتوں بھرا اسلام عرض اور پیشگی عید مبارک پہلی دفعہ گفتگو میں شریک ہو رہا ہوں آپ کی پر خلوص محبتوں کا منتظر رہوں گا نئے افق کی تعریف کرنا ممکن ہے کیونکہ یہ تمام تر تعریفی القابات سے بے نیاز ہے اس مہنگائی کے دور میں پچاس روپے ادا کرنا آٹے میں نمک کے برابر ہے مشتاق احمد قریشی صاحب کے قیمتی الفاظ کے ساتھ گفتگو بھی شمارہ کی قیمت سے زیادہ ہے۔ سلسلہ ذوق آگہی اور خوش بوئے سخن مصروف زندگی کی بوریت کو دور کرنے کے لیے کافی ہے ملک فاروق ارشد کو انعام یافتہ کلام پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اس کے علاوہ بہن سائرہ خان، بہن امبرین اختر بھائی، عبدالجبار رومی انصاری، نیر رضوی کا کلام بہت زبردست اور دل کو بھا جانے والا تھا انعام یافتہ اقتباس پر بہن سلمٰی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اسد اللہ سانگی کی تھوڑی سی وفا نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا علی اصغر انصاری صاحب نے پیر صاحبان کی بالکل صحیح تعریف کی ہے واقعی ہی ہمارے معاشرے میں بگاڑ دو نمبر پیروں کی ہی وجہ سے ہے اس کے علاوہ انعام یافتہ خط پر بھائی علی اصغر انصاری کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

پرنس افضل شاھین...... بھاولنگر۔ اس بار جولائی کا نئے افق ہمیں 29 جون کو ملا فنافٹ پڑھنا شروع کر دیا کیونکہ آخر آپ تک تین تاریخ تک خط بھی تو پہنچانا تھا، ویسے آپ نے اس بار سرورق منفرد ترین شائع فرمایا ہے، سرورق کی ماڈل کی موٹی موٹی آنکھیں ہمیں ایسا کچھ کہہ رہی تھیں۔

کسی سے ہاتھ کسی سے نظر ملاتے ہوئے
میں بجھ رہی ہوں رواداریاں نبھاتے ہوئے
کسی کو میرے دکھوں کی خبر ہو بھی کیسے
میں ہر کسی سے ملتی ہوں مسکراتے ہوئے

دستک میں انکل مشتاق احمد قریشی بنگلہ دیش کے ظالم حکمران باپ بیٹی یعنی شیخ مجیب الرحمان اور حسینہ واجد کے بارے میں مفصل فرما رہے تھے واقعی یہ دونوں باپ بیٹی پاکستان اور پاکستانیوں کے خلاف ہی ہیں جماعت اسلامی کے مذہبی رہنماؤں کو جو کہ پاکستان کے گن گاتے ہیں ان کو پھانسی کی سزائیں دے رہی ہے، اللہ حسینہ واجد کو غارت کرے اور نئے آنے والے بنگلہ دیشی حکمرانوں کو عقل دے آمین۔ آگے گفتگو پر پہنچے تو یہ کیا اس بار انعامی خط کا ذکر ہی نہیں تھا کیا اس بار

کسی کا خط انعام کا حقدار نہیں ٹھہرا، ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ عبدالغفار عابد کی والدہ کو جنت میں جگہ دے اور تمام لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، ہم تمام رائٹرز عبدالغفار عابد کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ ریاض حسین قمر اور ان کی فیملی کو تندرستی اور صحت عطا فرمائے واقعی جس طرح قمر صاحب گاڑیوں کا ایکسیڈنٹ بتا رہے ہیں بچنا محال تھا اللہ تعالیٰ نے اپنا معجزہ دکھایا اور آپ کو زیادہ چوٹیں نہیں آئیں، اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دور میں بھی اپنا معجزہ دکھاتا ہے۔ میرے خطوط اور تحریریں پسند فرمانے پر علی اصغر انصاری، ریاض بٹ، حسین جاوید، (پہلے خط پر خوش آمدید) خواجہ حسین، مجید احمد جائی، احسان سحر، احسن ابرار رضوی کا بہت بہت شکریہ آپ سب کے خطوط بھی زبردست تھے بہن صائمہ نور پہلے میں اپنی بیگم پروین افضل شاہین سے ڈرتا تھا مگر آپ نے جب سے میرے کندھے کے ساتھ کندھا ملایا ہے آپ کی صحت دیکھ کر مجھے حوصلہ ہو گیا ہے اب میں اپنی بیگم سے نہیں ڈرتا، اب تو میں اور لوگوں سے پرویز مشرف کی طرح کہہ دیتا ہوں (میں کسی سے ڈرتا ورتا نہیں ہوں) اس بار میرا خط کاٹ پیٹ کر بہت مختصر شائع کیا گیا ہے۔ کہانیوں پر تبصرہ نہیں کرسکوں گا کیونکہ عید کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں ذوق آگہی میں سلمیٰ عبدالجبار رومی، ممتاز احمد، علی اصغر، ریاض بٹ، علی اصغر انصاری، خوش بوئے سخن میں عمر فاروق ارشد، عنبرین اختر، بشریٰ خان، عروج فاطمہ سیدہ چھائے رہے میں اپنے ان تمام بہن بھائیوں کا مشکور ہوں جنہوں نے میری بیماری ہیپاٹائٹس بی سے نجات کے لیے دعائیں کیں آپ کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا اور مجھے اس بیماری سے نجات مل گئی، ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ ایم حسن نظامی کی اہلیہ کو ہیپاٹائٹس سی سے نجات دے آمین۔

سید عبداللہ توفیق...... حیدر آباد۔ السلام علیکم کیسے جناب کیسے مزاج گرامی ہیں امید ہے کہ خوش باش اور خیر و عافیت سے ہوں گے واہ جناب ماہ جولائی کا شمارہ بہت لشتم پشتم شائع کیا ہے پری پیکر ماڈل گرل دوشیزہ کے پرکشش و حسین چہرے کو یوں پورے طور پر شائع کیا ہے کہ دیکھنے والا اپنے اشاروں کنایوں سمیت مسحور ہو کر رہ جائے جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کو سامنے پا کر ہوش رہا رہ جائے خاص شاندار سرورق تھا آج کے رسالے میں حسن و عشق کا رنگ اور بھنگ دوچند نظر آتی ہے۔ اس کے بعد نئی دیدہ زیب فہرست پر طائرانہ نگاہ ڈالی بعض جانے پہچانے دوستوں کی کہانیاں شامل اشاعت نظر آرہی تھیں ناظم بخاری کی تحریر دیکھ کر تو یقین جانیے جلا پا محسوس کرنے لگا تھا کہ محترم میرے آگے کے لکھاری ہیں ہم دو تین رسائل میں مسلسل چھپ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ موصوف کی تحریر نئے افق پر بھی چھاگئی ویسے ناظم بھائی بہت اچھا لکھنے لگے ہیں جیلس ہونے کے باوجود ان کی کہانی نہ دیکھ کر افسوس ہوا انہیں تو آپ ریگولر چھاپ رہے تھے پھر اس بار کدھر رکھ چھوڑ گیا، گفتگو میں حدیث کے ساتھ آپ کی دو باتیں پڑھیں اچھی پر معنی اور چھپے دار انداز میں بات کہہ جاتے ہیں اسی بد طولیٰ گفتگو کے ہنر سے متاثر و اسیر ہوں آپ کا۔ اپنے اوسط درجے کے لیٹر کو دیکھ کر خوشی ہوئی اگر چہ آخری شرکائے محفل میں جگہ دی اللہ عزوجل آپ کو میرے لیے سخی اور فراخ دل کرے، آمین۔ دونوں ناول خوب سے خوب تر کی جانب بڑھ رہے ہیں، اس میں امجد جاوید کا عورت زاد بڑھ کر ہے آخری صفحات مکمل کہانیوں کے لیے مختص کریں، ہر ماہ کوئی شاہکار تحریر پڑھنے کو مل جائے تو مطالعے کا مقصد حاصل ہو جائے آخر میں گفتگو کے پرانے دوستوں انجم فاروق ساحلی ریاض بٹ عالیہ انعام الہٰی محترمہ شہناز بانو، ابن مقبول صدیقی، ریاض حسین قمر، طاہرہ جبیں تارا، ناز سلوش ذشے کی خدمتوں میں سلام اور عیدالفطر کی مبارکباد۔

شجاع بخاری...... اکوال۔ السلام وعلیکم عمران بھیا کیسے مزاج ہیں آپ کے امید کرتا ہوں کہ خیریت سے ہوں گے آپ کی پوری ٹیم اور قارئین کو میری طرف سے سلام دستک میں مشتاق احمد صاحب کا کالم اچھا تھا، گفتگو کے شروع میں ہمیشہ کی طرح اچھی حدیث لگائی گئی اگر عمل کیا جائے تو محترم عبدالغفار عباد کی والدہ کے بارے میں پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے علی اصغر صاحب نے بہت اچھا تھا ریاض بٹ صاحب کیسے ہیں آپ کا تبصرہ بہت اچھا تھا۔

محمد رفاقت، خواجہ حسین، محمد یاسر، مجید احمد، عمر فاروق، نسیم سحر، ایم عقیلہ، صائمہ نور، ایم اے راحیل، ممتاز احمد، ریاض حسین قمر، پرنس افضل، جاوید صدیقی، سید عبداللہ، اعجاز احمد تمام نے سیر حاصل گفتگو کی۔ تمام کی گفتگو بہت پسند آئی ریاض حسین صاحب کے بارے میں پڑھا اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی فیملی کو صحت عطا کرے تا کہ آپ سے یہ محفل ہمیشہ سجی رہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف تمام تر کہانیاں اچھی تھیں جو مجھے بہت اچھی لگیں ان میں دل جانی، چور کی داڑھی، دل جانی اور گندی نسل ہیں ذوق آ گہی میں تمام نے اچھا انتخاب کیا خوش بوئے سخن میں بھی تمام شعرا نے اچھا کلام پیش کیا ریاض حسین قمر، عنبرین اختر، عروج فاطمہ، سیدہ کی نظم بہت پسند آئی، ایم جے قریشی اور عبدالحکیم ثمر کا انتخاب اچھا تھا۔ آخر میں تمام بھائی بہنوں کو سلام پاکستان زندہ باد۔

احسان سحر...... میانوالی۔ السلام علیکم اللہ پاک ہم سب کو جہاں بھی رکھے اپنی امان میں رکھے، آمین۔ انسانوں کی طرح نرم وگرم دن گزر رہے ہیں، گزرنا اور آنا زندگی میں لگا رہتا ہے اور رہے گا۔ کیونکہ آتا جاتا دستور زندگانی ہے نئے افق کو بھی ایک ایسے ہی گیلے گیلے دن کو آنا نصیب ہوا کہنے کو بہت کچھ ہوتا ہے لفظ رقص کر رہے ہوتے ہیں دل میں پر انسان کبھی کبھی کچھ کہہ نہیں پاتا اپنا بھی وہی حال تھا بے سکون اور اداسی کا رقص جاری تھا اور ایسا رقصا ہمیں ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔ بہت زیادہ تعریف بھی مغرور بنا دیتی ہے۔ کئی ماہ سے نئے افق کے شاندار ٹائٹل تعریفیں حاصل کرتے رہے اور جب عید نمبر کا نمبر آیا تو ٹائٹل کی بے رونقی دیکھ کر حد سے زیادہ مایوسی ہوئی حد سے زیادہ مایوسی نے مضبوطی سے بانہوں میں جکڑ لیا، ٹائٹل من کو نہ بھایا اور جو من کو نہ بھائے اسے نظر انداز کرنا ہی بہتر ہوتا ہے دستک پر دستک دی جہاں ہندوؤں کی پجارن اور نام نہاد مسلمان کے غلیظ تر لوگوں کا حوالہ ملا۔ بنگلہ دیش ایسے منافق اور بد حرام قوم ہے کہ ہم نے ہر ممکن ان لوگوں کی سپورٹ کی ہر جہاں بھی ان کو موقع ملا اور ملا تا ہے ہمیں ڈس لیتے اور لیتے ہیں کمینے لوگ کبھی اپنی فطرت سے بعض نہیں آسکتے پھولوں کی وردی میں پہنچے جہاں پھول ہوں وہاں خوش بو نہ ہوا ایسا کبھی ہوا ہی نہیں۔ خوشیوں کی خوشبو اور محبتوں کی خوشبو جہاں چکراتی پھرتی ہو وہاں رونق ہی رونق دیکھنے کو ملتی ہے عبدالغفار کی والدہ کے لیے دل سے دعا گو ہیں اللہ پاک مرحومہ کی بخشش فرمائے آمین، علی اصغر نمائندگی کرتے پائے گئے حالات اور ساتھیوں پر تبصرہ اچھا لگا، ریاض بٹ صاحب کا مسکراتا انداز متاثر کن رہا ہر ایک کو محبت سے مخاطب کرنا کوئی آپ سے سیکھے سدا خوش اور مسکراتے رہیں۔ حسین محمد خواجہ اپنی ننھی سی خواہش کے ساتھ حاضر ہوئے مجید احمد جائی صاحب کافی دلکش انداز میں حاضر ہوئے اسی طرح آتے رہیے بھائی جان چاہے ہم رہیں یا نہ رہیں۔ دل لگانا نہیں پڑتا لگ جاتا ہے اقرا پڑھ کر ایمان تازہ ہوا۔ امجد جاوید صاحب کا انٹرویو بہت اچھا لگا ایک طرح سے لیکچر تھا عشق کے حوالے سے جس نے کافی معلومات میں اضافہ کیا ذوق آگہی میں کسب حلال کی فضیلت خوب صورت مضمون رہا، تھوڑی سی وفا نے بھی متاثر کیا محبت کے حوالے سے مراسلہ دل میں اتر گیا۔ انعام یافتہ غزل پسند آئی باقی بھی تمام غزلیں معیاری رہیں، اتنا ہی ٹائم ملا ہے تو اتنا ہی پڑھ پایا ہوں کیونکہ اس دفعہ ہمیں اعتکاف کی سعادت نصیب ہو رہی ہے زندگی رہی تو اگلے ماہ ملیں گے، اجازت اللہ حافظ۔

ترتیب: طاہر قریشی

(۶) قدرت

اللہ تعالیٰ کی "قدرت" کی صفات جن سے اس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے۔

(۱)۔ الفاتح والفتاح۔ ہر مشکل کو کھولنے والا' فتح و نصرت کے دروازے کھولنے والا' دل و دماغ روشن کرنے والا' حکم سنا کر فیصلہ کرنے والا' فتح مند' رحمت کا دروازہ کھولنے والا۔

(۲)۔ القدیر و القادر۔ قدرت والا' غالب آنے والا' اندازہ کرنے والا' قیمت رکھنے والا' سب پر غالب۔ طاقت رکھنے والا' اختیار رکھنے والا' قابو رکھنے والا' مختار۔

(۳)۔ المقتدر۔ اقتدار والا' جس کے سامنے کوئی چون و چرا نہیں کرسکتا۔ سب پر غالب' طاقت' قوت' اقتدار' قدرت' زبردست' زور آور' مختار مطلق۔

(۴)۔ القوی۔ ایسا زبردست جس کے سامنے کسی کا بس نہ چلے' ایسی قوت والا جس کے زیر قوت ہر چیز ہے' قوت دینے والا' تمام قوتیں اس کی ذات سے ہی حاصل ہوں۔

(۵)۔ المتین۔ مضبوط' جس میں کوئی کمزوری نہیں' استوار' مستحکم' جسے ہٹایا نہ جاسکے' جس کے کاموں میں کوئی رکاوٹ نہیں' ٹھوس بنیادوں پر قائم' مہذب اور مضبوط۔

(۶)۔ الجامع۔ جمع کرنے والا۔ اختلافات اور تضادات کو ختم کرنے والا' یوم آخرت سب کچھ جمع کرنے والا' خلقت کو جمع کرنے والا' ایک مقام اور وقت پر سب کو حاضر کرنے والا' سب پر حاوی۔

(۷)۔ الباعث۔ اٹھانے والا۔ مُردوں کو قبروں سے اٹھانے والا۔ خواب غفلت سے جگانے والا' ہر واقع و حادثہ کا اولین محرک' آزادانہ نقل و حرکت میں حائل رکاوٹ دور کرنے والا۔

(۸)۔ مالک الملک۔ تمام عالم کا مالک جس کے سامنے کسی کی کوئی ملکیت نہیں' جس کے سوا کوئی مالکِ حقیقی نہیں' وہی سچا اور حقیقی بادشاہ ہے' صاحب ثروت بادشاہ' ہر شے کا مالک۔

(۹)۔ البدیع۔ نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے والا' خالق اول' ہر شے کی ابتدا کرنے والا' ہر شے کی تخلیق سے پہلے موجود' کسی بھی چیز کو بغیر نمونے کے بنانے والا' بلا اعتبار زمان و مکان ایجاد کرنے والا۔

(۱۰)۔ الواسع۔ فراخ۔ ہر جگہ موجود' بڑی وسعت والا' بڑی گنجائش والا' ہر بات تک پہنچنے والا' کائنات کی ہر شے پر قادر' جس کا علم اور رحمت ہر شے پر محیط ہے۔

(۱۱)۔ المحیط۔ احاطہ کرنے والا۔ جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے' کوئی اس کے احاطہ سے باہر نہیں ہے۔

(۱۲)۔ الخالق۔ خلق کرنے والا۔ اپنی مشیت و حکمت کے مطابق پیدا کرنے والا۔ کائنات اور اس کی ہر ہر چیز کو پیدا کرنے والا' عدم سے وجود میں لانے والا۔

(۱۳)۔ المحیی۔ زندہ کرنے والا' حیات دینے والا' زندگی دینے والا' احیاء کرنے والا' نعمت بخشنے والا۔

(۱۴)۔ الممیت۔ مارنے والا' موت دینے والا' خالق جو مارتا ہے اور جلاتا ہے۔ مُردہ کرنے والا۔

(۱۵)۔ القابض۔ سمیٹنے والا' بندوں کی روزی محدود کرنے والا' روکنے والا' قبضے میں کرنے والا' کائنات کی ہر شے پر محیط۔

(۱۶)۔ الباسط۔ کشادہ کرنے والا' رزق وسیع کرنے والا' علم و طاقت پھیلانے والا' اضافہ کرنے والا' وسعت دینے

والا دینا' زندگی بخشا' خوشحالی۔
(۱۷)۔المعز۔عزت دینے والا' اپنی مخلوق کو طاقت اور عزت دینے والا' توقیر و شرف بخشنے والا' سب پر غالب و فائق۔
(۱۸)۔الباری۔مخلوق کو پیدا کرنے والا' عدم سے وجود میں لانے والا۔
(۱۹)۔المذل۔ذلت دینے والا' کافروں کا درجہ گھٹانے والا' ذلیل کرنے والا۔
(۲۰)۔المصور۔صورت بنانے والا' ترتیب و تزئین کرنے والا' وہ ذات جس نے سب کی الگ الگ صورتیں بنائیں' گناہ بخشنے والا۔
(۲۱)۔الخافض۔نافرمانوں کو پست کرنے والا' کافروں کو عاجز کرنے والا' نیچا دکھانے والا' خود ساختہ غرور کو توڑ کر پست کرنے والا۔
(۲۲)۔الرافع۔بلند کرنے والا' اوج و عروج عطا کرنے والا' رفعت و بلندی دینے والا' منزلت بخشنے والا' درجات بلند کرنے والا۔
(۲۳)۔المعطی۔عطا کرنے والا' بخشش کرنے والا' انعام دینے والا' فضل و کرم کرنے والا' مہربانیاں کرنے والا۔
(۲۴)۔المانع۔یہ نام صرف حدیث شریف میں آیا ہے۔مخلوق کے مصائب کو روکنے والا۔مخلوقات کی حفاظت کرنے والا' بچانے والا' باز رکھنے والا' روکنے والا' منع کرنے والا۔
(۲۵)۔النافع۔نفع پہنچانے والا' بھلائی پہنچانے والا' فائدہ پہنچانے والا' عمدہ ثمر دینے والا' بہتر نتیجہ دینے والا' اس صفتِ الٰہی کا ذکر صرف حدیث شریف میں آیا ہے' قرآن میں براہ راست نہیں آیا۔
(۲۶)۔الضار۔ضرر پہنچانے والا' نقصان پہنچانے والا' نقصان سے دوچار کردینے والا' نقصان و تباہی کا باعث بننے والا' غرور گھمنڈ توڑنے والا' (یہ نام صرف حدیث میں آیا ہے)
(۲۷)۔المبدء۔پہلی بار پیدا کرنے والا' خالقِ مطلق' جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کو وجود میں لانے والا۔
(۲۸)۔المعید۔دوسری بار پیدا کرنے والا' دوبارہ زندہ کرنے والا' جو چیز فنا کردی گئی ہو اسے دوبارہ وجود میں لانے والا' بار بار پیدا کرنے والا' ایک معنی اس کے قیامت کے اور دوسرے جہاں کے بھی ہیں۔

یہ وضاحت گزشتہ صفحات میں بھی آچکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام ایسی صفات جن میں اس کے غضب و جلال کی صفات کا بیان ہوا ہے' ان کے ساتھ ہی صفاتِ جمالی کا ذکر بھی فرمایا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ کی قدرت کی صفاتِ عالی میں کئی صفات جن کا تنہا استعمال چونکہ غلط فہمی پیدا کرنے کا باعث بن سکتا ہے' اس لئے جب تک ان کے ساتھ ان کی مد مقابل مثبت صفت نہ بولی اور لکھی جائے اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔مثلاً اللہ تعالیٰ کو صرف الضار جس کے معنی نقصان پہنچانے کے ہیں کہنا یا لکھنا درست نہیں الضار کے ساتھ النافع لکھنا ہوگا ایسے ہی الخافض کے ساتھ الرافع آئے گا۔یعنی نیچا کرنے والا' اونچا کرنے والا۔یعنی ایسی صفاتِ الٰہی جن سے انسانی ذہن میں کسی طرح بھی ذاتِ الٰہی کے لئے ذرا سا بھی منفی تاثر پیدا ہونے کا امکان ہو اس کے ساتھ اس تاثر کی مثبت صفتِ الٰہی کا استعمال کرنا ضروری ہوگا۔قرآن کریم اور حدیث شریف میں ان صفاتِ الٰہی کے استعمال میں یہ رعایت رکھی گئی ہے۔قرآنِ حکیم میں ربِ کائنات نے خود یہی اسلوب اپنایا ہے۔نفع و نقصان کو ایک ساتھ لایا گیا ہے' کیونکہ وہ ذاتِ عالی جو نقصان پہنچانے پر بھی پوری طرح قادر ہے وہ اگر کسی باغی' نافرمان کو نفع پہنچا رہی ہے تو اس کا مقصد قطعی یہ نہیں کہ وہ ذاتِ عالی اسے نقصان نہیں پہنچا سکتی یہ صرف اس کے رحم و کرم اور فضل کی علامت ہے کہ اس طرح اپنے بندوں کو اپنے پیار شفقت سے راہ راست پر لانا چاہتا ہے۔

●

ابن صفی کے نام سے شائع ہونے والے دو جعلی ناول

''سائے کا قتل''اور''روشنی کی آواز''

محمد عارف اقبال
ایڈیٹر، اردو بک ریویو، نئی دہلی

الہ آباد سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر محمود کاظمی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد کے شعبہ دارالترجمہ سے وابستہ ہیں۔ ان کے پاس نکہت پبلی کیشنز الہ آباد سے شائع ہونے والے ابن صفی کے تقریباً تمام ہی ناول موجود ہیں۔ وہ ابن صفی کی تحریروں کے عاشق ہی نہیں بلکہ نقاد بھی ہیں۔ انہوں نے ایک سال قبل اپنے ذخیرے سے مذکورہ دونوں ناول 'سائے کا قتل' اور 'روشنی کی آواز' راقم کو بذریعہ اسپیڈ پوسٹ ارسال کیے۔ فریدی-حمید کرداروں پر مشتمل دونوں ناول نکہت پبلی کیشنز، الہ آباد کے زیر اہتمام شائع کیے گئے تھے۔ نمبر شمار کے لحاظ سے 174 اور 175 سے موسوم یہ ناول بالترتیب اپریل اور مئی 1971 میں شائع ہوئے۔

ابن صفی کے ایک جواں سال پرستار اور محقق انجینئر راشد اشرف (کراچی) نے 'روشنی کی آواز' کے حوالے سے ایک چشم کشا مضمون لکھا ہے۔[1] ان کو مضمون لکھتے وقت صرف ایک ہی ناول دستیاب ہوسکا۔ 'سائے کا قتل' کے بارے میں ان کو ڈاکٹر خالد جاوید سے معلوم ہوا۔ راشد اشرف نے 'روشنی کی آواز' کے مطالعے کے بعد اس ناول کو یہ کہتے ہوئے مسترد کردیا کہ ''یہ ایک انتہائی بھونڈی اور کمزور تحریر ہے جس کی ایک بھی سطر سے اس کا تعلق ابن صفی جیسے لازوال مصنف کے ساتھ جوڑنا ایک بددیانتی سے زیادہ کچھ نہیں...'' انہوں نے اپنے مضمون میں لکھا کہ ''مذکورہ ناول میں اس کے مصنف نے جاسوسی دنیا کے دو یادگار ناولوں 'برف کے بھوت' اور 'نیلی روشنی' سے اقتباسات نقل کرنے کے بعد ان کو مختلف جگہوں پر ٹانکنے کی بھونڈی کوشش کی ہے۔ بالخصوص 'فزارو' جو ایک تفریحی مقام ہے اور 'دسینل گھاٹی' جہاں ابن صفی مرحوم نے 'برف کے بھوت' کے تانے بانے بنے ہیں، ان جگہوں کے نام مذکورہ ناول میں جابجا استعمال کیے ہیں۔'' راشد اشرف نے چھ نکات میں اس جعلی ناول اور اس کے مصنف کی بددیانتی کو اجاگر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے 'روشنی کی آواز' کی مختلف سطروں کے بارے میں لکھا کہ اس ناول میں غیر فصیح جملے، سوقیانہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں نیز فریدی-حمید، قاسم کے کرداروں کی مٹی پلید کی گئی ہے۔ انہوں نے اس ناول کے مصنف کو ہندوستانی قرار دیتے ہوئے اس کی زبان کے عیوب کی بھی نشاندہی کی ہے۔

میرے سامنے 'سائے کا قتل' اور 'روشنی کی آواز' دونوں ناول موجود ہیں۔ دونوں ناولوں کے مطالعے سے بلاشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ 'نکہت پبلی کیشنز، الہ آباد' اور 'عباس حسینی' کے علاوہ ان میں ابن صفی مرحوم کا ایک لفظ بھی نہیں ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا پاکستانی نہیں بلکہ ہندوستانی ہی ہے۔ راشد اشرف نے 'روشنی کی آواز' پر جو تنقید کی ہے، کم و بیش 'سائے کا قتل' ناول بھی اسی دائرے میں آتا ہے۔ دونوں کے لکھنے کا انداز یکساں ہے اور ان دونوں جعلی ناول کے مصنف نے زبان، اسلوب، پلاٹ، کردار ہر لحاظ سے ابن صفی کی عظمت کو گرد آلود کرنے کی کوشش کی ہے۔ جعلی مصنف نے جہاں غیر فصیح زبان استعمال کی ہے اور بین السطور میں ابن صفی کی نقالی کرتے ہوئے وہ لاتعداد خامیوں کا مرتکب ہوا ہے، وہیں دونوں جعلی ناولوں میں ایک لفظ 'ایکدم' کی ترکیب سے اس نے خود کو بے نقاب کردیا ہے۔ ابن صفی کے کسی بھی ناول میں 'ایکدم' لفظ کا استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کے یہاں لفظ 'دفعتہً' رائج ہے۔ نمونے کے طور پر 'سائے کا قتل' کے درج ذیل جملے دیکھیے:

1. وہ آدمی ایکدم سے چونک کر پیچھے مڑا... (ص:6)
2. وہ ایکدم سے قاسم پر ٹوٹ پڑا... (ص:6)

3. سوچتے سوچتے ایکدم سے اس کے ذہن میں حمید کا نام ابھرا... (ص:8)
4. فریدی بھی اسے دیکھ کر ایکدم سے چونک پڑا... (ص:10)
5. حمید تیزی سے ایک طرف جھپٹا اور پھر ایکدم سے ہال میں اندھیرا اچھل گیا... (ص:24)
6. ...قیا میں ایکدم سے وہ... وہ... الو کا پٹھا ہوں کہ... (ص:31)
7. ''اچھا تو میں چلا'' حمید ایکدم سے بیٹھے بیٹھے اٹھ کھڑا ہوا... (ص:45)
8. ...کمرے میں ایک آدمی داخل ہوا اور حمید اسے دیکھ کر ایکدم سے چونک پڑا... (ص:68)
9. ...میں ایکدم سے گھبرا گئی اور سوچنے لگی کہ جانے کب حادثہ پیش آیا... (ص:72)
10. فریدی کی آواز سنتے ہی حمید ایکدم سے چونک پڑا... (ص:82)
11. ''کیا بک رہے ہو؟'' پستہ قد آدمی ایکدم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا... (ص:88)
12. ...کیونکہ ایکدم سے اس کا سر چکرانے لگا... (ص:90)
13. قاسم کمرے میں داخل ہوا لیکن حمید پر نظر پڑتے ہی وہ ایکدم سے ٹھٹھک گیا۔ (ص:91)
14. ...وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایکدم سے اس کے چہرے پر کسی چھوٹی سی ٹارچ کا ننھا سا حلقہ پڑا... (ص:101)
15. حمید ایکدم سے چلتے چلتے چونک پڑا... (ص:102)
16. لیکن اپنی فطرت سے مجبور تھا، چاہتا تھا کہ آپ لوگ ایکدم سے چونک پڑیں۔ (ص:107)

پورے ناول میں 'ایکدم' کا استعمال اتنی کثرت سے ہوا ہے کہ یہی ایک لفظ مذکورہ ناول کے جعلی ہونے پر دلیل فراہم کرتا ہے۔ اس ناول کے گھٹیا پلاٹ اور کردار کشی پر مزید کسی تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی بلکہ وقت کا ضیاع ہے۔

ذرا روشنی کی آواز کے بھی چند جملے دیکھیے:

1. یہ آپ ایکدم سے چپ کیوں ہو گئے؟... (ص:36)
2. لیکن ہال میں داخل ہوتے ہی حمید ایکدم سے چونک پڑا۔ (ص:56)
3. ''راتوں کو اکثر اٹھ کر ٹہلتی رہتی ہیں اور جب میں کچھ کہتی ہوں تو ایکدم سے بگڑ جاتی ہیں... ایک ممی تھیں وہ بھی ایکدم سے بدل گئیں۔'' سارا کی آواز ایکدم سے بھرا گئی۔ (ص:66)
4. ''ارے ارے یہ کیا'' حمید ایکدم سے گھبرا کر بولا۔ (ص:66)
5. ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' لیڈی جمشید ایکدم سے چونک پڑیں۔ (ص:67)
6. وہ بڑی دیر سے کروٹیں بدلتا رہا کہ دور سے بارہ کے گھنٹے کی آواز اسے سنائی دی اور وہ ایکدم سے بستر چھوڑ کر اٹھ گیا۔ (ص:73)
7. جب دوسرا سایہ روشنی میں پہنچا تو حمید ایکدم سے چونک پڑا۔ (ص:74)
8. ...اور اس کی بات پر وہ تینوں ایکدم سے ہنس پڑے۔ (ص:75)
9. دو تین فرلانگ جانے کے بعد حمید ایکدم سے چونک پڑا۔ (ص:88)

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ 'مصنف' نے دونوں ناولوں میں 'ایکدم' کی تکرار جاری رکھی ہے۔ اگر دونوں ناولوں کا تجزیہ دیگر خامیوں اور کمزوریوں کے لحاظ سے کیا جائے تو مضمون طوالت اختیار کر جائے گا اور اسے وقت کا ضیاع خیال کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس سے گریز کرتے ہوئے ایک اہم سوال یہ ہے کہ پرنٹر، پبلشر عباس حسینی نے آخر ان دونوں ناولوں کو کیوں شائع کیا؟ دونوں ناولوں کے صفحہ 3 پر عباس حسینی کے اداریے اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان کی خواہش کے مطابق یہ دونوں جعلی ناول شائع ہوئے۔ شمارہ 174 کے اداریہ کا آخری پیرا اس طرح ہے: ''سائے کا قتل، بلاشبہ محترم ابن صفی

کے ان شاہکار ناولوں میں شمار کیا جا سکتا ہے جسے آپ کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔'' شمارہ 175 یعنی 'روشنی کی آواز' کے اداریہ کا آخری جملہ عباس حسینی یوں لکھتے ہیں:

''امید ہے کہ قارئین محترم ابن صفی کے اس ناقابل فراموش شاہکار کو ضرور پسند کریں گے۔''

عباس حسینی کے تقریباً ہر اداریے میں مذکورہ انداز کے ٹکسالی جملے لکھے جاتے رہے ہیں۔ انہوں نے ابن صفی کے کرداروں پر لکھے جانے والے جعلی پبلشرز کے خلاف مقدمے بھی قائم کیے۔ خاص طور سے 'ڈیڑھ متوالے' کے کیس میں بھی انہوں نے کانپور کے پبلشرز کے خلاف زوردار مہم چلائی تھی۔[2] لیکن اپریل، مئی 1971 میں یہ دونوں جعلی ناول آخر کن حالات میں نکہت پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع ہوئے۔ عباس حسینی مرحوم پر ابن صفی کے تمام ناولوں کے ہندی ایڈیشن کی اشاعت کا معاملہ بھی سنگین ہے۔ سوال یہ بھی ہے کہ کیا وہ اس بات سے واقف نہیں تھے کہ فریدی۔ حمید اور عمران کے کردار اپنا خاندانی پس منظر رکھتے ہیں؟ ابن صفی کے اصل کرداروں کو ونود، راجیش، پون، ملکھان بنا کر اور ان کے مذہب کو تبدیل کر کے کیا وہ خود کو 'اصلی ہندوستانی' ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اصل معاملہ کیا ہے؟ ابھی یہ معاملہ بحث اور تحقیق و تفتیش کا موضوع ہی تھا کہ خود عباس حسینی بھی ایک ایسی حرکت کے مرتکب نظر آتے ہیں جس کے بارے میں عام تاثر اور ثبوت یہی ہے کہ کراچی و لاہور سے دلّی و کانپور تک جعلی مصنفین نے ابن صفی کے کرداروں پر این صفی، ابن صفی، نجمہ صفی وغیرہ ناموں سے ناول لکھ کر قارئینِ ابن صفی سے فریب کرتے رہے۔ لیکن عباس حسینی کی ادارت میں جن مذکورہ دو جعلی ناولوں کے ثبوت ملے ہیں، آخر اس معاملے کی سنگینی کو کیا نام دیا جائے جبکہ ابن صفی کے وہ قریبی دوست تھے اور ان کے تمام ناولوں کی 'من و عن اشاعت' کے سلسلے میں ہمیشہ خود مختار رہے۔ راشد اشرف نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ:

''عباس حسینی نے ایسا کیوں کیا تھا۔ اس بات کا جواب اب کبھی نہ مل سکے گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہندوستان میں قیام پذیر عباس حسینی و ابن صفی کے دوست مجاور حسین رضوی اس کی کوئی تاویل پیش کر سکیں کہ وہ نکہت الٰہ آباد کی ٹیم کے واحد اہم ترین شخص ہیں جو اس وقت حیات ہیں۔''

راشد اشرف کی اس بات پر پروفیسر مجاور حسین رضوی کی جانب سے تادم تحریر کوئی جواب شائع نہیں ہوا ہے۔ تاہم ابن صفی مرحوم کے انتقال کے بعد ان کے لکھے مضمون ''روشنی جو ابھی باقی ہے''[3] کے مطالعہ سے خود مضمون کے بین السطور میں بعض متضاد اور غلط معلومات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود ان کے ذہن میں ابن صفی کے ادبی مقام کا واضح تصور یا نقشہ نہیں ہے۔ ان کے مضمون سے ایسا لگتا ہے کہ ان کے نزدیک ابن صفی اردو کے ایک ایسے ہی مصنف تھے جن کا تذکرہ ایک ڈیڑھ جملوں میں کر دینا ہی ادبی مقام کو متعین کرنے کے مترادف ہے۔ پروفیسر مجاور حسین (قلمی نام ابن سعید) کے اس مضمون کے مطالعے سے جو اشکالات پیدا ہوتے ہیں، درج ذیل ہیں:

1. مجاور حسین نے 'جاسوسی ادب' کے آغاز کا جو پس منظر بیان کیا ہے وہ خود ابن صفی کے بیان کردہ پس منظر سے متصادم ہے۔ جبکہ ابن صفی نے واضح طور پر لکھا ہے کہ فحاشی کے سیلاب کو روکنے کے لیے انہوں نے ناول نگاری کا آغاز کیا۔[4]

2. مجاور حسین کے بقول ''جنوری 53ء میں ناول نگار کا نام ابن صفی منتخب ہوا کہ اسرار صاحب کے والد کا نام صفی اللہ تھا اور اسی مہینہ میں جاسوسی دنیا کے پہلے شمارہ کی حیثیت سے یہ ناول شائع ہوا۔'' (حالانکہ مارچ 1952 میں پہلا ناول 'دلیر مجرم' شائع ہوا تھا جس پر ابن صفی بی۔اے درج تھا نہ کہ 1953 ـــ ع.ا.)

3. مجاور حسین نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ''ہندی میں ان کے ناولوں کا ترجمہ شائع ہوتا تھا۔ ابھی تقریباً ستر پچھتر ناول ایسے ہیں جو ہندی میں شائع نہیں ہوئے۔ وہ ہندی میں بھی اتنے ہی مقبول تھے جتنے اردو میں، البتہ ہندی میں ان کے دو کرداروں کے صرف نام بدلے ہوئے تھے۔ یعنی فریدی کی جگہ ونود اور عمران کی جگہ راجیش۔''

یہ بات جزوی طور پر درست ہے۔ عباس حسینی نے ابن صفی کے جملہ ناولوں کو ہندی میں منتقل کرایا تھا جن کے مترجم کوئی 'پریم پرکاش' تھے۔ ان ناولوں میں بعض حصوں میں کتر و بیونت کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حمید اور قاسم کے نام کو چھوڑ کر تقریباً تمام ہی مستقل کردار کے نام تبدیل کردیے گئے تھے۔ فریدی کو ونود، عمران کو راجیش، ایکس ٹو کو پون، فیاض کو ملکھان، صفدر کو مدن وغیرہ سے موسوم کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ نام کے ساتھ کرداروں کا مذہب بھی تبدیل ہوگیا جبکہ ابن صفی نے تمام اہم کرداروں کا خاندانی پس منظر بھی بیان کیا ہے۔

4. مجاور حسین اپنے مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں: "52 سے 60ء تک ہم لوگ ایک دوسرے سے دور رہے۔ صرف خط و کتابت ہی کا سہارا تھا۔ ہر ہفتہ انتہائی پابندی سے خط موصول ہوتا تھا۔ خط اتنے دلچسپ ہوا کرتے تھے کہ پڑھنے میں ناول کا مزہ آتا تھا۔"

ہر ہفتہ کے لحاظ سے آٹھ برسوں میں مجموعی طور پر خطوط کی تعداد تقریباً 350 ہوتی ہے۔ بہتر ہوگا کہ مجاور صاحب ان خطوط کو خود شائع کردیں یا ابن صفی کے اہل خانہ کے سپرد کردیں۔ کیوں کہ ابن صفی کے یہ خطوط جو ناول کا مزہ دیتے ہوں، دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

5. اسی مضمون میں مجاور حسین لکھتے ہیں: "یہ درست نہیں کہ ادبی حلقوں نے انہیں نظر انداز کیا۔ اردو میں آزادی کے بعد لکھے جانے والے ناولوں کے دور پر بہت کم لکھا گیا ہے پھر بھی ڈاکٹر اعجاز حسین نے 'اردو ادب آزادی کے بعد' اور ڈاکٹر علی حیدر نے 'اردو ناول سمت و رفتار' میں ان کا ذکر کیا ہے۔"

گویا پروفیسر مجاور حسین کے نزدیک ابن صفی کا ادبی مقام یہی ہے کہ چلتے چلتے ان کا تذکرہ کردیا جائے۔ ان کا یہ کہنا بھی حقیقت کی نفی ہے کہ ادبی حلقوں نے انہیں نظر انداز نہیں کیا۔ ایک عظیم ادیب و ناول نگار جس نے کئی نسلوں کو متاثر کیا، اردو زبان سکھائی، اردو ادب میں گراں قدر علمی سرمایہ چھوڑا، اس پر کام کرنے کا اگر یہی انداز ہے جیسا کہ مجاور حسین صاحب نے لکھا ہے تو اردو دنیا کے دیگر ادیبوں اور نقادوں کے منفی رویے پر ہمیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

6. پروفیسر مجاور حسین ایک جگہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ "یہ درست ہے کہ ان کے یہاں واقعات کی رفتار پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ پورے منظر، پس منظر و پیش منظر کی تصویر کشی پر نہیں۔"

حیرت ہے کہ پروفیسر مجاور حسین جیسے ادب کے پارکھی اور محترم استاد کی رائے ابن صفی کی منظر نگاری پر اتنی سطحی اور کمزور ہے۔ حالانکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ناول نگاری کے میدان میں ابن صفی واحد مصنف ہیں جنہوں نے اردو افسانہ اور ناول نگاری میں لفاظی سے گریز کرتے ہوئے ایک نئے انداز کی منظر نگاری کی طرح ڈالی۔ ممکن ہے کہ کوئی ناول نگار ایک 'منظر کشی' میں دو صفحے سیاہ کردیتا ہو لیکن ابن صفی کا طرز امتیاز یہی ہے کہ انہوں نے 'اجمال میں تفصیل' کی طرح ڈال کر اپنے قاری کے وقت کو ضائع ہونے سے محفوظ رکھا۔ اس فن میں ابن صفی واحد ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولوں سے منظر نگاری و جزیات نگاری کے انتخاب کو مرتب کرکے شائع کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہوسکتی ہیں جو اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

پروفیسر مجاور حسین اردو کے ایک ماہر استاد کی حیثیت سے حیدر آباد یونیورسٹی سے ریٹائرڈ ہوئے اور ان کی نگرانی میں ایک درجن سے زائد طلبا نے پی ایچ۔ ڈی کے مقالے مکمل کیے۔ افسوس کہ انہوں نے اپنی نگرانی میں ابن صفی کی ادبی خدمات پر ایک مقالہ بھی نہیں لکھوایا۔ حالانکہ ابن صفی کا ان پر حق تھا اور دونوں نے رفاقت کے کم سے کم سات برس ساتھ ہی گزارے تھے۔ یہ امر بھی باعث حیرت ہے کہ نکہت پبلی کیشنز، الہ آباد کے زیر اہتمام ابن صفی کی ادبی خدمات پر کوئی سمپوزیم یا سمینار منعقد نہیں کیا گیا۔

ایسی صورت میں برادرم راشد اشرف یہ توقع رکھتے ہیں کہ مجاور حسین رضوی صاحب، عباس حسینی کے راز سے پردہ
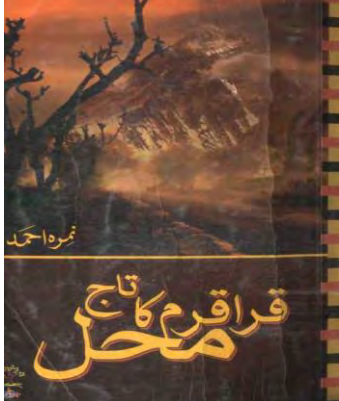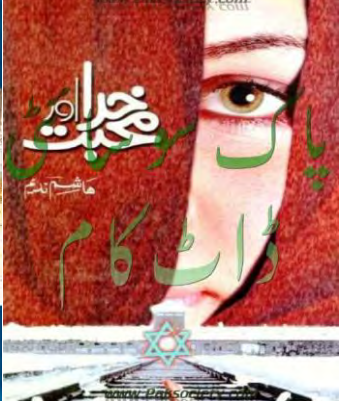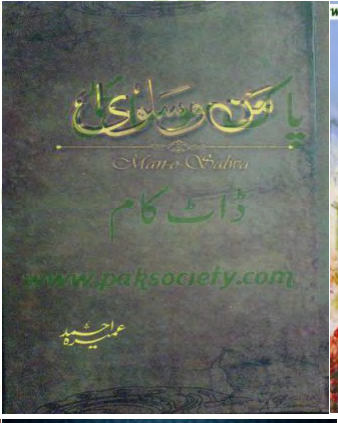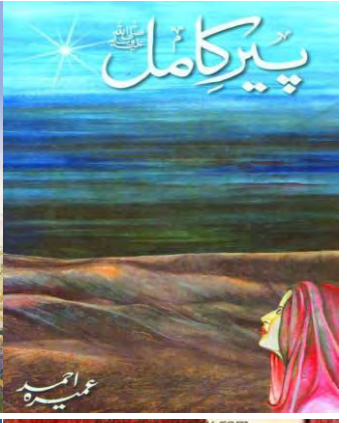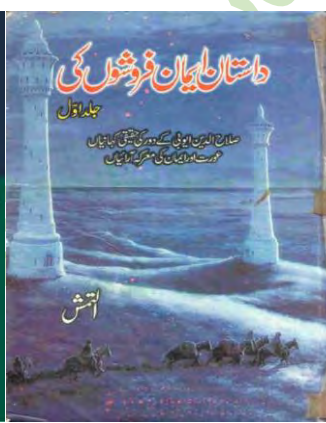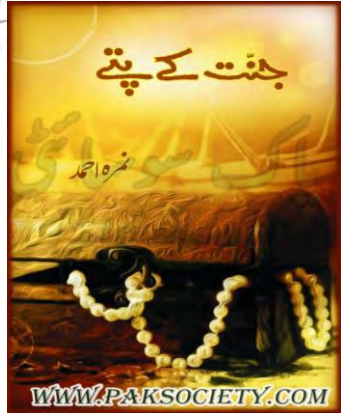
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اٹھائیں گے یا تاویل پیش کریں گے، شاید ممکن نہیں ہے۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ یہ راز' مجاور حسین صاحب بھی اپنے ساتھ ہی لے جائیں گے۔

راشد اشرف نے اپنے مضمون کے آخر میں لکھا ہے کہ 'ڈیڑھ متوالے' کے 'پیش رس' میں ابن صفی نے لکھا تھا— ''پھر جب میری صحت یابی کی خبریں اخباروں میں چھپنے لگیں تو یار لوگوں نے شوشہ چھوڑا کہ میرے اور عباس حسینی صاحب کے تعلقات خراب ہوگئے ہیں۔ اب بھارت میں میری کتابیں ان کے ادارے سے شائع نہیں ہوں گی۔ ان بے چاروں کو یہ نہیں معلوم کہ ایک درجن کتابیں تو میں عباس حسینی کی مسکراہٹ پر قربان کرسکتا ہوں (بشرطیکہ کسی بات پر جھینپ کر مسکرائے ہوں)۔''

اس کے بعد راشد اشرف نے مزید لکھا ہے:

''ابن صفی مرحوم کے پاس ان کے ناولوں کے الٰہ آباد ایڈیشن بھی پہنچتے تھے۔ گمان ہے کہ ابن صفی 'روشنی کی آواز' کی اشاعت کی خبر سے واقف نہیں ہوں گے۔ اگر ہوتے... اسے پڑھتے... تو شاید عباس حسینی مرحوم کو سچ مچ جھینپ کر مسکرانا ہی پڑتا... اور صفی صاحب کو ان پر ایک درجن کتابیں قربان کرنے کا موقع مل ہی جاتا...!''

برصغیر کے اردو ادب کی تاریخ میں اسے ایک معمہ ہی سمجھا جائے گا کہ دو گھرانے اور دو دوست کے مابین قربت کا حال یہ تھا کہ ابن صفی نے بھارت کے ایک پڑوسی ملک پاکستان سے اپنے ناول کا مسودہ تاحیات بلا معاوضہ اپنے دوست عباس حسینی کو ارسال کرتے رہے، عباس حسینی اسے چھاپ کر نہال ہوتے رہے، لیکن ابن صفی اس بات سے بھی ناواقف رہے کہ ان کے نام سے اور اسی مؤقر ادارے سے جعلی ناول 'سائے کا قتل' اور 'روشنی کی آواز' بھی شائع ہوئے ساتھ ہی ان کے تخلیق کردہ کرداروں کی ہندی زبان میں مٹی پلید کی جاتی رہی۔ یہ معمہ شاید کبھی حل نہ ہوسکے۔

☆☆☆

حوالے و حواشی

۱۔ ابن صفی کون؟ مرتب و مؤلف: مشتاق احمد قریشی، کراچی، 'روشنی کی آواز' (جاسوسی دنیا الٰہ آباد) ایک جائزہ، مقالہ نگار: راشد اشرف، صفحہ 128 تا 137

۲۔ ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ، مؤلف و مرتب: محمد عارف اقبال، (جون 2013)، اردو ادب میں سرقہ کی بدترین مثال' مقالہ نگار: محمد عارف اقبال، صفحہ 464 تا 484

۳۔ ابن صفی کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا؟ مرتب و مؤلف راشد اشرف، کراچی (مئی 2012)۔ راشد اشرف نے مجاور حسین کے مضمون کے عنوان میں جزوی تصرف کرکے 'ستارہ جو ڈوب گیا— روشنی جو باقی رہے گی' کے نام سے شائع کیا۔ (صفحہ 135 تا 141)۔ حیرت ہے کہ راشد اشرف نے اس مضمون کے مواد پر حاشیے کیوں نہیں لکھے۔ (ع۔ا۔)

۴۔ دیکھیے 'پیش رس' لاشوں کا بازار (ستمبر 1956) نیز میں نے لکھنا کیسے شروع کیا؟ ابن صفی، عالمی ادب کی نمائندہ تحریریں، ترتیب و ادارت: محمد عارف اقبال، جلد 60، صفحہ 15 تا 22

نوٹ: اس کتاب میں ابن صفی مرحوم کے دو مضامین کے علاوہ ان کے افسانے، انشائیے، پیروڈیز اور دستیاب شعری تخلیقات شامل ہیں۔ نیز 250 سے زائد ناولوں کے منتخب فکر انگیز اقتباسات (مع عنوان) بھی شامل کیے گئے ہیں۔

○○○

عقیدت کے پھول

راجہ بنارس

آج سے 25 سال قبل راجہ بنارس کی تحریر کردہ اسرار و رموز کے پردوں میں چھپی ایک ایسی کہانی جو پہلے صفحے سے آپ کو اپنے سحر میں اس طرح جکڑے گی کہ آپ اسے ایک ہی نشست میں ختم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

ایک مقتول کی سرگزشت، وہ اپنے قاتل کو گرفتار کرانے کیلئے قبر سے باہر آ گیا تھا

اماں بی کو حسب معمول دودھ میں خواب آور دوا پلا کر شب بخیر کہتی ہوئی جوں ہی میں بغلی دروازہ کھول کر اپنی خواب گاہ میں داخل ہوئی ایک سفید بلی نے میرے پلنگ سے چھلانگ لگائی اور بند کھڑکی سے سر ٹکرانے لگی، باہر نکلنے میں ناکام ہو کر اس نے سہمی سہمی نگاہوں سے چہرہ گھما کر میری جانب دیکھا اس کی روشن آنکھوں میں التجا اور ندامت کی جھلک بالکل نمایاں تھی، گو میں بلیوں، کتوں سے بے حد الرجک ہوں مگر نہ جانے اس بلی کی معذرت بھری نگاہوں نے مجھے کیوں اتنا متاثر کر دیا تھا اس نے پورا جبڑا کھول کر کہا۔

"میں آؤں۔"

"ہاں ہاں میڈم بڑے شوق سے تشریف لائیں۔" میں مسکراتی ہوئی اس کی جانب بڑھی پہلے تو وہ میٹھی نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر معاً اوپر اچھلی اور میرے اوپر سے گزرتی ہوئی صوفے پر جا گری اور وہاں سے دوسری چھلانگ میں بغلی دروازے سے اماں بی کے کمرے میں چلی گئی، چونکہ اماں بی کے کمرے کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے اس لیے میں نے سوچا کہ بلی اماں بی کو ساری رات پریشان کرے گی جب میں اندر گئی تو اماں بی نے استفہامیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔

"کوئی آوارہ بلی اندر آ گئی ہے اماں بی۔" میں نے بتایا۔

"ابھی ابھی ادھر آئی ہے۔"

"نہیں تو۔" اماں بی نے کہا۔ "میں جاگ رہی ہوں ادھر تو کوئی بلی ولی نہیں آئی۔"

"آئی ہے اماں۔" میں نے جھک کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر بلی کا نام و نشان تک نہ تھا حالانکہ باہر جانے کا کوئی راستہ بھی نہ تھا۔

"جاؤ عطو۔" اماں بی نے کہا۔ "سو جاؤ بلی ہی ہے نا کوئی بھیڑیا تو نہیں۔"

"لیکن اماں وہ گئی کہاں؟" میں نے الجھ کر کہا۔

"کہیں دبک گئی ہو گی تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔" اماں بی نے کہا اور میں نہ چاہتے ہوئے واپس چل پڑی تھی کیونکہ میری وجہ سے اماں بی کے آرام میں خلل پڑ رہا تھا۔

بلی کوئی خطرناک درندہ نہ تھی پھر بھی اس کی پراسرار آمد و رفت میرے ذہن میں چپک گئی تھی میں نے باتھ روم جا کر شب خوابی کا ڈھیلا ڈھالا لباس پہنا اور بیٹھ کر جوں ہی میں نے سائڈ ٹیبل پر رکھے لیمپ کی جانب دیکھا ٹیبل لیمپ کے نیچے بھورے رنگ کا لفافہ دبا ہوا تھا، لفافے کے اندر ایک انچ چوڑی اور تین انچ لمبی آرٹ پیپر کی سلپ تھی، جس پر سیاہ روشنائی سے نہایت ہی خوش خط تحریر تھی۔

"میں قتل کیا گیا ہوں اور اب تمہاری خدمات حاصل کر رہا ہوں پانچ ہزار پیشگی معاوضہ پیش کر رہا ہوں قاتل کو تلاش کرو۔"

چوہدری مہدی علی خان مقتول

سلپ کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر اپنے نادیدہ اور عجیب موکل کی تحریر پڑھنے لگی تب مجھے محسوس ہوا کہ میرا جسم پسینے کی نمی سے بھیگ رہا ہے میں کمزور دل اور بزدل لڑکی نہیں ہوں، اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں سفاک ترین مجرموں سے پالا پڑتا رہا تھا سوت کئی بار ایک انچ دور سے واپس پلٹی

تھی خوفناک حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا میرا پیشہ ہے مگر اس بے جان سی سلپ نے میرے رونگٹے کھڑے کردیے تھے، جب میں قانون کے پیشے سے منسلک تھی تو عدالت میں میرے پاس ہر قسم کے موکل آیا کرتے تھے اور پھر ادھر سے مایوس ہو کر جب میں نے سراغ رساں ایجنسی قائم کی تو مظلوم روتے بسورتے آتے اور مراد سے جھولی بھر کر معاوضہ اور دعائیں دیتے واپس چلے جاتے تھے لیکن سب کے سب زندہ لوگ زندہ لوگوں کے ستائے ہوئے آیا کرتے تھے۔

چوہدری مہدی علی خان جیسا موکل یقیناً کبھی کسی وکیل اور سراغ رساں کے پاس نہ آیا ہوگا وہ قتل ہو چکا تھا اور اب قاتل کے گریبان تک ہاتھ لے جانے کے لیے میری خدمات مستعار لینا چاہتا تھا، میں نے پیشگی رقم کو اِدھر اُدھر تلاش کیا تکیے کے نیچے عام سے لفافے میں سو سو کے نئے نوٹ موجود تھے۔

''ٹھیک ہے مہدی علی خان۔'' میں نے طویل سانس لے کر زیر لب جیسے پاس کھڑی روح سے کہا۔

''میں تمہاری پیش کش قبول کرتی ہوں، ایک انوکھا تجربہ ہی سہی۔'' میں نے اٹھ کر سلپ اور نوٹوں کی گڈی پر پاؤڈر چھڑکا اور خواب گاہ سے ملحق لیبارٹری میں جا کر فنگرز پرنٹس پرکھنے لگی، اس وقت ایک بار پھر میرے جسم سے خوف کی سردی لہر اٹھی تھی جب کسی بھی شے پر انگلی کا خفیف سا نشان بھی نہ دکھائی دیا تھا جیسے کاغذوں کو کسی انسانی ہاتھ نے چھوا تک نہ تھا لیبارٹری کی تمام تر آزمائشی کوششوں میں ناکام رہ کر میں نے تحریر سامنے رکھی اور نئے سرے سے سوچنا شروع کردیا میری خواب گاہ تک رسائی صرف تین اشخاص کی ممکن تھی اماں بی خالہ جیواں اور سرفراز، ان کے علاوہ کوئی چوتھا وجود میری اجازت اور اماں بی کی نگاہوں سے بچ کر اندر نہیں داخل ہو سکتا تھا خواب گاہ کا مقفل دروازہ شاذ و نادر ہی کھولا جاتا تھا چابی ہمیشہ میرے پرس میں رہتی تھی اور میں عموماً اماں بی کے کمرے سے ہو کر بغلی دروازے سے اندر آیا کرتی تھی۔

میں نے انٹر کام کا بٹن دبایا اور ریسیور اٹھا کر پہلے سرفراز سے رابطہ قائم کیا۔

''اگر تم عطیہ ہو تو سن لو میں اس وقت گرم رضائی نہیں چھوڑوں گا۔'' سرفراز بولنے لگا۔ ''بے شک تم دینوی لحاظ سے میری مادام ہو۔''

''بک چکے ہو یا کچھ اور بھی کہنا ہے۔'' میں نے سرد آواز میں کہا۔

''گرم رضائی کے اندر سے ہی جواب دو کہ آج تم میری خواب گاہ میں کس وقت آئے تھے؟''

اس نے سرد آہ بھری اور منہ سے پچپاک پچپاک کی آواز نکال کر بولا۔

''تمہاری مہکتی خواب گاہ میں داخل ہونے کا حق اپریل میں ملے گا۔''

''اس وقت بھی میں تمہیں مرغا بنا سکوں گی۔'' میں نے مسکراہٹ دبا کر جواب دیا۔

''میری عدم موجودگی میں جو موکل آیا تھا اس کا نام کیا تھا؟''

''گرامر کے لحاظ سے وہ موکل نہیں بلکہ خوب صورت چہرے والی موکلہ تھی۔''

''کیا اس نے میرے لیے کوئی پیغام دیا تھا؟''

''نہیں۔'' سرفراز نے بتایا۔ ''بلکہ وہ میری گستاخ نگاہی سے گھبرا کر فوراً ہی واپس چلی گئی تھی۔''

''اچھا اب اسی کا تصور نگاہوں میں لے کر سو جاؤ۔'' میں نے کھڑی ہتھیلی مار کر سلسلہ منقطع کردیا اور اٹھ کر اماں بی کے کمرے میں چلی گئی۔

''کیا بات ہے عطیہ، آج تم سوئی کیوں نہیں۔'' مجھے دیکھ کر انہوں نے سرزنش کی۔

''اماں کوئی ملاقاتی آیا تھا کیا؟''

''نہیں۔'' وہ بولیں۔ ''اوہ یاد آیا کسی نے ٹیلی فون پر پیغام دیا تھا۔'' میرا دل اچھل کر حلق میں جیسے پھنس گیا ہاتھ پاؤں جیسے سنسنانے لگے تھے۔

''اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔'' اماں بی کی آواز جیسے گہرے کنوئیں سے ابھر کر میری سماعت سے ٹکرائی۔

''کوئی تنک کٹا بول رہا تھا شاید۔''

''کیا کہہ رہا تھا۔''

''کہہ تو رہی ہوں اس کی کھر کھراتی آواز میرے پلے نہیں پڑی ہاں نام مہدی علی خان بتایا تھا۔''

تعارف

نسیم سکینہ صدف نئے افق کی دیرینہ قلم کار پنجاب کے شہر فیصل آباد میں پیدا ہوئیں۔ یہ وہ مقام ہے جن پر تفصیلی مرقع ان کی کہانیوں اور ناولوں میں دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج سے تعلیم حاصل کی۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ جس سے ان کا شغف اب بھی جاری ہے۔ ان کی افسانوں کی پہلی کتاب ''آؤ لمحے غلام کرلیں'' تھی جو 2014 ادارہ تخلیق لاہور میں جو حسن عباسی صاحب نے شائع کی۔ پہلا ناول۔ ''خواب سے عذاب تک'' ماہنامہ حکایت لاہور میں قسط وار شائع ہوا۔ نسیم سکینہ صدف کا شعری مجموعہ ''مجھ کو ہے تیری نظر میں رہنا'' زیر اشاعت ہے یہ وہ شعری مجموعہ ہے جیسے انہوں نے برسوں پہلے لکھنا شروع کیا اور اسی سال مکمل کیا ہے ملک کے بیشتر رسالوں میں ان کے افسانوں اور شاعری کی دھوم ہے۔

''اوہ اچھا۔'' میں نے واپس جاتے ہوئے کہا۔ ''وہ مجھ سے مل چکا ہے۔''

نیند پر لگا کر نہ صرف میری آنکھوں سے اڑ گئی تھی بلکہ خواب گاہ بھی میرے لیے مہدی علی خان کی قبر بن گئی تھی مجھے ہر شے سرگوشیاں کرتی محسوس ہو رہی تھی بستر کی ہر شکن میں جیسے مہدی علی خان کی روح موجود تھی میرے خوف کے پس منظر میں وہ سفید بلی تھی جو پراسرار طور پر سامنے آ کر غائب ہو گئی تھی پہلی بار مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ مشرق کا انسان قانون کی اعلیٰ ڈگری رکھنے کے باوجود بعض اوقات کسی جاہل دیہاتی کی طرح وہم کا شکار ہو سکتا ہے جب رات کا سناٹا گہرا ہونے لگا اور خوف و دہشت کی سرسراہٹیں میرے بدن پر رینگنے لگیں تو میں نے گھبرا کر اس شخص کا سہارا لینا چاہا جو میرے مذاق کا نشانہ بنا رہتا تھا اس رات سرفراز کی ذات یکا یک محافظ بن کر ابھری تھی وہ مجھے ایسی چٹان کی طرح لگا تھا جس کی آڑ میں، میں ہر طوفان سے خوف کو محفوظ سمجھنے لگی تھی۔

''ہیلو پارٹنر۔'' انٹر کام پر اس کی آواز سن کر مجھے ایسے ہی ڈھارس ملی تھی جیسے گھپ اندھیرے میں کوئی کرن دکھائی دی ہو۔

''لیبارٹری میں چلے آؤ ہاں آج تمہیں گرم بستر ساتھ لانے کی بھی اجازت ہے بے حد ضروری کام ہے۔'' اس سے قبل کہ سرفراز حسب عادت ہیر پھیر کرتا میں نے سلسلہ توڑ دیا کیونکہ مجھے یقین تھا وہ میرے بلاوے پر آگ کے سات سمندر عبور کر کے بھی آئے گا ٹھیک تین منٹ بعد اس نے لیبارٹری کے دروازے پر دستک دی تھی میں نے چابی لگا کر بے آواز تالا کھول دیا اور وہ گرم شال میں لپٹا ہوا اندر آ گیا۔

''رضائی بھی لے آئے، میں نے خلاف معمول نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔

''کر لو ظلم عطیہ بیگم۔'' وہ ناک سڑوک کر بولا۔

''خدا کی قسم ایک کا بدلہ دس سے نہ لیا تو سرفراز نام نہیں، تاریخ وار ڈائری لکھ رہا ہوں۔

''فی الحال تم میرے بزنس پارٹنر ہو۔'' میں نے خواب گاہ کی جانب چلتے ہوئے کہا۔ ''بزنس کی خاطر اگر میں جہنم میں جاؤں گی تو شرائط کی رو سے تم بھی میرے ساتھ جاؤ گے۔''

''ادھر تو جنت ہے۔'' سرفراز نے میری خواب گاہ کی جانب اشارہ کیا۔ ''جس میں داخلے کی شیطان کو اپریل سے پہلے اجازت نہیں۔''

''اگر تم مجھے پریشان کرتے رہے تو صرف اپریل فول ہی بن سکو گے۔'' میں نے پلٹے بغیر جواب دیا۔ ''آرام سے بیٹھو میں ادھر ہی کمبل لاتی ہوں۔'' وہ کمبل اٹھائے جب میں لیبارٹری میں داخل ہوئی تو چیخ میرے حلق کو زخمی کرتی ہوئی کہیں اٹک گئی تھی اگر کمبل میری باہوں کے شکنجے میں نہ ہوتے تو بے جان ہاتھوں سے پھسل جاتے میں دہشت زدہ نگاہوں سے سفید بلی کو دیکھ رہی تھی جو طویل میز کے کونے پر بکل مارے آرام سے بیٹھی ہوئی تھی۔

''کیا ہوا عطیہ؟'' مجھے خوفزدہ دیکھ کر سرفراز نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔

''سرفراز کیا تمہیں نہیں دکھائی دے رہا؟'' میری آواز کو

جیسے جاڑے کا بخار مار گیا تھا۔

"کیا عطیہ بیگم۔"

"بلی...... سفید بلی......!" میں نے اپنا چہرہ کمبل میں چھپالیا اور چیخ پڑی۔

"تمہارے قریب سفید بلی بیٹھی ہوئی ہے سرفراز۔"

"اوہ۔" وہ ہنس پڑا۔ "لیکن اس میں خوف زدہ ہونے کی کیا بات ہے۔"

"یہ...... یہ...... پہلے میری خواب گاہ میں تھی۔" میں نے آہستہ آہستہ چہرہ اٹھایا۔

"اور اب میری خواب گاہ کے باہر ٹہل رہی تھی۔" سرفراز بتانے لگا "اور میرے ساتھ یہاں آ گئی ہے۔"

"اسے مارو سرفراز۔"

"کیوں عطیہ؟"

"یہ...... یہ...... بری روح ہے نکال دو اسے۔"

سرفراز نے ہاتھ بڑھا کر بلی کو اٹھایا اور اپنی رانوں پر بٹھالیا۔

"روحیں اتنی فارغ نہیں ہوتیں عطیہ بیگم۔" اس نے بلی کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "کہ بلیوں کے روپ میں بھٹکتی پھریں یہ تو کسی کی پالتو بلی ہے اپنے مالک کی تلاش میں ادھر نکل آئی ہوگی۔"

پل بھر میں، بلی اور سرفراز کو دیکھتی رہی اور پھر سرفراز کے سامنے جس بزدلی اور توہم پرستی کا مظاہرہ کر چکی اس کا اثر زائل کرنے کی خاطر میں نے یہ تاثر دینے کا فوری فیصلہ کرلیا تھا کہ محض سرفراز کو آزمانے اور ڈرانے خاطر میں نے اداکاری کی تھی کمبل میز پر اچھالتے ہی میں نے ہنسنا شروع کردیا تھا لیکن سرفراز کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی تھی وہ اسی انہماک کے عالم میں بلی کو سہلائے جارہا تھا۔

"ویسے تم بتدریج اچھے اور روایتی سراغ رساں بنتے جا رہے ہو۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"شکریہ۔" وہ ادھر دیکھے بغیر بولا۔

"ویسے بحیثیت شوہر میں یکدم بہت اچھا ثابت ہوں گا۔"

"یہ آج کل تم پر شوہر کا بھوت کیوں سوار ہے۔"

"اس لیے کہ پرسوں آئینے میں ایک بال سفید دیکھا تھا۔"

"کیا تمہارے نزدیک زندگی کی معراج صرف شادی ہی ہے۔"

"یہ سوال اپنی اماں بی سے کرنا۔" اس نے بلی کو میز پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"جو ہر وقت بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونے کے لیے سرد آہیں بھرتی رہتی ہیں۔"

"اماں بی پچھلی صدی کی ایک روایتی ماں ہے۔" میں نے کرسی کھسکا کر بلی سے فاصلے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہم اس ماڈرن دور کے لوگ ہیں جن کے سامنے شادی سے کہیں زیادہ دوسرے مسائل موجود ہیں۔"

"کیا اس دور کے ماڈرن لوگ شادی کے بغیر ہی......!"

"شٹ اپ۔" میں نے شیشے کی نلکی اٹھا کر اسے ماری وہ جھکائی دے کر ہنسنے لگا۔

"یار عطیہ، کمال کی لڑکی ہو...... نہ یہ نہ وہ۔"

"بس میرے سامنے ایسی بکواس مت پھیلایا کرو۔"

"کام بھی تو نہیں۔" اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"تجربے کی میز خالی ہے۔"

تب میں نے سفید بلی سے لے کر اماں بی کے ٹیلی فونک پیغام تک تمام باتیں اسے بتادیں، وہ حسب عادت نگاہیں جمائے میری جانب ہی دیکھتا رہا تھا جب سے اس نے انکشاف کیا تھا کہ اسے میرے پھڑکتے لرزتے ہونٹ اس لیے بے حد پیارے لگتے ہیں جب میں مسلسل باتیں کر رہی ہوتی ہوں تو اس کا یوں دیکھنا مجھے بوکھلا کر رکھ دیتا تھا۔

"سنو عطیہ کریم۔" سرفراز مستحکم لہجے میں بولنے لگا، تم جانتی ہو کہ سرفراز احمق کا نام ہے وہ تمہارا ہر حکم ایسے ہی مانتا ہے جیسے غلام اپنے آقا کا حکم بے چون وچرا مانتے ہیں لہٰذا ہاتھ گھما کر ناک پکڑنے کی چنداں ضرورت نہیں بقول تمہارے ہم ماڈرن دور کے لوگ ہیں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتے مطلوبہ شخص کو انف نوٹ کرادو اور حسب سابق میں اسے پاتال سے بھی گھسیٹ لاؤں گا۔"

"ہم فرض کرتے ہیں کہ مہدی علی خان کی روح ہی ہماری موکلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم روح کو ہی بنیاد بنا کر سراغ کی عمارت اوپر اٹھائیں گے۔"

"یہ ہمارے کسی کرم فرما کا مذاق یا دشمن کا جال بھی ہوسکتا ہے۔" سرفراز نے کہا۔

"یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ چلتے وقت ہمیں اس امکان کی طرف بھی دھیان رکھنا ہوگا۔"

"پتا نہیں کیوں مجھے بار بار خیال آتا ہے کہ یہ مذاق نہیں ہے۔"

"یعنی واقعی روح یہاں آئی تھی؟" سرفراز نے قہقہہ لگایا۔

"امریکا پلٹ لڑکی کو ایسے خیالات زیب نہیں دیتے عطیہ جی بہرکیف ہم کیس لے چکے ہیں اور کل سے کام شروع کردیں گے۔"

صبح خلاف معمول میری آنکھ دیر سے کھلی تھی سر بوجھل تھا آنکھیں جل رہی تھی اور منہ کا ذائقہ کڑوا ہو رہا تھا اس کی وجہ یہ رہی تھی کہ رات بھر میں سکون کی نیند نہ سو سکی تھی باتھ روم سے فارغ ہو کر میں نے شہر میں پھیلے ہوئے اپنے نمائندوں سے سینئر نمائندہ روبینہ ملک کا انتخاب کیا اس لڑکی میں کچھ ایسی غیر معمولی خصوصیات تھیں کہ بعض اوقات مجھے خود سے بلند دکھائی دینے لگتی تھی۔

"یس میڈم۔" میری آواز پہچان کر روبی نے مودب آواز میں جواب دیا۔ "اینی سروس؟"

"نوٹ کرو۔" میں نے پیار اور اپنائیت سے اسے تیاری کا وقت دیا۔

"یس میڈم۔" کاغذ کی آواز کے ساتھ وہ بولی۔

"چوہدری مہدی علی خان نامعلوم سن اور تاریخ کو قتل ہوا تھا۔ تم پہلے مقامی تھانے چیک کرو گی اگر نتیجہ مثبت نہ نکلے تو ضلع کی پولیس سے رابطہ قائم کرلینا مجھے مقتول کے بارے میں مکمل رپورٹ درکار ہے۔"

"اوکے میڈم۔" اس نے کہا۔

"مقامی کارروائیوں کی رپورٹ آپ کو جلدی مل جائے۔"

"شکریہ پیاری لڑکی۔" میں نے پرستائش آواز میں کہا اور سلسلہ توڑ دیا دن کے ایک بجے جب روبی نے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیا تو میں ایک داخل دفتر شدہ کیس کی فائل کا از سر نو مطالعہ کر رہی تھی۔ کیونکہ میرا مفرور موکل چھ ماہ بعد مشرق وسطیٰ سے واپس آ گیا تھا سرفراز میرے سامنے بیٹھا موکل کی دوسری قسط کی رقم گن رہا تھا۔ "ہاں ڈیئر اونٹ کس کروٹ بیٹھا ہے؟" میری بات سن کر روبی ثانیہ بھر خاموش رہ کر بتانے لگی۔

"چھ جنوری سن اٹھاون کی درمیانی شب چوہدری مہدی علی خان اپنی خواب گاہ میں دم گھٹنے کی وجہ سے مرا تھا اور موت اتفاقیہ قرار دے کر دفنا دیا گیا تھا۔"

"بہت خوب روبی۔" میں نے تعریفی انداز اختیار کرتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

"اب مجھے مرحوم کی لائف ہسٹری چاہیے۔"

روبی کے ساتھ سرفراز بھی سرگرم عمل تھا لیکن روبی نے ہمیشہ کی طرح سرفراز سے پہل کرتے ہوئے تحریری رپورٹ پیش کردی تھی۔ میں نے سرفراز سے بھی رپورٹ لے کر دونوں کا موازنہ کیا انیس بیس کے فرق کے ساتھ دونوں کی معلومات یکساں تھیں، رپورٹ کے مطابق چوہدری مہدی علی خان انڈو پاک کی تقسیم کے وقت حیدر آباد دکن سے یہاں آیا تھا چونکہ اس کے پاس کوئی کلیم نہ تھا اس لیے اس نے بشن داس کی کوٹھی میں رہائش اختیار کرلی، یہ کوٹھی ان دنوں بھی ویران ہے کیونکہ جسے بھی الاٹ ہوئی وہ اس میں رہنے کی جرأت نہ کرسکا، مرحوم کا بظاہر کوئی ذریعہ معاش نہ تھا مگر بڑے ٹھاٹ کی زندگی بسر کر رہا تھا شاہ خرچی کی وجہ سے اس کا حلقہ احباب بھی خاصا وسیع تھا اور مقامی انتظامیہ سے بھی اس کے مراسم گہرے تھے اس رات اس کی بیوی اسپتال میں زیر علاج تھی اس نے اپنے پیچھے بیوہ کے علاوہ کوئی اولاد نہیں چھوڑی کوشش کے باوجود اس کی بیوہ کا کوئی سراغ نہیں مل سکا رپورٹ کے ساتھ چار اشخاص کے کوائف بھی درج تھے جو وقوعہ کی رات مرحوم کے ساتھ دیر تک شطرنج کھیلتے رہے تھے۔

رپورٹ کا تفصیلی جائزہ لے کر میں نے خود باہر نکلنے کا فیصلہ کیا اور اس وقت کے نائب تحصیلدار، منصب دار سے آغاز کیا اگر میں چاہتی تو اپنی ایجنسی کے حوالے سے منصب دار سے ملاقات کرسکتی تھی لیکن خطرہ تھا کہ وہ خول میں بند ہوجائے گا اس لیے میں نے صحافت کا روپ دھارا اور اس کے گھر جا کر محکمہ مال کی اصلاح سے متعلق انٹرویو کی درخواست پیش کردی، موصوف ایک کیس میں ملوث ہو کر سبکدوش کردیے گئے تھے اور ایسمنٹ کی ایجنسی چلا رہے

تھے دفتر، اسٹور میں ہارڈ بورڈ کی پارٹیشن کر کے بنایا گیا تھا اور اس وقت ٹرک سے سیمنٹ اتارا جا رہا تھا اس لیے دھواں نما گرد کیبن میں پھیلی ہوئی تھی بے شمار سوالوں اور باتوں کے دوران میں نے ناجائز الاٹمنٹ کی جانب باتوں کا رخ موڑا اور باتوں باتوں میں بشن داس کی کوٹھی کا بھی ذکر چھیڑ دیا۔

''بشن داس کی کوٹھی سرے سے کسی کو الاٹ ہوئی ہی نہیں۔'' منصب دار نے بتایا۔ ''جس کا نام بھی لیا گیا وہی دست بردار ہو گیا تھا۔''

''دست برداری کی وجہ؟''

''کوٹھی کا آسیب۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''جب فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تو ارد گرد کے ہندو خاندان بشن داس کی پناہ میں چلے آئے تھے لیکن سب کو ایک کمرے میں جمع کر کے جلا دیا گیا تھا سنا ہے ان لوگوں میں ایک ایسی ہندو عورت بھی تھی جس کی گود میں ایک دن کا بچہ تھا ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ کوئی غیر مسلم عورت اگر زچگی میں مر جائے تو اس کی روح بھوت بن کر بچے کے لیے روتی رہتی ہے۔''

''کیا آپ بھی اس توہم پرستی پر یقین رکھتے ہیں۔''

جب سانس لینے وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

''پہلے تو پڑھے لکھے نوجوانوں کی طرح میں بھی ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔'' اس نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔

''لیکن اب یقین رکھتا ہوں بات جب صرف سنی سنائی ہو تو یقین نہیں کیا جا سکتا مگر جب آنکھوں سے دیکھ لیا جائے اور کان سن لیں تو یقین کرنا ہی پڑتا ہے جب ہر ایک نے کوٹھی لینے سے انکار کر دیا تو چوہدری مہدی علی خان نے رہائش اختیار کر لی، وہ ایک نڈر اور روشن خیال آدمی تھا جب ہماری علیک سلیک دوستی میں بدلی تو ہم چار پانچ دوست اکثر شطرنج کھیلنے جایا کرتے تھے۔'' منصب دار بولتے بولتے خاموش ہو گیا اور پیپر ویٹ کو گھمانے لگا۔

''تو کیا آپ نے وہاں کچھ دیکھا۔''

''جی ہاں دیکھا بھی اور بارہا سنا بھی۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بتانے لگا۔

''کوٹھی کے در و دیوار روتے تھے وہ بین اور سسکیاں کسی عورت کی ہوتی تھیں، ایک رات میں دوسرے سے واپس ذرا لیٹ آیا دوسرے دوست جا چکے تھے اور چوہدری کا پیغام تھا کہ رات ضرور آنا میں کھانا کھا کر اکیلا ہی ادھر چل پڑا۔ جب کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا تو اچانک میری سماعت سے سسکیاں ٹکرائیں اور پھر سفید سایہ دار دیوار پھاند کر میرے سامنے آ گیا۔

''منصب دار نے جھرجھری لی اور طویل سی سانس لے کر بولنے لگا۔

''میں نے جیب سے چاقو نکال لیا اور کمانی دار چاقو کی کڑکڑاہٹ سن کر سایہ جھکا اور دوسرے لمحے پھر دیوار پھاند کر غائب ہو گیا تھا۔

''کیا آپ نے قدموں کی چاپ سنی تھی۔''

''شاید نہیں۔'' منصب دار نے نفی میں گردن ہلائی۔

''دراصل خوف کی وجہ سے مجھ پر نیم غشی سی طاری ہو گئی تھی اور اسی رات چوہدری اپنے کمرے میں مردہ پایا گیا یقیناً اسی بھوت نے اسی کی گردن توڑ دی تھی۔''

''کیا اب بھی دیواریں روتی ہیں۔''

''میں تو وہ شہر ہی چھوڑ آیا ہوں۔'' منصب دار نے بتایا۔

''البتہ گزشتہ دنوں ایک پرانے دوست سے ملاقات ہوئی اس نے بتایا کہ کوٹھی کے نزدیک جو بھی جاتا ہے وہ کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہو جاتا ہے اسی کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ خانہ بدوش خاندان بارش سے بچنے کی خاطر کوٹھی کے برآمدے میں جا بیٹھا آدھی رات کو پہلے انہوں نے غراہٹیں سنی پھر پتھروں کی بارش برسنے لگی۔ جب وہ بھاگے تو ایک سفید پوش سایہ دور تک ان کا تعاقب کرتا رہا تھا۔''

منصب دار کا ریکارڈ شدہ انٹرویو جب سرفراز نے سنا تو اس نے کہا۔ ''میں وہاں رات بسر کروں گا۔''

''ابھی نہیں۔'' میں نے اس کی تجویز مسترد کرتے ہوئے کہا۔

''میں مہدی علی خان کے نوکر سے مل لوں تو پھر پروگرام بنائیں گے میری اطلاع کے مطابق وہ نوکر حیدر آباد سے ساتھ ہی لایا تھا روبی کی کمانڈ میں فاروق اور نیاز احمد اسے تلاش کر رہے ہیں میرے خیال میں وہی اپنے مالک کی سابقہ زندگی پر روشنی ڈال سکتا ہے۔''

خاص موضوع، خاص ماحول اور خاص وقت میں جنم لینے والی ایک ناقابل فراموش کہانی
حقیقی کرداروں کی سانس لیتی اور نشوونما پاتی ایک دلچسپ تحریر
ملک کی معروف مصنفہ عشنا کوثر سردار کے نوک قلم سے 69 برس قبل جنم لینے والی ایک
دلکش اور رومانی اور محبت سے لبریز داستان
بہت جلد نئے افق کے صفحات پر سلسلے وار شائع ہوگی
ایک سو سولہ چاند کی راتیں
انڈو پاک کی تقسیم کے وقت اس محبت کی کہانی کا سفر شروع ہوا جہاں ایک پاک سرزمین کی تاریخ رقم ہوئی، زمین ٹکڑوں میں تقسیم ہوئی تو محبت دو دلوں کو جوڑ رہی تھی۔ زمین کی تقسیم نے دلوں کو تقسیم نہیں ہونے دیا۔ پاکستان بننے کے دوران جن مشکلات اور مصائب سے وہ لوگ گزرے ہیں ان کا ہماری آج کی نسل کو احساس نہیں، لوگوں کی ہجرت ہی نہیں ہوئی بلکہ ان کی زندگی ختم ہوگئی۔
افسانوی رومانوی لفظوں میں گندھی ناقابل فراموش حسین کہانی
محبت سے لبریز حسین چاندنی راتوں اور لمحوں کا ذکر، محبت کرنے والوں کا احوال خاص
دیر مت کیجیے اپنی اپنی کاپی آج ہی سے بک کرالیں۔ رابطہ نئے افق 03008264242

سرفراز کی یہی عادت مجھے پسند نہیں تھی کہ وہ بڑے خوفناک طوفانوں کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا ہے مگر میرے لیے وہ ریت کے گھروندے سے بھی نازک بن جاتا ہے، تنخواہ دار خدمت گار بھی بعض اوقات ضد کر بیٹھتا ہے لیکن سرفراز نے کبھی چھوٹی سی بھی ضد نہیں کی میں جانتی ہوں وہ چٹان جیسا مضبوط عزم نوجوان ہے نہ جانے کیوں کبھی کبھی میرے اندر کی لڑکی چاہنے لگتی ہے سرفراز میرے ساتھ سفاکانہ رویہ اختیار کرے لیکن مجھے یقین ہے وہ میری محبت کو خانقاہ بنا کر مجاوری میں ہی دلاوری سمجھتا ہے اس کا یہ جھکاؤ ہی اس کی کامرانیوں اور عظمتوں کا مظہر ہے کہ کمان جھک کر ہی تیر کو ہدف کے سینے میں پیوست کرنے میں کامیاب ہوتی ہے اگر سرفراز کی ذات کمان کی طرح لچک دار نہ ہوتی تو مجھ جیسی نک چڑھی اور خودغرض لڑکی اس کی ہم سفر بننے کا کبھی فیصلہ نہ کرتی سرفراز نے جھک کر میری بلندیوں کو زیر کر لیا تھا روبی نے اتنے بڑے شہر کی آبادی سے کرم دین کو تلاش کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ تلاش میں اگر سچائی ہو تو صحرا کی وسعتوں میں کھوئی ہوئی سوئی بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔

کرم دین دہکتی بھٹیوں کے قریب بان کی کھری چارپائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا میرے ساتھ روبی اور نیاز احمد تھے روبی ایک دن پہلے نیاز احمد کے ساتھ کرم دین کو چارہ ڈال گئی تھی۔ یہی وجہ رہی تھی کہ ہمیں دیکھ کر کرم دین بدبداتا ہوا چارپائی سے اٹھا تھا۔

''آپ کا مال پرسوں تک تیار ہو جائے گا۔'' اس نے ایک اینٹ اٹھا کر دوسری اینٹ پر بجائی۔ ''ہماری اینٹ پیتل کی طرح بجتی ہے۔''

''تیس ہزار مجھے بھی تیار کر دیں بابا جی۔'' میں نے جھک کر اینٹ اٹھالی۔

''لیکن کیریج کا انتظام بھی آپ ہی کریں گے۔''

''ہو جائے گا۔'' کرم دین بولا۔ ''کہاں مال لے جانا ہو گا؟''

''حسن ابدال کے قریب بشن داس کی کوٹھی تک۔'' میں نے دیکھا کوٹھی کے نام پر اس کی توند کو بھرپور جھٹکا لگا تھا۔

''میں نے کوٹھی خرید لی ہے حسن ابدال جا کر جس سے پوچھیں گے بتا دے گا۔''

''آپ بھی جانتے ہی ہوں گے۔'' سرفراز نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور کرم دین ہانپ گیا۔

''جج...... جی...... ہاں۔'' خوف سے اس کی آنکھیں پھیل سی گئی تھیں۔

''گزشتہ دنوں ایک ہفت روزہ میں بشن داس کی کوٹھی پر ایک فیچر شائع ہوا تھا۔'' سرفراز نے دوسرا حملہ کیا۔

''اس میں آپ کا نام موجودہ کاروبار اور تصویر بھی شامل تھی۔''

''چھوڑو بھئی ہم اینٹوں کے لیے آئے ہیں۔'' میں نے لاتعلقی سے کہا۔

''لوگ خوامخواہ افسانے تراشتے رہتے ہیں میں تو دو راتیں وہاں گزار چکی ہوں مجھے تو کوئی بھوت دکھائی نہیں دیا۔''

''تم اپنے ساتھ سارے خاندان کو مصیبت میں مبتلا کر کے بھی نہیں مانو گی۔'' سرفراز ترش لہجے میں بولا۔

''انگریزی تعلیم نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ جب سارے لوگ کہتے ہیں تو تمہیں اپنی ضد سے باز آ جانا چاہیے تھا ادھر لندن میں شاید جن بھوت نہ ہوں گے مگر ادھر ہیں۔''

''اچھا بابا، کان نہ کھاؤ۔'' میں نے زچ ہو کر ہاتھ جوڑ دیے۔

''جس روز میرے سامنے کوئی بھوت آیا تو یقین کر لوں گی مٹی کے بھاؤ اتنی اچھی جگہ ملی ہے اور تم لوگ خوامخواہ بھوت کے خوف سے مرے جا رہے ہو کیوں بابا جی بھوت کا وجود ہے۔''

''ہاں بیٹی۔'' کرم دین غم آلود ماتھا پونچھ کر بولا۔

''آپ کو وہ منحوس کوٹھی نہیں خریدنی چاہیے تھی۔''

''اوہ......!'' میں نے قہقہہ اچھالا۔ ''آپ بھی مجھے نصیحت کریں گے۔''

''ہاں۔'' وہ بڑبڑایا۔

''اس لیے کہ میں وہاں طویل مدت رہ چکا ہوں۔''

''کہاں حسن ابدال؟'' روبی بول پڑی۔

''بابا جی ہماری باجی کو سمجھایئے آپ نے یقیناً کوٹھی کے بارے میں بہت کچھ سنا ہو گا۔''

تب کرم دین نے منصب دار سے ملتا جلتا بیان دیا اور یہ بھی اعتراف کرلیا کہ اس رات وہ اسی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں موجود تھا۔

"اب بولیے۔" روبی نے کامران لہجے میں کہا۔

"بابا جی سنی سنائی باتیں نہیں بتا رہے بلکہ یہ چشم دید گواہ ہیں۔"

"لیکن میں تو قیمت ادا کرچکی ہوں۔" میں نے فکر مند انداز میں کہا۔

"بابا جی کیا اس رات بھی آپ نے بھوت کی آواز سنی تھی۔"

"میں نے ہی نہیں بلکہ راجہ منصب دار تحصیل دار نے بھوت دیکھا تھا۔" کرم دین نے بتایا۔

"پھر فی الحال میرا آرڈر کینسل کردیجیے میں نے کہا۔

"میں پراپرٹی ڈیلرز کے ذریعے کوٹھی فروخت کردوں گی۔"

"تمہاری طرح لوگ پاگل نہیں ہیں۔" سرفراز جلے کٹے لہجے میں بولا۔

"اپنی جان کے صدقے رقم بھول جاؤ۔"

"بابا جی کیا یہ بھٹیاں آپ کو کلیم میں ملی تھیں۔" روبی نے پوچھا۔

"نہیں بیٹے میں تو یہاں چوکیدار اور منشی ہوں۔" کرم دین نے جواب دیا "اگر مہدی علی خان کی بیوہ سے ملاقات ہوجائے تو شاید وہ موت کی اصل وجہ بتا سکے۔" میں نے کہا "میرا دل نہیں مانتا کہ موت میں کسی بھوت کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔"

"اسے میں نے بھی بہت تلاش کیا تھا۔" کرم دین نے بتایا۔

"مگر وہ اسپتال سے ہی پراسرار طور پر لاپتا ہوگئی تھی میں نے پولیس کی توجہ بھی اس کی طرف دلائی تھی مجھے شک تھا کہ وہ چوہدری کی زندگی میں کسی خاص مقصد کے تحت داخل ہوئی تھی ورنہ اس جیسی تعلیم یافتہ عورت ایک ان پڑھ بوڑھے کے ساتھ زندگی کبھی بسر نہ کرتی وہ بڑی کائیاں قسم کی عورت تھی میں جانتا ہوں کہ اسے کوئی بیماری نہ تھی وہ جائے واردات سے صرف غیر حاضری ثابت کرنا چاہتی تھی۔

"ہاں اب اصل بات ہوئی نا۔" میں نے چونک کر کہا۔ "بوڑھے کو بیوی نے قتل کرا دیا ہوگا اور بدنام ہوگیا ہے چارہ بھوت میرا آرڈر نوٹ کرلیں بابا جی میں اب کسی بھوت ووت سے نہیں ڈرتی، میں نے ایک ہزار بطور بیعانہ کرم دین کو ادا کیے اور کچی رسید لے کر وہاں سے واپس آ گئی کرم دین نے دو ہزار وصول کرکے ہمیں کامیابی کا راستہ دکھا دیا تھا اگلے دن روبی نے جو بیعانہ دیا تھا وہ بھی میری ہی جیب سے گیا تھا لیکن میں اپنے مردہ موکل سے پانچ ہزار بیعانہ وصول کرچکی تھی اسی سے گاڑی چل رہی تھی۔

روح کی علیت کا مجھے اعتراف کرنا پڑا تھا کہ اس نے میرے کاروباری اصول کا خاص خیال رکھتے ہوئے پیشگی اتنی ہی قسط ادا کردی تھی جتنی میں، قتل کے کیس میں ہر موکل سے ایڈوانس لیا کرتی تھی چوہدری مرحوم کی بیوہ کے پیچھے میں نے اپنی ساری فورس لگا دی تھی اور خود بھی رات دن سرگرداں تھی مگر ہر طرف سے مایوس کن رپورٹ مل رہی تھی۔ اسپتال کے ریکارڈ سے صرف اتنا پتا چلا کہ ریحانہ بیگم زوجہ چوہدری مہدی علی خان خاوند کی موت کے چوتھے روز بیڈ چھوڑ کر چلی گئی اور اسپتال کے واجبات بھی ادا نہیں کیے تھے اس کے بعد کسی آنکھ نے ریحانہ بیگم کو نہ دیکھا تھا اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے مارتے مایوس ہوکر میں نے حسب دستور چار دن بعد گول میز کانفرنس طلب کرلی۔

"خواتین و حضرات۔" سرفراز نے کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"میں خاتون محترم عطیہ کریم کی اجازت کے ساتھ درپیش مسئلے پر روشنی ڈال کر آپ سے گزارش کروں گا کہ حسب روایات اپنی اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں۔" سرفراز نے حرف اول سے آخر تک ممبران کو آگاہ کیا اور پھر میں نے اپنے استاد محترم جمال صاحب سے پوچھا۔

"استاد محترم، ہم گھوم پھر کر نکتہ آغاز پر آ جاتے ہیں اگر یہ صرف مذاق ہی ہوتا تو ہم نادم ہوکر خاموش ہو جاتے مگر ایسا نہیں ہے کسی نے مہدی علی خان کو قتل کیا ہے لیکن نہ تو ابھی تک وجہ قتل معلوم ہوچکی ہے اور نہ ہی کوئی اور ایسا سراغ ملا ہے مشتبہ افراد کو چیک کیا جا چکا ہے کسی پر بھی شک نہیں کیا جا سکا ہاں مقتول کی بیوی گم ہے اور وہی سرفہرست

آتی ہے۔"

"کوئی کڑی میرے بچو۔" جمال صاحب نرم آواز میں بولے۔

"پہلے وہ کڑی تلاش کرو جو ابھی تک گم ہے ہوسکتا ہے وہ مقتول کی بیوی ہی ہو یا کوئی ایسا آدمی جو مقتول کے حلقہ احباب میں شامل نہیں رہا۔"

"خاتون محترم۔" راحیل نے مودب آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "آخر یہ کیس مضحکہ خیز طور پر لیا ہی کیوں گیا ہے وہ شخص یا ذریعہ جس کی رسائی آپ کی خواب گاہ تک ہوسکتی ہے وہ اتنا بے بس نہیں ہوسکتا کہ ہماری خدمات کا محتاج ہو، یہ ہمارے کسی مخالف کی شاطرانہ چال بھی ہوسکتی ہے جو ہمارے قدموں کا رخ دوسری طرف پھیر کر کوئی خاص مقصد حاصل کرنا چاہ رہا ہوگا۔ میری معلومات کے مطابق مہدی علی خان کی موت دم گھٹنے کی وجہ سے واقع ہوئی تھی اور اس رات وہ کوئلے کی انگیٹھی جلا کر سویا تھا اس وقت کی پولیس اس قدر احمق نہیں رہی ہوگی کہ قتل کے کیس کو بلاوجہ ہی حادثہ قرار دے دیتی۔"

"اب یہ سوال بعد از وقت ہے۔" سرفراز نے گھور کر راحیل کو دیکھا۔

"میرے دوست شاید یہ بھول رہے ہیں کہ ہماری ایجنسی خدمت خلق کے جذبے سے قطع نظر کاروباری بنیادوں پر قائم ہے ہم کوئی بھی کیس لیتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ ہمارا موکل کون ہے ظالم ہے یا مظلوم ہم طے شدہ فیس لے کر تحقیق و تفتیش کے ذریعے سچ اور جھوٹ الگ کرتے ہیں اس میں موکل مقتول تصور کیا گیا ہے اور اس نے ہماری شرائط کے مطابق پیشگی فیس کا ون تھرڈ ادا کر دیا ہے اب ہمارا پیشہ ورانہ فرض ہے کہ ہم قاتل کو تلاش کریں۔"

"کیا ہمیں یہ یقین کر لینا چاہیے کہ موکل واقعی مقتول کی روح ہے؟" راحیل نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"میرے خیال میں یہ ایک فضول بحث ہوگی۔" جمال صاحب بولے۔ "میں مشورہ دوں گا کہ روح کو ہی بنیاد مان کر کوٹھی سے از سر نو سفر شروع کیا جائے وہ روح یا جسم اگر تم لوگوں کو کوٹھی تک لے جانا چاہتا ہے تو پوری تیاری اور احتیاط کے ساتھ کوٹھی کو ہی سنگ میل بنایا جائے۔"

"کسی کو اور کچھ کہنا ہے۔" میں نے باری باری راحیل، روبی اور سرفراز کی طرف دیکھ کر پوچھا جواب میں سب نے نفی میں سر ہلا کر بحث اور جمال صاحب کی رائے پر جیسے تائید کی مہر ثبت کر دی تھی۔

"کل رات۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں اور روبی کوٹھی میں داخل ہوں گی سرفراز اور راحیل ہمیں کور دیں گے۔"

"بلاشبہ تم دونوں بہادر لڑکیاں ہو۔" جمال صاحب نے کہا "لیکن اپنی صنف کے حوالے سے پھر بھی لڑکی کمزور ہوتی ہے یہ میرا نہیں قانون فطرت ہے کہ عورت کا محافظ مرد ہے سرفراز تمہارے ساتھ رہے گا اور روبینہ راحیل کے ساتھ نگرانی کرے گی۔"

جمال صاحب نے صرف ہمارے استاد تھے بلکہ بہت قریب بھی تھے وہ ہمارے ذاتی رابطوں سے بھی بخوبی آگاہ تھے ہماری نسبتوں کی تقاریب کے سربراہ بھی وہی تھے۔ ان کی تجویز سن کر سرفراز نے تو کوئی تاثر نہ دیا تھا البتہ روبی کا گلابی رنگ کچھ اور بھی گہرا ہوا تھا اور راحیل اپنی انگوٹھی کو بے وجہ گھمانے لگا تھا۔

"ویسے میں تو سیدھا سا انسان ہوں۔" ہمیں خاموش پا کر جمال صاحب ہنس پڑے۔ "اگر کوئی اخلاقی مجبوری ہو تو......!"

"اوہ نہیں سر۔" روبی بول پڑی۔ "ہماری خاموشی تائید اور احترام کی علامت تھی۔"

دوسرے دن ہم الگ الگ حسن ابدال پہنچے میں اور سرفراز سیاحوں کے بھیس میں آثار قدیمہ دیکھتے رہے پھر مغرب کی نماز باغ میں ادا کر کے منزل کی جانب روانہ ہو گئے تھے روبی اور راحیل بھی قرب و جوار میں موجود تھے۔ شارٹ رینج ٹرانسمیٹر پر ہمارا رابطہ قائم تھا بشن داس کی کوٹھی واقعی اجاڑ اور الگ تھلگ تھی پروگرام کی حد تک تو بلاشبہ میں بڑھ چڑھ کر باتیں کرتی رہی تھی مگر سرفراز کی مضبوط بانہوں کی اوٹ میں ہونے کے باوجود میری دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئی تھیں تاریک سناٹے میں ڈوبی ہوئی عمارت مجھے ڈولتی اور متحرک دکھائی دے رہی تھی لکڑی کا گیٹ ٹوٹ کر دیوار کے ساتھ ترچھا پڑا ہوا تھا جب ہم گیٹ سے داخل ہوئے تو خودرو گھاس اور جھاڑیوں کی شاخیں ہماری ٹانگوں

سے ٹکرانے لگیں اور پاؤں تلے آنے والے خشک پتوں کی سسکیاں ماحول کو اور بھی دہشت ناک بنا رہی تھیں۔

ابھی ہم نے نصف فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ معاً ایک چمگادڑ چیختا ہوا سرفراز پر جھپٹا سرفراز نے پھرتی سے ایک طرف جھک کر مجھے اوٹ میں لے لیا تھا چمگادڑ قیں قیں کرتا ہوا فضا میں بلند ہوتا چلا گیا تھا۔

"گھبرانا نہیں عطو۔" سرفراز نے میرے شانے کو تھپک کر کہا۔

"علامہ اقبال نے ایسے وقت کے لیے ہم نوجوانوں کو خبردار کیا تھا یہ سب کچھ ہمیں اور اونچا اڑانے کے لیے ہو رہا ہے چمگادڑ اگر ہماری راہ روک سکتا تو راہ فرار اختیار کبھی نہ کرتا انسان کی قوت ارادی کا مقابلہ کوئی دوسری مخلوق نہیں کر سکتی۔"

"سرفراز۔" انتہائی ضبط اور کوشش کے باوجود میری آواز میں کپکپاہٹ نمایاں رہی تھی۔ "یہ چمگادڑ وہی روح ہے۔"

"فرض کیا وہی ہے۔" سرفراز نے جواب دیا۔ "تو پھر کیا ہے تو حقیر چمگادڑ ہی نا، ہاں اگر شیر بن کر آتی تو خطرہ ہو سکتا تھا۔"

شکستہ سیڑھیاں چڑھتے وقت میری آنکھیں ٹانگیں میرے جسم کا بوجھ سہارنے سے معذور ہو گئی تھیں غالباً سرفراز نے میری کیفیت بھانپ لی تھی اس نے مجھے نہایت ہی نرم گرفت میں لے رکھا تھا اوپر جا کر اس نے پنسل ٹارچ روشن کی اور روشنی کی پتلی سی لکیر اندھیرے کے سینے میں شگاف کرتی آگے بڑھنے لگی۔

"چوتھا دروازہ ہی تھا نا؟" سرفراز نے کرم خوردہ کواڑوں پر روشنی کی لکیر ڈالتے ہوئے کہا اور پھر میرا جواب سنے بغیر اس نے کواڑوں کو ہلکی سی ٹھوکر ماری کواڑ کسی بدروح کی طرح کراہتے ہوئے کھل گئے تھے سرفراز نے چہرہ اندر کر کے جھانکا اور پھر مجھے گھسیٹتا ہوا اندر داخل ہو گیا پھر اس نے بڑی ٹارچ روشن کی اور سڑاند زدہ کمرہ روشن ہو گیا کمرے میں ٹوٹے ہوئے فرنیچر کی لکڑیاں بکھری ہوئی تھیں، دیوار گیر الماریوں کے پٹ کھلے ہوئے تھے اور جنگلی چوہے چک چک کرتے روشنی سے گھبرا کر لکڑیوں سے سر ٹکرا رہے تھے میں نے بیگ سے موم بتی نکال کر جلائی کیونکہ سرفراز بار بار ٹارچ بجھا دیتا تھا اور اندھیرے میں میری سانس حلق میں پھنس جاتی تھی چوہوں کا ریوڑ بوکھلائے انداز میں پچھلے دروازے کی جانب دوڑنے لگا تھا اور سرفراز ٹارچ لیے ٹوٹے ہوئے فرنیچر کو الٹ پلٹ رہا تھا۔

"اگر تم اجازت دو تو دوسرے کمروں کو بھی دیکھ آؤ۔" اس نے الماری میں جھانکتے ہوئے کہا۔ عین اسی لمحے میرا کلائی واچ ٹرانسمیٹر بیدار ہو گیا میں نے چابی باہر نکالی اور جواب دیا۔

"یس پی ون ریسیونگ۔"

"میڈم۔ ایک سفید پوش سایہ کوٹھی کی طرف بڑھ رہا ہے۔" روبی نے بتایا اور میرے جسم سے سرد لہر سرسراتی ہوئی نکل گئی۔ "کیا ہم تعاقب کریں۔"

"میری کال کا انتظار کرو۔" میں نے جواب دیا اور پھر سرفراز کی طرف دیکھا جو میرے قریب آ گیا تھا۔

"بھوت...... بھوت آ رہا ہے۔" میں نے ہکلاتے ہوئے بتایا۔

سرفراز نے فوراً ہی اپنے واچ ٹرانسمیٹر پر راحیل کو کال کرنا شروع کر دیا "کوٹھی سے تمہارا فاصلہ کتنا ہے۔" سرفراز نے پوچھا۔

"تقریباً تین چار سو قدم۔" راحیل کی آواز آئی۔

"ٹرانسمیٹر آن رکھو اور اپنی جگہ کھڑے رہو خبردار کوئی حرکت نہ کرنا ہر آنے والی شے کو تم نہیں روکو گے ہاں کوٹھی سے جانے والے کو ضرور چھاپنے کی کوشش کرنا۔" میں نے سر کو تین چار جھٹکے دیے خوف کا بوجھ ناقابل برداشت ہی ہو گیا تھا۔ "کھیل شروع ہو چکا ہے عطورانی۔" سرفراز نے بڑی جان لیوا مسکراہٹ کے ساتھ جھک کر کہا۔

"تم صرف ریفری ہو، ہاں اگر میں ہار گیا تو میری جگہ تم کھیلو گی۔" اس نے ریوالور نکال کر میگزین چیک کیا اور پھر شکاری چاقو کھول کر پیٹی میں اڑس لیا میں دم سادھے اپنی جگہ پتھر کی سل بنی کھڑی سرفراز کو دیکھ رہی تھی جو ایسے درندے کی مانند لگ رہا تھا جسے شکار کی بو نے بے کل کر رکھا ہو معاً مغربی کھڑکی کا پٹ سسک کر چرمرایا اور موم بتی کی لو میرے دل کی طرح کپکپانے لگی سرفراز نے پھنکارتے انداز میں چہرہ گھما کر کھڑکی کو دیکھا اور پھر دیوار سے ٹیک لگا

کر کھڑا ہو گیا۔

"عطیہ کریم۔" سرفراز کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"ادھر میرے ساتھ آ کر کھڑی ہو جاؤ۔"

میں جو عام حالات میں سرفراز کو تگنی کا ناچ نچایا کرتی تھی اس وقت سہمی ہوئی بچی کی طرح سر جھکائے اس کا ہر حکم مان رہی تھی۔

"میں موم بتی بجھا رہا ہوں۔" جوں ہی سرفراز موم بتی پر جھکا میں نے گھٹی گھٹی چیخ سے اس کا شانہ نوچ لیا۔

"نہیں سرفراز اندھیرے میں میری حرکت قلب بند ہو جائے گی۔"

"مجرموں کی گردنیں توڑنے والی عطیہ کریم کہاں چھوڑ آئی ہو۔" سرفراز نے حیرت سے پوچھا۔

"میں مافوق الفطرت قوتوں سے نہیں لڑ سکتی سرفراز۔"

اسی لمحے عقبی کمرے کا بیرونی دروازہ چرچرایا اور پھر میری حساس سماعت میں پاؤں کی مدھم مدھم چاپ گرم پانی کی بوندوں کی طرح ٹپکنے لگی۔

"کھی کھی کھی ..... پچاک پچاک ..... قیں قیں ......!" دہشت ناک آوازوں کا سیلاب امڈتا ہوا اندر آنے لگا تو سرفراز نے میرے شانے پر نرم تھپکیاں دے کر ریوالور نکال لیا قدموں کی چاپ بتدریج قریب سنائی دے رہی تھی۔

اور پھر میری پتھرائی ہوئی آنکھوں نے دیکھا ایک طویل قامت سفید پوش جسم ہمارے سامنے کھڑا تھا وہ عربی برقعے میں لپٹا ہوا تھا چند ثانیے مجھ پر قیامت بن کر بیتے تھے۔

"لڑکی میرے حوالے کر دو۔" سفید پوش کے حلق سے کھر کھراتی سرگوشی نکلی۔

"اے مہربان روح۔" سرفراز نے ادب سے جھک کر کہا "ہم ظالم سماج کی نگاہوں سے چھپ کر تمہاری پناہ میں دل کی دنیا آباد کرنے آئے ہیں ہم پر رحم کرو۔"

"او بدکار۔" غراہٹ ابھری۔ "میرے آستانے کو گناہ آلودہ نہ کر ..... بھاگ ..... جا۔"

"مجھے ..... مجھے معاف کر دو۔" سرفراز گڑگڑانے لگا۔

"مم ..... میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں۔" وہ جھکا اور دوسرے لمحے اس نے کسی ماہر غوطہ خور کی طرح غوطہ لگایا اور سفید پوش ڈکراتا ہوا الٹ گیا اور ساتھ ہی دھماکا ہوگا۔

سرفراز بری طرح برقعے میں الجھ گیا تھا اور تابڑ توڑ گھونسے مارتا ہوا اس کے سینے پر چڑھ گیا تھا ایک منٹ سے بھی کم وقت میں سفید پوش نے ہاتھ پاؤں ڈال دیے تھے اور سرفراز نے برقعہ ایسے ہی اتارا تھا جیسے کیلے کی چھلکی سے چھلکا الگ کر رہا ہو۔

"عطیہ۔" سرفراز نے برقعہ ایک طرف اچھالتے ہوئے کہا۔

"بھوت آپ کے ملاحظے کا منتظر ہے۔"

میں نے سر کو جھٹک کر طویل سانس لی اور تین قدم بڑھائے میرے سامنے بڑی بڑی مونچھوں والا سیاہ چہرہ تھا اور اس کی آنکھوں میں حیرت منجمد تھی۔

"ہیلو پی ون، ہیلو پی ون...... پی ٹو کالنگ یو اوور۔"

میرے ٹرانسمیٹر سے روبی کی آواز ابھری۔ "ہم نے گولی چلنے کی آواز سنی ہے اندر کی پوزیشن سے آگاہ کرو اوور۔"

"وہ نقلی بھوت پر قبضہ کر لیا گیا ہے وہ کوئی مرد ہے اوور۔" میں نے جواب دیا۔

سرفراز نے ہاتھ بڑھا کر اس کی مونچھ کے چند بال نوچ لیے اور وہ تڑپ کر اوندھا ہو گیا تھا۔

"اے بھائی صاحب اب ہوش میں آیئے۔" سرفراز نے اس کے پہلو میں انگلی مارتے ہوئے کہا "ہم لوگ اختلاج قلب میں مبتلا ہو رہے ہیں۔"

اس نے کروٹ لے کر آنکھیں کھول دیں اور سرفراز کو گھورتے ہوئے بولا۔

"میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا مجھے جانے دو۔"

"نہیں بھائی صبح اکٹھے چلیں گے۔" سرفراز نے کہا "ویسے بھی ہمیں ایک نگران کی ضرورت تھی۔"

"تم کون ہو؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور سر کے عقبی حصے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"ہاں اب تعارف ہو جانا چاہیے۔" سرفراز نے اٹھ کر فاصلہ بڑھایا اور پیٹی سے کھلا چاقو نکال لیا۔ "ادھر میری طرف دیکھو۔" سرفراز یکدم دوسری جون میں بدل آ گیا تھا میں نے اس آواز میں وہی سفاکی اور کرختگی محسوس کی تھی جو مجرموں کی ہڈیوں کو چٹخایا کرتی ہے۔

"غور سے سنو میں ہر سوال کے بعد چند سیکنڈ انتظار کروں گا اور دائیں کان سے کارروائی شروع کروں گا۔ اگر آزمانا چاہتے ہو تو سوال سے قبل میرے چاقو کی دھار دیکھ لو۔"

"ٹھہرو۔" جوں ہی سرفراز جھکا اس نے ہاتھ اٹھا دیا۔

"میں چور ہوں نہ ڈاکو بلکہ شام کو تمہیں کوٹھی میں داخل ہوتے دیکھ کر میرے اندر شیطان جاگ اٹھا تھا میں اس کوٹھی کی روایت سے فائدہ اٹھا کر تم سے لڑکی حاصل کرنا چاہتا تھا میرا خیال تھا تم کسی آوارہ لڑکی کو عیاشی کے لیے اس ویران جگہ لائے ہو۔"

"نہیں بھائی۔" سرفراز نے نفی میں گردن ہلائی۔

"تمہارا چہرہ تمہاری زبان کا ساتھ نہیں دے رہا بہتر ہے کھل جاؤ تم اگر مقامی ہو تو اچھی طرح جانتے ہو گے کہ اس کمرے میں قتل بھی ہو چکا ہے اور لوگ کہتے ہیں کسی بھوت نے قتل کیا تھا میں تمہیں پولیس کے حوالے کروں گا کیونکہ وہ فرضی بھوت تم ہی ہو جس نے لوگوں کو ادھر آنے سے خوفزدہ کر رکھا ہے اگر اپنی اصلیت بتا دو تو ہم اپنی اپنی راہ لگ جائیں گے۔"

"یقین کرو میں وہ بھوت نہیں ہوں۔" وہ زور دے کر بولا۔

"جب قتل ہوا تھا تو میری عمر دس بارہ برس رہی ہو گی۔"

"لیکن تم پہلے بھی یہاں اس برقعے میں دیکھے جاتے رہے ہو۔" سرفراز نے کہا۔ "خانہ بدوشوں کے پیچھے بھی تم ہی دور تک گئے تھے آخر کیوں تم اسی رات برقعہ اوڑھ کر حاضر ہو جاتے ہو جس رات کوئی مسافر یہاں قیام کرتا ہے۔"

اس نے دانت نچلے ہونٹ پر جمائے اور پھر تھوک نگل کر محتاط نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھنے لگا سرفراز نے چہرہ گھما کر جن نگاہوں سے میری جانب دیکھا تھا کئی بار پہلے بھی زبان کھلوانے کے دوران ایسی ہی نگاہوں سے دیکھ چکا تھا میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور سرفراز ایک قدم پیچھے ہٹ گیا بھوت کے خوف نے مجھے نڈھال کر دیا تھا ورنہ تشدد کی دنیا میں میرا نام مجرموں نے سفید ناگن رکھا ہوا تھا مجرم کو سامنے پا کر بلاشبہ میں زہریلی ناگن سے کم خطرناک نہیں ہوتی۔

غزل

میں ہوں آئینہ ذرا اور جلا دو مجھ کو
روشن جلوہ آفاق بنا دو مجھ کو
بے صدا الفاظ ہوں ڈر ہے نہ کہیں کھل جاؤں
ہے ابھی وقت کتابوں میں چھپا دو مجھ کو
ہاں مرے بعد نئی کونپلیں آ جائیں گی
خشک پتی ہوں تو ٹہنی سے گرا دو مجھ کو
خط تقدیر ہوں میں نقش ہر دیوار نہیں
تم ممکن ہی نہیں ہے کہ مٹا دو مجھ کو
میں نے کب چاہا مرے خواب کی تعبیر ملے
کب کہا میں نے وفاؤں کا صلہ دو مجھ کو
جس میں خود اپنی بھی تصویر دکھائی دے صدف
شیشہ گر ہو تو وہ آئینہ بنا دو مجھ کو

نسیم سکینہ صدف

"اب تم زبان بند رکھو گے اور میں سوال کروں گی۔"

میں نے ہاتھ اس کی مونچھ پر ایسے ہی مارا جیسے ناگن اپنے شکار پر پھن مارتی ہے اس کے حلق سے دھاڑ نما چیخ بڑی گونج دار اور کرب ناک نکلی اور ادھڑی ہوئی ایک مونچھ کا گچھا ایک طرف اچھالتے ہوئے سوال کیا۔

اچانک وہ اپنی جگہ سے اوپر اٹھا مگر میں اب کسی بھوت سے ہم کلام نہ تھی میرے سامنے ایک مشتبہ شخص تھا لہٰذا میں پوری طرح چوکس اور بیدار تھی میری لات گھوم گئی اور وہ ڈکراتا ہوا پہلو کے بل گر گیا تھا۔ "تمہارے چہرے کا توازن مونچھ کی وجہ سے بگڑ گیا ہے۔" میں نے جھپٹ کر اس کے بال جکڑے اور دوسری مونچھ بھی ادھیڑ لی اس بار وہ کسی بچے کی مانند رو پڑا تھا۔

"بس...... بس...... مم...... میں بتاتا ہوں۔" بالائی ہونٹ کا خون تھوک کر وہ بلبلانے لگا۔

"پھر شروع ہو جاؤ۔" میں نے مسکرا کر سرفراز کی جانب دیکھا جو لاتعلق سا کھڑا تھا۔

"میں اسٹاک کا نگران ہوں۔"
"کیسا اسٹاک۔"
"وہ...... مجھے ایک ہزار ماہوار دیتے ہیں میری ڈیوٹی یہی ہے کہ بھوت بن کر دوسری تیسری رات کوٹھی کے ارد گرد گھوم جایا کروں، دن کے وقت میں باغ میں کام کرتا ہوں، آج بھی باغ سے ہی تم لوگوں کے تعاقب میں ادھر آیا تھا۔"
"چلو اسٹاک دکھاؤ۔" میں نے اس کی پھیلی ہوئی ٹانگوں پر پاؤں زور سے مارا۔ "ورنہ میں تمہارے بیان پر یقین نہیں کروں گی۔"
"اگر میں نے اسٹاک دکھایا تو وہ مجھے قتل کر دیں گے۔" اس نے آستین سے خون صاف کرتے ہوئے کہا۔
"اس سے بہتر ہے کہ تم ہی مجھے ہلاک کر دو مرنا ہی ہے تو غداری کی موت کیوں مرا جائے۔"
"میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ زبان بند رکھنا اور میں سوال کروں گی۔" دو قدم ہٹ کر میں نے زاویہ بدلا اور جب گھوم کر اس کے قریب جا کر اوپر اٹھی تو اس کا دایاں کان میری چٹکی میں تھا اور وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر گندی گالیاں بک رہا تھا۔
"زور زور سے بھونکو۔" میں نے کہا۔ "تمہاری زبان بالکل آخر میں گدی سے کھینچی جائے گی۔"
"ن...... نہیں...... تم اور ظلم نہیں کرو گی۔" وہ ہاتھ اٹھا کر چیخا۔
"مجھے کون روکے گا۔"
"آؤ۔" وہ کراہتا ہوا اٹھنے لگا۔ "ایک ایک وعدہ کرو مجھے یہاں سے فرار ہونے کا موقع دو گی، ورنہ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"
"تم اپنی زندگی بچا سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "اسٹاک کے ساتھ اگر تم اسٹاک کے مالکان تک ہماری رہنمائی کرو گے تو قانون تمہیں معاف کر دے گا اور قتل کرنے والے قانون کی گرفت میں چلے جائیں گے۔"
"لیکن سب نہیں صرف ایک کو میں جانتا ہوں وہ یہاں کا مقامی ایجنٹ ہے" سارا مال آگے وہی لے جاتا ہے۔"
"ٹھیک ہے، ہم ایک ہی کے ذریعے دوسروں تک خود چلے جائیں گے۔"

ٹارچ کی روشنی میں وہ آگے آگے چل رہا تھا سرفراز نے ریوالور کی جھلک دکھا کر اسے باخبر کر دیا تھا اس لیے فرار کی کوشش کا خطرہ نہ تھا وہ چوکور کمرہ غالباً بشن داس بطور گودام استعمال کرتا رہا ہوگا آہنی دروازے اور روشن دانوں میں مضبوط سلاخیں لگی ہوئی تھیں اندر داخل ہوتے ہی مانوس سی بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی تھی دیواروں کے ساتھ پلاسٹک کے بڑے بڑے ڈبے ایسے ہی قطار در قطار اوپر تک رکھے ہوئے تھے جیسے ہول سیل ڈرگ ایجنسی کا اسٹور ہو۔
"ادھر چرس ہے۔" اس نے اشارہ کیا "اور وہ افیم کے پیکٹ ہیں۔" میرے اندازے کے مطابق کروڑوں کا مال تھا۔
"مال لایا کیسے جاتا ہے۔" سرفراز نے پوچھا۔
"تین آدمی ہر ہفتے پیدل مال لاتے ہیں۔" اس نے بتایا۔
"پھر یہاں سے آگے تقسیم کیا جاتا ہے۔"
"اور تمہیں صرف ایک ہزار دے کر ٹرخا دیا جاتا ہے۔" سرفراز نے نرم لہجے میں کہا۔
"میں صرف نگرانی کا معاوضہ لیتا ہوں۔" اس نے بتایا۔ "شروع شروع میں مال لے جایا کرتا تھا لیکن اس کام میں ہر وقت جان سولی پر چڑھی رہتی ہے۔"
"واپس چلو۔" میں نے رکا ہوا سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ "بدبو سے میرا دم گھٹ رہا ہے۔"
باہر آ کر سرفراز نے بیگ اٹھایا اور ہم اسے لے کر کوٹھی سے چل پڑے تھے روبی اور راحیل کو بھی کال کر کے گیٹ پر بلا لیا تھا پھر وہاں سے ہم پانچوں کھیتوں میں پیدل چلتے اپنی اپنی گاڑی تک گئے تھے ماروں گھٹنا اور پھوٹے آنکھ کے مصداق شریف خاندان اپنی ہوس ناکی کے ہاتھوں اپنی مونچھوں اور ایک کان سے محروم ہو گیا تھا اور حسن گل سلاخوں کے پیچھے چلا گیا تھا البتہ میری ایجنسی کی خاصی پبلسٹی ہو گئی تھی لیکن ہم پھر نقطہ آغاز پر ہی لڑھک آئے تھے غالباً دوسری یا تیسری شام لان میں اماں بی، سرفراز اور میں بیٹھے، بین الاقوامی سیاست پر باتیں کر رہے تھے اور سرفراز بار بار سیڑھیوں کی جانب ہی دیکھ رہا تھا اسے چائے کا انتظار تھا کیونکہ اسے پولیس ہیڈ کوارٹر میٹنگ میں جانا تھا

ملازمہ نے ٹرالی گھما کر برآمدے کے کونے سے اتاری اور ہمارے قریب آکر اس نے پلیٹ اٹھا کر میرے سامنے کرتے ہوئے بتایا۔ ''بی بی یہ لفافہ بلی کے گلے میں لٹک رہا تھا۔''

مجھ سے پہلے سرفراز نے جھپٹ کر پلیٹ سے بھورے رنگ کا لفافہ اٹھالیا ہونٹ بھینچ کر اندر سے ایک سلپ نکالی اور پڑھنے لگا۔

''بلی کا رنگ؟'' میں نے گہری نظروں سے گھور کر دیکھا۔ ملازمہ ہمارے لیے پیالیوں میں قہوہ انڈیل رہی تھی۔

''سفید تھی بیٹے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کسی بچے نے شرارت کی ہوگی۔''

سرفراز نے طویل سانس لے کر سلپ میری جانب بڑھادی اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کسی بچے نے اپنے ساتھی کو گلی ڈنڈا کھیلنے کی دعوت دی ہے۔''

میرے سامنے وہی کاغذ اور بالکل وہی خوب صورت تحریر تھی جو پہلے مجھے مل چکی تھی۔

''پشت پر لکھے پانچوں اشخاص کو میری کوٹھی کے اسی کمرے میں بروز جمعرات رات آٹھ بجے مدعو کرو میں اپنے قاتل کو پکڑلوں گا۔''

پشت پر وہی نام تھے جو اس رات کوٹھی میں موجود تھے، صرف مہدی علی خان کے ملازم کا اضافہ کیا گیا تھا میں نے سلپ نیچے گرادی کیونکہ اماں بی استفہامیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

چائے پیتے پیتے سرفراز نے غیر محسوس انداز میں سلپ پاؤں سے کھسکا کر اٹھالی تھی میرا ذہن پھر بری طرح الجھ گیا تھا مہدی علی خان کا بھوت میرے حواس پر چھانے لگا تھا۔ سرفراز میری بدلتی کیفیت کو بغور نوٹ کررہا تھا مگر اماں بی کی وجہ سے ہم دونوں مجبور تھے۔

اچانک میں نے سرفراز کو چونکتے دیکھا اس کی نگاہوں کے تعاقب میں جب میں نے چہرہ پھیر کر دیکھا تو میرا ہاتھ اتنا لرزا تھا کہ پیالی سے چائے چھلک گئی تھی۔ وہی سفید بلی سیڑھیوں پر کنڈلی مارے بیٹھی ہوئی تھی، سرفراز نے کھٹ سے ٹرے میں پیالی رکھی اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''آہ...... خوب صورت بلی۔'' وہ چہکارا۔ ''خالہ اس بلی کو کچھ کھانے کو دو تا کہ مانوس ہو جائے۔''

''کوئی ضرورت نہیں۔'' اماں بی بول پڑیں۔ ''کتے بلے نجس ہوتے ہیں انہیں بھگادو۔''

''اور کیا بی بی جی۔'' مائی جیواں برتن سنبھالتے ہوئے بولی۔

''اس گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں اترتے۔''

سرفراز کے ساتھ میں بھی اٹھ کر چل پڑی تھی ابھی ہم نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ بلی نے اٹھ کر انگڑائی لی اور پھر ہماری طرف دیکھنے لگی۔ ''میں آج بلی کا لیبارٹری ٹیسٹ لوں گا۔'' سرفراز نے کہا۔

''تمہارے طوطے والا پنجرہ کہاں ہے۔''

''اسٹور روم میں۔''

''ٹھیک ہے میری واپسی تک بلی پنجرے میں بند رہے گی۔'' اس نے نزدیک جا کر بلی کو پچکارا۔

''میں آؤں۔'' بلی نے دانت نکوس کر جواب دیا اور بھاگ کر گیلری میں دوڑتی چلی گئی۔ سرفراز بھی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا دوڑا تھا مگر اوپر جا کر یکایک رک گیا۔ ''بھاگ گئی۔'' اس نے بتایا۔

''کیا اب بھی نہیں مانو گے سرفراز۔''

''یہ سائنس کی صدی ہے عطیہ خانم۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''فضول خیالات تمہاری کارکردگی متاثر کرسکتے ہیں، واپس آکر ہم نئی ہدایت کے لیے لائحہ عمل مرتب کریں گے۔''

میں ستون کا سہارا لیے چپ چاپ کھڑی رہی اور سرفراز دھم دھم کرتا واپس سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ تب میں نے اپنی موجودہ بے بسی پر سوچا۔ مہدی علی خان نے میری ذات کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیے تھے، وہی سرفراز جو میرے سامنے بھیگی بلی بنا رہتا تھا اس کیس میں مجھے روندتا پھر رہا تھا یہ کیس میری ذات کے لیے چیلنج بن گیا۔

رات دس بجے سرفراز نے انٹرکام پر مجھ سے ملاقات کی اجازت طلب کی میں تو دھڑکن دھڑکن اسی کا انتظار کر رہی تھی کیونکہ بلی مسلسل میرے تعاقب میں تھی اور میرے حوصلے پھر میرا ساتھ چھوڑ رہے تھے اتنی بے بس اور نروس تو میں ان دنوں بھی نہ ہوئی تھی۔ جب لندن میں ایک سیاہ فام مذہبی تنظیم غلط فہمی کا شکار ہو کر میری جان کی دشمن بن گئی

تھی ہر لمحے سیاہ چہرے میرے تعاقب میں رہا کرتے تھے۔ سرفراز براؤن کلر شلوار کرتے میں ملبوس جب لیبارٹری میں داخل ہوا تو اس کا قد اور مردانہ رعب مجھے پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت لگا تھا شاید اس پر میں نے ہمیشہ عطیہ کریم کی نظر ہی ڈالی تھی۔ اس احساس برتری کے پس منظر میں میرے ڈیڈی کی قدآور شخصیت اور سرفراز کے ڈیڈی کی مسخ شدہ ذات کارفرما رہی ہوگی، میرے ڈیڈی نے اپنے خاندان کے وقار کو نہ صرف سنبھالا تھا بلکہ چار چاند بھی لگائے تھے جبکہ سرفراز کے والد مرحوم نے اپنے حصے کی ساری جائیداد شراب کباب اور شباب کی آگ میں جلا کر اپنے بیٹے سرفراز کو مرتے وقت ہمارے صحن میں پھینک دیا تھا۔

سرفراز کے اندر جو احساس کمتری اور ندامت تھا اس کے پیچھے بھی یہی احساس تھا وہ جانتا تھا کہ اگر اماں بی اس کے لیے ممتا کے جذبات وقف نہ کرتیں تو آج وہ دوسری سوسائٹی کا روندا ہوا ہوتا۔ "سرفراز" میں نے خلاف عادت نرم اور اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

"اگر یہ الجھن جلدی ختم نہ ہوئی تو میں نفسیاتی مریضہ بن جاؤں گی۔"

"کیوں جان۔" سرفراز بغیر کسی ہچکچاہٹ میری کرسی کے قریب بیٹھ گیا اور میرے بالوں کو انگلیوں سے سلجھانے لگا کیف و سرور کی انجانی سی سرسراہٹیں میرے اچھوتے سراپا پر رینگ اٹھی تھیں اس لمس کا ذائقہ میرے لیے ایک انوکھا تجربہ ہی تھا میں بالکل محبوبہ کی طرح اندر ہی اندر سرشار ہوتی رہی، اگر پندرہ روز قبل یہ جرات کرتا تو اگلے دانت اس کے حلق میں اتر چکے ہوتے۔ "میں دوسری قسم کا انسان ہوں۔" اس کی آواز کا رس میرے کانوں میں ٹپکا۔

"کھردری اور سرد موسموں والی عطیہ کریم بے حد اچھی لگتی ہے ڈری کبوتری کو تو کوئی بھی چور بلا دبوچ سکتا ہے اٹھو ہمیں آخری معرکے کی تیاری کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔" اس نے اٹھ کر میرے بالوں کو تھپ تھپایا اور دوسری کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ میں روبینہ کو اختیارات سونپ آیا ہوں وہ آخری راؤنڈ کے سارے انتظامات کرلے گی۔" میں چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی جو فی الحال میرا پارٹنر تھا اور مستقبل قریب میں شریک حیات بننے والا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ اتنا اسمارٹ اور وجیہہ شخص گزشتہ تیس برس سے میرے قریب تھا اور میں نے اسے اس نگاہ سے کبھی نہ دیکھا

"ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ مطلوبہ اشخاص کو بہ رضا و رغبت کوٹھی تک کیسے لے جائیں۔" اس نے کاغذ پھیلاتے ہوئے کہا۔ "ویسے بڑا ہی سنسنی خیز ڈرامہ ہوگا۔"

"ایک نکتے پر تم نے غور نہیں کیا سرفراز۔" میں نے چہرہ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر رکھ کر کہا۔ "جمعرات چھ جنوری کو پڑتی ہے اور اسی تاریخ کو مہدی علی خان کی موت واقع ہوئی تھی۔"

"اوہ۔" سرفراز اچھل پڑا۔ "ابھی میری عطیہ کریم زندہ ہے بہت خوب تم نے اس نکتے کی جانب توجہ مبذول کرا کر ایک قابل عمل اور شاندار منصوبے کی راہ کھول دی ہے مہدی علی خان مرحوم کی بیوہ ریحانہ بیگم اپنے پیارے شوہر کی برسی منائے گی اور برسی پر ان تمام دوستوں کو شریک دعا ہونے کی استدعا کرے گی جو مہدی علی خان کی زندگی میں بہت قریب تھے۔"

"اچھی تجویز ہے۔" میں نے پرستائش آواز میں کہا۔

"مگر رابطے کا طریقہ؟"

"ریحانہ بیگم پہلے برسی کا اعلان بذریعہ اخبارات کرے گی اور پھر فرداً فرداً مخصوص لوگوں کو دعوتی کارڈ بھجوا دے گی۔"

"اگر ان ہی لوگوں میں سے کوئی قاتل ہوا تو وہ بدک نہ جائے گا۔"

"عطو، مہدی علی خان کی روح چاہتی بھی تو یہی ہے نا۔" سرفراز نے کہا "جو نہیں آئے گا ہم اسے چیک کرلیں گے۔"

"ٹھیک ہے کل تمام اخبارات میں اشتہار دلوا دو۔" میں نے منصوبے کی منظوری دیتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن تمام اخبارات میں ریحانہ بیگم بیوہ چوہدری مہدی علی خان مرحوم کی جانب سے اشتہار شائع ہوا تھا جس میں ریحانہ بیگم نے صرف مرحوم کے احباب سے شرکت کی درخواست کی تھی اور اسی شام نہایت سادہ سیاہ حاشیے والے کارڈ بھی راحیل پریس سے لے آیا تھا مرحوم کے مطلوبہ دوستوں کو بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ کارڈ روانہ کرنے کے بعد میں خود کو ایسا احمق شکاری سمجھنے لگی تھی

جو خشک نالے میں کانٹا پھینک رہا ہو لیکن سرفراز پر امید تھا اسے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ ریت سے ابھر کر مچھلی کانٹا ضرور نگل لے گی۔

''میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔'' اس نے میز پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔ ''ان پانچ ناموں میں سے کم از کم ایک مطلوبہ شخص ہے یہ بھی ہوسکتا ہے ہمارا موکل اور قاتل دونوں ہی ان میں شامل ہوں۔

''میرا خوبرو جاسوس شاید نہیں جانتا۔'' میں نے ٹھہری ٹھہری آواز میں کہا۔ ''میں نے اپنے گھر کے گرد نگراں مقرر کر رکھے ہیں اگر تمہارا قیاس درست تسلیم کرلیا جائے تو کسی کو تحریری پیغام پہنچانے کے لیے اندر آنا پڑتا جبکہ نگرانی کرنے والوں کی رپورٹ نفی میں ہے وہ شخص یا قوت تم کس خانے میں فٹ کرو گے گی جو مجھ تک پیغام پہنچاتی رہی ہے۔''

''اب تم کہو گی کہ مہدی علی خان کی روح بلی کے روپ میں پیغام رسانی کررہی ہے۔''

''میری بات چھوڑو۔'' میں نے زوردار لہجے میں کہا۔

''تم اس ذریعے کے بارے میں جواب دو۔''

''یار۔'' سرفراز سر کھجانے لگا۔ ''سچ پوچھو تو میرا اپنا ذہن بھی اس طرف سے کلیئر نہیں ہے سنو جس دن پیغام دیا گیا ہے اس دن تمہاری مائی جیواں باہر تو نہیں گئی۔''

''یقیناً نہیں گئی۔'' میں نے جواب دیا ''میں اسے چیک کرچکی ہوں بلکہ وہ تو گزشتہ ماہ سے باہر نہیں نکلی۔''

''روح لکھ نہیں سکتی عطیہ خانم۔'' سرفراز نے دلیل پیش کی۔

''پھر ہم مسلمان ہیں ہمارا عقیدہ ہے کہ روح قفس عنصری سے نکل کر اپنے مقام پر چلی جاتی ہے جس طرح قیدی رہائی کے بعد اپنے گھر جاتا ہے۔''

''بدروحیں بھی تو ہوتی ہے۔''

''کہاں ہوتی ہیں۔''

''ویرانوں میں اور پرانے مرگھٹوں کے اردگرد منڈلاتی پھرتی کئی لوگوں نے دیکھی ہیں۔''

''جھوٹ۔'' سرفراز چیخ پڑا۔ ''سب لغویات ہے کوئی کچھ نہیں ہوگا، لوگوں کو تو اپنے اندر کے بھوت ڈراتے رہتے ہیں بھوت چڑیل صرف وہم کے نام ہیں۔''

غزل

بھولی بسری یاد منانے آؤ تم
آنکھوں میں پھر خواب جگانے آؤ تم

ساحل ساحل ڈوب رہی ہوں مدت سے
موجوں کو پتوار بنانے آؤ تم

طوفانوں میں جاں کو خطرہ رہتا ہے
ناؤں میری پار لگانے آؤ تم

تیرہ شب کا راج ہے میری راہوں میں
الفت کا ایک دیپ جلانے آؤ تم

کہتی ہیں مخمور صدائیں گلشن کی
دھڑکن دھڑکن گیت سنانے آؤ تم

کہتی ہے صدف بڑی ہی چاہت سے
چاہت کا کردار نبھانے آؤ تم

نسیم سکینہ صدف

☆☆

محبت اور ہی شئے

بھلادو خواب کے قصے
حقیقت اور ہی شئے ہے
ایسے جینا نہیں آسان
محبت اور ہی شئے ہے
یہ سانسوں کا تسلسل ہے
اسے آنے دو جانے دو
اگر تم روک لیتے ہو
تو دم گھٹنے کا اندیشہ
اگر تم چھوڑ دیتے ہو
تو غم بڑھنے کا اندیشہ
سو اس پہلے قدم سے
لوٹنے کا عہد کرلو

نسیم سکینہ صدف

"یوں چیخ چیخ کر بولنے سے حقیقت پر تم گرد تو ڈال سکتے ہو مگر چھپا نہیں سکتے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "پیغام رسانی کا ذریعہ بتاؤ یا روح کو مان لو۔"

"جمعرات آٹھ بجے، وقت خود جو سچ ہے منوالے گا۔" اس نے بحث ختم کرتے ہوئے کہا۔

"اٹھو اماں کھانے کے کمرے میں ہماری منتظر ہوں گی، اگر لیٹ ہو گئے تو طویل لیکچر سننا پڑے گا۔"

میں نے برقی گھنٹی کا بٹن پش کیا اور چوکیدار آ گیا۔

"منشی خان۔" سرفراز نے اس کے کندھے پر دھپ سے ہاتھ مارا۔

"تمہارے نشے کا کیا حال ہے۔"

"اب بہت آرام ہے صاحب جی۔" منشی خان نے ممنون نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بھلا ہو بی بی جی کا سگریٹ چھڑا کر مجھ پر بڑا کرم کیا ہے تنگ دستی کا بھی کچھ فائدہ ہوا ہے اور رات بھر آرام سے سوتا ہوں ورنہ کھانسی سونے ہی نہیں دیا کرتی تھی۔"

"دیکھو منشی خان۔" میں نے اٹھتے ہوئے

"آج سے اندر کی تمام بتیاں بند رہا کریں گی صرف برآمدے کا بلب روشن رہے گا۔"

"کیا بل جاستی آ گیا ہے جی۔" منشی خان نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"بل جاستی نہیں آیا بلکہ غیر ضروری بجلی ان دنوں استعمال نہیں کی جانی چاہیے۔"

"اچھا جی بجھا دیا کروں گا۔" منشی خان نے ہماری موجودگی میں ہی سوئچ آف کرنے شروع کر دیے۔

"چلو جلدی کرو۔" سرفراز نے کہا۔ "ہمارا بھائی بلیک آؤٹ کر رہا ہے۔"

جمعرات والے روز روبی، راحیل اور ایک خاتون آمنہ خاتون بارہ بجے ہی بشن داس کی کوٹھی میں چلے گئے تھے روبی اپنے ساتھ اپنا باورچی اور کھانے پکانے کا سامان لے گئی تھی چونکہ انتظامیہ پارٹی کی وہی سربراہ تھی اس لیے مجھے آخر وقت تک معلوم نہ ہوا کہ اس نے اسٹیج کس طرح تیار کیا تھا میں اور سرفراز مہمان جوڑے کی حیثیت سے جب گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو آمنہ خاتون نے سیڑھیوں پر ہمارا استقبال کیا تھا باورچی قسم کے دو مرد آگ تاپ رہے تھے برآمدے میں پیٹرومکس روشن تھا۔

"روبی کہاں ہے۔" میں نے آمنہ سے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"دعا کے لیے دسترخوان چن رہی ہے۔"

"کیا وہ پانچوں موجود ہیں۔" سرفراز نے پوچھا حالانکہ راحیل ٹرانسمیٹر پر اوکے کی رپورٹ دے چکا تھا۔

"ہاں اندر سات مرد بیٹھے ہوئے ہیں ان میں سے ایک مولوی بھی ہے۔" آمنہ خاتون کی رہنمائی میں ہم دونوں اندر داخل ہوئے پیٹرومکس کی روشنی میں وہ لوگ چٹائی پر دائرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ "ریحانہ آپا نے معذرت کے ساتھ بہو اور بیٹے کو بھیج دیا ہے۔"

سرفراز نے سلام کیا اور میں جھک کر آداب بجالایا۔

"امی جان کو ڈاکٹر نے اجازت نہیں دی۔" میں نے نگاہیں جھکا کر بتایا۔ "انہوں نے آپ لوگوں کا شکریہ ادا کیا ہے۔"

منصب دار بڑے غور سے میری جانب دیکھ رہا تھا لیکن میرے چہرے پر نئی نویلی دلہن کی سرخی بکھری ہوئی تھی میرا میک اپ سرفراز کے ماہر ہاتھوں نے کیا تھا لہٰذا پہچان لیے جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا مہدی علی خان کے دوستوں سے ہم پہلے مل چکے تھے اس لیے دونوں کا میک اپ ضروری تھا۔ "ٹھیک ہے بچو۔" منصب دار نے زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ برسی ہمارے دوست کی روح کو سکون پہنچانے کے لیے ضروری تھی۔"

منصب دار کی ذو معانی بات اور مسکراہٹ پر میں چونک اٹھی تھی وہ یقیناً کچھ نہ کچھ سمجھ رہا تھا لیکن اب ہمیں کسی کے بدکنے کی کوئی پروا نہ تھی ہم نے مہدی علی خان کی ہدایت پر سب کو جمع کر دیا تھا ہمیں اتنا ہی کہا گیا تھا آگے کی کارروائی ہمارے پروگرام میں شامل نہ تھی۔

دعا کے بعد جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہوئے تو قہوہ تقسیم کیا گیا ابھی قہوہ کسی نے بھی ختم نہ کیا تھا کہ عقبی کھڑکی دھڑ سے کھلی سب نے بیک وقت چونک کر ادھر دیکھا تھا معاً ایک سفید کبوتر پھڑپھڑاتا ہوا ہمارے درمیان گرا اور پھر ہمارے سروں کے اوپر سے اڑتا ہوا کھلے دروازے سے باہر نکل گیا، سب ہی پتھر کی طرح اپنی اپنی جگہ بے حس و حرکت ہو گئے تھے جس کی پیالی جس حالت میں

تھی وہاں ہی جم سی گئی تھی ابھی سکتہ ٹوٹنے بھی نہ پایا تھا کہ عقبی کمرے سے ایسی آواز آنے لگی جیسے زنجیریں آپس میں ٹکرا رہی ہوں سب کی ساکت پتلیاں تھرک اٹھیں اور جیسے برقی رو کا منقطع سلسلہ بحال ہو گیا اور ٹھہری ہوئی گردنیں متحرک ہو گئی تھیں۔

''یہ کیسا مذاق ہو رہا ہے؟'' جمال دین ناگوار آواز میں بولا۔

''مجھے پہلے ہی شک تھا کوئی گڑبڑ ہے۔''

''سلطان۔'' آمنہ خاتون نے چیخ کر آواز دی۔

''دیکھو یہ کون شرارت کر رہا ہے۔''

ابھی کسی نے آمنہ خاتون کے حکم کی تعمیل نہ کی تھی کہ کونے میں پڑی پرانی کرسی ہلنے لگی۔

''وہ...... وہ...... ادھر۔'' میرے منہ سے بچ بچ گھٹی گھٹی چیخ ابھری تھی۔

مولوی صاحب نے بہ آواز بلند سورۃ یاسین کی تلاوت شروع کر دی تھی وہ کہنیوں کے بل جھکے ہلکورے لے لے کر پڑھنے لگے تھے۔ کرسی فرش پر متحرک تھی ثانیہ بھر رکتی پھر چل پڑتی تھی چند قدم دوڑا کر کرسی کو چلتے چلتے جیسے ٹھوکر لگی تھی لڑکھڑائی اور پھر رخ بدل کر رک گئی۔

''السلام علیکم۔'' کرسی کی سیٹ سے بھرائی ہوئی مردانہ آواز ابھری۔

''وعلیکم اسلام۔'' یہ مولوی صاحب کی آواز تھی باقی لوگ میرے سمیت خوف و دہشت میں ڈوبے ہوئے تھے۔

''میں مہدی علی خان ہوں۔'' کرسی بولنے لگی۔

''طویل مدت بعد میرے دوست پھر یہاں آئے ہیں۔ میں اپنے دوستوں کو خوش آمدید کہتا ہوں اور اپنے قاتل سے انتقام لے رہا ہوں، ایک ایک کر کے میرے دوست میرے قریب آئیں گے۔ منصب دار تم پہلے آؤ۔''

منصب دار اچھل کر اٹھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ سرفراز نے کسی بھی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ریوالور تیار کر لیا تھا۔ منصب دار نے اٹھ کر چند قدم بڑھائے اور کرسی کے ہتھے پر جھک کر آگے نکل گیا۔

''شیر خان اب تم اٹھو۔'' اس بار منصب دار نے تحکم آمیز آواز میں کہا جیسے مہدی علی خان نے بقیہ کارروائی اسے سونپ دی تھی۔

شیر خان فوراً نہیں اٹھا تھا اس نے خوف زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا، پھر اٹھا اور آنکھیں بند کر کے دوڑتا ہوا کرسی کے قریب سے گزرتا ہوا منصب دار سے جا ٹکرایا تھا۔ منصب دار نے اسے سہارا دے کر دلاسہ دیا اور بولا۔ ''ہم دونوں اپنے دوست کے قاتل نہیں ہیں، اب کرم دین تم اپنے آقا سے وفاداری کا ثبوت دو گے۔''

''نن...... نہیں......'' کرم دین نے نفی میں ہاتھ لہرائے۔

''مم...... میں......!'' میں پھر وہ پھدک کر اٹھا اور دروازے کی طرف دوڑا، سرفراز نے سلپ لیا اور کرم دین اس کی ٹانگ میں الجھ کر اوندھے منہ گر پڑا۔

''اٹھو اپنی وفاداری کا ثبوت دو۔'' سرفراز نے کرم دین کو گریبان سے جکڑ کر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... مم...... میں اس کے قریب نہیں جاؤں گا۔'' کرم دین دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بلکنے لگا پھر یکدم تڑپ کر سرفراز کی گرفت سے نکل گیا اور دوڑتا ہوا کسی کے سامنے جا کر گھٹنوں کے بل گرا۔

''مجھے...... مجھے معاف کر دیجیے مالک...... مجھے معاف کر دیجیے...... میں اندھا ہو گیا تھا۔''

''کھڑے ہو جاؤ نمک حرام۔'' منصب دار جھپٹا اور کرم دین کو بالوں سے پکڑ کر اٹھایا ''تم ہی اپنے مالک کے قاتل ہو۔''

''ہاں میں اعتراف کرتا ہوں۔'' کرم دین ہانپتے ہوئے بولا۔ ''دولت کی ہوس نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔''

''براہ کرم۔'' سرفراز نے نقلی چہرے کی جھلی اتارتے ہوئے کہا ''مجرم ہمارے حوالے کر دیجیے ہم قانون کے محافظ ہیں۔'' میں نے سرفراز کی تقلید میں جب نقلی چہرہ الگ کیا تو پانچوں اشخاص بری طرح اچھل پڑے تھے کیونکہ میں اصلی چہرے کے ساتھ ان سے مختلف اوقات میں ملاقات کر چکی تھی۔

''میں معزز مہمانوں سے قانون کے نام پر درخواست کروں گی یکایک مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا تھا کیونکہ میں ایجنسی کی سربراہ تھی اور میرے کارکن وہاں موجود تھے جن کے نزدیک میں خاتون آہن تھی اگر میں خود

کو سرفراز کے پس منظر میں رکھتی تو میری آہنی شخصیت میرے ماتحتوں کے نزدیک متاثر ہو سکتی تھی۔ "آپ لوگ تشریف لے جائیں۔"

"اور وہ شخص اب خود کو ظاہر کر سکتا ہے۔" سرفراز بول پڑا "جس نے حق دوستی ادا کرتے ہوئے یہ کیس ہمارے سپرد کیا تھا۔"

جب کوئی بھی سامنے نہ آیا تو سرفراز نے مایوس نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور گہری سانس لے کر کرم دین کا ہاتھ تھام لیا۔

"اب بھی کسی شک کی گنجائش ہے سرفراز۔" میں نے کہا۔ "سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔"

"کرم دین۔" سنی ان سنی کرتے ہوئے اس نے کرم دین کو مخاطب کیا۔ "آرام سے کرسی پر بیٹھ جاؤ تمہارا آقا اپنا فرض ادا کر کے واپس جا چکا ہے۔" کرم دین نے نفی میں گردن ہلائی اور دھپ سے زمین پر بیٹھ گیا۔

جب ایک ایک کر کے چاروں مہمان کمرے سے نکل گئے تو میں نے آمنہ خاتون سے کہہ کر روبی، راحیل اور نیاز احمد کو بھی اندر بلا لیا روبی آخر میں آئی اور میں نے دیکھا کہ گل رنگ لڑکی سراپا مسکراہٹ بنی ہوئی ہے اور جب اس نے باہر جھانک کر کہا۔ "خالہ آپ بھی آجائیں۔" اندر آنے والی خالہ کو دیکھ کر میں نے خشونت آمیز نگاہوں سے روبی کو دیکھا۔

"اسے کون لایا ہے اور کیوں؟" میں نے سرد اور ناگوار آواز میں جواب طلب کیا۔

"میں لائی ہوں میڈم۔" روبی نے مسکراہٹ دبا کر بتایا۔

"مجھے کھانا پکانے کے لیے مدد درکار تھی۔"

"میری اجازت کے بغیر۔" میں نے روبی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"کیا یہ حرکت مناسب تھی۔"

"یس میڈم۔" روبی نے کہا۔

"ہمارا پیشہ ہی ایسا ہے بعض اوقات اپنی ذات سے بھی گستاخی ناگزیر ہو جاتی ہے۔"

"میڈم۔" حسب دستور سب کی موجودگی میں سرفراز نے مودب انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"کرم دین کا بیان ریکارڈ کر لیا جائے مقتول کی روح کو واپس جانا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے تم ریکارڈ کر لو۔" میں نے اجازت دے دی۔

راحیل نے ٹیپ ریکارڈ آن کر کے مائیک کرم دین کے قریب کر دیا۔

"کریم دین۔" سرفراز نے سوال کیا۔ "تم نے اپنے مالک کو کیوں قتل کیا تھا۔"

"میں صرف جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔" کرم دین نے جواب دیا۔

"کیا تم پسند کرو گے کہ ناک اور کانوں کے بغیر عدالت میں جاؤ۔" سرفراز نے چاقو کھولتے ہوئے سرد آواز میں کہا۔

کرم دین نے پہلی بار چہرہ اوپر اٹھایا اور اس کی نگاہ سامنے کھڑی خالہ جیواں پر پڑی تو وہ بدبداتا ہوا اٹھا اور پھر گھٹنوں کے بل گر پڑا اور ہانپنے لگا۔

"اوپر دیکھ نمک حرام۔" خالہ جیواں کڑکی اور چیتے کی مانند کرم دین پر جھپٹ پڑی تھی۔

"مجھے...... مجھے معاف کر دو۔" کرم دین جیواں کے تابڑ توڑ طمانچے کھاتا ہوا گڑگڑانے لگا۔

"بس خاتون محترم۔" سرفراز نے غصیلی جیواں کے دونوں ہاتھ جکڑتے ہوئے۔ "آپ ہمیں بیان لینے دیں۔"

"میں اس کی ہڈیاں چبا ڈالوں گی۔" جیواں نے اچھل کود کر دولتی جھاڑی اور کرم دین کراہتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

"کرم دین میرا سوال تمہیں یاد ہے۔" سرفراز نے جیواں کو روبی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" کرم دین پل بھر چھت کو گھورتا پھر بولنے لگا۔

"میں اور مہدی ہندوستان میں ایک سیٹھ کے ملازم تھے مہدی منشی تھا اور میں گھر کا کام کیا کرتا تھا، جب بلوے شروع ہوئے تو ایک رات مہدی نے تجوری سے پندرہ سیر سونا اور ہیرے نکالے اور ایک قافلے کے ساتھ پاکستان آ گیا میں بھی اسے تلاش کرتا ہوا جب اس سے ملا تو اس نے صاف انکار کر دیا پھر میں موقع کی تلاش میں اس کا ملازم بن کر رہنے لگا اور اس رات جب الماری سے وہ سونا نکال رہا تھا تو میں نے اسے دبوچ لیا اور اس کی ناک پر تکیہ

رکھ دیا جب وہ مر گیا تو اسے بستر پر لٹا کر کوئلے دہکا کر انگیٹھی قریب رکھی اور کھڑکی کے راستے باہر نکل گیا تھا۔"

"سنو کرم دین۔" سرفراز نے سرگوشیانہ آواز میں کہا۔

"ہم پولیس کے آدمی نہیں ہیں اگر تم سونا اور ہیرے ہمارے حوالے کردو تو ہم تمہیں اور مہدی علی کو بھول جائیں گے۔"

"تم جھوٹے ہو۔" کرم دین جیواں کی طرف دیکھتے ہوئے زور سے بولا۔ "ریحانہ بیگم تمہیں لائی ہے۔"

"کون ریحانہ بیگم۔" میں نے چونک کر پوچھا۔

"میں۔" جیواں بول پڑی۔ "مجھے معاف کرنا بی بی...... میں ریحانہ بیگم ہوں۔"

"اوہ۔" میں ہونٹ سکوڑ کر رہ گئی تھی تب سرفراز نے قہقہہ لگایا اور بولا۔

"اس کو کہتے ہیں چور کو لے گئے مور۔"

"ریحانہ بیگم اگر مجھے معاف کرسکیں تو مال واپس کیا جاسکتا ہے۔" کرم دین سودے بازی پر آ گیا۔

میں نے ریحانہ بیگم کو آنکھ کا اشارہ کیا اور وہ بولی "ٹھیک ہے اگر مجھے سونا اور ہیرے لوٹا دو تو میں تمہیں معاف کردوں گی۔"

"اب بتاؤ مال کہاں ہے؟" سرفراز نے پوچھا۔

"بینک کے لاکر میں۔" کرم دین نے بتایا۔

"راحیل۔" سرفراز بولا۔

"اب تم انکل کرم دین کو دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔"

"ہاں خالہ۔" کرم دین کے جاتے ہی سرفراز نے مسکراتے ہوئے خالہ سے پوچھا۔

"اب آپ بتائیں کہ ناک گھما کر پکڑنے کی کیا ضرورت تھی۔"

خالہ نے روبی کی جانب دیکھا اور روبی پہلے تو ناخن کریدتی رہی پھر بولنے لگی۔

"آج سے چند ماہ قبل ایک دن خالہ ہمارے دفتر آئی تھیں۔ آپ سیٹھ کریم اللہ مرڈر کیس کے سلسلے میں کراچی گئی ہوئی تھیں، خالہ نے مجھے عطیہ کریم سمجھ کر ساری داستان سنائی چونکہ میں ایجنسی کے قوانین سے آگاہ تھی اور خالہ کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی لہٰذا میں نے ان کو مشورہ دیا کہ آپ عطیہ کریم کی ملازمت اختیار کرلیں اور پھر موقع محل دیکھ کر ہم آپ کا کیس پیش کردیں گے گزشتہ دنوں آپ کی عدم موجودگی میں ایک کلائنٹ نے بقایا رقم ادا کی اور میں نے وہ رقم خالہ کو دے کر ان کو تھوڑی جاسوسی کرنے پر رضا مند کرلیا اور پھر جو کچھ ہوا۔"

میرا دل چاہ رہا تھا کہ روبی کا خوب صورت چہرہ نوچ لوں یا اپنی حماقت پر زور زور سے ہنسوں میں تو ہونٹ دانتوں تلے دبا کر چپ ہی رہی تھی البتہ سرفراز نے کھل کر قہقہے اچھالے تھے۔

"خوب، بہت خوب۔" وہ بولا۔ "روبینہ نے ہمارا ہی جوتا ہمارے ہی سروں پر بجایا ہے۔"

"اچھی نیت سے برا کام کیا ہے۔" روبی بولی۔ "امید ہے معاف کردی جاؤں گی۔"

"لیکن بلی۔"

"اوہ۔" روبی ہنس کر بولی۔

"پہلے دن کوئی بلی محض اتفاق سے آپ کی خواب گاہ میں موجود تھی پھر جب آپ پر بلی کا بھوت سوار ہوتے دیکھا تو ہم نے بلی کو بھی ایک کردار بنا لیا تھا بلی اڑوس پڑوس سے آتی تھی۔"

"اور یہ کرسی کیسے چلتی تھی۔"

"کرسی تو تار کے ذریعے راحیل چلا رہا تھا۔" روبی نے اٹھ کر فرش سے باریک تار اٹھا کر مجھے دکھایا اور پھر کرسی الٹ کر چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈ الگ کرلیا۔

"میں اور راحیل نے یہ سارا انتظام کیا ہے۔"

اور میں فیصلہ نہ کرپائی تھی کہ اپنے ذہین ماتحتوں کی کارکردگی پر فخر کروں یا اپنی توہم پرستی اور بے وقوفی کا ماتم کروں قاتل پکڑ کر روبی نے میری شخصیت کو قتل کردیا تھا۔

سلیم کرد

وہ نئے سال کا جشن منانے کے لیے کھلے سمندر میں گئے تھے ابھی وہ عیش و طرب کے سمندر میں غوطہ زن تھے کہ اچانک ان کے درمیان شیطان ایک بکس کی صورت میں نمودار ہو گیا اور تمام دوست پل بھر میں لالچ کے اسیر ہو گئے۔

کھلے سمندر میں کھیلے جانے والے خونی ڈرامے کی روداد

یہ ایک درمیانے سائز کی لانچ تھی جو خشکی سے سیکڑوں ناٹیکل میل دور رات کے وقت کھلے سمندر میں لنگر انداز تھی۔ اس میں عملے کے دو افراد سمیت کل سات افراد سوار تھے۔ لانچ کے عملے کے افراد اور اصغر کے علاوہ باقی چار افراد نوعمر لڑکے تھے جو ایک میڈیکل کالج کے اسٹوڈنٹس اور آپس میں دوست تھے اور ان چاروں نوجوانوں میں سے جمیل احمد کا تعلق ایک امیر گھرانے سے تھا اور باقی تین کا تعلق متوسط خاندانوں سے تھا جبکہ پینتیس سالہ اصغر جمیل احمد کے والد کا ڈرائیور تھا اور ایف اے پاس تھا۔ وہ پانچوں اس وقت عرشے پر موجود پلاسٹک کی میز کے دونوں جانب بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے لانچ کے کیبن میں ایک بڑے ڈائل والی دیوار گیر گھڑی خصوصی طور پر ٹنگی ہوئی تھی۔ ان کی بے چین اور منتظر نگاہیں اس وقت گھڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے' سیکنڈ والی سوئی لحہ بہ لحہ ٹک ٹک کرتی ہوئی گول دائرے کی صورت میں بارہ کے ہندسے کی سمت بڑھ رہی تھی۔

پلاسٹک کی میز پر بڑی بڑی پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں جن میں فرائی شدہ مچھلی کے قتلے' جھینگے اور مختلف انواع واقسام کی ڈشیں موجود تھیں اور ان کے درمیان میز پر جابہ جا مختلف اقسام کے کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں اور ڈبے بھی موجود تھے۔ لانچ کے عملے کے دونوں افراد نثار اور خلیل اس وقت انجن روم میں موجود تھے اور گرم گرم قہوہ سے شغل کررہے تھے۔ لانچ کی ضروری روشنیاں جل رہی تھیں' ہوا کے سرد جھونکے وقفے وقفے سے چل رہے تھے۔

پھر بارہ بجتے ہی لانچ پر ایک جشن کا سماں چھا گیا' ہیپی نیو ائر کی گونج زور وشور سے سنائی دینے لگی۔ اس کے ساتھ ہی ایک مدھر ومسرور کن استقبالیہ میوزک کی دھن مدھم انداز میں رنگ برنگی برقی قمقموں کی روشنیوں کے ساتھ بکھرنے لگی اور برقی قمقموں کی روشنیاں لانچ کے اردگرد سطح آب پر پھلجڑیاں گویا بکھیرنے لگیں اور لانچ ان روشنیوں کے خوب صورت ودلکش حصار میں ہولے ہولے سے دائیں بائیں ڈول رہا تھا۔

دلکش نظارہ تھا' دنیا والوں سے دور' گہرے پانیوں میں منچلوں کا نئے سال کی آمد کا جشن زوروں پر تھا۔ آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے اور مشرق سے چاند اپنا سر ابھارنے میں مصروف تھا۔ سرد ہوائیں بدستور وقفے وقفے سے چل رہی تھیں' ان کے جسم پر گرم سوئٹر تھے۔ جمیل اور طارق نے اپنا نائن ایم ایم کا پستول نکالا اور ہوا میں فائر کرنا شروع کردیا۔

موسیٰ ایک ہینڈی کیم کے ذریعے تقریبات کو شوٹ کررہا تھا' یہ پانچوں اب میز کے قریب عرشے پر کھڑے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کو نئے سال کی آمد کی مبارک باد دے رہے تھے۔ موسیٰ کے ہاتھ سے کامران نے ہینڈی کیم لیا اور مووی بنانے لگا' ان کے والدین نے نصیحت کی تھی کہ بے شک نیو ائر نائٹ دھوم دھام سے مناؤ مگر سادگی کے ساتھ۔ اس لیے ان کے سامنے میز پر الکوحل سے پاک مشروبات کی بوتلیں وغیرہ تھیں جن سے وہ شغل فرما رہے تھے ان کی آوازیں واضح طور پر انجن روم میں سنائی دے رہی تھیں۔ نثار اور خلیل دونوں ان کی موج مستیوں اور فائرنگ کی تڑتڑاہٹ کی آواز سن کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہورہے تھے۔

"نجانے ان لوگوں کو مستی اڑانے کے لیے کیا سوجھتی ہے۔" نثار نے کہا۔

"بس ایک بہانہ چاہیے۔" خلیل نے کہا۔

"چاہے عمر عزیز کا ایک سال کم کیوں نہ ہو۔" نثار نے کہا۔

"شاید ان لوگوں کو علم بھی نہیں ہے کہ وہ دراصل نئے سال کا جشن کس خوشی میں منارہے ہیں' زندگی کے چند مہینے کم ہونے کی خوشی میں یا نئے سال میں زندہ سلامت قدم رکھنے کی خوشی میں؟" خلیل نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"اگر بات دوسری ہے تو ٹھیک ہے ویسے یہ پارٹی شریف لوگوں پر مشتمل ہے۔ وہ پارٹی تمہیں یاد ہوگی ناں جو تفریح کم اور ہم لوگوں کا تمسخر زیادہ اڑاتی تھی؟" نثار نے یاد دلایا۔

"وہ...... جسے ہم لوگ تیئس مارچ کو لے گئے تھے؟" خلیل نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں' جی ہاں۔" نثار نے مثبت انداز میں کہا۔

"نہایت ہی چھچھوری پارٹی تھی۔" خلیل نے کہا۔

عرشے پر منعقد پارٹی اپنی جوبن پر تھی اور لانچ کے

انجن روم میں خلیل اور نثار محو گفتگو تھے چند منٹ گزرنے کے بعد عرشے سے جمیل احمد کی آواز آتی ہوئی سنائی دی۔

"خلیل آپ لوگ آجاؤ عرشے پر ڈنر کرنے کے لیے۔"

"یہ کیسا ڈنر ہے جو رات باہر بجے کے بعد کیا جا رہا ہے' منہ میں ابھی تک قہوہ کا ذائقہ ہے۔" نثار نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"چلو بھئی' ان لوگوں کی دلجوئی کے لیے ان کے ساتھ مل کر کچھ کھا پی لیتے ہیں' ویسے مجھے بھی اب بھوک کی طلب نہیں ہو رہی ہے۔" خلیل نے کہا اور وہ دونوں اٹھ کر انجن روم سے نکل گئے۔

نثار اور خلیل دونوں اس لانچ کے مشترکہ مالک تھے۔ لوگ اکثر ان کی لانچ تفریح منانے کے لیے کرائے پر حاصل کرتے تھے اور یہ دونوں ایک مناسب کرائے پر پارٹیوں کو ٹور پر لے جانے کے لیے آمادہ ہوتے' مناسب کرائے کے ساتھ ساتھ ان کا رویہ سیاحوں کے ساتھ ہمیشہ مہذبانہ ہوتا تھا جس کے باعث شہر کے بڑے بڑے لوگ شکار کے شوقین حضرات اور سیاحتی حلقے ان کی لانچ کرائے پر دھڑا دھڑ حاصل کرنے لگے پر ان کی یہ لانچ کرائے کے لیے وقف ہوگئی۔

اصغر سے ان دونوں کی اچھی جان پہچان تھی اور جمیل احمد نے اپنے والد کے ڈرائیور اصغر کے کہنے پر ان کی یہ لانچ مناسب کرائے پر حاصل کی تھی۔

دراصل یہ اصغر کا مشورہ تھا کہ اس بار نئے سال کا جشن کچھ ایسے مختلف انداز میں منایا جائے جو منفرد اور یادگار بن جائے۔ اس ضمن میں اس نے یہ مشورہ سامنے رکھا کہ نئے سال کی آمد کی پارٹی کا انعقاد خشکی سے سیکڑوں میل دور باقی دنیا سے تمام ذرائع سے بالکل منقطع ہو کر گہرے پانیوں میں منایا جائے اس طرح جشن منانے کا ایک الگ مزہ ہوگا اور لطف ٹوٹ ٹوٹ کر آئے گا اور یہ تقریب برسوں یاد رہنے والی تقریب بنے گی۔

اس نے یہ مشورہ سب سے پہلے جمیل احمد کے سامنے رکھا تھا پھر اس کے بعد اس کے دوستوں کے سامنے پیش کیا۔ اصغر کو علم تھا کہ جمیل احمد اپنی گیدرنگ میں ایک لیڈر کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی ہر بات اس کے دوست بنا چوں و چرا مانتے ہیں لیکن یہ ایک ایسا منفرد مشورہ تھا کہ جمیل احمد سمیت اس کے دوستوں نے بھی بے حد پسند کیا۔ پہلے تو جمیل احمد کے والد احمد خان نے بیٹے کو گہرے پانیوں میں نئے سال کا جشن منانے کی اجازت نہیں دی جب ڈرائیور اصغر نے یہ بتایا کہ یہ میرا مشورہ ہے اور میں بھی ان کے ساتھ جاؤں گا تو جمیل احمد کے والد راضی ہوگئے' اصغر پچھلے دس سالوں سے ان کے ہاں بطور ڈرائیور ملازمت کرتا چلا آ رہا تھا۔ جمیل احمد کے والد چاہتے ہوئے بھی اس کی بات ٹال نہیں سکتے تھے۔ اکثر بڑے بڑے لوگوں کی نبض ان کی شریک حیات کے بعد ان کے ڈرائیورز کے ہاتھوں میں ہوتی ہے پھر اصغر کے مشورے پر جمیل احمد اور اس کے دوستوں نے مل کر لانچ کرائے پر حاصل کی۔ اصغر کی دلی خواہش پوری ہوگئی' اسے کھلے سمندر کی کھلی اور فرحت آمیز فضاؤں میں تفریح منانے کا بے حد شوق تھا۔ وہ اس سے قبل بھی کئی بار کھلے سمندر میں تفریح کا مزہ حاصل کر چکا تھا لیکن پھر بھی نئے سال کی یہ خصوصی پارٹی کئی لحاظ سے منفرد تھی جبکہ جمیل احمد اور اس کے دوستوں کے لیے یہ نیو ائیر نائٹ کی گہرے پانیوں میں منعقد ہونے والی تقریب ہر لحاظ سے ایک نیا اور انوکھا تجربہ تھا کیونکہ یہ ان کا پہلا بحری ٹور تھا جو خشکی سے دور باقی دنیا سے کٹ کر نئے سال کی آمد کے حوالے سے منایا جا رہا تھا۔

جمیل احمد اور طارق کا سر اس وقت چکرانا شروع ہوگیا تھا جب لانچ کھلے سمندر میں پہنچی تھی۔ لیکن اچھی بات یہ ہوئی کہ سفر میں سر چکرانے اور متلی کو رفع کرنے والی دوا لینے کے بعد وہ جلد نارمل ہوگئے تھے اور ابھی تک دوبارہ شکایت سامنے نہیں آئی تھی اور موسیٰ و کامران کو کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔

خلیل اور نثار کی بات مختلف تھی' وہ بحری سفر کے عادی تھے۔ سمندر سے ان کا معاش وابستہ تھا اور تیراکی ان کی زندگی کا جزو تھی جبکہ ڈرائیور اصغر کے سوا باقی چاروں لڑکے تیراکی کے گر سے بالکل نابلد تھے۔

یہاں دور دور تک سیل فون کام نہیں کرتا تھا اور باقی دنیا سے الگ تھلگ رہنے کے لیے انہوں نے اپنے ساتھ رابطے کا کوئی اور ذرائع بھی نہیں لایا تھا۔ یہ ان پروگرام میں شامل تھا تاکہ یکسوئی کے ساتھ نئے سال کا جشن منا سکیں۔

اگر لانچ کے عملے کے پاس کوئی رابطے کا آلہ وغیرہ تھا تو وہ اور بات تھی یہ ان کا مسئلہ تھا لیکن ابھی تک نثار اور خلیل دونوں کے پاس سوائے سیل فون کے رابطے کا اور کوئی آلہ ان کے ہاتھوں میں نظر نہیں آیا تھا۔

جمیل احمد سمیت چاروں لڑکے اصغر کو اصغر بھائی کہہ کر پکارتے تھے اور یہ لوگ اصغر بھائی کے منفرد لوکیشن میں تشکیل کردہ پروگرام سے بے حد لطف اندوز ہو رہے تھے۔

غل غپاڑہ اور اُدھم تھم گیا تھا' وہ کھانا کھانے اور بات چیت میں مصروف تھے جبکہ خلیل اور نثار خاموشی کے ساتھ کھانا کھانے میں مصروف تھے۔

"واہ واہ اصغر انکل! آپ کے ذوق کا کوئی ثانی نہیں' کیا چوکس کر ڈالا۔ کیا سماں ہے' قسم سے بہت مزہ آ رہا ہے۔" موسیٰ نے ستائشی وشرارت بھرے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اصغر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مزہ تو ہمیں بھی بہت آ رہا ہے' بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں لیکن یہ تو بتایئے اصغر بھائی سے انکل کب بن گیا؟" کامران نے ایک نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر فضا میں قہقہے گونجنے لگے تاہم خلیل اور نثار نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

"شاید اپنے منفرد آئیڈیا کی وجہ سے اصغر بھائی سے انکل کے رتبے پر فائز ہو چکے ہیں۔" جمیل احمد نے لقمہ دیا جو گروپ لیڈر تھا۔ ایک دفعہ پھر لانچ کی خوشگوار فضا میں بے ساختہ قہقہوں کی گونج سنائی دینے لگی۔

"شاید نہیں بلکہ یقینی طور پر بھائی سے انکل کے رتبے پر فائز ہو چکا ہوں' اس لیے نئے سال کے اولین مہینے اور پہلی تاریخ سے یعنی آج سے مجھے اصغر انکل کے نام سے لکھا اور پکارا جائے۔" اصغر نے لفظ انکل کو دفاعی انداز میں قبول کرتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر تھمنے والی ہنسی میں تیزی آ گئی۔

بیشتر پکا ہوا کھانا وہ اپنے ساتھ لائے تھے اور باقی چند خاص اقسام کی ڈشیں کامران نے یہاں لانچ کے کچن میں تیار کی تھیں' وہ ایک معقول لنگر تھا۔

خلیل اور نثار دونوں کوشش کر رہے تھے کہ وہ قدرے ان کے ساتھ گھل مل سکیں مگر معذور دکھائی دے رہے تھے۔

"سنا ہے کہ سمندر میں اب مختلف اقسام کی مچھلیوں اور دیگر آبی حیات کی نسل کم ہوتی چلی جا رہی ہے؟" جمیل احمد نے خلیل اور نثار سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں' بالکل ایسا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ وائر نیٹ' گھجا نیٹ چھوٹے چھوٹے سوراخوں والے جالوں کا کثرت سے استعمال اور سمندری آلودگی ہے۔ بڑے بڑے سمندری ٹرالرز قافلوں کی صورت میں رات کے وقت کنارے کے قریب ان ممنوعہ جالوں کے ذریعے بے دردی کے ساتھ سمندر میں جھاڑو پھیرتے ہیں۔ چھوٹی بڑی مچھلیاں اور دیگر آبی مخلوقات ان کے دام میں کثرت سے پھنس جاتی ہیں ان کی افزائش نسل کے ٹھکانے ختم ہو رہے ہیں اور یہ ایک بڑا کاروبار بن چکا ہے جس کے باعث چھوٹے ماہی گیر بے روزگار ہوتے چلے جا رہے ہیں اور دوسری بڑی وجہ سمندری آلودگی ہے۔ دنیا بھر کے ناکارہ بحری جہاز ہمارے یہاں لاکر توڑے جاتے ہیں' جن سے رسنے والا تیل اور دیگر کیمیائی فضلے سمندر میں بہہ جاتے ہیں جس کے باعث سمندری حیات مر جاتی ہے یا دم گھٹنے کے باعث علاقہ چھوڑ کر کہیں اور چلی جاتی ہے۔" خلیل نے بتایا۔

"ان عوامل کے تدارک کے لیے کوئی اقدام نہیں اٹھایا جا رہا؟" جمیل نے استفسار کیا۔

"بالکل نہیں' ادارے موجود ہیں مگر سب اپنا خرچہ پانی بٹور رہے ہیں۔ اوپر سے نیچے تک سب ملے ہوئے ہیں' سمندر کو کنگال کر آلودہ کر رہے ہیں۔" خلیل نے بتایا۔

"یہ تو سراسر آبی حیات کی نسل کشی ہے۔" کامران نے کہا اور پھر وہ سب مل کر اس موضوع پر بات کرنے لگے اور اس موضوع بحث کی وجہ سے خلیل اور نثار بھی ان کی صحبت میں گھل مل گئے پھر نثار نے موجودہ موضوع سے ہٹ کر ایک نیا سوال جھاڑ دیا۔

"آپ لوگ نئے سال کا جشن کس سوچ کے تحت مناتے ہو؟"

"بس' نیا سال آنے والا ہے خوشی منانا ہے۔" موسیٰ نے سادگی سے جواب دیا۔

"یہ نہیں سوچتے کہ عمر کا ایک سال کم ہو گیا؟" خلیل نے مسکراہٹ سے کہا اور سب ہنسنے لگے۔

"کم ہو گیا تو کم ہو گیا' وقت کو روکا نہیں جا سکتا'

سیلیبریٹ کرتا ہے خوشی مناتا ہے۔ ہم ہر نئے سال کا جشن مناتے ہیں لیکن اس دفعہ ہمارا یہ سادہ و منفرد جشن جو گہرے پانیوں میں منایا جارہا ہے' ہمارے لیے نئے سال کا جشن کم سمندری تفریح کچھ زیادہ ہے۔ ہم نے آپ لوگوں کے کہنے پر ایک پٹاخہ بھی نہیں پھوڑا اور آتش بازی بھی نہیں کی سوائے چند ہوائی فائر کے جس سے لانچ میں آگ لگنے کا کوئی اندیشہ بھی نہیں ہے اگر ہم خشکی پر تقریب مناتے تو ضرور بھرپور آتش بازی کا مظاہرہ کرتے لیکن مجھے ہر لحاظ سے نئے سال کا یہ سادہ پارٹی پچھلی تمام پارٹیوں سے پُروقار اور شاندار محسوس ہورہی ہے۔" جمیل احمد نے کہا۔

وقت کا پنچھی اپنی رفتار میں محو پرواز تھا۔

❀....❀....❀

چاروں لڑکے کیبن میں بیٹھے ہوئے تھے' خلیل اور نثار لانچ کے تہہ خانے میں اپنے بستر پر لیٹے ہوئے نیند کی تیاری کررہے تھے جبکہ اصغر باہر عرشے پر کھلی فضا میں اکیلا ہوا خوری کررہا تھا۔ وہ کبھی دائیں اور کبھی بائیں ٹہل رہا تھا پھر اچانک اس کی نگاہیں سمندر میں کسی چیز پر ٹھہر گئیں۔ عین سامنے دور پرسکون سطح آب پر ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی کوئی شے آہستہ آہستہ لانچ کی سمت بڑھ رہی تھی۔ اصغر عرشے پر چند قدم آگے بڑھ کر اس شے کو بغور دیکھنے لگا۔ لانچ کی روشنیاں قدرے اس پر پڑرہی تھیں اور وہ رفتہ رفتہ لانچ کے برقی قمقموں کی روشنیوں کے دائرے کے اندر داخل ہورہی تھی۔ وہ کوئی بکس یا تابوت نما کوئی چیز تھی اصغر پلٹ گیا اور کیبن کے سامنے آتے ہوئے بولا۔

"کوئی چیز تیرتی ہوئی لانچ کی طرف آرہی ہے۔"

"چلو بھئی دیکھتے ہیں' انکل نے سمندر میں کیا چیز دریافت کرلی۔" موسیٰ نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

"میرے خیال میں اصغر اب انکل سے دادا بننے کی جدوجہد میں ہیں۔" کامران نے لقمہ دیا اور ایک بار پھر ان کے درمیان ہنسی مذاق کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

"اگر وہ انجانی شے ہمارے کام کی ہوئی تو اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اصغر راتوں رات بھائی سے انکل اور پھر انکل سے زقند بھر کے دادا کے اعلیٰ رتبے پر فائز ہونے کا ریکارڈ اپنے نام کرسکتے ہیں۔" جمیل احمد نے کہا اور تمام افراد اٹھ کر قہقہہ لگاتے ہوئے باہر کھلی فضا میں آگئے۔

"وہ دیکھو۔" اصغر نے ہاتھ سے سمندر کی طرف اشارہ کیا' تمام لڑکے اس طرف متوجہ ہوگئے۔ کوئی چیز پرسکون سطح آب پر ہچکولے کھاتی ہوئی لانچ کی سمت آرہی تھی۔ اب اس کا رنگ بھی واضح دکھائی دے رہا تھا جو زردی مائل تھا۔

"ارے یہ تو تابوت ہے۔" طارق نے چونکتے ہوئے کہا۔

"انکل نے گہرے پانیوں میں کئی ہزار سال پرانے تابوت میں بند حنوط شدہ ممی کو دریافت کرلیا ہے' چند دن بعد پوری دنیا کے میڈیا میں انکل اصغر بلکہ دادا اصغر کے نام کا ڈنکا بجنے لگے گا۔" کامران نے شوخی سے کہا اور اصغر سمیت سب ہنسنے لگے۔

"ارے یار اگر ہم سب ممی کے عذاب سے بچ گئے تو انکل اصغر' دادا اصغر کے مقام تک پہنچ سکتے ہیں ورنہ سب خلاص۔" موسیٰ نے کہا اور سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگے۔

"بڑا مزہ آرہا ہے یار! نئے سال کی نئی خوشگوار رات' آسمان پر ٹمٹماتے ستارے' افق پر چمکتا ہوا نئے سال کا چاند' پُرلطف ٹھنڈی ہوا کے تازہ جھونکے' چاروں اور پرسکون سمندر اور اس میں دھیمے دھیمے انداز میں دائیں بائیں ڈولتی ہماری لانچ اور لانچ کی طرف آنے والی انجانی شے' کیا پُراسرار اور خوشگوار سماں بندھا ہوا ہے یار! اس تابوت نما شے نے تو نئے سال کی تقریب میں رنگ میں بھنگ ڈال کر تجسس کا عنصر بھر دیا ہے۔" طارق نے سماں باندھتے ہوئے کہا۔

"اور یہ سب کس کا کمال ہے؟" اصغر نے زور سے استفسار کیا۔

"دادا اصغر کا۔" سب نے یک زبان ہوکر کہا۔

"دادا اصغر کا یا انکل اصغر کا؟" اصغر نے دوبارہ پوچھا۔

"کوئی نہ کوئی چیز ضرور اس میں برآمد تو ہوئی ہے ناں۔" کامران نے کہا۔

"اور ضرور کوئی اہم چیز ہوگی۔" جمیل احمد نے کہا۔

"اس لیے آپ خود کو ابھی سے دادا کے رتبے پر فائز سمجھو۔" موسیٰ نے جھٹ سے کہا۔

"نثار والو! آپ لوگ عرشے پر آجاؤ' کوئی چیز لانچ کی طرف آرہی ہے اسے پکڑ کر لانچ پر چڑھانا ہے۔" جمیل احمد نے پکار کر کہا۔ نثار اور خلیل دونوں اپنے اپنے بستر پر تھے اور نیند کی تیاری کی کوشش میں تھے۔ دونوں عرشے سے آتی ہوئی آوازوں کو واضح طور پر کافی دیر سے سن بھی رہے تھے' انہیں توقع تھی کہ جلد بلاوا بھی آجائے گا اور توقع کے عین مطابق انہیں پکارا گیا۔

"چلو دیکھتے ہیں کہ کیا چیز ہے۔" نثار نے خلیل سے کہا۔

"آجاؤ' جلدی سے۔" ایک دفعہ پھر عرشے سے جمیل احمد کی تیز آواز آئی۔

"ہم آرہے ہیں ابھی۔" نثار نے کہا اور پھر دونوں لانچ کے تہہ خانے سے نکل کر عرشے پر ان کے درمیان پہنچ گئے۔ وہ تابوت نما بکس لانچ کے دائیں طرف پہنچنے والا تھا مگر اس کا فاصلہ لانچ سے کافی دور تھا۔

لانچ میں ایک چھوٹی سی ہلکی پھلکی مگر مضبوط لائف بوٹ موجود تھی' جس میں چھ سات افراد کی گنجائش تھی جو لانچ کے ایک کونے میں رسیوں کے سہارے چوبی شہتیروں سے تقریباً لٹکی ہوئی تھی اور اتفاق سے وہ تابوت نما چیز بھی لانچ کے اس کونے کی طرف تھی جہاں لائف بوٹ لانچ سے نصب تھی۔ نثار اور خلیل نے سرعت کے ساتھ بوٹ کی رسیاں کھولنا شروع کیں۔

"ہم تیر کر بھی اس چیز کو پکڑ کر لانچ پر چڑھا سکتے ہیں مگر یہاں گہرے پانیوں میں خونخوار شارک کا اندیشہ ہے اور ٹھنڈ بھی کافی ہے' قلفی جم سکتی ہے۔" خلیل نے نثار کے ساتھ لائف بوٹ سمندر میں اتارتے ہوئے کہا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک چھپاک کے ساتھ لائف بوٹ بڑی آسانی کے ساتھ سمندر میں اتر گئی۔ خلیل لانچ سے اتر کر بوٹ کے اندر چلا گیا' بوٹ کا پچھلا حصہ رسی سے باندھا ہوا تھا اور رسی کا بقایا حصہ لانچ میں موجود نثار کے ہاتھوں میں تھا۔ لانچ کا رخ مغرب کی سمت تھا اور وہ بکس مغرب کی سمت آنے والی ہواؤں کے دوش پر آرہا تھا۔ لائف بوٹ کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے سائز کی چپو بیلٹ کے سہارے منسلک تھے۔

خلیل نے ایک چپو نکال کر سرعت کے ساتھ کبھی دائیں اور کبھی بائیں چلانا شروع کیا اور لانچ میں موجود نثار نے رسی کو ڈھیل دینا شروع کیا جو کافی لمبی تھی اور بکس تک باآسانی کے ساتھ پہنچ سکتی تھی۔ خلیل نے بوٹ کا رخ بکس کی طرف موڑ دیا تھا' بالآخر لائف بوٹ بکس کے قریب پہنچ گئی۔ خلیل نے زرد رنگ کے تابوت نما بکس کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر آگے بڑھنے سے روک دیا جو کافی وزنی بھی محسوس ہو رہا تھا۔

"رسی کھینچ لو۔" خلیل نے جب بکس کو دونوں ہاتھوں سے پوری طرح جکڑ لیا تو آواز لگائی۔

رسی کا صرف آخری سرا نثار کے ہاتھوں میں رہ گیا تھا جسے نثار نے کھینچنا شروع کر دیا۔ لائف بوٹ رسی کے سہارے اور تابوت نما بکس بوٹ کے اندر خلیل کے ہاتھوں کے ذریعے دھیمی دھیمی رفتار میں پیچھے کی جانب لانچ کی طرف بڑھنے لگی۔

❀........❀........❀

سب کی نگاہیں تابوت نما بکس پر جمی ہوئی تھیں زرد رنگ کا یہ بکس جدید قسم کا فائبر گلاس ساختہ تھا۔ یہ لمبائی اور چوڑائی میں کسی عام تابوت سے بڑا تھا اس کے دونوں طرف قدرے ابھرے ہوئے لاک نصب تھے۔ فائبر گلاس ساختہ ہونے کی وجہ سے یہ مضبوط' پائیدار اور واٹر پروف تھا جو سمندر کی گہرائیوں میں ڈوبنے کے بجائے سطح آب پر رہنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

"کافی وزنی ہے اندر کچھ خاص قسم کی چیزیں ہوسکتی ہیں۔" جمیل احمد نے کہا کیونکہ کچھ دیر قبل اس نے نثار اور خلیل کے ساتھ مل کر بکس کو لانچ پر چڑھایا تھا۔

"اب رنگ کے بھنگ کا بھید جلد کھلنا چاہیے' بکس کے اندر کیا برآمد ہوگا۔ فوری طور پر یہ بات سامنے آنا چاہیے تاکہ اصغر انکل اور دادا درمیان کشمکش سے نجات پائے۔" طارق نے کہا اور بار پھر سب ہنس پڑے۔

نثار اور خلیل بکس کے لاک سے چھیڑ خانی کرنے لگے مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تھوڑی دیر بعد خلیل نے تہہ خانے سے ہتھوڑی اور چھینی لایا اور ان کی مدد سے لاک توڑنا شروع کیا پھر تھوڑی دیر بعد وہ دونوں سائیڈ کے لاک کو توڑنے میں کامیاب ہوا اب صرف ڈھکنا کھولنے کا مرحلہ باقی تھا۔ نثار اور خلیل کے علاوہ سب کے دل اضطراری

کیفیت سے سینے میں دھڑک رہے تھے اور متجسس نگاہیں بکس پر ٹکی ہوئی تھیں۔

موسیقی کی دھن لانچ کے گوشے گوشے میں سنائی دے رہی تھی اور ایک نئے سُر کا آغاز ہو رہا تھا۔ سب نے اپنے اسمارٹ فون نکال کر بکس کا ویڈیو بنانا شروع کیا۔

"یار کہیں اندر بم وغیرہ نہ ہو۔" اچانک موسیٰ نے کہا اور خلیل اور نثار کے علاوہ باقی فوراً پیچھے ہٹ گئے۔

"لڑکے ہمیں ڈراؤ مت۔" نثار نے کہا۔

"احتیاط بھی کسی شے کا نام ہے آخر اور آج کل کے حالات کا علم سب کو ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈھکنا کھلتے ہی ہمارے چیتھڑے اڑ جائیں۔" موسیٰ نے ایک بار پھر خوفزدہ انداز میں کہا اور خلیل نثار دونوں ہنسنے لگے۔

"چھوڑو اس پاگل لڑکے کی باتوں کو گہرے پانیوں میں بھلا بم کہاں سے آیا۔" نثار نے خلیل سے کہا اور پھر دونوں نے مل کر ڈھکنا اوپر اٹھایا' ڈھکنا کسی قدر وزنی تھا اور ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ نہ بم پھٹا نہ دھماکا ہوا نہ کسی کے چیتھڑے اُڑے۔ ڈھکنا دوسری طرف جھک سا گیا تھا' روشنی بکس کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ اندر کا منظر صاف اور واضح نظر آ رہا تھا۔ سب بکس کے قریب آ کر اندر جھانک رہے تھے' اندر موجود اشیا پر ایک سفید رنگ کا کور بچھا ہوا تھا جو ترپال کا تھا اور اس پر بے شمار چھوٹے چھوٹے گول ابھار تھے' جو دیکھنے میں نرم و ملائم محسوس ہو رہے تھے شاید یہ نرم و ملائم ابھار والا کور اندر موجود اشیا کو ہلنے اور بکھرنے سے بچائے رکھتا تھا۔

"کور اٹھاتے ہوئے خیال رکھنا کہیں اندر موجود کمی انگلی نہ چبا دے۔" کامران نے کہا اور تمام لوگ بے ساختہ ہنسنے لگے۔ نثار نے کور ہٹایا' اندر پلاسٹک کے سفید سانچوں میں کالی نوکدار اشیا نظر آنے لگیں جو ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔

"اوہ......" نثار اور خلیل کے سوا باقی افراد کے منہ سے بے وقت نکلا۔ نثار اور خلیل ان کی حیرت سے چونک سے گئے۔ نثار اور خلیل کے سوا باقی لوگوں نے بکس کے اندر اشیا کو دیکھتے ہی فوراً پہچان لیا' یہ اکیسویں صدی کی ٹیکنالوجی کو بروئے کار لانے والے تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ان کے لیے اشیا کی ایک جھلک کافی تھی۔ وہ خاک دیکھ کر بتا سکتے تھے کہ کس خمیر کا ہے۔ لیکن آج کے دور میں ہر کوئی اپنی بساط کے تحت کچھ نہ کچھ علم و معلومات ضرور رکھتا ہے۔ نثار اور خلیل اندر موجود اشیا کے نام صرف اپنے کانوں سے سن لیتے تو ان کی آنکھیں بھی اپنے ساتھیوں کی مانند چکاچوند ہوئے بنا نہیں رہ سکتی تھیں۔ وہ ان پڑھ تھے لیکن معلومات کے زمانے میں جی رہے تھے' ساتھیوں کے اچانک بدلتے تاثرات کے باعث نثار اور خلیل دونوں کے ذہن میں بکس کے اندر موجود اشیا کے بارے میں سوالیہ نشان تھا لیکن وہ دونوں یہ جاننے سے قاصر تھے کہ یہ موٹی موٹی اور نوکدار کالی اشیا در اصل ہیں کیا بلا۔

"گینڈے کے سینگ۔" جمیل احمد نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"اوہو......" نثار اور خلیل دونوں کا منہ حیرت سے کھل گیا اور انہیں اپنے ساتھیوں کی حیرت کا اندازہ بھی ہوا پھر وہ مل کر بکس کو چیک کرنے لگے' اوپر تلے پلاسٹک کے سانچوں میں گینڈے کے کئی سینگ تھے جن کی تعداد سو کے لگ بھگ تھی۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے جمیل احمد کے کہنے پر گینڈے کے سینگ دوبارہ بکس میں رکھنے شروع کیے' بکس کے دونوں لاک ناکارہ ہو چکے تھے اس لیے سینگ رکھنے کے بعد اسے دو مضبوط بیلٹ کے ذریعے بند کر دیا گیا پھر جمیل احمد کی ہدایت پر اسے اٹھا کر لانچ کے کیبن میں رکھ دیا گیا۔

❁ ❁ ❁

تمام لوگ لانچ کے کیبن میں چوبی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ گینڈے کے سینگ سے بھرا ہوا بکس نیچے چوبی فرش پر پڑا ہوا تھا۔ فضا میں خاموشی چھائی ہوئی تھی' میوزک کی آواز بھی اب سنائی نہیں دے رہی تھی۔

"واہ دادا اصغر واہ! آپ تو توقع سے بڑھ کر ثابت ہوئے۔" موسیٰ نے شرارت بھرے انداز میں کہا لیکن کہیں سے بھی شوخی نظر نہ آئی ہر طرف سرد مہری چھائی ہوئی تھی۔ بکس سے گینڈے کے سینگوں کی برآمدگی کے بعد فضا میں ایک بدلاؤ سا آ چکا تھا۔ نئے سال کی آمد کا جشن سب کے دل و دماغ سے محو ہو چکا تھا۔

"یہ افریقی گینڈے کے سینگ ہیں' انتہائی قیمتی اور نایاب قسم کے ہیں۔ ایک سینگ کی قیمت لاکھوں میں

ہے۔'' جمیل احمد نے سکوت توڑتے ہوئے سینگوں کے متعلق تذکرہ شروع کیا۔

''میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ بکس جس سمت سے آ رہا تھا وہ راستہ افریقہ اور خلیج عدن کا ہے اگر قیاس کیا جائے تو یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ یہاں آس پاس یا افریقہ یا خلیج عدن میں گینڈے کے سینگ اسمگلنگ کرنے والی کوئی لانچ چند دن قبل غرق آب ہو گئی ہو اور یہ بکس ایسی کسی بدقسمت لانچ کا ہو سکتا ہے جو قسمت سے ہمارے ہاتھوں لگ گیا ہے۔ آپ لوگ اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے ابو کے تعلقات کاروباری حلقوں میں کافی وسیع ہیں' انہیں منڈی میں مناسب ریٹ پر فروخت کرنا ان کے لیے کوئی مشکل نہ ہوگا۔ سینگوں کے بدلے کرنسی نوٹ لیں گے تو ہم آپس میں بانٹ لیں گے اور اس میں اصغر کا حصہ دوگنا ہوگا اور باقی ہم چھ کا حصہ ایک گنا ہوگا کیونکہ بکس کو اصغر نے دریافت کیا تھا۔ میرے خیال میں لنگر اٹھا کر ہمیں ابھی اسی وقت یہاں سے جانا چاہیے' آپ لوگ جانے کی تیاری کر لیں۔'' آخر میں جمیل احمد لانچ کے عملے سے مخاطب ہوا۔

❀ ❀ ❀

انجن اسٹارٹ نہیں ہو رہا تھا' صرف ایک آدھ سے کے لیے کھانس کر خاموش ہو جاتا تھا۔

''کیا ہوا؟'' جمیل احمد نے لانچ کے کیبن سے زوردار ہانک لگائی۔

''چیک کر کے دیکھتے ہیں۔'' انجن روم سے نثار کی جوابی آواز سنائی دی۔

نثار انجن کی مرمت کا ہنر جانتا تھا اور دوران سفر لانچ کے انجن کو آپریٹ کرتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ خرابی کوئی معمولی نوعیت کی نہیں ہے۔ تیل کی ٹینکی سے کچرا تیل کی لائن میں آ گیا تھا۔ دو تین دفعہ انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں انجن کے بعض اہم قسم کے کل پرزے ہل گئے تھے۔ انجن کو ٹھیک کرنے میں چار سے چھ گھنٹے بھی صرف ہو سکتے تھے مگر اس نے انجن کی اصل خرابی کے بارے میں جمیل احمد کو بتانے سے اجتناب کیا کیونکہ نثار نہیں چاہتا تھا کہ لانچ پر انتظار اور بے چینی کی کیفیت چھا جائے۔

''انجن کو بھی ابھی خراب ہونا تھا۔'' جمیل احمد کی بڑبڑاہٹ کیبن سے آئی لیکن نثار نے فی الحال انہیں آگاہی دلانے میں احتیاط برتی پھر وہ جھک کر انجن کا معائنہ کرنے لگا چند سے معائنے کے بعد نثار نے ایک طرف رکھا ہوا اوزار کٹ اٹھایا اور اسے کھول کر اوزار نکالنا شروع کیا۔

طارق اور موسیٰ عرشے پر بے چینی اور خاموشی کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ خلیل نثار کا ہاتھ بٹانے کے لیے انجن روم میں داخل ہو گیا۔ اصغر اور کامران لانچ کی کیبن سے خاموشی کے ساتھ نکل کر لانچ کے پچھلے حصے کی طرف چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے لگے جہاں چوبی اسٹیئرنگ وہیل نصیب تھی جبکہ جمیل احمد کیبن میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا جہاں گینڈے کے قیمتی سینگ سے بھرا ہوا بکس چوبی فرش پر رکھا ہوا تھا۔ وقت اپنی رفتار میں آگے بڑھ رہا تھا سوائے انجن روم کے لانچ کے بقایا ہر گوشے میں ایک خاموشی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نثار اور خلیل دونوں کی باتوں کی بازگشت اور کسی نٹ بولٹ کھولنے کی آواز انجن روم سے وقفے وقفے سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

''سانپ کی طرح کنڈلی مار کر خزانے پر بیٹھا ہوا ہے۔'' اچانک طارق نے سرگوشی کرتے ہوئے موسیٰ سے کہا اور موسیٰ ایک لمحے کے لیے چونک سا گیا۔

''اب یہ کروڑوں روپے مالیت کے سینگ اپنے ابو کے ہاتھوں میں دینا چاہتا ہے۔ میں اس کے ابو کو اچھی طرح سے جانتا ہوں' انتہائی بے ایمان اور حرام خور قسم کا آدمی ہے۔ اپنے ذاتی ملازموں کا حق پورا ادا نہیں کرتا' ایک آدمی سے دو آدمیوں کے برابر کام نکالتا ہے اور تنخواہ صحیح معنوں میں ایک ملازم کے برابر کی ادا نہیں کرتا۔ ہر تین چار مہینے بعد اس کے گھریلو ملازم بدلتے رہتے ہیں' ایک جان چھڑا کر بھاگ جاتا ہے تو کوئی دوسرا پھنس جاتا ہے۔ معلوم نہیں اصغر نے دس سال کیسے نکال لیے ہیں' ایسے آدمی کے ہاتھ کروڑوں روپے مالیت کے سینگ آ گئے تو ہمیں آٹے میں نمک کے برابر حصہ بھی شاید ملے۔'' طارق نے نفرت بھرے لہجے میں ایک دفعہ پھر خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''جمیل احمد نے کہا تھا کہ سب کو اس کا حصہ ملے گا اور اصغر کا دگنا حصہ ہوگا۔'' موسیٰ نے کہا۔

''دولت اچھے اچھوں کی نیت بدل ڈالتی ہے یہ رہے

بخیل اور زر پرست انسان باپ بیٹے دونوں کر جائیں گے یعنی کم دام میں فروخت کا بہانہ بنا کر ہمارے ہاتھوں میں چند نوٹ تھما دیں گے۔ اصغر ان کا ذاتی ملازم ہے وہ کیسے اس بات کو حلق سے اتار سکیں گے کہ ان کا ہمہ وقت حکم بجالانے والا' ان کا ادنیٰ ملازم آناً فاناً ایک دولت مند شخص بن جائے۔ لہٰذا اس کی باتوں پر کان مت دھرو میرے یار! یہ سب محض باتیں ہیں۔" طارق نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

"پھر کیا کریں؟" موسیٰ نے استفسار کیا۔

"بٹوارہ...... ابھی سے سینگوں کا عملی طور پر بٹوارہ لازمی ہے' محض لفظی تقسیم سے کام نہیں چلے گا۔" طارق بے ساختہ بولا۔

"لیکن ہم لوگ تو اپنے طور پر سینگ فروخت نہیں کرسکتے' الٹا کسی بڑی مصیبت میں بھی پھنس سکتے ہیں۔ ان سینگوں کو فروخت کرنا ایک انتہائی اہم معاملہ ہے۔ جمیل احمد کے کنجوس والد کے سوا اور ذریعہ بھی نہیں ہے ہمارے پاس۔" موسیٰ نے کہا۔

"کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکلے گا' اگر نہیں نکلا تو دوسری صورت میں جمیل احمد کے والد کے ہاتھوں فروخت کریں گے۔" طارق نے بتایا۔

"اور جو قیمت وہ ادا کرے گا اس کی مرضی' بات وہی ہوئی ناں۔" موسیٰ نے نکتہ اٹھایا۔

"میں نے کہا کہ اگر کوئی راستہ نہیں نکلا تو...... یعنی بحالت مجبوری جمیل احمد کے ابو کے ہاتھوں میں فروخت کریں گے۔" طارق نے دلائل دیتے ہوئے کہا' وہ اپنے طور پر اس بارے میں مباحثہ کر رہے تھے۔

"ہاں جی...... لیکن بٹوارے کے لیے جمیل احمد سے بات کرے گا کون؟" موسیٰ نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

"اصغر کو چھوڑ کر باقی لوگوں سے اس بارے میں مشورہ کرنا لازمی ہے۔" اصغر جمیل احمد کے قریب تر ہے اور اس کو دگنا حصہ ملنے کی امید ہے شاید وہ ہماری باتوں پر اتفاق نہ کرے۔" طارق نے کہا۔

"اگر کامران' نثار' خلیل تینوں میں سے ایک بھی ہمارے ساتھ نہ مل سکا یا تینوں نے انکار میں جواب دیا تو ہماری پوزیشن کمزور ہوجائے گی اور مسئلہ کھڑا ہوگا۔" موسیٰ

نے اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا اور طارق چند ثانیے غور کرنے کے بعد گویا ہوا۔

"ایسا بھی ہوسکتا ہے پھر میرے خیال میں خاموش رہنا بہتر ہوگا۔ اصغر اور کامران دونوں چوبی اسٹیرنگ وہیل کے قریب کھڑے ہوئے تھے اور خاموشی کے ساتھ آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ کے درمیان چمکتے دمکتے چاند کو تک رہے تھے۔

"دن ماہ و سال رات کی تاریکی میں تبدیل ہوتے ہیں ہماری زندگی بھی راتوں رات تبدیل ہوگئی ہے۔" کامران نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا' ہاں اگر ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو فی الحال ہماری زندگیوں میں تبدیلی آ گئی ہے۔" اصغر نے کہا' ایک دفعہ پھر دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔

"کیا ہوا بھائی' انجن کی خرابی نظر آ گئی؟" جمیل احمد کی بے قرار آواز کیبن سے آتی ہوئی سنائی دی۔

"جی ہاں' نقص مل گیا۔" انجن روم سے نثار کی آواز آئی۔

"کب ٹھیک ہوگا؟" ایک بار پھر جمیل احمد کی آواز سنائی دی۔

"چار سے پانچ گھنٹے لگ سکتے ہیں۔" نثار کی ایک دفعہ پھر جوابی آواز سنائی دی۔

"او ہو ابھی یہ کون سی خرابی آن پڑی ہے۔" جمیل احمد نے بڑبڑاتے ہوئے کہا لیکن انجن روم سے کوئی جواب نہ ملا۔

"اس کا مطلب ہے ہمیں صبح تک انتظار کرنا ہوگا۔" کامران نے اصغر سے کہا۔

"ہاں' صبح تک انتظار کرنا ہوگا۔" اصغر نے ریسٹ واچ کی لائٹ آن کرتے ہوئے ٹائم دیکھ کر کہا۔

"لیکن انجن میں نقص کیا ہے؟" موسیٰ نے آواز لگائی۔

"جالی ناکارہ ہونے کی وجہ سے تیل کی ٹینکی میں موجود کچرا گھس آیا جو انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی وجہ سے خرابی کا باعث بن گیا اور بعض کل پرزے بھی ہل چکے ہیں۔" نثار نے جواب دیا' اس نے تقریباً آدھا انجن پرزہ پرزہ کردیا تھا اور ناکارہ پرزوں کی جگہ نئے پرزے فٹ کررہا تھا۔

وقت گزرتا جارہا تھا' آدھی رات کا وقت آن پہنچا' نثار اور خلیل انجن کی مرمت کے محنت طلب کام کی وجہ سے بے حد تھک چکے تھے' آدھا کام ابھی باقی تھا۔

"بقایا کام صبح دن کی روشنی میں کرنا بہتر ہوگا' کچھ دیر آرام کرنا لازمی ہے۔" نثار نے ایک لمبی سانس لینے کے بعد ہاتھوں پر لگی ہوئی سیاہی کو رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا اور پھر چند ثانیوں بعد دونوں انجن روم سے نکل کر کیبن میں داخل ہوئے۔

"ہم لوگ کچھ دیر کے لیے آرام کررہے ہیں' صبح کے وقت دوبارہ کام شروع کریں گے۔" نثار نے کہا۔

"انجن تو ٹھیک ہوجائے گا نا؟" جمیل احمد نے جاننا چاہا۔

"بالکل' آپ لوگ بے فکر رہیں۔" نثار نے وثوق سے کہا۔

"چلو جی ٹھیک ہے۔" جمیل احمد نے کہا پھر وہ دونوں کیبن سے نکل کر اسٹیرنگ وہیل اور کیبن کے درمیان پہنچ کر رک گئے اور چوبی فرش سے ایک چوکور چوبی تختہ ہٹایا۔ تختہ ہٹنے کے بعد ایک خلا نمودار ہوگیا' جہاں مدھم سی روشنی تھی پھر وہ دونوں خلا میں یکے بعد دیگرے اترنے لگے۔ خلیل پیچھے تھا' اندر پہنچنے کے بعد خلیل نے دہانے کے قریب رکھا ہوا تھا۔ تختہ کھسکا کر دہانا بند کردیا اور پھر مختصر سیڑھیوں سے اترنے کے بعد تہہ خانے کے اندر پہنچ گیا' باہر سردی کافی تھی لیکن تہہ خانے کا ماحول متعدل تھا۔

"پتا نہیں ہمیں کتنا حصہ ملے گا۔" نثار نے اپنے بیڈ پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

"جمیل احمد کے مطابق ہر ایک کو اپنا حصہ ملے گا۔" خلیل نے کہا۔

"دولت کے معاملے میں ہمیشہ قول و فعل میں تضاد آجاتا ہے' دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے آگے آگے۔" نثار نے کہا۔ خلیل لائٹ آف کرنے کے بعد اپنے بستر پر لیٹ گیا اور پھر دونوں جلد نیند کی وادی میں کھو گئے۔

لانچ کے کیبن میں چھ سات افراد کے بیک وقت لیٹنے کی گنجائش تھی۔ کیبن کے چاروں کونوں سے لمبے چوڑے چوبی برتھ منسلک تھے۔ وہ پانچوں اپنے اپنے برتھ پر کمبل

اوڑھ کر لیٹ گئے' لائٹ آف تھی اور کیبن کا دروازہ اور کھڑکیاں بند تھیں۔ جمیل احمد حتی المقدور جاگتے رہنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جلد اس کی آنکھ لگ گئی' گینڈے کے سینگ سے بھرا ہوا بکس اس کی برتھ تلے رکھا ہوا تھا۔

❀......❀......❀

نیند طارق سے کوسوں دور تھی' وہ بڑی بے چینی کے ساتھ پل پل کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس کا ذہن ان گنت خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا' وہ برتھ پر لیٹے لیٹے باری باری اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا' چاروں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے پھر اس کی مضطرب نگاہیں کیبن کی بند کھڑکیوں پر گھومنے لگیں۔ بند کھڑکیوں کے شفاف گلاسز سے لانچ اور چاند کی ملگجی روشنیاں چھن چھن کر آرہی تھیں۔ طارق کی نگاہیں مغربی سمت والی کھڑکی پر خود بخود ٹھہر گئیں۔ جہاں سے چاند افق پر چمکتے دمکتے ستاروں کے درمیان واضح دکھائی دے رہا تھا۔ بند دریچہ نہیں گویا دلکش نظارے والی کوئی تصویر کیبن کی دیوار سے آویزاں تھی۔

طارق اٹھ کر بیٹھ گیا' کمبل برتھ کی پائنتی کی طرف سمیٹا اور برتھ پر موجود بغلی ہولسٹر اٹھایا پھر اسے جلدی اور بغیر کوئی آواز پیدا کیے بائیں بغل میں ڈالا جس میں اس کا ذاتی لائسنس یافتہ نائن ایم ایم پستول تین بھری ہوئی میگزین کے ساتھ موجود تھا۔ لانچ میں طارق اور جمیل احمد دونوں مسلح تھے باقی پانچوں افراد کے پاس کوئی آتشیں اسلحہ وغیرہ نہیں تھا۔ ہولسٹر کو بغل میں ڈالنے کے بعد طارق نے اوپر گرم سوئٹر پہنا اور پھر برتھ سے نیچے اتر کر جوتے بھی پہن لیے۔ ایک لمحے کے لیے اس کی مضطرب نگاہیں خود بخود جمیل احمد کی برتھ کے نیچے موجود بکس پر جم سی گئیں مگر دوسرے لمحے وہ محتاط انداز کے ساتھ کیبن کا دروازہ کھول کر باہر کھلی فضا میں آگیا اور پھر دوبارہ بناء کوئی آواز پیدا کیے آہستگی کے ساتھ دروازہ بند کیا۔ باہر آکر اسے طمانیت کا احساس ہوا پھر وہ لانچ کے اگلے حصے کی طرف چھوٹے چھوٹے ڈگ بھرنے لگا۔ اس کی نگاہیں نیلے افق پر ٹمٹماتے چاند اور تاروں پر تھیں۔

مطلع صاف تھا' کبھی کبھار یخ بستہ ہوا کے جھونکے چلتے تو طارق کے بدن میں ہلکی سی خوشگوار سرد لہر دوڑ جاتی۔ طارق عرشے کے آخری کونے پر پہنچ کر رک گیا اور قدرت کے حسین نظاروں میں کھو سا گیا۔

اوپر صاف و شفاف نیلا افق' نیچے پرسکون نیلگوں سمندر' نیلے افق کی وسعتوں میں روشن چاند اور تارے اور نیلگوں سمندر کی پرسکون سطح پر دور دور تک آسمان سے چھن چھن کر آتی ہوئی چاند تاروں کی روشنیاں اور دھیرے دھیرے سے لرزتے ہوئے ان کا مبہم عکس بڑا ہی دلفریب اور روح پرور نظارے پیش کر رہے تھے۔ طارق کے دل و دماغ سے بچھو کی طرح ڈنگ مارنے والے وسوسے اور اندیشے رفتہ رفتہ چھٹنا شروع ہوگئے۔

کھلی فضا میں کھڑا طارق قدرت کے حسین نظاروں کو اپنی روح میں اتار رہا تھا۔ وہ اس قدر قدرت کے حسین نظاروں میں ڈوبا ہوا تھا کہ اسے ذرہ برابر بھی گمان نہ ہوا کہ کوئی ڈھاٹا بندھ عقب سے بناء کوئی آہٹ پیدا کیے اس کے سر پر پہنچ گیا ہے جس کے ہاتھ میں ہتھوڑا بھی تھا' چہرے پر ڈھاٹا بندھ شخص نے طارق کے قریب پہنچنے کے فوراً بعد ہاتھ میں موجود ہتھوڑا ہوا میں گھمایا اور دوسرے لمحے بڑی سفاکی کے ساتھ ایک کاری ضرب طارق کے سر پر رسید کردی۔ طارق کے پورے وجود میں روح کو تڑپانے والا ایک شدید درد دوڑنے لگا۔ بے خبر طارق سمجھ بھی نہ پایا کہ کون سی افتاد اچانک اس کے سر پر آن پڑی۔ قدرت کے حسین نظاروں کو روح میں اتارنے والی آنکھوں کی روشنیاں یکدم بجھ گئیں۔ طارق لڑکھڑا کر نیچے ڈھیر ہوتا اس سے قبل ڈھاٹا نے بڑی پھرتی سے اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور پھر دھیمے انداز میں نیچے چوبی فرش پر لٹا دیا۔

طارق کا سر کھل گیا تھا اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی تھی۔ ڈھاٹا بندھ کی سانسیں بھی بے ربط تھیں اور ڈھاٹے میں سے جھانکتی ہوئی آنکھوں میں ایک جنونی کیفیت جھلک رہی تھی۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں پیچھے کیبن کی طرف دیکھنے لگا مگر وہاں کوئی نہیں تھا پھر اس نے جھک کر اپنے مرتعش ہاتھوں سے سامنے پڑے ہوئے طارق کے بے جان جسم پر موجود لباس کو ٹٹولنا شروع کیا۔

ہولسٹر سے نائن ایم ایم کا پستول اور میگزین نکالنے کے بعد اس نے انہیں اپنے جسم پر موجود گرم سوئٹر کے نیچے نیفے میں اڑس لیا۔ اس کی بے اعتدال سانسیں تیزی کے ساتھ چل رہی تھیں اور خوف کے مارے اس کے پورے

بدن میں ارتعاش تھا اس نے ایک دفعہ پھر گردن گھما کر پیچھے کی جانب دیکھا مگر وہاں پہلے کی طرح کوئی نہ تھا پھر اس نے طارق کی دونوں ٹانگوں کو چھوڑ دیا اور اب طارق کی لاش لانچ پر ایسے انداز میں موجود تھی کہ اس کی دونوں ٹانگیں نیچے سمندر کی جانب جھول رہی تھیں اور باقی سر دھڑ والا حصہ اوپر لانچ میں موجود تھا۔ قاتل نے جھک کر لاش کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور پھر بڑے احتیاط کے ساتھ طارق کی لاش سمندر میں اتارنا شروع کی چند ثانیے بعد ایک انتہائی دھیمی چھپاک کی آواز کے ساتھ طارق کی لاش سمندر برد ہونا شروع ہوگئی اور سطح سمندر پر چھوٹی چھوٹی لہروں کے گول دائرے سے نمودار ہونے لگے اور ان گول دائروں کے درمیان جب لاش مکمل طور پر اوجھل ہوگئی تو قاتل نے سکون کا سانس لیا اور نیچے پڑا ہوا آلہ قتل یعنی ہتھوڑا اٹھا کر سمندر میں اچھال دیا۔

شدید ضرب کی وجہ سے طارق موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا اور سر کھلنے کی وجہ سے کافی خون بہہ گیا تھا' نیچے چوبی فرش پر جا بجا خون کے گاڑھا دھبے جمے ہوئے تھے۔ قاتل کے جسم پر کالی پینٹ اور اسی رنگ کا گرم سوئٹر تھا' جس کے باعث طارق کے کھلے سر سے رستے خون کے چھینٹے اس کے لباس پر پڑنے کے باوجود بھی صریحاً غیر واضح تھے تاہم اس کے دونوں ہاتھ طارق کے لہو سے رنگے ہوئے تھے جنہیں اس نے اپنے کالے لباس پر پھیر کر صاف کیا اور پھر کالے رنگ کا گرم سوئٹر اتار کر نیچے فرش پر پھیلے ہوئے لہو کو صاف کرنا شروع کیا۔ چوبی فرش کے چوبی تختوں نے خون جذب کرلیا تھا اور انہیں چند ساعتوں میں صاف کرنا آسان نہیں تھا۔ قاتل خون کے دھبوں پر گرم سوئٹر رگڑنے لگا بالآخر اس نے اپنے تئیں ہنگامی طور پر خون کے دھبے صاف کیے لیکن دن کی روشنی میں باریک بینی سے دیکھنے پر ان ہلکے دھبوں کی حقیقت واضح ہونے کا امکان کافی تھا جو اب پونچھنے کے بعد ہلکے کالے رنگ کے دھبوں میں ڈھل چکے تھے لیکن قاتل کو ان دھبوں سے کوئی خاص سروکار نہیں تھا۔ وہ گینڈے کے قیمتی سینگوں کا بلا شرکت غیرے مالک بننے کے جنون میں انتہائی اقدام اٹھانے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

ایک بار پھر اس نے گرم سوئٹر سے اپنے ہاتھ صاف کیے اور پھر گرم سوئٹر کا بنڈل بنا کر اسے دور سمندر میں پھینک دیا پھر اس کے قدم کیبن کی طرف اٹھنے لگے۔

❀......❀......❀

صبح کا اجالا پھیل رہا تھا' نثار اور خلیل اٹھ کر انجن میں جت گئے' کیبن کے اندر برتھ پر لیٹے ہوئے جمیل احمد کی آنکھ کھل گئی۔ موسیٰ' کامران اور اصغر اپنے اپنے برتھ پر سو رہے تھے جبکہ طارق والا برتھ خالی تھا۔ جمیل احمد نے کیبن میں طارق کی عدم موجودگی کا اثر نہ لیا وہ خیال کررہا تھا کہ طارق باہر کسی معمول کی ضروریات کے لیے گیا ہوگا۔ تھوڑی دیر بعد باقی تینوں بھی جاگ گئے اور آپس میں معمول کی گفتگو کرنے کے بعد چاروں کیبن سے باہر نکل گئے۔

گینڈے کے سینگ سے بھرا ہوا بکس کیبن کے اندر موجود تھا۔ کیبن سے باہر نکلنے کے بعد جمیل احمد نے کیبن کا دروازہ لاک کردیا۔ وقت رفتہ رفتہ بیت رہا تھا' سورج مشرق کی سمت طلوع ہوچکا تھا لیکن طارق باہر بھی بڑی دیر کے بعد کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ سمندر کے بیچوں بیچ گہرے پانیوں میں لنگر انداز ایک درمیانے سے لانچ میں کسی کا اس طرح کافی دیر غائب رہنا اچنبھے کی بات تھی۔

نثار اور خلیل انجن میں سر کھپانے میں مصروف تھے۔ پہلے تو چاروں نے مل کر طارق کو پکارنا شروع کیا مگر کہیں سے کوئی جواب نہ آیا۔ حالات کی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے نثار اور خلیل انجن کی مرمت کا کام ادھورا چھوڑ کر عرشے پر آگئے پھر سب نے مل کر لانچ کا چپہ چپہ چھان مارا' باہر لانچ کے بیرونی سائیڈ میں جھانک کر دیکھا گیا مگر طارق کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔

''نیند میں چلنے کی تو عادت نہیں ہے؟'' نثار نے ساتھیوں سے معلوم کیا۔

''نہیں...... میں طارق کے زیادہ قریب رہا ہوں' ایسی کوئی عادت اسے لاحق نہیں ہے۔'' موسیٰ نے جواب دیا۔

''تو پھر کہاں چلا گیا یہ لڑکا؟'' نثار نے ایک دفعہ پھر سوال کیا۔

''یہ سوال تو سب کے ذہن میں ہلچل مچا رہا ہے۔'' موسیٰ نے کہا۔

''اور اس کا جواب بھی ظاہر ہے' دل گرفتہ ہوگا۔'' کامران نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"لانچ میں موجود نہیں ہے تو ظاہر ہے سمندر میں گر گیا ہوگا۔" اصغر نے بے ساختہ کہا۔

چھ کے چھ افراد عرشے پر کھڑے طارق کی پُراسرار گمشدگی کے متعلق اپنی اپنی رائے دے رہے تھے اور منطقی لحاظ سے وہ تمام اس بات پر متفق تھے کہ طارق لانچ میں نہیں ہے تو ضرور اس کی لاش سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں کہیں موجود ہوگی

جمیل احمد نے سب کو کیبن میں آنے کے لیے کہا اور خود کیبن کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور اپنی برتھ پر بیٹھ گیا جس کے نیچے گینڈے کے قیمتی سینگ سے بھرا ہوا بکس موجود تھا۔ باقی تمام افراد برتھ پر بیٹھنے لگے چند ثانیے کے لیے کیبن کے ماحول میں پُراسرار خاموشی چھائی رہی پھر جمیل احمد کی آواز نے سکوت توڑا۔

"ایک درمیانے لانچ میں ہم نے طارق کو کافی ڈھونڈا مگر وہ کہیں بھی نظر نہ آیا حتیٰ کہ لانچ سے باہر بھی کھوجا' وہاں بھی ہمیں نہ ملا۔ ساتھیو! اس بت میں اب کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کہ وہ رات کے وقت سمندر میں گر چکا ہے اور اس کی لاش سمندر کی تہہ میں کہیں موجود ہوگی۔ میں اسے ڈھونڈ کر نکالنا ہوگا' وہ ہمارا دوست وساتھی تھا اس کی لاش کو سمندری حیات کا خوراک بننے کے لیے چھوڑنا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔"

"نکالیں گے کیسے؟ اور نکالے گا کون؟ ہم تو ایسے کام نابلد اور ناتجربہ کار ہیں۔" کامران نے کہا اور پھر سب کی نگاہیں نثار اور خلیل پر ٹھہر گئیں۔

"سمندر میں طارق کی لاش نکالنے کا میرا مطلب نثار' خلیل اور اصغر سے ہے' ہم تینوں سے نہیں۔" جمیل احمد نے بتایا۔

"لاش کو سمندر میں ڈھونڈ نکالنے کے لیے ہمارے پاس کوئی انتظام بھی نہیں ہے۔ آکسیجن' ماسک وغیرہ ایسی کوئی شے نہیں ہے کہ ہم سمندر کی گہرائی میں اتر کر لاش کو ڈھونڈ کر نکال سکیں۔ یہاں پانی کافی گہرا ہے اور بغیر آکسیجن کے غوطہ لگا کر سانس روک کر سمندر کی تہہ میں پہنچ جانا اور پھر لاش کو تلاش کرنا انتہائی ناممکن ہے اور خونخوار شارک کی موجودگی کا خطرہ الگ سے ہے۔ لانچ کے انجن کو درست کرنے میں ایک گھنٹہ کا کام رہ گیا ہ لانچ کا انجن

ہیں ترے دل کا آئینہ آنکھیں

کتنی دل کش ہیں دل ربا آنکھیں
ہیں ترے دل کا آئینہ آنکھیں
میں بھی گہرائیوں میں ڈوب گئی
جب بھی تم نے کی ہیں وا آنکھیں
شہر جاناں میں رات دن مجھ کو
کیوں دیا کرتی ہیں صدا آنکھیں
جس نے بے خود بنا دیا مجھ کو
دے رہی ہیں اسے دعا آنکھیں
روتے روتے غموں کے صحرا میں
بن گئیں اس کی کربلا آنکھیں
جس کی منزل بھی بے نشاں ہے صدف
ڈھونڈتی ہیں وہ راستہ آنکھیں

نسیم سکینہ صدف

☆☆

غزل

اپنے ہونے کی دعا مانگتی ہوں
میں خدا سے یہ کیا مانگتی ہوں
کر کوئی رحم ترے جاں بہ لب
مژدہ جاں فزا مانگتی ہوں
میری تری مدح کو نہ ستائش کو
ہر گھڑی لفظ نیا مانگتی ہوں
جب بھی افلاک کا در کھلتا ہے
میں ترے حق میں دعا مانگتی ہوں
مجھ کو ملزم ابھی واپس دے دو
میں گرفتار وفا مانگتی ہوں
میں بقا کے طفیل سے صدف
جارہ راہ فنا مانگتی ہوں

نسیم سکینہ صدف

ٹھیک ہونے تک آپ لوگ سطح سمندر پر چاروں طرف دوربین کے ذریعے نگاہیں دوڑاتے رہیے ہوسکتا ہے کہ لاش گہرائی سے ابھر کر کہیں سمندر کی سطح پر آ جائے۔ مرنے کے بعد بعض اوقات لاش سمندر کی سطح پر مل گئی تو ٹھیک' دوسری صورت میں انجن ٹھیک ہونے کے بعد یہاں سے جانا ہوگا۔ ہمارا تجربہ یہی کہتا ہے۔'' نثار نے تفصیل سے بتایا۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم اپنے ساتھی کی لاش کو ڈھونڈے بغیر بے فکری کے ساتھ یہاں سے نکل کر اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ ہم کیا جواب دیں گے طارق کے گھر والوں کو اور کس منہ سے ان کا سامنا کرنا کریں گے؟'' اصغر نے مشتعل انداز میں کہا۔

''یہاں ٹھہر کر بھی ہم کیا کر سکتے ہیں اور کوئی چارہ ہے آپ لوگوں کے پاس؟'' خلیل نے اب کی بار کہا۔

''جال وغیرہ آپ لوگوں کے پاس ہوگا؟ سمندر میں جال پھیر کر لاش تلاش کی جاسکتی ہے۔'' موسیٰ نے کہا۔

''نہیں' ہمارے پاس جال یا اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔ لائف بوٹ اور چند لائف جیکٹس کے علاوہ اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔'' نثار نے نفی میں کہا۔

''پھر کیا کریں؟'' جمیل احمد نے سوچتے ہوئے سوال کیا۔

''میں نے ایک مشورہ دیا ہے' اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا' آپ لوگوں کی مرضی پر منحصر ہے۔ ہم آپ لوگوں سے الگ تھلگ نہیں۔'' نثار نے کہا۔

''مجھے یہ سب کچھ کسی ڈراؤنے خواب کے مانند محسوس ہو رہا ہے۔'' کامران نے غیر ارادی طور پر کہا۔

''چلو صحیح ہے' انجن ٹھیک ہونے تک ہم کھلے سمندر پر نظریں دوڑاتے رہیں گے اور پھر چلتے لانچ کے ذریعے آس پاس تلاش شروع کریں گے اور تلاش کا کام سہ پہر تک جاری رہے گا۔ اللہ کرے کہ اس دوران میں طارق کی تلاش ہمیں ملے اگر نہیں ملی تو یہاں سے روانہ ہوجائیں گے اور تو نہیں کم از کم ہمارے ضمیر تو مطمئن ہوسکیں گے۔'' جمیل احمد نے حتمی لہجے میں کہا' جس پر سب نے اتفاق کیا۔

نثار اور خلیل ایک دفعہ پھر انجن کی مرمت میں مصروف عمل ہو گئے اور باقی چاروں دوربین کے ذریعے پانی کی سطح پر طارق کی لاش کو کھوجنے میں مصروف ہو گئے۔ کامران کی ایک ہاتھ میں چائے کا کپ اور دوسرے ہاتھ میں دوربین موجود تھا۔ وہ کبھی دوربین آنکھوں سے ہٹا کر چائے کی چسکی لیتا اور کبھی دوربین آنکھوں سے لگا کر دور دور تک دیکھتا رہتا۔ اس نے دوربین نظروں سے ہٹایا اور چائے کی چسکی لی۔

عین اس وقت اس کی نگاہیں عرشے پر ہلکے سیاہ دھبوں پر پڑ گئیں' ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا کہ آئل کے دھبے ہوں گے پھر غیر ارادی طور پر دوربین آنکھوں سے لگا کر دھبوں کو بغور دیکھنے لگا۔ دھبے یکدم بڑے ہو کر اس کی نگاہوں کے بالکل سامنے آ گئے۔

''دوربین سے نیچے کیا دیکھ رہے ہو؟'' اچانک اصغر کی طنزیہ آواز اسے اپنے قریب سنائی دی۔ کامران نے فوراً نگاہوں سے دوربین ہٹاتے ہوئے شرمندگی سے کہا۔

''بس...... اچانک ہی ان دھبوں کو دوربین سے دیکھنے لگا۔'' اسے اب اپنا یہ عمل بالکل بچگانہ اور مضحکہ خیز محسوس ہو رہا تھا۔

''آئل کے دھبوں میں طارق کی لاش نہیں ملے گی تجھے' سمندر پر نظر رکھو۔'' ایک دفعہ پھر اصغر نے طنزیہ انداز میں کہا اور شرمندگی کا مارا کامران خاموش ہو گیا۔

وقت اپنی رفتار میں آگے کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا پھر لانچ کی فضاؤں میں انجن کا شور سنائی دینے لگا۔ لانچ پر عجیب سی پُراسرار کیفیت کا سماں چھایا ہوا تھا۔ نئے سال کی آمد کا منفرد جشن پھر گینڈے کے سینگ سے پُر فائبر بکس کا اچانک ملنا اور پھر طارق کی پراسرار گمشدگی' وقت کا بدلتا مزاج انوکھا اور نہایت حیران کن تھا۔

لانچ دھیمی رفتار کے ساتھ پانی کی سطح پر حرکت کرنے لگی۔ سب کی نگاہیں متلاشی انداز میں نیلگوں سمندر پر جمی ہوئی تھیں۔ وقت تیزی کے ساتھ گزرتا چلا جا رہا تھا۔ طارق کی تلاش کا یہ لہو نچوڑنے والا عمل سہ پہر تین بجے تک جاری رہا لیکن طارق کی لاش انہیں نہ ملی۔ لنچ کرنے کے بعد لانچ آگے کی طرف گامزن ہوئی' طارق کی گمشدگی کے باعث سوگواری کی کیفیت میں بھی انہیں بھوک کا احساس ہو رہا تھا اور تیار شدہ کھانے بھی ان کے پاس محفوظ تھے جن سے انہوں نے لنچ کیا۔

وہ آج سے دو دن قبل ہاربر سے روانہ ہوئے تھے پھر تقریباً چھبیس گھنٹے سفر طے کر کے سمندر کے بیچوں بیچ اس مقام پر پہنچ کر ٹھہر گئے تھے جہاں انہوں نے نئے سال کی آمد کا جشن منایا تھا اور جہاں چاروں اور تاحد نگاہ نیلگوں سمندر کا راج تھا۔ خشکی کا کہیں نام و نشان بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آج انہیں بندرگاہ تک پہنچنے کے لیے اتنا ہی طویل سفر کا سامنا تھا۔

لانچ پانی کی سطح کو چیرتی ہوئی آگے کی طرف رواں دواں تھی' جمیل احمد کیبن میں برتھ پر بیٹھا ہوا اسمارٹ فون سے چھیڑ خانی کر رہا تھا۔ گینڈے کے قیمتی سینگ سے بھرا ہوا بکس بدستور جمیل احمد والے برتھ کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ کامران اور اصغر بھی کیبن میں موجود تھے اور اپنے اپنے برتھ پر ٹیک لگائے خاموشی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ خلیل اسٹیئرنگ وہیل سنبھالے ہوئے تھا' نثار انجن آپریٹ کرنے میں مصروف تھا جبکہ موسیٰ عرشے پر اکیلا کھڑا سامنے کی طرف دیکھنے میں مگن تھا۔ عین اس وقت فضا میں اڑتا ہوا ایک سفید رنگ کا آبی پرندہ سمندر میں غوطہ زن ہوا' چند سیکنڈ کے لیے وہ پانی کی سطح کے نیچے غائب ہوا اور پھر جب زن کے ساتھ پانی سے دوبارہ نمودار ہوا تو اس کی لمبی چونچ میں ایک مچھلی تڑپ رہی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنا پر پھیلا کر محو پرواز ہو گیا۔ شکار کا یہ خوب صورت نظارہ موسیٰ کے دل کو لبھا گیا اور اعصاب پر چھائی ہوئی اداسی دور ہو گئی۔

سورج کسی سرخ ٹکیہ کی مانند بادلوں پر اپنی سرخی مائل روشنی بکھیرتا ہوا مغربی سمت جھکتا چلا جا رہا تھا۔ کھلے سمندر میں ڈوبتے سورج کا یہ منظر بڑا دلکش اور مسرور کن تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے سورج گویا نیلگوں سمندر میں اتر گیا اور مغربی افق پر محض سرخی مائل روشنی رہ گئی اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب سرخی مائل روشنی معدوم ہو گئی اور دھیرے دھیرے غیر محسوس انداز میں رات کی کالی چادر نیلگوں سمندر پر پھیلنے لگی۔

لانچ بدستور اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی پھر ایسا وقت آیا کہ لانچ کا انجن خاموش ہو گیا اور فضا میں سکوت چھا گیا۔ انجن بند ہوتے ہی لانچ کی رفتار سست ہونے لگی۔

''رات یہاں گزاریں گے' آرام کرنا ضروری ہے' باقی سفر صبح دن کی روشنی میں طے کریں گے۔'' سکوت کو چیرتی ہوئی نثار کی آواز سنائی دینے لگی۔

''ٹھیک ہے بھئی۔'' جمیل احمد نے جواباً زور سے کہا۔

''ہم بھی تھک چکے ہیں' آرام کرنا چاہتے ہیں۔'' اصغر نے بھی آمادگی کا اظہار کیا۔

باقی سفر نصف سے بھی زائد رہ گیا تھا لیکن مسلسل مصروفیات کی وجہ سے نثار اور خلیل دونوں جسمانی و ذہنی حوالے سے تھک چکے تھے اور باقی سواریوں کا حال بھی ان سے بہتر نہ تھا۔ بالآخر لانچ پانی کی سطح پر ٹھہر کر دائیں بائیں ڈولنے لگی۔ خلیل نے یکے بعد دیگرے آگے پیچھے دونوں لنگر ڈال دیئے اور لانچ ان کے قابو میں آ گئی۔

لانچ کی روشنیاں جل رہی تھیں' موسم بدستور خوشگوار تھا۔ سب نے مل کر خاموشی اور بے دلی کے ساتھ رات کا کھانا کھایا اور کھانے کے بعد اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے۔ نثار اور خلیل حسب معمول تہہ خانے میں اپنے اپنے بستروں پر دراز ہو گئے جبکہ باقی چاروں کیبن میں اپنے اپنے برتھ پر لیٹ گئے۔

❀ ❀ ❀

کھلے سمندر میں آج ان کی یہ تیسری رات تھی۔ سوگوار اور خاموش سی رات' پہلی رات کو دوران سفر ان کا رابطہ اپنے گھر والوں سے کافی دیر تک برقرار رہا تھا پھر رفتہ رفتہ سیل فونز کے سگنلز غائب ہونا شروع ہو گئے اور لانچ کا رابطہ باقی دنیا سے کٹ کے رہ گیا تھا۔ تاحال یہ باقی دنیا سے منقطع تھے جو اس بات کی غمازی بھی کر رہا تھا کہ منزل ابھی کافی دور ہے۔

نثار اور خلیل تہہ خانے میں گہری نیند سو رہے تھے۔ کیبن میں چاروں اپنے برتھ پر لیٹے ہوئے تھے' کامران کو بے چینی محسوس ہو رہی تھی' اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ باقی تینوں ساتھی کمبل سر تا پا اوڑھے نیند کے مزے لوٹتے ہوئے نظر آ رہے تھے' رات کا کھانا کھانے کے بعد کامران نے جمیل احمد سے کہا تھا۔

''ہمارے پاس گینڈے کے سینگوں کی صورت میں کافی دولت ہے جو ہماری ہے' پھر ہم اتنے مغموم و پریشان کیوں ہیں؟''

''ہمارا ایک دوست' کالج فیلو اور ساتھی اندوہناک

موت کا شکار ہو چکا ہے اس کی لاش تک ہمیں نہ ملی۔ یہ حادثے کے اثر کا نتیجہ ہے' میری چھٹی حس خطرے کا الارم بجا رہی ہے جب تک ہم خشکی پر نہیں پہنچتے تب تک حادثات کا شکار ہوتے رہیں گے۔'' آخر میں جمیل احمد نے اچانک پر خیال انداز میں کہا تھا۔

''وہم ہے یہ تیرا' تم ہر بات کا اثر گہرائی سے لیتے ہو بہر حال یہ بتایئے' طارق کا حصہ اس کے گھر والوں کو ملے گا؟'' کامران نے استفسار کیا تھا۔

''یہ قبل از وقت بات ہے' خشکی پر پہنچنے کے بعد اس بارے میں سوچا جائے گا۔'' جمیل احمد نے رکھائی سے جواب دیا۔

''میں سمجھا نہیں؟'' کامران نے کہا تھا۔

''جاؤ' سو جاؤ' کل صبح سمجھ آئے گا۔'' جمیل احمد نے شوخی سے کہا تھا اور وہ دونوں ہنستے ہوئے کیبن میں داخل ہوئے تھے۔

لیکن اب کامران کو نیند نہیں آ رہی تھی' رات لمحہ بہ لمحہ بیت رہی تھی۔ ان گنت سوچوں میں مستغرق کامران کو احساس بھی نہ ہوا کہ آدھی رات کا سمے آن پہنچا ہے پھر اس نے اپنے اسمارٹ فون کا بٹن پریس کیا اور اسکرین پر نگاہ ڈالی تو تلملا سا اٹھا' آدھی رات کا سمے تھا لیکن ابھی تک وہ جاگ رہا تھا۔ اس نے بے چینی کے عالم میں اپنے اوپر سے کمبل ہٹایا اور بیٹھ گیا پھر قریب رکھا ہوا گرم جیکٹ پہن کر بنا کوئی آہٹ پیدا کیے کیبن سے باہر نکل آیا۔

چاند آسمان کی وسعتوں میں ستاروں کے درمیان چمک رہا تھا۔ چاندنی بکھیرتی کھلی فضا میں آ کر کامران کو بھرپور طمانیت کا احساس ہوا۔ عرشے پر چند ساعت ٹہلنے کے بعد وہ لانچ کے پچھلے حصے کی طرف چلا گیا۔ پانی کی پرسکون سطح پر ہر طرف بکھرتی ہوئی چاندنی عجیب سماں پیش کر رہی تھی۔

سامنے نیلے افق کی شفاف وسعتوں میں آبی پرندوں کا ایک سفید جھنڈ محو پرواز تھا۔ جھنڈ کا رخ لانچ کی طرف تھا' کامران دلچسپی کے ساتھ جھنڈ کو دیکھنے میں محو تھا۔ آبی پرندے ایک ترتیب کے ساتھ ایک مخصوص آواز نکالتے ہوئے بڑی شان کے ساتھ لانچ پر سے گزر گئے۔ کامران کو یوں محسوس ہوا جیسے چاندنی رات میں پریوں کی کوئی بارات گیت گاتی سر پر سے گزر گئی ہو۔ یہ سب کامران کو ایک حسین خواب کی مانند محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی نگاہیں ہنوز چاندنی بھری فضا میں محو پرواز آبی پرندوں کے سفید جھنڈ پر ٹھہری ہوئی تھیں۔ اس کے اعصاب پر چھائی ہوئی کشیدگی قدرت کے ان حسین نظاروں کے سامنے ڈھیر ہو رہی تھی۔ کامران کو لمحہ بہ لمحہ سکون کا احساس ہو رہا تھا ان خوابیدہ نظاروں کے باعث کامران کی روح ترو تازہ ہو رہی تھی۔ آبی پرندوں کا سفید جھنڈ کامران کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

وقت لمحہ بہ لمحہ گزرتا چلا جا رہا تھا' کامران چوبی کرسی پر بیٹھ گیا جس کے سامنے چوبی اسٹیئرنگ وہیل نصب تھا لیکن کامران کا رخ اسٹیئرنگ وہیل کے مخالف سمت میں تھا کیونکہ سامنے اور سیدھے بیٹھنے سے کیبن آڑے آتی تھی اور منظر درست طور پر دکھائی نہیں دیتے تھے اور وہ چوبی کرسی کو گھسیٹ سکتا تھا اور نہ ہلا سکتا تھا کیونکہ وہ چوبی فرش پر نصب تھی۔ اس لیے وہ چوبی کرسی کی ٹیک پر بازو رکھے اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اس کی نگاہیں کبھی کھلے سمندر پر اور کبھی نیلے افق پر ٹھہر رہی تھیں پھر دفعتاً کامران کو اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اس سے قبل کہ وہ گردن گھما کر پیچھے کی جانب دیکھتا عین اس وقت کوئی بھاری اور ٹھوس شے اس کے سر سے آ ٹکرائی' اس کے سر سے خون کا فوارہ ابل پڑا' اس کی نگاہوں کے سامنے تاریکی چھانے لگی۔ ایک بے تاب درد نے اس کی جان کو جسم سے کھینچنا شروع کیا' کامران تڑپنے لگا وہ چوبی کرسی پر ایک جانب ڈھلک سا گیا پھر جلد اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی بھرپور وار کی وجہ سے کامران کو آواز نکالنے کا موقع نہیں ملا تھا اور وہ موقع پر دم توڑ گیا۔

ڈھاٹا بندھ قاتل چند لمحے تیز سانسیں لینے لگا پھر اپنے ہاتھ میں موجود موٹے آہنی سلاخ کو سمندر کی طرف اچھال دیا اور پھر ایک دبیز کپڑا اپنے لباس کے نیچے سے نکال کر کرسی پر موجود بے جان کامران کے کھلے ہوئے سر پر اچھی طرح باندھ لیا۔ دبیز کپڑا زخم سے رستے ہوئے لہو کو جذب کرنے لگا اور نیچے فرش پر خون کا ایک قطرہ بھی گرنے سے رہ گیا۔ چند ثانیے بعد قاتل نے آس پاس کا جائزہ لیا پھر کامران کی لاش کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر لانچ کے

آخری کونے کی طرف بڑھنے لگا جب کونے پر پہنچا تو لاش کو
اس طرح نیچے رکھ دیا کہ اس کی دونوں ٹانگیں نیچے پانی کی
سطح کی طرف جھولنے لگیں اور باقی حصہ جو سر اور دھڑ پر
مشتمل تھا' لانچ پر چت پڑا ہوا تھا پھر اس نے کامران کی
لاش کے دونوں بازو پکڑ کر اسے بڑی آہستگی کے ساتھ
سمندر میں اتارنا شروع کیا۔ چند ثانیوں بعد لاش بغیر کسی
چھپاک کی آواز پیدا کیے' سمندر برد ہوگئی۔ قاتل نے
کامران کی لاش کو جب پانی میں اوجھل ہوتے دیکھا تو
سکون کا سانس لیا۔ لاش سمندر میں اتارنے کی وجہ سے
پانی کی سطح پر قدرے ارتعاش سا پیدا ہوا تھا' جو اب پرسکون
ہو رہا تھا۔

قاتل کے لباس پر کامران کے خون کے دھبے لگے
تھے مگر سیاہ کلر ہونے کی وجہ سے خون کے دھبے کیموفلاج
ہو کر غیر واضح ہو چکے تھے۔ ڈھاٹا بندھ قاتل نیچے غور کے
ساتھ دیکھنے لگا مگر نیچے فرش پر کہیں بھی خون کا ایک قطرہ بھی
دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دبیز اور موٹا کپڑا زخم پر ڈالنے کی
وجہ سے ایک قطرہ بھی نیچے گرنے نہ پایا تھا۔ قاتل کا یہ دوسرا
شکار تھا جو پہلے کی نسبت اسے آسان محسوس ہوا تھا۔ قاتل
نے اپنے دونوں ہاتھوں کی طرف اچھی طرح دیکھا جو
صاف تھے پھر وہ بڑبڑاہٹ کے ساتھ آگے بڑھا۔

"گینڈے کے نادر سینگوں پر صرف میرا حق ہے کسی
اور کا نہیں۔"

❁❁❁

موسیٰ کی آنکھ علی الصباح کھلی' جمیل اور اصغر سوئے
ہوئے تھے جبکہ کامران کا برتھ خالی تھا۔ یہ دیکھ کر موسیٰ
چونک سا گیا اگر حالات عام اور معمولی نوعیت کے ہوتے تو
بستر کا خالی ہونا اچنبھے کی بات نہ تھی مگر طارق کی گمشدگی کے
بعد یہ عام سی اور نظر انداز کرنے والی بات نہیں رہ گئی تھی۔
موسیٰ اپنے بستر سے اٹھا' جوتے پہنے اور دروازہ کھول کر
کیبن سے باہر نکل آیا لیکن کامران کا کہیں نام و نشان نہ تھا
پھر وہ لانچ میں گھوم کر کامران کو دھیمی آواز میں پکارنے لگا
مگر کہیں سے بھی اسے جواب نہ ملا۔

اس نے کیبن کا دروازہ کھولا اور اندر وارد ہوتے ہی
جمیل احمد اور اصغر کو کامران کی گمشدگی کی اطلاع دی۔ جمیل
احمد اور اصغر ہڑبڑا کر اٹھ گئے پھر پوری لانچ کھنگال ڈالی مگر
کامران کا طارق کی طرح کہیں نام و نشان تک نہ ملا۔ ناکام
تلاش کے بعد پانچوں عرشے پر کیبن کے ساتھ بچھی ہوئی
کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے والی میز اس
وقت کھانے پینے کے لوازمات سے یکسر خالی تھی۔

"یہ اتفاق ہرگز نہیں ہو سکتا' کل طارق آج کامران
اور پتا نہیں کل کس کا نمبر نکل آئے۔ دونوں کی پراسرار
گمشدگی کا تعلق گینڈے کے نایاب سینگوں سے ہے۔
قاتل گینڈے کے قیمتی سینگ کو اکیلا ہتھیانا چاہتا ہے۔
خطرے والی بات یہ ہے کہ وہ دوست اور ساتھی کے لبادے
میں ہمارے درمیان موجود ہے' ہم پانچوں میں قاتل کوئی
بھی ہو سکتا ہے۔" جمیل احمد نے صورت حال کے پیش نظر
اپنا نقطہ نظر پیش کیا' اسے اپنے لباس کے اندر نائن ایم ایم
پستول کی موجودگی تحفظ کا احساس دلا رہی تھی۔

"ایک چھپے ہوئے انسان نما درندے سے چار انسانی
زندگیوں کو خطرہ لاحق ہے۔" موسیٰ نے جھرجھری لیتے
ہوئے کہا۔

"ہاں' بالکل ایسا ہی ہے۔" جمیل احمد نے اثبات میں
کہا۔

"ہو سکتا ہے' وہ ایک نہ ہو بلکہ دو بندے ہوں۔" اصغر
نے نثار اور خلیل پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی' ایسا بھی ہو سکتا ہے مگر یہ قبل از وقت بات
ہے' بہرحال یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ دشمن ہمارے
اندر موجود ہے۔" جمیل احمد نے کہا اس کی اور موسیٰ کی
نگاہیں بھی ایک لمحے کے لیے لاشعوری طور پر نثار اور خلیل پر
ٹھہر گئی تھیں۔ نثار اور خلیل دونوں' تینوں دوستوں کی باتوں
اور نگاہوں کا مطلب سمجھ گئے۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ طارق اور کامران کا
قاتل ہم دونوں کو ٹھہرا رہے ہو۔" نثار نے اصغر کی آنکھوں
میں آنکھیں ڈال کر بے دھڑک انداز میں کہا۔

"تم غلط سمجھ بیٹھے ہو نثار! میرا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم
پانچوں میں دو بندے مل کر باقیوں کو ایک ایک کر کے موت
کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔ وہ دونوں ہماری صفوں میں
موجود ہیں۔" اصغر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"تیرا اشارہ خاص طور پر ہماری طرف تھا۔" نثار نے
یاد دلایا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

"اصغر اور موسیٰ بھی ہو سکتے ہیں' اکیلا موسیٰ یا اصغر بھی ہو سکتا ہے۔ میں اور اصغر بھی ہو سکتے ہیں' اکیلا اصغر بھی ہو سکتا ہے جو قاتل ہے یا قاتل ہیں انہیں خوف نہیں۔ باقی جو بے قصور ہیں انہیں اپنی جان کا خدشہ لاحق ہے۔ وقت آنے پر قاتل خود بخود سامنے آ جائے گا' آپ لوگ بحث کو اب یہاں ختم کر دیں۔" جمیل احمد نے دلائل دیتے ہوئے کہا۔

"اب کیا کریں؟" موسیٰ نے جمیل احمد سے استفسار کیا۔

"یہاں سے جلد نکلنا ہوگا' میرے خیال میں آٹھ نو گھنٹے کا سفر ابھی باقی ہوگا اور اس دورانیے میں ہر ایک کو اپنا خیال خود رکنا ہوگا اور ایک دوسرے پر نظر رکھنا ہوگی کیونکہ دشمن دوست اور ساتھی کے لبادے میں ہماری صفوں میں موجود ہے۔ ظاہری دشمن کے مقابلے میں مخفی دشمن سے لڑنا انتہائی مشکل ہے۔ صورت حال کچھ ایسی ہی نازک اور حساس ہو تو انسان کو اپنے سائے سے بھی ڈر لگتا ہے' ہمارا مخفی دشمن آتشیں ہتھیار سے مسلح ہے۔" جمیل احمد نے آخر میں خبردار کرنے کے انداز میں کہا اور سب چونک پڑے۔

"وہ کیسے؟ ہم لوگوں میں سے اس وقت صرف آپ کے پاس اسلحہ موجود ہے۔" موسیٰ نے کہا۔

"آپ لوگوں کے علم میں ہے کہ میرے علاوہ طارق کے پاس بھی گن تھی' ہو سکتا ہے کہ قاتل نے طارق کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اس کی گن حاصل کی ہو۔" جمیل احمد نے جواباً کہا۔

"چھپا ہوا دشمن اگر آتشیں ہتھیار سے لیس ہے تو یہ انتہائی خطرناک بات ہوگی۔" خلیل نے کہا جواب تک خاموش تھا۔

"ہمیں ایک دوسرے کی جامہ تلاشی لینا ہوگی۔" نثار نے مشورہ دیا۔

"قاتل نے گن لانچ میں کہیں چھپا دی ہو پھر؟" اصغر نے نثار کا مشورہ اپنے سوال سے رد کیا۔

"تلاشی لینے میں کیا حرج ہے اگر کسی سے گن برآمد نہیں ہوئی تو آسمان سر پر نہیں گرے گا ناں۔ جمیل احمد نے درست کہا' قاتل نے طارق کی گن ضرور حاصل کی ہوگی کیونکہ اسے گن کی اس وقت یقیناً اشد ضرورت ہوگی۔ ابھی اور اسی وقت تلاشی شروع ہونی چاہیے جس کے پاس گن برآمد ہوا قاتل وہی ہے اور جمیل احمد کے پاس ایک سے زائد گن برآمد ہوگئی تو وہ قاتل ثابت ہوگا۔ مارِ آستین کو بے نقاب کرنے کے لیے یہ طریقہ نہایت کارآمد ثابت ہوگا۔" نثار منطقی انداز میں بولا۔

"تم اپنی اوقات میں رہو' اپنی بک بک بند کرو' میں نے تیری لانچ کرائے پر اس لیے لینے کو نہیں کہا کہ تم ہمیں لیکچر دینا شروع کرو۔ ہم پہلے ہی اپنے دو ساتھیوں کی پُراسرار گمشدگی کے باعث رنجیدہ ہیں اور اوپر سے تم ہمیں ایک دوسرے کی جامہ تلاشی کا مضحکہ خیز مشورہ دے کر ہمارے زخموں پر نمک چھڑکنے کی کوشش کر رہے ہو۔" اصغر بھڑکتا ہوا نثار سے مخاطب ہوا۔

"سوائے قاتل کے ہم سب رنجیدہ حال ہیں اور ہماری جان خطرے میں ہے۔ پریشانی و خوف کی کیفیت سب پر یکساں چھائی ہوئی ہے' اسی نسبت کے تحت کوئی کسی سے بڑھ کر یا کمتر نہیں ہے جمیل احمد صاحب! آپ تلاشی کے لیے ساتھیوں کو کہہ دیں۔" نثار نے دلائل دیتے ہوئے آخر میں استدعانہ انداز میں جمیل احمد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

نثار کی باتوں میں وزن تھا' ماحول میں ایک عجیب قسم سے تناؤ کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ ہر ایک اپنی ذات میں تنہا تھا اور اپنا ہر دوسرا ساتھی قاتل نظر آ رہا تھا' شک و خوف کا کچھ ایسا سماں بندھ چکا تھا جہاں بے اعتمادی کا راج تھا۔ خوشی اور مسرت کے حسین رنگوں سے مزین فضا کو لہو میں نہلانے کا سامان فراہم کرنے والے گینڈے کے قیمتی سیٹنگ کیبن میں رکھے بکس میں موجود تھی۔ سب کی نگاہیں جمیل احمد پر جمی ہوئی تھیں' اصغر نے بولنے کے لیے لب کھولے مگر جمیل احمد نے انہیں فوراً ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ جامہ تلاشی کا عمل عجیب و غریب اور مضحکہ خیز ضرور تھا لیکن موجودہ حالات کا تقاضہ بھی یہی تھا۔

جمیل احمد نے حالات کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے اپنی گن ہولسٹر سے نکالی اور اسے ہاتھ میں تیار رکھا۔

"خلیل! آپ موسیٰ کی تلاشی لیں۔" جمیل احمد نے خلیل سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا اور خلیل اور موسیٰ دونوں اپنی نشست سے فوراً اٹھ گئے' خلیل موسیٰ کی جامہ تلاشی لینے

لگا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں جمیل صاحب؟" اصغر نے اضطرابی انداز میں استفسار کیا۔

"جو حالات کا تقاضہ ہے۔" جمیل احمد نے مختصر جواب دیا۔ یہ سنتے ہی اصغر کے چہرے پر بے زاری و ناراضگی کے تاثرات عیاں ہونے لگے اور وہ اپنی جگہ سے فوراً اٹھ گیا۔ اٹھتے ہی اس نے بے زاری کے عالم میں اپنا چہرہ دوسری طرف گھمایا اور گھومتے ہی چشم زدن میں اس نے اپنی جیکٹ کے نیچے سے نائن ایم ایم کا پستول نکالا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بڑی پھرتی کے ساتھ اپنے مدمقابل براجمان جمیل کے دائیں ہاتھ پر گولی داغ دی جس میں پستول موجود تھا' گولی لگتے ہی پستول جمیل احمد کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ جمیل احمد کو اصغر سے یہ توقع تو بالکل نہیں تھی اگر شک ہوتا تو اصغر کے اٹھنے پر مستعد ہو جاتا' وہ تو یہ سمجھا تھا کہ اصغر اپنی باتوں کو ٹھکرائے جانے کی وجہ سے ناراضگی کا اظہار کر رہا ہے جو اس کی طبیعت کا خاصہ ہے۔

"حالات کا تقاضہ تھا کہ میں کھل کر سامنے آ جاؤں' جمیل احمد صاحب!" اصغر نے فائر کرتے ہی دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے خونخوار انداز میں جمیل احمد کو مخاطب کیا۔ اس کے پستول کا رخ جمیل احمد کی طرف تھا' اس کا یہ نیا روپ جمیل احمد کے لیے بالکل انوکھا تھا۔

"ہاتھ اوپر اٹھائیں سب لوگ ورنہ......" اصغر نے خبردار کرتے ہوئے کہا۔ سب نے خاموشی کے ساتھ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ جمیل احمد کے دایاں ہاتھ سے خون رس رہا تھا' گولی نے ہتھیلی کے گوشت کو چیر کے رکھ دیا تھا۔

"تم دونوں اپنی جگہ پر بیٹھو۔" اصغر نے خلیل اور موسیٰ کو تحکمانہ انداز میں کہا جو چند ثانیے قبل جمیل احمد کے حکم پر ایک دوسرے کی جامہ تلاشی لینے کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ اب دونوں فوراً اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔

جمیل احمد کے چہرے پر نفرت' حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات چھائے ہوئے تھے۔ باقی تینوں کے سر سے بلند ہاتھ خوف کے مارے لرز رہے تھے۔ چھپا ہوا سفاک قاتل کھل کر سامنے آ گیا تھا اور یہ چاروں اب اس کے رحم و کرم پر تھے۔ اصغر پستول تانے میز کے گرد گھوم کر جمیل احمد کے پیچھے پہنچا اور پھر فرش پر پڑا ہوا جمیل احمد کا

پستول اٹھایا' اسے ایک لمحے کے لیے بغور دیکھا جوان لاک تھا پھر سیفٹی کیچ اوپر دبا کر لاک کرنے کے بعد پستول جیکٹ کے نیچے موجود ہولسٹر میں رکھ لیا۔

''اب اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ طارق اور کامران کو میں نے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔'' اصغر نے ٹہلتے ہوئے دوبارہ جمیل کے سامنے پہنچتے ہوئے بڑی بے فکری سے کہا۔

''میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم کسی موڑ پر اتنے کمینے اور نمک حرام نکلو گے۔'' جمیل احمد نے اپنے ہونٹ چباتے ہوئے نفرت سے کہا۔

''کیا ساری زندگی تیرے اور تیرے باپ کی غلامی کرتا رہوں؟ گینڈے کے سینگوں پر صرف اور صرف میرا حق ہے۔ بکس کو سب سے پہلے میں نے دیکھا اور پھر لوگوں کو بتایا۔ میرا حصہ دگنا کیونکہ میں نے بکس دریافت کیا تھا اور باقی کا حصہ ایک ایک گنا' ہوں بیٹھے بٹھائے کھلے سمندر میں جمیل احمد تم نے کیا منصفانہ فیصلہ صادر کیا۔ واہ واہ......سب عارضی اور وقتی باتیں ہیں' وقت آنے پر دولت کی چکا چوند روشنی انسان کو اندھا کردیتی ہے۔ اپنے اور پرائے کی پہچان ختم کردیتی ہے اور میں نے تیرے والد احمد کے ساتھ اپنی زندگی کے دس سال بتائے ہیں' میں جانتا ہوں کہ وہ کس قبیل کا آدمی ہے۔ انتہائی شاطر ذہن کا مالک حرص و لالچ کا پیکر ایک ایسا انسان ہے جو دوسروں کی تجوریوں سے اپنی تجوری بھرنے کا ہنر جانتا ہے۔ یہ قیمتی سینگ جب آسانی کے ساتھ اس کے ہاتھ آجائیں گے تو یوں سمجھ لو بکرا شیر کے کچھار میں آگیا۔ صرف تیرا والد گینڈے کے سینگ فروخت نہیں کرسکتا' میرے بھی تعلقات کافی ایسے افراد سے ہیں جو گینڈے کے سینگ وغیرہ کا کاروبار کرتے ہیں۔ میں ایک ایک کرکے تم سب کو موت کے گھاٹ اتارتا چلا جاؤں گا۔'' اصغر نے انتہائی درشت لہجے میں کہا۔

''مجھے تو پہلے ہی تم پر شک تھا' ہمیں مارنے کے بعد تم زندہ سلامت یہاں سے کبھی نہیں نکل سکو گے۔'' نثار نے کہا۔

''او ملاح کے بچے' تیری وجہ سے میرا سارا منصوبہ چوپٹ ہوگیا اور مجھے وقت سے پہلے کھل کر سامنے آنا پڑا۔ میں خاموشی کے ساتھ کرایک ایک کو قتل کرتا چلا جارہا تھا اگر تیری جامہ تلاشی کا مشورہ آڑے نہ آتا تو آج میں کسی طرح چپکے سے لانچ کے انجن میں کسی قسم کی فنی خرابی ڈال کر منزل کی طرف جانے سے باز رکھتا اور پھر موقع ملتے ہی کسی کا سر طارق اور کامران کی طرح کسی بھاری شے سے کھول کر لاش سمندر میں پھینک دیتا۔ پستول کی صورت میں طاقت میرے ہاتھوں میں ہے اور میں بحری کام سے کچھ کچھ واقفیت بھی رکھتا ہوں پھر میرا یہاں گینڈے کے سینگ لے کر زندہ بچ کر نہ نکلنا عقل سے بعید والی بات ہوئی نا؟'' اصغر نے نخوت سے کہا۔

''قدرت کے کام ماورائے عقل ہوتے ہیں اصغر یہ نہ بھولو۔'' نثار نے بے دھڑک کہا۔

''اپنا منہ بند رکھو۔'' اصغر نے یہ سنتے ہی اشتعال کے عالم میں نثار کی گدی پر زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔

''پہلے جو انجن میں خرابی ہوئی تھی وہ اتفاقی تھی پھر میں نے اسے آئندہ اپنے منصوبے میں شامل کرنے کے بارے میں سوچا اس سے مجھے کافی وقت ملتا تھا کام کرنے کے لیے لیکن اب صورت حال یکسر بدل گئی ہے۔ حالات کا تقاضہ ہے کہ اب میں اپنا کام براہ راست اور جلد شروع کروں۔'' یہ کہتے ہی ایک دفعہ پھر اچانک اصغر نے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا' فضا میں ایک دفعہ پھر گولی کی آواز گونج اٹھی۔ چاروں ہینڈز اپ پوزیشن میں کرسیوں پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے پھر دھڑا دھڑا مزید تین فائر ہوئے اور موسیٰ کی چیخیں فضا میں بلند ہوگئیں۔ وہ جمیل احمد کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا اور گولیوں کی بوچھاڑ نے اسے کرسی سمیت نیچے دھڑام سے گرادیا تھا۔ جمیل احمد اپنے قریب نیچے فرش پر لہو میں لت پت تڑپتے ہوئے موسیٰ کو دیکھ کر خوف کے مارے ہذیانی انداز میں چیخ کر بولا۔

''ہم لوگوں کو مار کر تم میرے ابو کے قہر سے بچ نہ پاؤ گے۔''

''اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈر دنیا کو قائل کرنے کے لیے میرے پاس آئیڈیا اچھا ہے۔ ویسے بھی کسی کو کیا معلوم کہ کھلے سمندر میں ہوا کیا ہے۔ جب میں گینڈے کے سینگوں کی وجہ سے کروڑ پتی بن آؤں گا تو

"تیرے بیچارے ابو جان میرا بال بھی بیکا نہیں کرسکیں گے۔" اصغر نے خباثت بھرے لہجے میں کہا۔ اس دوران میں موسیٰ ساکت ہوگیا اور اس کی بے نور آنکھیں ادھ کھلی ہوئی تھیں۔ پہلی گولی موسیٰ کے بازو میں پیوست ہوگئی تھی اور باقی تینوں گولیوں نے اس کا سینہ چیر کے رکھ دیا تھا۔

موسیٰ کی موت کے بعد تینوں بڑی شدومد کے ساتھ کانپ رہے تھے۔ موت' سفاک و بے رحم قاتل کی صورت میں ان کے سر پر کھڑی ہوئی۔ چاروں اور تاحد نگاہ کھلا سمندر پھیلا ہوا تھا اور کہیں سے بھی کوئی وسیلہ اور ذرائع کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے جس سے زندگی بچانے کی اندھی امیدیں باندھی جاسکتی ہوں۔ سطح آب پر دائیں بائیں ڈولتی لنگر انداز لانچ میں خونی کھیل جاری تھا۔

"تم لوگوں کی مدد کے لیے کوئی مسیحا یہاں نہیں آئے گا۔" اصغر نے ان کی متلاشی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

"جو کہنا تھا میں نے تم لوگوں سے کہہ دیا اب میرے پاس فالتو وقت نہیں۔" اصغر نے سرد لہجے میں کہا پھر سرعت کے ساتھ اپنی جیکٹ سے جمیل احمد والا پستول برآمد کیا اور انگوٹھے کے ذریعے سیفٹی کیچ ہٹا کر رخ تینوں کی طرف کردیا۔ اب وہ دو خوفناک پستولوں کی زد میں تھے۔ وہ تینوں سے قدرے فاصلے پر کھڑا تھا پھر اس نے ایک پستول کا رخ جلیل کی طرف موڑ دیا اور فائر کھول دیا۔ لگاتار تین فائر کے بعد جلیل لڑھکتا ہوا نیچے ڈھیر ہوگیا اور خون میں لت پت کسی کٹتے ہوئے بکرے کی طرح ہاتھ پیر چلانے لگا پھر جلد ساکت ہوگیا۔ تینوں گولیاں اس کی گردن میں لگی تھیں۔

"جمیل احمد اٹھ جاؤ اور سمندر میں کود جاؤ۔" اصغر نے خونخوار انداز میں حکم دیا۔

"کیوں؟" جمیل احمد کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکلا۔

"کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تم بالواسطہ میری گولیوں سے مرو۔ جب تم صرف نو سال کے بچے تھے میں نے تیرے والد کی ڈرائیوری شروع کی' دس سال کی قرابت نے شاید مجھے کچھ کمزور کردیا ہے۔ اٹھو اور سمندر میں کود جاؤ۔" آخر میں اصغر غراتے ہوئے کہا۔

"دونوں صورتوں میں موت ہے۔" جمیل احمد بدستور اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا' بولا۔

"اس کا یہ مطلب ہر گز مت لیں کہ حکم عدولی کی صورت میں' میں تم پر گولی چلانے سے دریغ کروں گا۔ میں دس تک گنوں گا اگر تم نے سمندر میں چھلانگ نہ لگائی تو میں فائر کھول دوں گا۔" اصغر نے خبردار کرتے ہوئے کہا اور پھر گنتی شروع کی۔

"ایک' دو......"

جمیل احمد کے پاس اصغر کا سفاکانہ حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کے دونوں ہاتھ بدستور سر سے بلند تھے اور چہرے پر روہانسی چھائی ہوئی تھی۔ دل و دماغ عجیب کشمکش میں بُری طرح مبتلا تھے' اصغر گنتا چلا جا رہا تھا۔

"تین' چار......"

انسان عموماً موت سے بھاگ کر زندگی کی طرف قدم اٹھاتا ہے لیکن یہاں حالات قطعاً اس کے برعکس تھے۔ جمیل احمد ایک بھیانک موت سے بچنے کے لیے دوسری اذیت ناک موت کو گلے لگانے کے لیے قدم آگے کی طرف اٹھا رہا تھا۔ آگے موت' پیچھے موت وہ موت کے شکنجے میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔ جمیل احمد لانچ کے کونے پر پہنچ کر رک گیا' اصغر کی بے رحمانہ گنتی بدستور جاری تھی۔

"چھ......سات......"

جمیل احمد کی نگاہیں سمندر پر مرتکز تھیں' سمندر یقینی موت کی صورت میں جیسے اسے نگلنے کے لیے بے تاب تھا۔ جمیل احمد غیر ارادی طور پر پیچھے گھوم گیا اور متوحش نگاہوں سے اصغر کی طرف دیکھنے لگا۔

"نو......دس......"

"نمک حرام انسان! تجھے یہ مفت کا مال نصیب نہیں ہوگا۔" جمیل احمد نے یہ کہتے ہوئے اصغر کی طرف ایک زقند بھری۔ اصغر نے دھڑا دھڑ فائر شروع کیا' لپکتے جمیل احمد کا سینہ چھلنی ہوگیا۔ وہ اصغر سے چند قدم کے فاصلے پر اوندھے منہ گر گیا۔

"آخر مالک کا بیٹا بھی اپنے دوستوں کے پاس چلا گیا۔" اصغر نے ایک لمبی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

صرف چند منٹوں میں حالات یکسر بدل گئے تین جیتے جاگتے انسان اب لاش کی صورت میں نیچے پڑے ہوئے

تھی۔ نثار اب خون آشام انسان کے رحم و کرم پر اکیلا لانچ میں موجود تھا۔ یکبارگی اس کا دل چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے مگر پھر یہ سوچ کر ضبط کے بند کو قائم رکھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

''کیا سوچ رہے ہو' ان لاشوں کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دو اور فرش کو صاف کرو۔'' اصغر نے دہاڑتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ اس کے ہاتھوں میں موجود دونوں پستولوں کا رخ نثار کی طرف تھا۔

''میرے ہاتھوں میں اتنی سکت نہیں کہ میں اپنے ساتھیوں کی لاشوں کو اٹھا کر سمندر برد کرسکوں۔'' نثار نے معذوری کا اظہار کیا۔

''کیا...... تم شاید غلط سمجھ رہے ہو' یہ بات ذہن سے نکال دو کہ میں تیری مدد کے بغیر یہاں سے نہیں نکل سکتا۔ لاشوں کو اٹھا کر سمندر میں پھینکنا شروع کرو ورنہ میں تجھے لاش کی صورت میں بدل کر خود ان لاشوں کے ساتھ سمندر میں پھینک دوں گا۔'' اصغر نے دونوں پستول نثار کی طرف لہراتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ نثار بادل نخواستہ خلیل کی لاش کی طرف قدم اٹھانے لگا جو اس کے قریب فرش پر پڑی ہوئی تھی پھر وہ ایک ایک کرکے تینوں لاشوں کو بڑی مشکل کے ساتھ سمندر برد کرتا چلا گیا۔ اپنے ساتھیوں کی لاشوں کو سمندر میں پھینکنے کے اذیت ناک کام کے بعد وہ گیلے پونچھے سے عرشے پر خون صاف کرنے لگا۔

''ہاتھ اوپر اٹھاؤ اور کھڑے رہو۔'' خون صاف کرنے کے بعد اصغر نے کہا اور پھر قدم بڑھاتا ہوا نثار کے قریب آگیا۔ اس کے ہاتھ میں اب ایک پستول موجود تھا' دوسرا اس نے جیکٹ کے نیچے موجود ہولسٹر میں رکھ لیا تھا۔ قریب پہنچنے کے بعد وہ نثار کی جامہ تلاشی لینے لگا۔ پرس اور موبائل فون کے سوا اور کوئی اہم چیز برآمد نہیں ہوئی جنہیں اصغر نے سمندر کی طرف اچھال دیا۔

''چلو کیبن میں۔'' اصغر نے حکم دیا پھر اصغر پستول کی زد میں نثار کو لیے کیبن کے سامنے پہنچ گیا۔ اصغر پیچھے تھا اور نثار آگے' اصغر کے اشارے پر اس نے دونوں ہاتھ نیچے کیے اور کیبن کا دروازہ کھول دیا۔

''بکس کو اٹھاؤ اور انجن روم میں رکھ دو۔'' اصغر کیبن کے کھلے ہوئے دروازے کے سامنے کھڑا رہا اور نثار بکس اٹھانے کے لیے کیبن میں داخل ہوا' تھوڑی دیر کے بعد نثار بکس اپنے کندھے پر اٹھائے انجن روم میں داخل ہوا۔ اصغر نثار سے مناسب فاصلہ رکھ رہا تھا' بکس کو انجن روم میں رکھنے کے بعد اصغر نے نثار کو لنگر اٹھانے اور یہاں سے نکلنے کا حکم دیا۔ یرغمالی نثار نے تھوڑی دیر بعد لنگر اٹھائے اور انجن اسٹارٹ کیا۔ سائلنسر سے دھواں چھوڑتا ہوا انجن کھانس کر اسٹارٹ ہوا' لانچ پانی کی سطح پر دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ چوبی اسٹیئرنگ وہیل کے سامنے کوئی نہ تھا' فی الوقت یہ کوئی اہم بات نہ تھی پھر نثار نے اصغر کے حکم پر لانچ کا اسٹیئرنگ وہیل سنبھالا۔ اصغر نے اس کے عقب میں ایک کرسی سنبھالی ہوئی تھی اور اس کے پستول کی نال بدستور نثار کی طرف تھی۔

''مجھے پیاس لگی ہے۔'' نثار نے کہا۔ اصغر نے قدرے نیچے جھک کر لانچ کے چوبی فرش پر مشروبات کے کارٹن سے ایک منرل واٹر کی بوتل نکال کر نثار کی طرف اچھال دی جسے نثار نے پکڑ لیا اور ڈھکنا کھولنا کر غٹا غٹ پانی پینے لگا۔ مشروبات کا کارٹن اور کرسی جس پر اس وقت اصغر بیٹھا ہوا تھا' کچھ دیر پہلے نثار، اصغر کے حکم پر عرشے سے لے آیا تھا۔

لانچ منزل کی طرف رواں دواں تھی' ربن کے ذریعے ایک دوربین اصغر کے گلے سے لٹک رہی تھی۔ جس کے ذریعے کبھی کبھار اصغر کھلے سمندر کا چاروں طرف جائزہ لیتا' دونوں کے درمیان خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

''ہمیں فی الحال تین چار گھنٹے تک جنوب مشرق کی طرف سفر کرنا ہے اور تم ابھی سے لانچ کا رخ صرف مشرق کی سیدھ میں کر بیٹھے ہو۔'' اصغر نے اسٹیئرنگ وہیل کے پاس کمپاس پر نگاہ دوڑاتے ہوئے دہاڑ کر کہا۔

''یہ کوئی سڑک نہیں جہاں معمولی ٹرن کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ یہ کھلا سمندر ہے' معمولی موڑ کی یہاں کوئی حیثیت نہیں۔'' نثار نے رکھائی سے جواب دیا۔

''رسی جل گئی پر بل نہ گیا' اتنا کچھ ہونے کے باوجود ابھی تک تیری اکڑ مزاجی اپنی جگہ قائم ہے۔'' اصغر نے سخت لہجے میں کہا' ایک دفعہ پھر دونوں حریفوں کے درمیان خاموشی کی فضا چھا گئی۔

''میں تیرے ساتھ تعاون کر رہا ہوں تو بھی میرے ساتھ تعاون کر۔'' نثار نے خاموشی کو توڑتے ہوئے اچانک

کہا۔

"تم میرے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور ہو جبکہ میں بے وقوف نہیں کہ تیرے ساتھ تعاون کروں۔" اصغر نے نثار کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔

"بے شک تم مجھے یرغمال بنائے رکھو لیکن تعاون ضرور کرو۔ میرے اور تیرے سوا کسی کو کیا معلوم کہ کھلے سمندر میں کس نوعیت کا حادثہ پیش آیا ہے۔ مجھے اپنی جان سے سروکار ہے اور مال سے صرف دو سینگ کی مالیت کی رقم میرے لیے کافی ہے۔ تاحیات خاموش رہوں گا۔" نثار نے ایک دفعہ پھر معنی خیز انداز میں کہا اور اصغر اس کی بامعنی گفتگو کا مطلب سمجھ رہا تھا لیکن اسے نثار پر اعتبار نہیں تھا۔

"نہیں...... ہرگز نہیں، تم میرے ساتھ دھوکا کرو گے۔" اصغر نے نفی میں جواب دیا۔

"جب تک تمہیں مجھ سے کسی خطرے کا گمان ہو اس وقت تک مجھے اپنی پستول کی زد میں رکھنا۔" نثار نے کہا۔

"جب تک تم زندہ ہو مجھے تم سے خطرہ لاحق ہے، میں اپنے خلاف کوئی ثبوت چھوڑنا نہیں چاہتا۔" اصغر نے سفاک انداز میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے مار دو گے؟" نثار نے استفہامیانہ لہجے میں کہا۔

"تم بچے ہو نا میں بچہ ہوں، اب اپنی بک بک بند کرو۔" اصغر نے بھڑکتے ہوئے کہا اور پھر ایک دفعہ دونوں کے درمیان خاموشی کی فضا چھا گئی۔

لانچ کا زیر آب کا حصہ پانی کو چیر رہا تھا، لانچ غرغراتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اسٹیئرنگ وہیل کو سنبھالے نثار سوچوں کے بحر میں مستغرق تھا، اسے اصغر کے خطرناک ارادے کا علم تو پہلے ہی سے ہو چکا تھا وہ جانتا تھا کہ فی الحال وہ اصغر کی ضرورت ہے اور جب اس کی ضرورت ختم ہو گی تو اصغر اسے اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح مار ڈالے گا اس نے اس امید کے تحت اصغر کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے بات کی تھی کہ شاید اصغر اس کی باتوں سے متاثر ہو کر مان جائے۔ یہ حقیقت تھی کہ اسے اپنی زندگی عزیز تھی اور زندگی بچانے کے لیے وہ اصغر جیسے درندے سے بھی سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار تھا مگر اصغر کے انکار نے آخری امید بھی ختم کر ڈالی تھی۔ وہ مایوسی کے عالم میں اسٹیئرنگ وہیل تھامے بیٹھا ہوا تھا، لانچ کا سفر جاری تھا۔

❀ ❀ ❀

نثار کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت کو پر لگ گئے ہوں وہ بڑی تیزی کے ساتھ اڑتا چلا جا رہا تھا اور ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ نثار موت کے قریب تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اصغر سے مقررہ وقت تک استعمال کرنا چاہتا تھا پھر اس کے بعد گولیوں سے بھون ڈالتا۔ اصغر دوربین کے ذریعے سامنے کنارے کو ڈھونڈ رہا تھا مگر کنارے کے کہیں آثار بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

دوپہر کا وقت ہونے کو تھا، سورج نیلے افق کی وسعتوں میں پورے آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ دھوپ کی تپش میں فرحت بخش تیزی آ رہی تھی جو کھلے سمندر میں سردیوں کے موسم میں کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔

"ابھی تک خشکی کے آثار کیوں دکھائی نہیں دے رہے؟" اصغر نے دوربین نگاہوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"مزید دو تین گھنٹے کے سفر کے بعد نظر آئیں گے۔" نثار نے جواب دیا۔

"کیا بک رہے ہو، پہلے کہا جا رہا تھا کہ آٹھ نو گھنٹے کا سفر باقی ہے اس حساب سے ہمیں آئندہ دو گھنٹے سفر کے بعد خشکی پر ہونا چاہیے اور تم کہتے ہو کہ دو تین گھنٹے کے بعد بھی خشکی کے آثار نظر آئیں گے۔" اصغر نے گرجتے برستے ہوئے کہا۔

"میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ یہ کھلا سمندر ہے، کسی شہر کی سڑک نہیں کہ ہم کوئی سائن بورڈ دیکھ سکیں کہ ہم کس مقام پر ہیں اور اس جگہ سے کتنی دوری کے فاصلے پر واقع ہے۔ کھلے سمندر میں فاصلوں کے معاملے میں اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔" نثار کے یاد دلاتے ہوئے قدرے وضاحت سے کہا۔

"اچھا...... ابھی تک تیری ہٹ دھرمی برقرار ہے۔" اصغر نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔

دھوپ کی تمازت سے چمکتی نیلی سطح آب کو چیرتی لانچ آگے کی جانب محو سفر تھی۔

"یاد رہے لانچ کا رخ ہاربر کی سمت نہ رکھنا، ہاربر سے جنوب کی طرف کافی فاصلے پر رکھنا۔" اصغر نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" نثار نے کہا۔

دراصل اصغر اپنے لیے یہ بہتر تصور کر رہا تھا کہ خشکی کے آثار شام ڈھلتے وقت تک نظر آنا چاہیے تھے۔ اسے جلدی نہ تھی لیکن اسے خدشہ تھا کہ کہیں نثار بے خبری میں اسے کہیں اور نہ پہنچا دے۔ اس لیے وہ نثار پر برابر اپنا دباؤ بڑھا رہا تھا۔ شام ڈھلنے میں بھی تقریباً آدھا دن باقی تھا' اسے جلدی ہوئی تو لانچ کی اسپیڈ بڑھانے کا حکم دیتا۔

سردیوں کے مختصر دن تھے' سورج جلد غروب ہونے والا تھا' وقت اپنے دوش پر لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ دوپہر سے سہ پہر سہ پہر سے شام ہوگئی اصغر کو دوربین سے اچانک انتہائی دوری کے فاصلے پر ریت کے ٹیلے اور درخت نظر آنا شروع ہوگئے۔

''انجن کو بند کرو اور لنگر ڈالو۔'' اصغر نے دوربین کے ذریعے خشکی کے آثار دیکھتے ہوئے نثار کو حکم دیا اور پھر فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ نثار بوجھل ہاتھوں کے ساتھ اسٹیرنگ وہیل چھوڑ کر کھڑا ہوگیا اور پھر پستول کی زد میں انجن روم کی طرف سست روی کے ساتھ قدم اٹھانے لگا تھوڑی دیر بعد انجن خاموش ہوگیا پھر چند ثانیے بعد اپنی رو میں آگے بڑھتی لانچ لنگر کے سہارے سطح آب پر ٹھہر گیا۔

دونوں کام نمٹانے کے بعد اصغر عرشے پر موجود میز کے اردگرد بچھی ہوئی کرسیوں کی طرف نثار کو پستول کی زد میں لیے پہنچا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' اصغر نے ایک کرسی سنبھالتے ہوئے نثار کو حکم دیا' نثار کے دونوں ہاتھ سر سے بلند تھے وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

میز پر کھانے پینے کی اشیا موجود تھی' اصغر کو بھوک محسوس ہو رہی تھی اس نے بسکٹ کا ڈبا جلدی سے کھولا اور کھانے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ نثار بھی بھوکا پیاسا ہوگا لیکن وہ نثار کو کھلا پلا کر توانا نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ ایک بھوکے پیاسے نثار کے مقابلے میں اسے پیٹ بھرے نثار سے زیادہ خطرہ لاحق تھا۔ بہرحال اس نے دوپہر کے وقت نثار کے طلب کرنے پر اسے دو دفعہ پانی پلایا تھا لیکن اب وہ ایک قطرہ پانی بھی پلانے کے حق میں نہ تھا۔ پہلے اسے نثار کی زیادہ ضرورت تھی لیکن اب نہیں۔

''بھوکے ہو؟'' اصغر نے سوال کیا۔

''نہیں۔'' نثار نے نفی میں کہا۔

''پیاسے ضرور ہوگے؟'' اصغر نے کہا۔

''بالکل۔'' نثار نے اثبات میں کہا۔

''اچھا تو یوں کرتے ہیں کہ شام ڈھلتے ہی پھر کچھ دوری پر جانے کے بعد لانچ دوبارہ لنگر انداز کریں گے۔'' اصغر نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

''تم نے میری بات نہیں مانی' مجھے مال سے ایک روپیہ بھی نہیں چاہیے' مجھے صرف اپنی زندگی چاہیے۔'' نثار نے ایک دفعہ پھر کوشش شروع کی۔

''میں اپنے خلاف کسی بھی قسم کا ثبوت چھوڑنا نہیں چاہتا' پھر تمہیں میں کیسے زندہ چھوڑ کر اپنے منصوبے میں شامل کرسکتا ہوں اور وہ بھی آخری وقتوں میں...... تمہیں میں ایسا ہرگز نہیں کرسکتا۔'' اصغر نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''یقین نہیں ہے' میں قسم اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔'' نثار نے زور دے کر کہا۔

''میں نے کہا نا کہ نہیں۔'' اصغر نے سرد لہجے میں کہا۔

''کیوں؟'' نا چاہتے ہوئے بھی نثار کی زبان سے نکلا۔

''آج کل وعدے اور قسموں کا پاس رکھنا' بے وقوفی تصور کیا جاتا ہے۔ موقع پرستی کے اس دور میں لوگ موقع محل کی مناسبت سے وعدے بھی کرتے ہیں۔ طرح طرح کی قسمیں بھی اٹھاتے ہیں اور پھر آنے والے وقتوں میں اسی طرح موقع محل کی مناسبت سے قسمیں اور وعدے توڑنے سے پل بھر کے لیے بھی نہیں ہچکچاتے اور میں تو ویسے بھی ایک حریص قاتل ہوں۔ رہائی ملنے کے بعد تیرے خیالات بھی بدل سکتے ہیں۔'' اصغر نے تفصیل سے بتایا۔

''لیکن میں ایسا انسان نہیں ہوں۔'' نثار نے وثوق سے کہا۔

''ایسے انداز کی مصیبت میں پھنسا ہوا ہر انسان اسی طرح سوچتا ہے لیکن رہائی ملنے کے بعد جب اسے مکمل تحفظ کا احساس ہوتا ہے تو وہ منتقم المزاج بن جاتا ہے۔'' اصغر نے کہا۔

''لیکن تم جو......''

''بس' اب زیادہ بکواس میں سننا نہیں چاہتا۔'' اصغر نے نثار کی بات کو کاٹتے ہوئے درشت لہجے میں کہا اور نثار

سہم سا گیا پھر دونوں کے درمیان خاموشی کی فضا چھا گئی۔
شام ڈھلنے لگی' غروب آفتاب کا وقت آن پہنچا۔ مغرب کی سمت سورج کی سرخ ٹکیہ نیلے افق سے نیلگوں سمندر میں غوطہ زن ہونے کے لیے تیار تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے سورج گویا سمندر میں غوطہ زن ہو گیا اور پھر لحہ بہ لحہ نیلگوں سمندر پر رات کی کالی چادر پھیلنا شروع ہو گئی۔ ایک دفعہ پھر اصغر کے حکم پر لنگر اٹھائے گئے۔ انجن کھانس کر اسٹارٹ ہوا اور لانچ آگے بڑھنے لگی' شہر کی روشنیاں دور شراروں کی مانند نظر آ رہے تھے۔ نثار کا بوجھل دل چاہ رہا تھا کہ وہ کسی پرندے کی مانند اڑان بھر کر ان شراروں کے درمیان کہیں گم ہو جائے' ان چمکتی روشنیوں کے درمیان کہیں اس کا گھر تھا' گھر والے تھے' عزیز و اقارب تھے' اس کی پوری زندگی روشنیوں کے اس شہر میں گزر چکی تھی۔ وہ نثار کی جنم بھومی تھی۔ نثار حسرت بھری نگاہ سے روشنیوں کے وسیع جھرمٹ کو تکے جا رہے تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا چمکتا دمکتا شہر اسے اپنی طرف بلا رہا ہو۔ اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں' وہ بے اختیار و بے بس تھا اور اس بے بسی سے نجات کے لیے وہ موقع کی تاک میں تھا۔ اصغر ایسا محتاط تھا کہ وہ اپنے اور نثار کے درمیان ایک مناسب فاصلہ رکھتا تھا۔

''انجن بند کر دو اور لنگر ڈال دو۔'' ایک دفعہ پھر اصغر کا مکروہ حکم اسے سنائی دینے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اب یہ ان کا آخری پڑاؤ ہے اور موت سے اس کا فاصلہ کم رہ گیا ہے۔

''لانچ کی لائٹس آن کرو؟'' نثار نے کہا۔

''نہیں' بالکل نہیں۔'' اصغر نے نفی میں کہا۔ لانچ کی تمام روشنیاں بجھی ہوئی تھیں' انجن ایک دفعہ پھر کھانس کر خاموش ہو گیا پھر نثار نے لنگر گرانا شروع کیا جب اس نے لنگر سمندر میں پھینکا تو اصغر اس کے کچھ قریب سا آ گیا۔ لانچ کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں لیکن رات قدرے روشن تھی اور ان دونوں کی آنکھیں بھی اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں۔ دونوں کو اپنے قریب چیزیں نیم تاریکی میں قدرے واضح نظر آ رہی تھیں۔ لانچ چوڑائی میں مختصر تھی نثار اور اصغر دونوں عرشے پر موجود تھے۔ نثار نے اپنے عقب میں اصغر کو اپنے قریب محسوس کیا تو گویا اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی مگر دوسرے لمحے اصغر چند قدم پیچھے کی

حکمت کے موتی

+ ایمان داری سے خرید و فروخت کرنے والے کا انجام نیکوکار اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔

+ بنی اسرائیل اس لیے تباہ ہوئے کہ وہ غریبوں کو سزا دیتے تھے اور امیروں کو چھوڑ دیتے تھے۔

+ جو لوگوں کا شکریہ ادا نہ کرے وہ خدا کا شکر گزار نہیں ہو سکتا۔

+ سب سے بہتر جہاد یہ ہے کہ تم انتقام کی قدرت رکھتے ہوئے بھی غصہ کو پی جاؤ۔

+ علم مال سے بہتر ہے کہ وہ تمہاری حفاظت کرتا ہے اور تم مال کی حفاظت کرتے ہو۔

+ صرف خواہش کرنے سے ہر چیز نہیں مل جاتی' خواہش کے ساتھ جدوجہد بھی لازمی ہے۔

+ کسی کی خوبیوں کی تعریف کرنے میں اپنا وقت برباد نہ کرو بلکہ اس کی خوبیاں اپنانے کی کوشش کرو۔

+ اللہ سے اس کا فضل طلب کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ اس سے مانگا جائے۔

سونی علی...... ریشم گلی' مورو سندھ

☆☆

قطعہ

یہ سب میری بربادی کا کب پوچھ رہے ہیں
کیوں زندہ ہوں اب تک یہ سبب پوچھ رہے ہیں
وہ شدت غم ہے میری جاں پر بنی ہے
اور دوست سوالات عجب پوچھ رہے ہیں

راؤ تہذیب' حسین تہذیب...... رحیم یار خان

طرف ایسے اٹھانے لگا جیسے اسے نثار کی اندرونی کیفیت کا علم ہو گیا ہو۔ اب دونوں کے درمیان فاصلہ تھا' موقع ہاتھ سے نکل گیا تھا' نثار کا دل شدت کے ساتھ دھڑکنے لگا۔

''جانتے ہو اس وقت میں کیا سوچ رہا ہوں؟'' اصغر نے کہا۔

''ایک حریص قاتل مارنے اور بھاگنے کے سوا کیا سوچ سکتا ہے لیکن اصغر تمہیں اپنے کیے کی سزا ضرور کسی نہ کسی صورت ضرور ملے گی۔ کوئی نہ کوئی تجھے ضرور دبوچ

لے گا' اکیلے دولت تم نہیں ہڑپ کرسکو گے۔" نثار نے جواب دیا۔

"ویسے بھی کھلے سمندر میں لانچ ڈوبنے کے حادثات پیش آتے رہتے ہیں' کسی کو کیا معلوم کہ اصل حقائق کیا تھے' ڈوبنے والی لانچ سے کوئی نہ کوئی معجزانہ طور پر زندہ سلامت بچ جاتا ہے۔ مجھے تو ویسے بھی تیرنا اچھی طرح سے آتا ہے' پھر مجھے کون دبوچ سکے گا؟" آخر میں اصغر نے نخوت سے کہا اور غیر ارادی طور پر ایک بار پھر نثار کے قریب آگیا۔

ذہنی طور پر تیار نثار یکلخت گھوما اور پھر اپنے سامنے ایستادہ پستول سے مسلح اصغر کو دونوں ہاتھوں سے زور کا دھکا دیا' اصغر اس اچانک ہونے والے حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ سینے پر بھرپور دھکا کھانے کے بعد وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑاتا ہوا لانچ کے کونے میں ڈھیر ہوگیا اور اس کے ایک پیر سے جوتا نکل گیا' وہ نیچے سمندر میں گرنے سے بال بال بچ گیا تھا اگر لڑکھڑاتے وقت جوتے کی ایڑی نیچے عرشے کی دراڑ میں اٹک نہ جاتی تو وہ یقیناً سمندر میں گر جاتا۔ جوتے کی ایڑی دراڑ میں پھنس جانے کی وجہ سے اصغر کے لڑکھڑاتے جسم کو اچانک جھٹکا لگا تھا۔ جوتا پیر سے نکل گیا اور وہ لانچ کے اندر ڈھیر ہوگیا تھا لیکن گرتے ہی اصغر نے اپنے حواس پر سیکنڈوں میں قابو پایا۔ پستول اس کے ہاتھ میں موجود تھا' نثار ایک دفعہ پھر گھوما اور سمندر میں چھلانگ لگاتا لیکن اس سے پیش تر اصغر نے فائر کھول دیا' نثار کو شدید جھٹکا لگا۔ بائیں پہلو میں گویا انگارے سے بھرنے لگے لیکن پھر بھی وہ ہمت مجتمع کرتے ہوئے سمندر میں غوطہ زن ہوگیا۔ اصغر پستول سنبھالتا ہوا اٹھ گیا' گرنے کی وجہ سے اسے کہیں بھی چوٹ نہیں لگی تھی۔

❀ ❀ ❀

پانی گہرا تھا' چھلانگ لگانے کے بعد نثار پانی کی گہرائی میں اترتا چلا گیا۔ وہ دم خم رکھنے والا ماہر تیراک تھا لیکن پسلیوں میں پیوست ہونے والی گولی کا زخم اس وقت اس کی جسمانی طاقت اور اسٹیمنا کو لمحہ بہ لمحہ سلب کرتا چلا جارہا تھا۔ گھاؤ سے لہو بہہ کر پانی میں شامل ہورہا تھا اس کا سانس بے تحاشہ پھول رہا تھا اگر وہ زخمی نہ ہوتا تو غوطہ لگانے کے بعد سمندر کی تہہ میں کسی مچھلی کی مانند پانی کو تیزی سے چیرتا ہوا لانچ سے کافی دور سطح آب پر سانس لینے کے لیے نکل آتا اور پھر یہ سلسلہ جاری رکھتے ہوئے گولیوں کے دائرے سے بحفاظت نکل جاتا لیکن اب اسے یہ سب کچھ انتہائی دشوار محسوس ہورہا تھا۔ اس کا سانس تیزی کے ساتھ پھول رہا تھا۔

اصغر کی چلائی ہوئی گولی اپنا کام کرگئی تھی اب اس کے علاوہ کوئی چارہ باقی نہ تھا کہ وہ لانچ سے کم فاصلے پر پانی سے اپنا سر نکالتا۔ نثار نے اپنے ہاتھ پیر سست روی سے چلاتے ہوئے سمندر کی تہہ میں اوپر کی جانب تیرنا شروع کیا چند ثانیے بعد اس کا سر سطح آب سے نمودار ہوگیا۔ نثار نے ایک لمبی سانس کھینچی پھر لانچ کی طرف دیکھنے لگا' لانچ سے لڑکھڑاتی ہوئی ٹارچ کی روشنی سطح آب پر گھوم رہی تھی۔

اصغر پاگلوں کی طرح اسے ٹارچ کی روشنی کی مدد سے کھلے سمندر میں ڈھونڈ رہا تھا' نثار کو لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی نقاہت کا احساس ہورہا تھا۔ اسے پختہ یقین تھا کہ وہ بچ نہیں پائے گا' شدید زخمی حالت میں گہرے پانی میں دیر تک زندہ رہنا ناممکن تھا پھر نثار کا سر جلد ٹارچ کی سفید روشنی کے دائرے میں آگیا۔ ڈبڈباتی ہوئی آنکھیں چکاچوند ہوگئیں' اس سے قبل کہ لانچ سے برستی ہوئی گولیاں اس کا بھیجا اڑا دیتیں' اس نے بمشکل اپنے بھاری ہوتے ہونٹوں کو ہلاتے ہوئے زور سے کہا۔

"تم نہیں بچ سکو گے اصغر! تیری طاقت قدرت کی طاقت کے سامنے ڈھیر ہوجائے گی۔" اس کے ساتھ ہی لانچ سے نثار کی طرف سے تڑتڑاہٹ کی آواز کے ساتھ شعلے لپکے' نثار کا سر بری طرح ادھڑ گیا اور وہ پانی کی سطح سے غائب ہوگیا۔

"مرتے مرتے بھی اپنی زہر آلود بات کہہ گیا۔" اصغر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور پستول لاک کرکے جیکٹ کے نیچے ہولسٹر میں رکھنے کے بعد اپنا موبائل فون نکال کر دیکھنے لگا۔ دونوں سمز کے سگنل بدستور غائب تھے' وہ ہنوز فون نیٹ ورکس رینج سے باہر تھا پھر اس نے سر کھجاتے ہوئے موبائل فون آف کیا اور اسے جیب میں ڈالا پھر آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور آئندہ آنے والے وقت کے بارے میں غور و خوض کرنے لگا۔

❀ ❀ ❀

اصغر تہہ خانے میں موجود تھا' وہ گنتی اور چھینی کے

ذریعے لانچ میں شگاف ڈالنے میں کوشاں تھا جب چھینی پر گینتی کی زور دار ضرب ثابت ہوئی، گینتی ایک طرف پھینک کر اصغر نے ٹارچ کی روشنی نیچے پھینکی موٹی اور لمبی چھینی پیوست ہونے کے باعث لمبی اور چوڑی دراڑ پڑ چکی تھی جس میں سے پانی لانچ کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اصغر تہ خانے سے سرعت کے ساتھ نکل آیا اور باہر لٹکی ہوئی لائف جیکٹس میں سے ایک جیکٹ نکال کر گرم جیکٹ پر پہننے لگا۔

لائف بوٹ لانچ کے پہلو میں سطح آب پر موجود تھی، جو لانچ سے رسّی کے ذریعے بندھی ہوئی تھی اور اس میں ضرورت کی تمام اشیا موجود تھیں۔ لانچ میں سوراخ ڈالنے سے قبل اصغر نے اسے سمندر میں اتارا تھا اور اس وقت یہ تیار حالت میں سطح آب پر دائیں بائیں ڈول رہی تھی۔

لائف جیکٹ پہننے کے بعد اصغر تیزی کے ساتھ انجن روم میں داخل ہو گیا اور پھر گینڈے کے سینگ سے بھرا ہوا بکس اٹھا کر باہر نکل آیا۔ بکس کو لانچ کے کنارے پر رکھ دینے کے بعد قریب موجود تہہ کی ہوئی رسّی اٹھا کر بکس سے باندھنے لگا۔ شگاف سے پانی مسلسل لانچ کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اصغر کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے لانچ کا پچھلا حصہ دھیرے دھیرے زیر آب ہوتا چلا جا رہا ہو۔ رسّی بکس کے کونے سے باندھ لینے کے بعد اصغر نے تیزی کے ساتھ گینڈے کے سینگ سے بھرے ہوئے بکس کو سطح آب پر لائف بوٹ کے قریب اتارنا شروع کیا۔ بکس، لائف بوٹ کے پاس سطح آب پر تیرنے لگا یہ دیکھتے ہی اصغر لانچ سے اتر کر لائف بوٹ میں جا پہنچا۔ بکس والی رسّی کا سرا اس کے ہاتھ میں موجود تھا جسے اس نے لائف بوٹ کے پچھلے حصے سے باندھ لیا اور پھر لانچ والی رسّی بھی لائف بوٹ سے کھولی جس کے سہارے تھوڑی دیر قبل لائف بوٹ پانی کی سطح پر ٹھہری ہوئی تھی اس کے فوراً بعد اصغر نے چپو چلانا شروع کیا اور دھیرے دھیرے لانچ سے دور ہوتا ہوا چلا گیا، بکس لائف بوٹ کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

ہر سو نیم تاریکی اور خاموشی کا راج تھا۔ اصغر نیم تاریکی میں زیر آب جاتے ہوئے لانچ کی سمت دیکھنے لگا۔ لانچ کا پچھلا حصہ نیچے بیٹھتا ہوا چلا جا رہا تھا اور عرشہ سطح آب پر قدرے اوپر اٹھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا پھر وہ بکس کی طرف

دیکھ کر خوشی سے بڑبڑانے لگا۔

"اب کوئی نہیں رہ گیا حصہ مانگنے کے لیے، یہ سارے میرے ہیں۔" سب کچھ اس کی توقع کے مطابق ہو رہا تھا وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت انسان تصور کر رہا تھا۔ موسم کا مزاج بھی اس کے حق میں بہتر تھا نہ تلاطم خیزی اور نہ سمندر کو مست کرنے والے جھکڑ۔ اصغر یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ کنارہ یہاں سے کافی فاصلے پر ہے، لائف بوٹ جو بے انجن تھی اس کے ذریعے کنارے تک پہنچنے کے لیے پانچ چھ گھنٹے صرف ہو سکتے ہیں کیونکہ مسلسل اور ستائے بغیر چپو چلانا مشکل کام تھا کیونکہ چپو چلانے کے بعد ستانا ناگزیر تھا۔

شام کے وقت کنارہ دوربین کے ذریعے دکھائی دیا تھا بغیر دوربین کے کنارہ بالکل نظر نہیں آیا تھا۔ اب رات کا وقت تھا اور دوربین کا استعمال بے فائدہ تھا۔ حالات اصغر کے لیے بے حد موافق تھا جس طرف اصغر کا رخ تھا اسی طرف ہوا کا بھی رخ تھا۔ لائف بوٹ ہوا کے دوش پر اصغر کے چلاتے چپوؤں کی مدد سے بکس کو کھینچتی آگے کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اصغر نے ایک دفعہ پھر گردن گھما کر پیچھے ڈوبتی ہوئی لانچ کی طرف دیکھا، ستاروں کی روشنی میں لانچ کافی فاصلے پر نظر آ رہی تھی جو پہلے کی نسبت اب بڑی تیزی کے ساتھ ڈوب رہی تھی بلکہ صرف اگلا حصہ کچھ باقی بچا ہوا تھا۔ اصغر نے اپنے ہاتھ روک دیئے اور ڈوبتی لانچ کا منظر دیکھنے میں منہمک ہو گیا۔

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پانی کی سطح پر لانچ کے آثار تک غائب ہو گئے۔ اصغر کا من خوش ہو گیا، وہ ایک دفعہ پھر چپو چلانے میں مصروف عمل ہو گیا۔

❀....❀....❀

اصغر چپو چلاتا ہوا لائف بوٹ کو آگے کی سمت دھکیل رہا تھا۔ لانچ ڈوبتے کا نظارہ دیکھنے کے بعد وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے مسلسل چپو چلا رہا تھا۔ اس کے دونوں بازو چپو چلانے کی وجہ سے شل ہو چکے تھے۔ اس نے ستانے کے ارادے سے اپنے دونوں ہاتھ روک دیئے اور سامنے موجود اشیاء میں سے منرل واٹر کی ایک چھوٹی سی بوتل اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولا اور منہ سے لگایا۔ ابھی چند گھونٹ وہ اپنے خشک حلق میں اتار چکا تھا۔ پیاس ابھی باقی تھی عین اسی

سے ایک زوردار آواز کے ساتھ لائف بوٹ اصغر سمیت ہوا میں اچھلی پھر بکس اور لائف بوٹ کے درمیان بندھی ہوئی رسی ایک دم تن گئی اور دوسرے لمحے اچھلتی لائف بوٹ ایک جھٹکے کے ساتھ سطح آب پر تیرتے ہوئے بکس کی سمت بڑھنے لگی۔ اصغر اچھل کر دور سمندر میں جا گرا اور پھر کوئی شے پلک جھپکتے لائف بوٹ نیچے موجود گینڈے کے سینگ سے بھرے ہوئے بکس سے آ ٹکرائی' ایک دھماکا ہوا اس کے ساتھ لائف بوٹ کے ٹکڑے ٹکڑے بکھر گئے اور بکس کا ڈھکنا ٹوٹ کر دور جا گرا اور وہ پانی کی سطح پر الٹ گیا۔ گینڈے کے نایاب سینگ سانچوں سے نکل کر زیر آب ہونا شروع ہوگئے۔

اچانک ٹوٹ پڑنے والی افتاد کی وجہ سے اصغر کے حواس منتشر ہوگئے تھے اس کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ خالی نگاہوں سے لائف بوٹ کے تیرتے ٹکڑوں اور اشیاء کی طرف دیکھ رہا تھا' یہ سب کچھ چند سیکنڈوں میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ لائف جیکٹ کی وجہ سے اصغر پانی کی سطح پر موجود تھا پھر اصغر کا ذہن تیزی کے ساتھ کام کرنے لگا۔ اسے خنکی کا احساس ہوگیا پھر وہ متوحش نگاہوں سے فائبر بکس کی سمت دیکھنے لگا پھر بڑی تیزی کے ساتھ بکس کی سمت تیرنے لگا۔ قریب پہنچتے ہی وہ بڑی بے صبری کے ساتھ بکس کو چیک کرنے لگا' بکس کا ڈھکنا ٹوٹ کر علیحدہ ہوچکا تھا اور الٹ جانے کی وجہ سے بکس بالکل خالی ہوچکا تھا۔ بکس کو خالی دیکھ کر اصغر کا سر گھومنے لگا' وہ حیران تھا کہ لائف بوٹ سے ایسی کون سی شے آ ٹکرائی تھی کہ وہ تمام کھیل اختتام کے قریب آ کر غارت ہوگیا تھا۔ طیش کے ساتھ ساتھ اس کے اعصاب پر خوف کی ایک ہلکی سی لہر چھائی ہوئی تھی دفعتاً اصغر کو اپنے دائیں طرف تقریباً بیس پچیس گز کے فاصلے پر پانی میں قدرے ہلچل محسوس ہوئی وہ اس جانب متوجہ ہوا اور بغور دیکھنے لگا۔ کوئی شے پانی کی سطح پر ابھری ہوئی نظر آئی جو حرکت پذیر تھی اور اس کی ساخت کسی اونٹ کے کوہان جیسی تھی وہ ملگجے اندھیرے میں آہستہ آہستہ اصغر کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اصغر کا دل گویا کنپٹیوں میں آ کر دھڑکنے لگا' اس کا حلق خشک ہونے لگا۔ اصغر کو شدید عدم تحفظ اور بے بسی کا احساس ہونے لگا۔ وہ اونٹ کے کوہان جیسی شے کسی شارک کا بالائی

پڑ تھا پھر یہ نوکیلی پنکھ پانی کی سطح سے یکدم اوجھل ہوگیا۔ اصغر نے بے بسی و خوف کے عالم میں اس طرف دیکھنا شروع کیا جہاں چند منٹ قبل لانچ لنگر انداز تھی مگر وہاں اب کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اچانک تبدیل ہونے والے حالات نے اس کی ذہنی رو بدل ڈالی تھی اب اسے لانچ گینڈے کے قیمتی سینگ سے کئی گنا قیمتی محسوس ہو رہی تھی لیکن لانچ کو ڈبو دینا اس کے بے داغ منصوبے کا ایک اہم جز تھا تاکہ باقی دنیا کے سامنے یہ جواز آسانی کے ساتھ پیش کرنا ممکن ہوسکے کہ لانچ آدھی رات کے وقت شگاف پڑنے کی وجہ سے ڈوب گئی۔

اس وقت سب گہری نیند سو رہے تھے پھر اچانک کسی کو لانچ غرق آب ہوتی محسوس ہوئی افراتفری مچ گئی' تمام لوگ اپنے بستر چھوڑ کر اس جگہ جانے کی تگ و دو میں مصروف ہوگئے جہاں لائف جیکٹس ٹنگے ہوئے تھے مگر لانچ کافی حد تک پانی کے سپرد ہوچکی تھی۔ اصغر کے علاوہ کوئی اور لائف جیکٹس تک رسائی حاصل نہ کرسکا۔ رات کا وقت تھا ہر کسی کو اپنی پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھی کہاں چلے گئے کس حال میں ہیں اسے پتا نہیں۔ وہ معجزانہ طور پر سمندر سے زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔

اصغر کے بے داغ منصوبے کا آخری جز کچھ یوں تھا کہ ویران کنارے پر پہنچنے کے بعد وہ لائف بوٹ کو کہیں ضائع کرتا اور پھر سورج نکلتے ہی وہ کسی مناسب جگہ پر بکس کو زمین میں دفن کرنے کے بعد کنارے سے نکل جاتا پھر جب تین چار دن بعد حالات معمول کے مطابق آتے تو دوبارہ ویران کنارے پر آ کر گینڈے کے قیمتی سینگ سے پُر بکس کو نکال کر لے جاتا۔

اب یہ بے داغ منصوبہ خود اصغر کے لیے یقینی موت بن چکا تھا وہ اپنے ہی دام میں آ پھنسا تھا۔ صحیح و سالم لانچ میں اس نے خود شگاف ڈالا تھا اور یہ سوچ کر لانچ سے اتر کر لائف بوٹ میں سوار ہوگیا کہ مصیبت سے جان چھوٹ گئی مگر اب اسے شدت کے ساتھ احساس ہو رہا تھا کہ اس نے خود مصیبت کو گلے سے لگایا ہے۔

❁......❁......❁

اصغر نے اپنی بکھری ہوئی قوت کو بمشکل تمام یکجا کیا اور تیزی کے ساتھ بکس سے خالی سانچے نکال کر اس میں سکڑ

کر بیٹھ گیا۔ پستول اس نے جیکٹ کے نیچے سے نکال لیا اور پھر دو تین فائر اس طرف داغ دیئے جہاں نیچے شارک کی موجودگی کا امکان تھا مگر کوئی ردعمل سامنے نہ آیا۔ پانی کی گہرائی زیادہ تھی اس لیے پانی کی تہہ میں موجود شارک کے آثار پانی کی سطح پر نظر آنا بے حد مشکل تھا۔ اصغر دھڑکتے دل اور خوف زدہ نگاہوں کے ساتھ چاروں طرف بغور دیکھنے لگا مگر اس کا کہیں نام ونشان تک نظر نہیں آ رہا تھا جیسے وہ اصغر کو کھانے کا پروگرام ترک کر کے کہیں اور شکار کرنے چل نکلی ہو یا شاید وہ چھپ کر دوبارہ حملہ کرنے کی تیاری کر رہی ہو۔

❀❀❀

وہ تقریباً سترہ اٹھارہ فٹ لمبی شارک تھی اور اس کا وزن ڈیڑھ ٹن سے زیادہ تھا۔ اس کا بالائی حصہ ہلکے کالے رنگ اور نچلا حصہ سفید تھا اور بالائی حصے پر جابجا سفید رنگ کے دھبے سے تھے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بے چینی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ پہلا حملہ اس نے بھرپور انداز میں کیا تھا مگر اس کے باوجود وہ ناکام رہا تھا۔ لائف بوٹ میں موجود اصغر اس کے سفاک جبڑے کی گرفت میں نہیں آ سکا تھا۔ اس نے زن کے ساتھ آ کر اصغر کو دبوچنے کے لیے اپنا جبڑا کھولا تھا مگر اس سر کی ٹھوکر لائف بوٹ پر ہی پڑی اور اصغر ہوا میں اچھلتی لائف بوٹ سمیت اچھلا اور دور جا کر پانی میں گرا۔ اب ایک دفعہ پھر وہ اپنے شکار پر جھپٹنے کے لیے تیار تھی اس کی تیز اور مضطرب آنکھیں تیرتے ہوئے بکس کے نچلے حصے پر مرکوز تھیں جس میں اصغر موجود تھا۔

❀❀❀

سمندر کی تہہ میں جابجا گینڈے کے سینگ بکھرے ہوئے تھے اور اوپر پانی کی سطح پر فائبر بکس تیر رہا تھا جس میں خوف زدہ اور بے بس اصغر سکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اصغر کے دونوں ہاتھوں میں پستول موجود تھے اور وہ چاروں سمت بے چینی کے ساتھ دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ فائبر ساختہ بکس ہوا کے رحم وکرم پر سطح آب پر تیرتا ہوا جا رہا تھا مگر اس کی رفتار نہایت دھیمی تھی۔ یکلخت اصغر کے بائیں طرف ایک ہلچل برپا ہوئی پانی کے چھینٹے کسی موسلا دھار بارش کی طرح اصغر پر برسنے لگے۔ اصغر سنبھل کر فائر بھی نہ کر پایا کہ دوسرے لمحے بائیں کاندھے میں گویا یک وقت دونوں طرف کئی نوکدار اور تیز دھار خنجر پیوست ہو گئے اور پلک جھپکتے وہ ایک چوڑے جبڑے کی گرفت میں ہوتا ہوا سمندر کی تہہ میں پہنچ گیا۔ اس کا سانس پھولنے لگا۔ زخم سے خون رسنے لگا' اس کے رگ و پے میں درد کی ٹیسیں دوڑنے لگیں' وہ تڑپنے لگا' چیخنا چاہا تو چیخ نہ سکا۔ صرف بلبلا کر پانی کے بلبلے خارج کرنے لگا۔

❀❀❀

اصغر خونی شارک سمیت پانی کی تہہ میں موجود تھا۔ اس کے کاندھے کی ہڈی بری طرح چٹخ گئی تھی۔ وہ بے بسی کی منہ بولتی تصویر بنا ہوا تھا۔ یہ وہ انسان تھا جس نے دولت کے لالچ میں آ کر اپنے تمام ساتھیوں کو ایک ایک کر کے بڑی آسانی کے ساتھ موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اس وقت وہ خود زیست وموت کی کشمکش میں مبتلا بے دست و پا تھا۔ اس کی طاقت کب کی ڈھیر ہو چکی تھی اسے اپنے منہ میں دبوچے دیوہیکل خونی شارک سرعت رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتی چلی گئی پھر چشم زدن میں سطح آب پر نمودار ہوئی تقریباً دس فٹ کی بلندی تک فضا میں پانی کے چھینٹے اڑاتی ایک جھٹکے کے ساتھ اصغر کو دور پھینک کر ایک چھپاک کی آواز کے ساتھ غوطہ زن ہو گئی۔ اصغر چیختا ہوا ایک چھپاک کی آواز کے ساتھ پانی کی تہہ میں گرتا چلا گیا۔

❀❀❀

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ اس کے زندگی کے آخری لمحات ہیں جو انتہائی کرب واذیت سے بیت رہے ہیں پھر اس کے ڈوبتے ہوئے ذہن میں نثار کی باتیں سرسرانے لگیں۔

"تمہیں اپنے کیے کی سزا ضرور کسی نہ کسی صورت میں ملے گی۔ کوئی نہ کوئی تجھے ضرور دبوچ لے گا' تم اکیلے دولت ہڑپ نہیں کر سکو گے...... تم نہیں بچ سکو گے اصغر...... تیری طاقت قدرت کی طاقت کے سامنے ڈھیر ہو جائے گی۔"

قیامت

نوشاد عادل

چھوٹے سے کینوس پر ایک بڑی کہانی، ان لوگوں کی روداد، جو زندہ لاش کی طرح ہر دفتر چورا ہے اور مارکیٹوں میں گھومتے نظر آتے ہیں ان کی جیبیں خالی اور آنکھوں میں ویران امیدیں نظر تو سب کو آتی ہیں لیکن ان میں چھپی کہانیاں کسی کو سمجھ نہیں آتیں۔

گھر گھر کی کہانی، ان لمحوں کا فسانہ جب شریف انسان اپنی شرافت سے شرمسار ہو جاتے ہیں

"آج آپ پھر لیٹ ہو گئے...؟" رخشی بیگم نے اپنے شوہر وجاہت صاحب کو دیکھتے ہی پوچھا۔

"ہاں... دیر ہو گئی۔" وجاہت صاحب نے اندر آتے ہوئے کہا۔ تھکن اُن کے چہرے سے مترشح تھی۔

"کام ہی ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔"

"تو اکیلے آپ کے ذمہ اتنے کام لگا رکھے ہیں آفس والوں نے...؟"

"نہیں... اور بھی ہیں بے چارے... صبح سے رات تک سر جھکائے لگے رہتے ہیں... پھر بھی کام ختم نہیں ہوتے... بس روک کر گھروں کو چلے جاتے ہیں۔" وجاہت صاحب نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

تھوڑی دیر بعد وجاہت صاحب کھانا کھانے میں مصروف تھے اور رخشی بیگم اُن کے سامنے خاموش بیٹھی تھیں۔ لگتا ایسا تھا کہ کچھ کہنا یا پوچھنا چاہتی ہیں۔ چہرے پر تذبذب اور اضطراب کی لکیریں تھیں۔ کھاتے کھاتے وجاہت صاحب نے سر اُٹھا کر اُنھیں دیکھا۔ "تم نے کھانا کھالیا...؟"

"ہاں... کھالیا... دوا کھانی ہوتی ہے نا وقت پر... اس لیے۔"

"اور بچوں نے...؟"

"وہ بھی کھا کر سو رہے ہیں۔"

"ہوں۔" وجاہت صاحب دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پھر چند ثانیے کے توقف کے بعد اچانک بولے: "مجھے پتا ہے تم کیا پوچھنا چاہتی ہو۔" اُنھوں نے ہلکی آواز میں سر جھکا کر کہا: "آج بھی سیلری نہیں ملی۔"

"کیا... آج بھی نہیں ملی...؟" رخشی بیگم کا رنگ اُڑ گیا۔

"ہاں..."

"مگر کیوں...؟"

"پتا نہیں... بس مرضی ہے سیٹھ کی۔"

"آج سات تاریخ بھی ہو گئی... میرے پاس... میرے پاس پیسے بالکل ختم ہو گئے ہیں۔" رخشی بیگم نے اٹکتے ہوئے بتایا۔

"اللہ مالک ہے... ویسے سنا ہے کہ کل سیلری کا امکان ہے۔ کل سیٹھ صاحب چیک پر دستخط کر دیں گے تو تمام ملازمین کے اکاؤنٹس میں سیلری آجائے گی۔" وجاہت صاحب نے اُمید بھرے لہجے میں بتایا۔

"تو اُنھوں نے آج ہی چیک پر دستخط کیوں نہیں کیے...؟" وجاہت صاحب نے رخشی بیگم کو دیکھا اور ہلکی سی مسکراہٹ اُن کے چہرے پر اُبھر آئی۔

"بھئی نہیں کیے بس... مرضی کے مالک ہیں... مصروف آدمی ہیں... ہزاروں کام ہوتے ہیں اُنھیں..."

"مگر ملازموں کا تو صرف ایک ہی کام ہوتا ہے

نا... سیلری... وہ بھی ٹائم پر نہ ملے تو کیا فائدہ اتنی محنت کرنے کا۔" زخشی بیگم کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

"بس اب کیا کریں... ملازمت بھی تو کرنی ہے سب نے... کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ جا کر سیٹھ صاحب سے سیلری کا پوچھے... بس پورا دن اُمید و بیم کی کیفیت میں گزر جاتا ہے۔"

"آج بھی وہ آئی تھی مکان مالکہ... زبیدہ... کرایہ مانگ رہی تھی... تھوڑا ناراض بھی ہوئی تھی۔"

"ہاں تو بتا دینا تھا کہ جان بوجھ کر دیر نہیں کر رہے ہیں ہم۔ تنخواہ آئے گی تو دیں گے نا... اب نہیں ہیں پیسے... تو کہاں سے دیں۔" وجاہت صاحب نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"بولا تھا... مگر اس عورت کی سمجھ میں ہی نہیں آتا... وہ شاید یہ سمجھ رہی تھی کہ میں بہانے بازی کر رہی ہوں اور ہم جان بوجھ کر کرایہ لیٹ کر رہے ہیں۔"

"بس دُعا کرو کہ کل سیلری مل جائے۔"

"اللہ کرے..." زخشی بیگم نے دُعائیہ انداز میں ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "بچوں کی اسکول فیس بھی دینی ہے راشن بھی ختم پر ہے۔ دس کام رُکے ہوئے ہیں۔"

وجاہت صاحب نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور اُٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گئے۔

☆......☆......☆

اگلے روز آفس میں عجیب سا بوجھل بوجھل ماحول تھا۔ آج لوگوں نے ایک دُوسرے کو بجھا بجھا سا سلام کیا تھا اور اپنی نشستوں پر بیٹھ کر کاموں میں مصروف ہو گئے۔

"سر چائے..." رمضان نے وجاہت صاحب کی ٹیبل پر چائے کا کپ رکھتے ہوئے توجہ دلائی۔

"ہاں... ٹھیک ہے... شکریہ..." وجاہت صاحب نے اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور دوبارہ مانیٹر کی جانب دیکھنے لگے۔

"سر..." رمضان نے دبی آواز میں قدرے ہچکچا کر کہا۔

"ہوں..."

"سر وہ... سیلری... کب آ رہی ہے... آج آ جائے گی نا...؟" رمضان کی آواز میں عجیب سی یاسیت تھی۔

کی بورڈ پر چلتی ہوئی انگلیاں رُک گئیں۔ وجاہت صاحب نے رمضان کی جانب بھرپور نظر ڈالی۔

"پتا نہیں... بس دُعا کرو کہ آج مل جائے۔" اُنھوں نے بڑبڑاتے کے انداز میں کہا۔

"بڑی پریشانی ہو گئی ہے سر..." رمضان اپنا دُکھڑا بیان کرنے لگا۔

"ایک دو دن اُوپر ہو جائیں تو چلتا ہے... مگر ایک ہفتہ اُوپر ہو جائے تو ہم جیسوں کی ایسی کی تیسی ہو جاتی ہے۔ سیلری کے علاوہ اور کوئی آمدنی کا ذریعہ بھی تو نہیں ہے... بس سر جی... حالت پتلی ہو گئی ہے... اگر کوئی ہزار روپے بھی دو دن کے لیے اُدھار دے دے تو تھوڑی ٹینشن کم ہو جائے گی۔" رمضان نے بڑی صفائی سے اُدھار کا تقاضا کر دیا تھا۔

''یہاں پالش کیے ہوئے جوتوں کے اندر سب کے موزے پھٹے ہوئے ہیں یار... ہم کون سا لاکھوں روپے کما رہے ہیں... میرا بھی سیلری کے لگے بندھے پیسوں سے گھر چلتا ہے... مجھے خود تارے نظر آگئے ہیں۔'' وجاہت صاحب بولے۔

''سر جی... میں تو معلوم نہیں کر سکتا... مگر آپ تو معلوم کر سکتے ہیں اکاؤنٹ والوں سے۔''

''کل کیا تھا... اُنھوں نے آج کا آسرا دے دیا تھا۔''

''پتا نہیں کیا ہوگا۔'' رمضان مایوس ہو کر بولا۔

''مجھے تو آج بھی کچھ نظر نہیں آرہا... سب ٹھنڈے ٹھنڈے بیٹھے ہیں۔'' وجاہت صاحب نے جواب نہیں دیا اور رمضان سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ وہ تو چلا گیا مگر وجاہت صاحب کو سپردِ اضطراب کر گیا۔ اُن کا سارا دھیان نا چاہتے ہوئے بھی گھر اور مسائل کی طرف چلا گیا تھا۔ آج آٹھ تاریخ ہے... اگر آج بھی سیلری نہ ملی تو... اس سے آگے سوچنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اب تو اُن کی جیب میں تھوڑے سے پیسے بچے تھے جو اُنھوں نے آفس آنے جانے کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ کئی دن سے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھا رہے تھے کہ بچ جانے والے پیسے بچوں کے کھانے کے کام میں آجائیں گے۔ ایسا پہلے بھی کئی بار ہوا تھا مگر پہلے کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی تھی۔ اس بار تو کوئی وجہ بھی نہ تھی، سوائے اس کے کہ سیٹھ صاحب چیک پر سائن نہیں کر رہے تھے۔

بے کلی بڑھتی چلی گئی۔ تب اُنھوں نے لاشعوری طور پر ایکس ٹینشن پر اکاؤنٹ کا نمبر ملایا:

''اختر صاحب... کیا خبر ہے آج...؟''

''ابھی تو کچھ نہیں ہے۔''

''سیٹھ صاحب تو آئے ہیں نا آج...؟''

''ہاں... مگر تھوڑا موڈ ٹھیک نہیں ہے ان کا... میری ہمت نہیں ہو رہی چیک لے کر جانے کی۔''

''دیکھیں... کچھ کریں... ہو سکتا ہے آج سائن کر دیں۔''

''لنچ کے بعد جاؤں گا... موڈ دیکھ کر۔'' اختر صاحب نے کہا۔

''شاید کام بن جائے... مجھے بھی تو ضرورت ہے نا...''

''چلیں... کام ہو جائے تو بتا دیں۔''

''او کے...''

وجاہت صاحب نے ریسیور رکھا۔

''صاحب کا موڈ خراب ہے آج...'' سامنے ہی انور کھڑا تھا اُن کے آفس کا ساتھی۔ وہ سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ہاں...''

''پتا ہے... میں نے بھی تھوڑی دیر پہلے اختر صاحب سے بات کی تھی۔'' انور پھیکے انداز میں ہنسا۔

''صاحب کا خراب موڈ ہم سب کی زندگی خراب کر رہا ہے... کام پر موڈ ٹھیک رہتا ہے بس تنخواہ دینے پر مصروفیات بڑھ جاتی ہیں اور موڈ بھی بگڑ جاتا ہے۔''

''ہم کیا کر سکتے ہیں یار...'' وجاہت صاحب نے سر اور ہاتھ بے بسی سے ہلایا۔

''صبر کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔''

......☆......

''ہاں... کیا ہوا...؟'' کمپنی کے سیٹھ اور پریذیڈنٹ نے خشک لہجے میں اختر سے پوچھا۔

''سر... یہ...'' اختر نے ڈرتے ڈرتے اکاؤنٹ کی فائل ٹیبل پر رکھ دی۔

''کیا ہے یہ... منہ سے تو بولو...؟'' پریذیڈنٹ نے تیز آواز میں دریافت کیا۔

''سر... وہ سیلریز کی فائل ہے... چیک پر سائن ہونے ہیں آپ کے۔'' اختر نے تیزی سے بتایا۔

''تم نے فائل رکھ دی ہے نا... اب جاؤ... ہو جائیں گے سائن...'' پریذیڈنٹ نے فائل کی طرف دُوسری نگاہ بھی نہ ڈالی اور موبائل اُٹھا لیا۔

اختر خاموشی سے باہر آگیا۔ اُس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں اُبھر آئی تھیں۔ کئی دن سے تمام کمپنی کے افراد کال کر کر کے اُس سے سیلری کا پوچھ رہے تھے اور اُس وقت تک پوچھتے رہیں گے جب تک کہ اُنھیں سیلری مل

نہیں جاتی۔

☆......☆

"کیوں نہیں دے رہے آفس والے تنخواہ...؟" رضوانہ چیخنے لگی۔ "تم مانگتے کیوں نہیں ہو اُن سے... صبح سے رات تک اُن کی غلامی کرتے ہو... کم از کم تنخواہ تو مانگ لیا کرو ٹائم پر۔"

"ابھی کسی کو بھی تنخواہ نہیں ملی... سب پریشان ہیں... اکاؤنٹ والوں سے پوچھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ مالک نے چیک پر سائن نہیں کیے ہیں... سائن ہوں گے تو تنخواہیں ملیں گی۔"

"تو تم چلے جاتے مالک کے پاس... بتا دیتے کہ گھر میں فاقے شروع ہوگئے ہیں... کون کب تک اُدھار دے گا... کوئی ایک پریشانی ہو تو انسان برداشت کرلے... یہاں تو ہر چیز کا حل پیسہ ہے۔" رضوانہ کی آواز بدستور بلند تھی۔

"اچھا... اچھا... چیخو تو نہیں۔" رمضان نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تمہیں بولنا چاہیے تھا مالک سے۔" رضوانہ نے اُس کی بات سنی اَن سنی کردی۔

"میں وہاں کوئی بڑا آفیسر لگا ہوا ہوں جو مالک کے کمرے میں جا کے اُس سے بولوں۔" رمضان بے بسی آمیز غصے سے بولا۔ "ایک سیکنڈ میں فارغ کردے گا مالک..."

"تو پھر کوئی دُوسری نوکری کرلو..."

"دُوسری نوکری کرلوں... کہاں سے کرلوں... نوکریاں کیا سڑک پر پڑی مل جاتی ہیں... جب کسی چیز کا پتا نہ ہو تو بات نہ کیا کرو فضول میں۔" رمضان بڑبڑاتا ہوا پلنگ پر لیٹ گیا۔

"اب تو کھانے کے پیسے بھی نہیں ہیں... صبح بچے کیا کھا کے اسکول جائیں گے...؟" رضوانہ رونے لگی۔

"تھوڑا بہت تو ہوگا... وہی کھالیں گے... دیکھو... شاید کل مالک سائن کردے۔" رمضان نے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرلیں کہ شاید اس طرح مسئلہ وقتی طور پر حل ہو جائے گا... شاید کوئی جادو ہو جائے گا کھانے پینے کا مسئلہ حل

ہو جائے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے... کہاں جائے۔ سخت پریشانی کے عالم میں دماغ میں دھمک سی ہو رہی تھی۔ وہ زبردستی سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

......☆......

وجاہت صاحب کو اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ یونس صاحب اُن کے پاس آگئے اور سلام کیے بغیر پوچھا:

"بھائی...! یہ تنخواہ ملے گی بھی یا نہیں..." وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

"خدا کی قسم... حالت بُری ہو گئی ہے... اب تو آفس آنے کے پیسے بھی نہیں بچے... آج بھی نہیں ملی تو میں کل سے چھٹیوں پر چلا جاؤں گا... جب تک کہ تنخواہ نہیں آجاتی... ایک حد ہوتی ہے یار... کوئی لاکھوں میں تنخواہ تھوڑی ملتی ہے کہ ڈیڑھ مہینے تک چلا لیں۔" یونس صاحب دل کے جلے پھپھولے پھوڑنے لگے۔

"میرے پاس تو بتانے کے لیے الفاظ بھی نہیں ہیں۔" وجاہت صاحب نے گہری سانس لی۔

"ناشتا کیے بغیر آیا ہوں آج۔"

"کیوں...؟"

"گھر میں کچھ ہوگا تو پکے گا نا... اُدھار مانگتے بھی شرم آتی ہے... کس سے مانگیں... لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ میں اتنے بڑے ادارے میں اچھے عہدے پر جاب کرتا ہوں... بڑی تگڑی سیلری ہوگی میری... مگر انھیں کیا پتہ کہ اندر ہمارا کیا حال ہے۔" وجاہت صاحب ایک ہی سانس میں بولتے چلے گئے۔

"یار... ان مالک لوگوں کو اللہ کا خوف ہونا چاہیے... ذرا بھی احساس نہیں ہوتا ان لوگوں کو..."

"کیوں ہوگا... پتا ہے کس میں ہمت ہوگی... نہ نوکری چھوڑ کر کوئی جائے گا... اگر کوئی چھوڑ بھی دے تو اس کی جگہ بیسیوں آجائیں گے... انھیں کیا پروا..."

اتنے میں رمضان نے اُن دونوں کی چائے وہاں رکھ دی اور کھڑا ہو کر باتیں سننے لگا۔

"مجبوریاں بعض اوقات ہم جیسوں کو جانوروں سے بھی بدتر درجے پر لے جاتی ہیں... صبح سے رات تک محنت بھی کریں اور ملتا بھی کچھ نہیں۔" وجاہت صاحب نے چہرے پر ہاتھ پھیرے۔

"میرا تو دماغ پھٹنے کو ہے سر..." رمضان نے گفتگو میں حصہ لیا۔

"کچھ سمجھ نہیں آرہا ہے کیا کروں... کہاں سر پھوڑوں... سارا دن یہاں ٹینشن میں گزارو... گھر جاؤ تو وہاں بھی رونا پڑا ہوا ہے... اگر یہی حال رہا تھا تو میں کسی گاڑی کے نیچے سر دے دوں گا۔"

"مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔" یونس صاحب نے کہا۔

وجاہت صاحب نے تو رمضان کی طرف دیکھا تک نہ تھا۔

......☆......

موٹر سائیکل درمیانی رفتار سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ نظریں تو سامنے تھیں مگر اُن کا دماغ کہیں دُور ویرانوں میں بھٹک رہا تھا۔ آج بھی کچھ نہیں ہوا تھا۔ آج پریذیڈنٹ صاحب ہی آفس نہیں آئے۔ کرب ناک مایوسی نے سب لوگوں کو گھیرے میں لے لیا تھا۔

اچانک زوردار ہارن کی آواز آئی۔ وجاہت صاحب نے بے اختیار بریک لگا دیے اور ایک کار سامنے سے گزر گئی۔ بے دھیانی میں انھوں نے کار کو نہیں دیکھا تھا وہ دائیں جانب سے ہارن دیتی ہوئی دوڑی چلی آرہی تھی۔ اگر عین وقت پر وہ بریک نہ لگاتے تو لازمی ٹکر ہو جاتی۔

چند منٹ وہ سڑک کے کنارے بائیک روک کر کھڑے رہے مگر انھیں اس بات کا خوف نہیں تھا کہ وہ ایک خوف ناک ایکسیڈنٹ سے بال بال بچ گئے بلکہ یہ احساس کسی اژدھے کی طرح اُن کا وجود سموچا نگل رہا تھا کہ آج گھر میں کیا ہوگا۔ صبح وہ اپنی بیگم کو بڑی اُمیدیں دلا کر نکلے تھے کہ آج تو لازمی تنخواہ مل جائے گی۔ گھر میں کھانے کو ایک کھیل نہ بچی تھی۔ پینے کو صرف پانی تھا۔ وہاں جا کر وہ کیا کریں گے... کس طرح بیوی اور بچوں کے سُتے ہوئے بھوکے چہرے دیکھیں گے... بچوں کے اسکول سے نوٹس پر نوٹس آرہے تھے کہ اسکول فیس جمع کروادیں۔

کٹھے میٹھے اقوال

- کچھ لوگ کئی سو سال تک محیط اپنا شجرہ نسب تو زبانی بتا سکتے ہیں لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ پچھلی رات ان کی اولاد کہاں تھی۔
- ہرن اور بکری، چوہا اور خرگوش، چکوترا اور لیموں کا خاندان ایک ہی ہے لیکن فرق صاف ظاہر ہے۔
- ہنستا بستا خاندان جنت قبل از وقت ہے۔
- خچر کے علاوہ ہر کسی کو خاندان کی ضرورت ہے۔
- گھر وہ ہے جہاں خاندان کے کچھ افراد باقیوں کی واپسی کے منتظر ہوتے ہیں۔
- بچوں کی وجہ سے گھر روشن رہتے ہیں کیونکہ وہ بتیاں نہیں بجھاتے۔
- گھر وہ ہے جس کی کھونٹی پر آپ اپنا دل بھی لٹکا سکتے ہیں۔
- جب دو خاموش آمری ملتے ہیں تو شیطان کھانا کھانے نکل جاتا ہے۔
- وہ جو معاف کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا دراصل اس پل کو توڑ دیتا ہے جسے اس نے خود عبور کرنا ہوتا ہے۔
- معافی خود اپنے لیے بھی مرہم ہے
- معاف کر دینا محفوظ ترین انتقام ہے

مشاہر: حسن نثار

انتخاب: افضل شاہین...... بہاولنگر

......☆☆......

جن کا یہ کلیہ تھا

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا "یہ بتاؤ کہ اپنے ملک کا شریف آدمی کون ہے؟"

دوست نے کہا: "یہ بتا کر میں اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بننا چاہتا۔"

"اچھا...... تو سب سے بے ایمان شخص کون سا ہے؟"

"یہ بتا کر میں تم سے دشمنی نہیں مول لینا چاہتا۔" دوست نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

عنبر فاطمہ...... فیصل آباد

روز ٹیچر کلاس میں سب کے سامنے فیس کا پوچھ رہی تھی۔ بچے شرم سے سر جھکائے کھڑے رہتے تھے اور گھر آ کر اپنی ماں سے شکایت کرتے۔

آج بھی اُن کی جیب خالی تھی۔ دل میں آیا کہ کاش وہ کار انھیں کچلتی ہوئی چلی جاتی۔

"کس منہ سے گھر جاؤں...؟" وجاہت صاحب نے خود کلامی کی۔

پھر انھیں خیال آیا کہ یہاں سے نزدیک ہی اُن کا ایک پرانا دوست رہتا ہے۔ انھوں نے بائیک اسٹارٹ کی اور دوست کی طرف روانہ ہو گئے۔ خالد انھیں دیکھ کر کھل اٹھا۔

"واہ بھئی واہ... کیا بات ہے... بڑے دنوں بعد آیا ہے میرا یار... لگتا ہے آفس سے واپسی پر یاد آ گئی میری..."

"بس ایسا ہی ہے۔" وجاہت صاحب نے بہ

مشکل مسکرا کر کہا۔

خالد اُنھیں اندر لے آیا۔ خالد کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا۔ اُس کے گھر میں عام سی چیزیں تھیں۔ ان سے زیادہ قیمتی سامان وجاہت صاحب کے گھر میں تھا۔

''کام کیسا چل رہا ہے تمھارا...؟'' وجاہت صاحب نے پوچھا۔

''فِٹ فاٹ... اللہ کا بڑا کرم ہے... گزر بسر اچھی ہو رہی ہے... بس کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا نہیں پڑتا۔'' خالد نے جواب دیا۔

وجاہت صاحب کے دل پر گھونسا سا لگا۔ ابھی ابھی چند سیکنڈ پہلے اُن کے دل میں یہ بات آئی تھی کہ خالد سے کچھ رقم اُدھار مانگ لیں لیکن اُس نے ایسی بات کر دی تھی کہ اُن کی زبان پر تالے لگ گئے۔

کافی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ یہ تو صرف وقت گزارنے کا بہانہ تھا۔ وجاہت صاحب کے دل میں خوف کی چھپکلی نے پنجے گاڑے ہوئے تھے کہ وہ خالی ہاتھ گھر کیسے جائیں۔ بیوی بچے آس لگائے ہوں گے کہ کب وہ آئیں گے اور کب وہ کھانا کھا سکیں گے۔ اُنھوں نے اپنا موبائل بھی آف کر کے جیب میں ڈالا ہوا تھا تاکہ گھر کی کوئی کال نہ آسکے۔ وہ دیر سے گھر جانا چاہتے تھے کہ اس وقت تک بچے سو چکے ہوں اور وہ اُن کی لرزاں وترساں سوالیہ نظروں سے بچ جائیں۔ آفس کی چائے اور چند بسکٹس کے علاوہ اُنھوں نے دن بھر کچھ نہیں کھایا تھا۔ خالد نے بہت زور دیا کہ وہ کھانا کھا کر جائیں۔ وجاہت صاحب منع کرتے رہے۔ پھر خالد کی بیوی نے جسے وہ بہن کہتے تھے اُن کے آگے کھانا سجا دیا۔ جب وجاہت صاحب لقمہ توڑنے لگے تو اپنے بچوں اور بیوی کی صورتیں نگاہوں کے سامنے آ گئیں۔ اُن کا ہاتھ رُک گیا۔ دکھانے اور دل رکھنے کو اُنھوں نے بہ مشکل دو نوالے حلق سے اُتارے تھے۔

رات ایک بجے وہ اپنے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ اس وقت تک بچے سو چکے تھے۔

☆......☆

''کمال ہے...'' حارث نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

''آج سترہ تاریخ ہو گئی ہے اور تم نے اب تک اپنی کمپنی کے ملازمین کو سیلریز نہیں دیں...؟''

''ہو جاتی ہے لیٹ... ہر جگہ ہوتی ہے۔'' کمپنی کے مالک اور پریذیڈنٹ نے بے پروائی سے کہا۔

''دس تاریخ تک دے دیتا... بس اس بار مصروفیات زیادہ رہیں... کبھی یاد نہیں رہا... پھر ہفتہ پہلے ایک موقع کی زمین خرید لی ہے... پچاس ایکڑ... سارے پیسے اِدھر لگا دیے... اب دیکھو کہ ایک ہفتے میں ہی مجھے اس کے دو کروڑ اُوپر مل رہے ہیں... کاروبار بھی تو ضروری ہے نا...''

''بات تو ٹھیک ہے تمھاری... مگر اب بہت ٹائم ہو گیا ہے... بلاوجہ کسی کی بددُعا لگ جائے گی۔'' حارث نے ہنس کر کہا۔

''ہمیں نہیں لگتی کسی کی بددُعا... بزنس بھی تو کرنا ہے نا... اتنے پروفٹ والی زمین میں کیسے ہاتھ سے جانے دیتا۔''

''چلو خیر ہے... جیسی تمھاری مرضی۔'' حارث نے کندھے ہلائے۔

☆......☆

اکاؤنٹنٹ اختر آدھا پاگل ہو چکا تھا۔

آج اٹھارہ تاریخ ہو گئی تھی اور اب تک سیلری نہیں ملی تھی۔ پریذیڈنٹ ہر کام میں باریک بینی اور سختی سے پیش آتا تھا، صرف سیلریز کے بارے میں اُسے کوئی پروا نہ تھی۔ اختر نے کئی روز پہلے اُس کی ٹیبل پر جہاں فائل رکھی تھی وہ اب تک اُسی جگہ سابقہ پوزیشن میں رکھی تھی۔ لگتا تھا کہ اُسے چھوا تک نہیں تھا۔ ظاہر ہے اختر بھی کمپنی کا ملازم تھا۔ اس کی سیلری بھی نہیں ملی تھی۔ اُس کے پاس جو بچت کی رقم تھی وہ خرچ ہو چکی تھی۔ اب اُس نے ایک رشتہ دار سے خاصی رقم اُدھار لی تھی۔ اُس کے گھر کے اخراجات بھی زیادہ تھے۔ بوڑھے ماں باپ ساتھ رہتے تھے۔ اُن کے الگ خرچے تھے۔ جو کہیں سے بھی ہر حال میں پورے کرنے تھے۔ اب تو اُدھار کی رقم بھی ختم ہو گئی تھی۔ بلکہ رشتہ

دار پیسوں کی واپسی کا تقاضا بھی کر رہا تھا۔ اچانک اُس نے کوئی بڑی ضرورت کہیں سے نکال لی تھی۔

بیوی بچوں کے اخراجات الگ تھے۔ ان سے نبرد آزما ہو کر جب اختر صبح آفس پہنچتا تو شام تک کمپنی کے ملازمین اس سے پوچھتے رہتے کہ مالک نے سائن کیے یا نہیں... آج سیلری آجائے گی نا...؟ وہ جواب دیتے دیتے چڑچڑانے لگا تھا... کمپنی میں کئی افراد ایسے بھی تھے، جو دُوسری ملازمت کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ کچھ کو اب بھی کوئی خاص پروا نہ تھی۔ اُن کے خرچے کسی نہ کسی ذریعے سے پورے ہو رہے تھے۔

"آج صبح مالک آیا اور تھوڑی دیر بعد چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد آفس میں بیٹھے عثمان صاحب غصے سے پھٹ پڑے۔

"اس کمپنی میں کوئی انسان نہیں ہے... سب جانور ہیں جانور... فاقوں سے مرجانا پسند ہے مگر مالک کے آگے زبان کھولنا کسی کو منظور نہیں ہے... پھر شوق ہے مرنے کا تو مرو..."

"کون زبان کھولے گا... کس میں ہمت ہے..."

"کوئی تو پہل کرے... پھر ہم بھی بولیں گے۔"

"آپ خود پہلے کیوں نہیں بولتے عثمان بھائی...؟" وجاہت صاحب نے کہا۔

"اس لیے کہ مجھے پتہ تھا میرے پیچھے ایک آدمی بھی نہیں بولے گا... سب خاموشی سے اپنی سیٹوں پر جا کر بیٹھ جائیں گے۔" عثمان صاحب نے کہا۔

"خدا کی قسم... دل کرتا ہے خود کو گولی مارلوں... حد ہوتی ہے بے بسی کی... وہ نواب کا بچہ آتا ہے اور ایسے ہی چلا جاتا ہے... ذرا احساس نہیں ہے اسے..."

وہاں موجود ہر شخص یہی سوچ رہا تھا کہ آج بھی خالی ہاتھوں گھر کیسے جائیں گے۔ کب تک دُنیا کے سامنے اپنے ریزہ ریزہ وجود کو سالم دکھاتے رہیں گے۔

......☆......

"تمام پے منٹس آچکی ہیں...؟" پریذیڈنٹ نے اختر سے پوچھا۔

"جی سر... میں نے اُن کی تفصیل آپ کو میل کر دی ہے۔" اختر نے بتایا۔

"گڈ... میں دیکھ لوں گا... ٹھیک ہے آپ جائیں۔"

اختر کھڑا ہو گیا۔ پھر پتہ نہیں کیسے ہمت آگئی اور بولا: "سر... وہ سیلریز اب تک نہیں ہوئی ہیں۔"

"سیلریز...؟" پریذیڈنٹ چونک کر بولا۔

"اچھا... اب تک نہیں ہوئیں... آپ نے مجھے بتایا...؟"

"دو تین بار یاد دلایا تھا آپ کو..."

"اچھا ٹھیک ہے... چیک لائیں..."

"وہ تو میں نے اکاؤنٹ کی فائل کافی دن پہلے آپ کو دے دی تھی۔" اختر نے آگے بڑھ کر ٹیبل کے ایک جانب رکھی ہوئی فائل اُٹھائی۔ "یہ رہی فائل..."

پریذیڈنٹ نے سائن کر دیے اور پوچھا: "آج تو بیس تاریخ ہو گئی ہے... کافی لیٹ ہو گئی سیلری... لوگ تو پوچھ رہے ہوں گے...؟"

"جی سر... بہت... کافی دن ہو گئے تھے نا... بڑی پریشانی ہو جاتی ہے سر۔" اختر کے منہ سے نا چاہتے ہوئے بھی نکل رہا تھا۔

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے...؟" پریذیڈنٹ کے ماتھے پر ناگواری کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ "کبھی کبھی تھوڑا بہت اُوپر نیچے ہو ہی جاتی ہے... کوئی قیامت تو نہیں آگئی نا... یا کوئی مر گیا فاقوں سے...؟"

"نہیں سر... ایسی کوئی بات نہیں..." اختر یہ کہہ کر باہر نکل آیا۔ وہ سوچنے لگا کہ مالک کی نظر میں یہ صرف تھوڑی سی دیر تھی۔ معمولی سی بات تھی۔ اتنے دنوں میں پتہ نہیں کس کس پر کیا کیا قیامت گزر گئی ہوں گی۔ کتنے لوگوں کی عزتِ نفس مجروح ہوئی ہوں گی۔ مالک کو اس بات کا احساس نہیں تھا اس لیے تو اُس نے اتنی آسانی سے کہہ دیا کہ کوئی قیامت تو نہیں آگئی نا۔

○

جنت کا خواب

محمد سفیان بٹ

جنت ہر مومن کا خواب ہے بلکہ جنت کا تصور دنیا کے ہر دین میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے، جنت وہ مقام ہے جہاں سے شیطان کو نافرمانی کرنے پر ہمیشہ کے لیے نکالا گیا جس کا انتقام وہ ازل سے مومنوں سے لے رہا ہے، اس نے اپنے انتقام کی آگ میں ایک ایسا طبقہ تیار کر لیا ہے، جس نے جنت کے حصول کا ثواب وہاں پہنچنے کا مختصر راستہ بتا کر لوگوں کو اس سے بہت دور کر دیا ہے، آج کچھ لوگوں کے لیے جنت کی قیمت معصوم اور بے گناہ لوگوں کی جان لینا مقرر کر دی ہے، بس خود کش جیکٹ پہنوں اور بے گناہ لوگوں کے ہجوم میں گھس کر خود کو اڑا دو اور سیدھے جنت میں داخل ہو جاؤ۔

آنسوؤں، سسکیوں سے گندھی ایک سسکتی ہوئی تحریر

اختتام پڑھ کر آپ اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں پاسکیں گے

فاطمہ کی پیدائش ایک نہایت غریب گھرانے میں ہوئی تھی اپنے تمام بہن بھائیوں میں وہ تیسرے نمبر پر تھی۔ وہ اپنے دوسرے بہن بھائیوں کی نسبت قدرے خوش شکل، ہنس مکھ اور ذہین بچی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے ماں باپ کی تمام تر توجہ کا مرکز تھی اس کے ماں باپ اپنی سی کوشش کر کے اس کی تمام خواہشات و ضروریات پوری کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے مگر اس کی خواہشات تھیں ہی کتنی؟ کبھی کسی ٹھیلے پر چنے چاٹ کھانے کی ضد تو کبھی لمبے بالوں والی کانچ کی گڑیا کا مطالبہ اور کبھی چڑیا گھر دیکھنے کی خواہش۔۔۔ غریب بھلا اس سے زیادہ کچھ جانتا ہو تو خواہش بھی کرے فاطمہ جب چھوٹی تھی تو عبدالحمید اکثر اس سے پوچھتا میری بیٹی بڑی ہو کر کیا بنے گی؟ تو جواب میں فاطمہ توتلی زبان میں کہتی میں داکٹر (ڈاکٹر) بنوں گی اور اس کا باپ کھل کھلا کر ہنس دیتا دوسری بہت سی خواہشوں کی طرح فاطمہ کو پڑھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ وہ دوسرے بچوں کو اسکول جاتے دیکھتی تو اس کے دل میں بھی اسکول جانے کی خواہش مچلنے لگتی۔ پر وہ ایک گہری سانس لے کر رہ جاتی۔ ان تمام بہن بھائیوں میں اگر کچھ مشترک تھا تو وہ تھی غربت، جس نے بہت سی دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم کا حصول بھی ناممکن بنا دیا تھا عبدالحمید محنت مزدوری کر کے جیسے تیسے بچوں کا مشکل سے پیٹ ہی بھر پاتا تھا اور سلیمہ بیچاری اس کا ساتھ دینے کی خاطر دن بھر آس پاس کے لوگوں کے برتن مانجھتی، جھاڑو لگاتی اور فارغ وقت میں قریب ہی ایک کھٹی میٹھی ٹافیاں بنانے والی فیکٹری سے کچھ مال منگوا کر اپنی بڑی دو بیٹیوں کے ساتھ مل کر ان کی پیکنگ کرتی جس کے عوض اسے اجرت کے طور پر چند روپے مل جاتے فاطمہ کی ماں کو بھی اپنے سب بچوں کو پڑھانے کا بہت شوق تھا مگر اس غربت بھرے ماحول میں اس شوق اور خواہش کی تکمیل بہت مشکل تھی۔ اپنے سب بچوں کو پڑھانا تو اس کے بس میں نہ تھا، سو اس نے صرف فاطمہ کو سکول بھیجنے کا فیصلہ کیا اس اکیلی کی پڑھائی کا بوجھ تو وہ اٹھا ہی سکتے تھے۔ فاطمہ کو ایک قریبی لڑکیوں کے گورنمنٹ اسکول میں داخلہ دلا دیا گیا

فاطمہ چونکہ ایک ذہین بچی تھی اور اسے پڑھنے کا بھی بیحد شوق تھا اس لیے بغیر کسی وقت کے پرائمری سے ہائی سکول تک کا سفر وہ نمایاں نمبروں سے طے کرتی گئی وہ جوں

جوں جوں بڑی ہو رہی تھی اس نے خواب بھی بڑے بڑے دیکھنا شروع کر دیئے تھے اس میں اس کا قصور بھی نہیں تھا۔ کیونکہ وہ ابھی عمر کے اس حصے میں تھی جس میں انسان خوابوں کی تعبیر نہیں دیکھتا، بس خواب دیکھتا ہے یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان تھوڑی سی کامیابی ملنے پر ہی وہ گمان کرنے لگتا ہے کہ وہ چاند پہ کمند ڈال دے گا یا آسمان سے تارے توڑ لائے گا مگر ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ فاطمہ بھی آنکھوں میں ایسے ہی خواب لئے اکثر رات دیر تک آسمان پر اپنی قسمت کے ستارے کو ڈھونڈتی رہتی لیکن وہ نادان یہ نہیں جانتی تھی کہ قسمت کا ستارہ ہر ایک کے مقدر میں نہیں چمکتا اس کا بچپن میں بار بار لاشعوری طور پر دہرایا جانے والا فقرہ کہ وہ بڑی ہو کر ڈاکٹر بنے گی، اب بڑھتی عمر کے ساتھ اس کی زندگی کا مقصد بنتا جا رہا تھا اب کوئی اس سے نہیں پوچھتا تھا کہ وہ بڑی ہو کر کیا بنے گی؟ کیونکہ اب وہ خود ہی اکثر اوقات اپنے باپ سے کہتی رہتی یا شاید اسے یاد دلاتی رہتی تھی کہ وہ بڑی ہو کر ڈاکٹر بنے گی۔

بابا! میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور غریب و نادار لوگوں کا مفت علاج کیا کروں گی آپ کیا ورلتاں کے تمام دکھ میں خود دور کروں گی۔ آپ کو اپنی بیماری کے لیے خود سے نہیں لڑنا پڑے گا۔ مہنگی دوائیوں کے لیے پریشان نہیں ہونا پڑے گا۔ بابا! آپ مجھے ڈاکٹر بنائیں گے نا؟ فاطمہ نے اپنے باپ کی گود سے سر اٹھا کر امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتی۔

کیوں نہیں پتر! میری بیٹی ضرور ڈاکٹر بنے گی بس تم دل لگا کر خوب محنت کرو عبدالحمید چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہتا۔ فاطمہ کی یہ بات سن کر اس کے دل میں دکھ کی ایک لہر اتر جاتی تھی۔

وہ فاطمہ کی اس بات پر اب کھل کھلا کر نہیں ہنستا تھا

کیوں کہ حالات اب پہلے سے بھی مشکل ہو گئے تھے۔
فاطمہ باپ کی ایسی طفل تسلیوں سے خوش ہو جاتی اور اپنے خواب کو دن بہ دن تعبیر ہوتے دیکھتی لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ فاطمہ سے بڑی اس کی دو بہنیں تھیں جواب شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھیں جس کی وجہ سے عبدالحمید اور سلیمہ کی راتوں کی نیند غائب ہو چکی تھی کیونکہ دونوں بہنوں کی شادی کے اخراجات پورے کرنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا آخر ایک دن دونوں میاں بیوی نے فیصلہ کیا کہ فاطمہ کو اب مزید آگے نہیں پڑھانا چاہیے۔ کیونکہ اب اس کے تعلیمی کیا خراجات برداشت کرنا ممکن نہیں رہا تھا فاطمہ کی تعلیم سے زیادہ اس کی بہنوں کی شادی ضروری تھی اور ایک بیٹی کا خواب پورا کرنے کے لئے دوسری بیٹیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا لہٰذا چار و نا چار فاطمہ کو اپنی تعلیم کو خیر باد کہنا پڑا جس دن اسے یہ کام کرنا پڑا تھا، اس دن وہ بہت ٹوٹ کر روئی تھی اس کی سب امیدیں دم توڑ گئی تھیں مگر اس کے لبوں پر کوئی شکوہ نہیں تھا۔ گھر کے سب حالات اس کے سامنے تھے۔ آج اسے پہلی دفعہ اپنی مفلسی اور بے بسی کا شدید احساس ہوا تھا کسی چیز کے چھن جانے یا نہ ملنے کا تکلیف دہ احساس آج فاطمہ کو اپنی اسکول فرینڈ سعدیہ کی کہی بات شدت سے یاد آ رہی تھی کہ غریب آدمی بغیر سموں والے گھوڑے کی طرح ہوتا ہے جو جتنا مرضی تیز بھاگ لے لیکن زیادہ دور نہیں جا پاتا اور اس کی یہ بات سچ ثابت ہوئی تھی۔ آج پہلی بار اسے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ اس کے سارے خواب محض ایک سراب تھے اور کچھ نہیں مگر ستم ظریفی کے امتحان ابھی اور بھی تھے وقت گزرتا گیا اور ایک دن فاطمہ کی بھی اپنی بہنوں کی طرح شادی کر دی گئی فاطمہ کا شوہر سلیم کلرک کی ایک چھوٹی موٹی نوکری کرتا تھا وہ ایک نیک اور محنتی آدمی تھا وہ فاطمہ کو دنیا کی آسائشات تو نہ دے سکتا تھا لیکن اس نے فاطمہ کو کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی وہ اس سے محبت کرتا تھا اور اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا فاطمہ کو اپنے شوہر کے گھر چھائی تنگدستی سے کوئی شکوہ نہیں تھا کیوں کہ اس نے برے سے برے حالات میں بھی جینا سیکھ لیا تھا لہٰذا یہاں بھی اس نے سمجھوتہ کر لیا تھا دنیا میں دکھ سکھ زندگی کا حصہ ہیں اور یہ ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ اسی دھوپ چھاؤں میں زندگی کے سات سال گزر گئے۔ ان سات سالوں میں زندگی ان پر کچھ حد تک مہربان ہو گئی تھی مگر ایک اولاد کی نعمت تھی، جس سے وہ محروم رہے سلیم فاطمہ سے بہت محبت کرتا تھا اور اسے خیال تھا کہ وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ کیوں کہ فاطمہ نے ہر اچھے برے وقت میں اس کا ساتھ دیا تھا اور اس نے سلیم سے کبھی کسی چیز کا بے جا مطالبہ نہیں کیا تھا نہ ہی کبھی کسی محرومی کا شکوہ کیا تھا، اسی لیے سلیم نے بھی کبھی اسے بے اولادی کا طعنہ نہیں دیا تھا اور نہ ہی کبھی دوسری شادی کا سوچا تھا۔ قسمت کے اس تماشے میں فاطمہ کی زندگی جیسے رک سی گئی تھی اس کے خواب تو بہت پہلے ہی مایوسیوں کی خاک تلے دب چکے تھے اور اب جینے کی وجہ بھی مفقود ہوتی دکھائی دے رہی تھی وہ اکثر سوچتی کہ اس کا دنیا میں آنے کا آخر مقصد کیا تھا؟ کیا وہ دنیا کی ساری مشکلیں اور محرومیاں برداشت کرنے کے لئے بنائی گئی تھی؟
کیا وہ زندگی کی خوشیوں اور نعمتوں پر کوئی حق نہیں رکھتی تھی؟
ایسے ہی کئی شکوے تھے جو وہ ہر وقت اپنے دل میں لئے پھرتی تھی مگر اپنے رب کے سامنے ان شکوؤں کو لب پہ لانے سے ڈرتی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ شکوہ کرنے سے زندگی کی مشکلیں آسان نہیں ہوتیں بلکہ صبر اور برداشت کا راستہ مزید لمبا اور تکلیف دہ ہو جاتا ہے ایک دن طبیعت کچھ ناساز ہونے پر فاطمہ ڈاکٹر کے پاس گئی تو پتا چلا کہ اس کی زندگی میں بہار آنے والی ہے وہ ماں بننے والی تھی یہ ایک عورت ہی جانتی ہے کہ ماں بننے کا احساس دنیا کا سب سے خوبصورت احساس ہوتا ہے ایک روح کو نو ماہ تک اپنے وجود میں پنپتے دیکھنے کا احساس، اس کی ہر سانس کو محسوس کرنے کا احساس اور اپنے اندر ایک خواب کے پلنے کا احساس فاطمہ کا یہ احساس قدرے شدید تھا کیونکہ خدا سات سال بعد اسے اولاد کی نعمت سے نوازنے والا تھا اس خبر سے، فاطمہ کے چھوٹے سے ٹوٹے پھوٹے زنگ آلود گھر میں جیسے ہر طرف خوشیوں کی برسات ہونے لگی تھی۔ کئی برسوں سے اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں جیسے کوئی امید کا تارا ٹمٹمانے لگا تھا، سارے خواب جاگ اٹھے تھے، سب ارمان مچل مچل کے لبوں پہ مسکراہٹوں کے ساتھ بکھرنے لگے تھے اور اچانک جیسے زندگی سے سارے گلے شکوے دور ہو گئے تھے عورت ایک خوشی ملنے پر بہت سے

غم بھلا دیتی ہے اور فاطمہ نے بھی ایسا ہی کیا تھا اسے کو ایسا لگ رہا تھا جیسے قدرت کو اس پر ترس آ گیا تھا اور اس کے بیٹے کی شکل میں اس کی حیات طویل کر دی گئی تھی اور آخر نو ماہ بعد فاطمہ اپنے بیٹے عمر کو گود میں لئے بہت خوش تھی آج اس کی سب محرومیوں کا مداوہ ہو گیا تھا اس کی زندگی کا حاصل اس کی گود میں قلقاریاں بھر رہا تھا سلیم کی بھی خوشی کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اسے بیٹا ملنے کی خوشی سے زیادہ فاطمہ کو خوش دیکھ کر خوشی اور سکون حاصل ہو رہا تھا عمر کی پیدائش کے دو سال بعد ہی سلیم کی پروموشن بھی کر دی گئی تھی اور اب سلیم کلرک سے ہیڈ کلرک ہو گیا تھا ایک دن اس نے فاطمہ سے کہا۔

''فاطمہ! تم نے میرے ساتھ بہت تنگدستی کے دن گزارے ہیں تمہاری جگہ اگر کوئی اور عورت ہوتی تو شاید کب کی مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہوتی لیکن تم نے ہر مشکل اور برے وقت میں میرا ساتھ دیا ہے تم ایک بہت اچھا جیون ساتھی ثابت ہوئی ہو، جس کے لئے میں اپنے رب کے ساتھ ساتھ تمہارا بھی بہت شکر گزار ہوں سلیم نے فاطمہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''میں نے یہ تمام مشکلیں اور مصیبتیں اکیلے تو برداشت نہیں کی ہیں آپ بھی اس مشکل وقت میں ایک سچے اور محبت کرنے والے ساتھی کے طور پر ہمیشہ میرے ساتھ رہے ہیں ورنہ اس معاشرے میں کوئی بھی مرد اپنے گھر میں ایسی عورت کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتا جو اسے اولاد کی خوشی نہ دے سکے۔اس کے لیے آپ نے جس قدر صبر و تحمل اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا ہے یہ ہر مرد کے بس کی بات نہیں فاطمہ نے تشکر بھرے انداز میں سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''لو باتوں باتوں میں اصل بات تو میں بھول ہی گیا۔'' سلیم نے خوشی بھرے لہجے میں کہا۔

''کون سی بات؟'' فاطمہ نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

''میں آج تک تمہیں کوئی تحفہ نہیں دے پایا ایسا نہیں کہ مجھے تحفہ دینے کی چاہ نہیں تھی۔بس حالات کچھ ایسے تھے کہ میں نے ہمیشہ اس خواہش کو دل میں چھپائے رکھا لیکن اب چونکہ اللہ کا کرم ہے کہ میں تمہیں تمہاری مرضی کا کوئی بھی تحفہ دے سکتا ہوں تو بتاؤ تمہیں کیا چاہیے؟ سلیم نے پرجوش انداز میں کہا۔آج وقت تھا کہ وہ اپنے لئے کچھ مانگ لیتی لیکن اب اسے اپنے لئے کچھ بھی مانگتے ہوئے ڈر لگتا تھا اسے کسی چیز کی چاہ نہیں رہی تھی یا شاید کہیں نہ کہیں آج بھی اسے اپنی قسمت پر بھروسہ نہیں تھا میں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ محرومیوں میں گزارا ہے اپنے خوابوں کو سراب بنتے دیکھا ہے اپنی خواہشوں کو دھول بن کر نا امیدی کی وادیوں میں کہیں گم ہوتے دیکھا ہے میں نے زندگی سے بہت کچھ تو نہیں چاہا تھا بس میری ایک ہی خواہش تھی کہ میں زندگی میں کچھ بن کر اوروں کے کام آسکوں اپنوں اور غیروں کی مشکلوں کا مداوا کر سکوں لیکن میں ایسا نہیں کر پائی اور اب نہ ہی کبھی ایسا کر پاؤں گی یہ کہتے ہوئے فاطمہ کی آنکھیں شکست خوردہ سپاہی کی طرح جھکی ہوئی تھیں اور ٹپکنے والے آنسو اس کے رونے کا پتا دے رہے تھے! میں آپ سے کچھ نہیں چاہتی سلیم! آپ کی محبت اور خلوص ہی میرے لئے سب سے بڑا تحفہ ہے آپ سے مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ فاطمہ نے سلیم کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

''میں بس آپ سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں۔'' فاطمہ نے بات جاری رکھی۔

''کیسا وعدہ؟ تم جو بھی وعدہ لوگی، میں اسے ضرور پورا کروں گا۔'' سلیم نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''ہم دونوں نے تو ساری زندگی مشکلوں اور تکلیفوں میں گزار دی لیکن میں چاہتی ہوں کہ ہمارا بیٹا ایسی زندگی نہ گزارے اسے زندگی میں کبھی کسی محرومی کا سامنا نہ کرنا پڑے وہ ایک بااعتماد اور باوقار انسان بن کر زندگی کی تمام رونقیں اور خوشیاں حاصل کرے ہمارا بیٹا ہماری طرح گمنامی کی زندگی نہ گزارے بلکہ کچھ بن کر اس معاشرے میں ایک اونچا مقام حاصل کرے میں چاہتی ہوں کہ ہمارا بیٹا ڈاکٹر بن کر غریب و نادار لوگوں کی خدمت کرے۔'' فاطمہ نے سلیم کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے ملتجیانہ انداز میں کہا! آج پھر اس نے اپنے خوابوں کی تعبیر مانگی تھی ایک بار پھر اس نے تاروں کو نوچنے کے لئے اڑان بھرنا چاہی تھی کتنے برسوں بعد فاطمہ نے قسمت کو ایک اور موقع دینے کی ٹھان لی تھی۔

"ہمارا بیٹا ضرور ڈاکٹر بنے گا اور معاشرے میں ایک باعزت اور باوقار زندگی گزارے گا۔" سلیم نے فاطمہ کا ہاتھ تھامے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا! یہ سن کر فاطمہ کی آنکھوں میں امید کی ایک چمک اور ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ جھلملانے لگی اسے اب اپنے خوابوں کی تعبیر پر بھروسہ ہونے لگا تھا کیونکہ اب اس کا شوہر سلیم اس کے ساتھ تھا اور وقت بھی پہلے جیسا سرکش نہیں رہا تھا ہم اپنی تربیت سے اسے ایک اچھا اور قابل انسان بنائیں گے تاکہ وہ زندگی کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے غرور و تکبر کی سیڑھی پر پاؤں دھرے بغیر کامیابی کو پالے اور غریب اور محتاج لوگوں کو اپنے سے کم تر نہ سمجھے فاطمہ نے خود سے سوچا! فاطمہ نے ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے بیٹے کی تربیت بہت اچھے انداز سے کی تھی اس کی ہر ضرورت اور خواہش کا خیال رکھا تھا اسے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی فاطمہ کی شدید خواہش تھی کہ اس کا بیٹا معاشرے میں لوگوں کے ساتھ ساتھ اپنے رب کے سامنے بھی سرخرو ہو لہٰذا اس نے اپنے بیٹے کو چھوٹی عمر سے ہی اخلاقیات کے ساتھ ساتھ نماز اور روزے کی تعلیم بھی دینا شروع کر دی تھی۔ فاطمہ کی اس تربیت کا اثر ہی تھا جو عمر کو ہر جگہ نمایاں حیثیت دلانے میں مددگار رہتا تھا عمر نے بچپن سے ہی وہ سب بنیادی باتیں سیکھ لی تھیں جو ایک کامیاب انسان بننے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں ایک مثالی بیٹا تھا جس پر اس کے والدین کو فخر تھا فاطمہ کے خوابوں کی تعبیر دور افق پہ چھائے کالے بادلوں کی طرح آہستہ آہستہ چھٹتی نظر آ رہی تھی۔ لیکن شاید قسمت ابھی بھی اپنی روش پر قائم تھی اور زندگی ابھی اتنی آسان نہیں ہو پائی تھی کہ ایک اور آزمائش پہاڑ بن کر سامنے آ کھڑی ہوئی عمر ابھی نو سال کا تھا کہ اس کے والد کا ایک بس حادثے میں انتقال ہو گیا سلیم کی یوں اچانک موت سے فاطمہ پہ جیسے کوئی سکتہ طاری ہو گیا تھا اسے نہ اپنا ہوش تھا نہ دنیا کا وہ صدمے کی وجہ سے کئی دن تک ہوش میں نہ آ سکی تھی ایک ہفتے بعد جب وہ ہوش میں آئی تو اسے احساس ہوا کہ اس کا دامن تو ایک فقیر کے کاسہ کی طرح بالکل خالی ہو چکا تھا اسے اپنا سارا وجود بے جان سا محسوس ہو رہا تھا ایک بار پھر قسمت نے اسے اوندھے منہ گرایا تھا اس میں چلنے پھرنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی کیونکہ ایک بار پھر اس سے لاٹھی چھین لی گئی تھی آگے بڑھنے کے سارے راستے مفقود ہو چکے تھے وہ خود کو نیم پاگل محسوس کرنے لگی تھی ایسے حالات میں کچھ سوچنا اور سمجھنا اس کے لئے ممکن نہیں رہا تھا وقت اسی طرح اپنی دھیمی رفتار سے چلتا رہا اور تین ماہ بعد اسے سلیم کے چہرے کے علاوہ بھی کوئی چہرہ دکھائی دیا، عمر کا چہرہ اپنے بیٹے کا چہرہ جو اب اس کی کل پونجی تھا اس کے جینے کی آخری امید تھا ایسے حالات میں عمر نے ایک جگنو کا کام کیا تھا جو اندھیرے میں بھٹکی ہوئی چڑیا کو راہ دکھاتا ہے فاطمہ کو بھی جینے کی راہ عمر نے دکھائی تھی ورنہ وہ تو زندہ لاش کی طرح زندگی سے بالکل خالی ہو چکی تھی۔

"امی جان! آپ نہ روئیں اور نہ ہی پریشان ہوں اگر آپ اسی طرح پریشان رہیں گی تو بابا جان کو بھی بہت دکھ ہوگا بابا آپ کو ایسی حالت میں کبھی نہیں دیکھ سکتے تھے وہ آپ کو ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتے تھے ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا کہ آپ ہمیشہ ہنستی مسکراتی رہیں امی جان آپ اس طرح رو کر انہیں تکلیف نہ پہنچائیں، عمر نے رندھی ہوئی آواز میں فاطمہ کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا اور فاطمہ نے گویا اس دن اس کی بات مان لی اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ عمر کی دلجوئی، خدمت اور محبت سے فاطمہ آخر ایک ماہ بعد سنبھل گئی اسے اپنے اردگرد کی دنیا کا احساس ہونے لگا تھا۔ اب اس کے بیٹے کا مستقبل ہی اس کا نصب العین تھا اپنے بیٹے عمر کے مستقبل کے لئے وہ کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھی اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے خوابوں کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی خواہ اس کے لئے اسے مزدوری ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ بہت سوچ بچار کے بعد آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بیٹے کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے گی جس خواب کو وہ خود پورا نہیں کر پائی اب اپنے بیٹے کو اس خواب کی تعبیر دے گی ابھی اس میں جان باقی تھی جینے کی امید باقی تھی فاطمہ کو اب اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں چاہیے تھا اسے اگر کچھ چاہیے تھا تو اپنے بیٹے عمر کے لئے زمانے کی تمام رعنائیاں، تمام خوشیاں اور تمام رونقیں اور ان سب کے حصول کی خاطر اس نے لوگوں کے برتن مانجھے، جھاڑو پوچھے لگائے فیکٹری میں پارٹ ٹائم جاب کی، ساری ساری رات جاگ کر لوگوں کے

کپڑے سلائی کیے اور اپنے بیٹے کی تعلیم کے لیے ہر وہ کام کیا جو ایک عورت کرسکتی ہے۔ جو ایک ماں کرسکتی ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عمر اپنی انتھک محنت سے ہر امتحان میں پاس ہوتا گیا اور فاطمہ کی آنکھوں کی چمک روز بروز بڑھتی جاتی مگر اس کا جسم جواب دینے لگا اس میں اب اتنی طاقت باقی نہیں رہی تھی کہ وہ کوئی مشقت بھرا کام کرتی عمر اکثر اپنی ماں کی گرتی ہوئی صحت کو دیکھ کر پریشان ہوجاتا۔

"امی جان! میں اب جوان ہوگیا ہوں میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ کوئی پارٹ ٹائم جاب کرلیتا ہوں بس آپ اب اتنا کام نہ کیا کریں بیمار پڑ جائیں گی۔" فاطمہ عمر کی اس بات پر مسکرا کر کہتی۔

"کوئی بات نہیں۔ میرا بیٹا جب ڈاکٹر بن جائے گا تو خود ہی میرا علاج کرلے گا ایک دن عمر کو عشاء کی نماز گھر پہ پڑھتے دیکھ کر فاطمہ کچھ پریشان سی ہوگئی کیونکہ آج تک اس نے عمر کو کوئی بھی نماز گھر پہ پڑھتے نہیں دیکھا تھا خواہ سخت ٹھنڈ کا موسم ہو یا موسلا دھار بارش وہ پانچ وقت کی نماز مسجد میں ہی ادا کرتا تھا عمر نے ابھی نماز ختم نہیں کی تھی کہ فاطمہ گھر پر نماز پڑھنے کی وجہ دریافت کرنے کی غرض سے اس کے پاس جاکر بیٹھ گئی۔

"بیٹا سب خیر تو ہے نا؟ تم آج گھر پر ہی نماز پڑھ رہے ہو طبیعت تو ٹھیک ہے نہ تمہاری؟" فاطمہ نے عمر کے سر پر فکرمندی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"جی امی جان میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے آپ کو پتا ہی ہے کہ آج صبح کراچی کی ایک اہم اور بڑی مسجد میں خود کش حملہ ہوا ہے۔ جس میں کئی معصوم جانیں ضائع ہوئی ہیں اور دہشت گردوں نے ایسے اور بھی حملے کرنے کی دھمکیاں دی ہیں بس اسی بات کے پیش نظر ہماری مسجد کے امام نے تھوڑا احتاط رہنے کا کہا ہے لیکن میں موت سے نہیں ڈرتا امی جان! کیونکہ زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے میں بس سارا دن اسی پریشانی میں رہا ہوں اس لیے اس وقت باہر جانے کا دل نہیں کیا۔" عمر نے اپنا سر فاطمہ کی گود میں رکھتے ہوئے قدرے افسردگی سے کہا۔

"اللہ ہدایت دے ان لوگوں کو جو اپنے ہی لوگوں کی جان کے دشمن بن گئے ہیں مجھے ایک بات سمجھ نہیں آتی کہ یہ لوگ انسانوں کو مار کر کون سی جنت کے طلبگار ہیں بھلا

ایک مذہب جو ایک معصوم انسان کو مارنے کو ساری انسانیت کا قتل قرار دیتا ہے اور ایک انسان کو بچانا ساری انسانیت کو بچانے کے مترادف قرار دیتا ہے وہاں ایسی بوسیدہ سوچ کی کہاں گنجائش ہے کہ اگر آپ کی بات نہیں مانی جاتی تو آپ معصوم لوگوں کو مار کر اپنی بات منوائیں؟
''امی جان اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ پڑھے لکھے نہیں ہیں ان لوگوں کے پاس نہ دنیاوی علم ہے اور نہ دین کی صحیح سوجھ بوجھ جس کی وجہ سے یہ بہت جلد دشمن کی چکنی چپڑی اور جذباتی باتوں میں آجاتے ہیں یہ بہت سادہ لوح لوگ ہیں یہ اسلام کو ایک دین کے طور پر نہیں بلکہ ایک کلچر کے طور پر اپنائے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے مذہب کو لے کر یہ اتنے شدید ہو چکے ہیں کہ آج دنیا انہیں شدت پسند مسلمان کہنے پر مجبور ہو گئی ہے۔''
عمر نے فاطمہ کی گود سے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔
''یہ لوگ لاشعوری طور پر اسلام کی غلط تصویر دنیا کو دکھا رہے ہیں ان کی اس روش سے دنیا میں آج میرے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیارا دین ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا ہے۔ بیٹا تم فکر نہ کرو ہمارے فوجی جوان ان دشمنوں سے خوب نپٹ رہے ہیں یہ ان کا آخری مورچے تک پیچھا کریں گے اور آخر شکست ہی ملک دشمنوں اور غداروں کا مقدر ٹھہرے گی ان شاء اللہ۔'' فاطمہ نے پر عزم اور حتمی انداز میں کہا اور پھر بولی۔
''اچھا بیٹا تم آرام کرو صبح جلدی اٹھنا ہے۔'' عمر کے مزید کچھ بولنے سے پہلے ہی فاطمہ اٹھ کر وہاں سے چلی گئی عمر کتنی دیر ان گتھیوں کو سلجھاتے سلجھاتے کب سو گیا اسے پتا ہی نہیں چلا۔
اتنے سالوں میں فاطمہ نے اپنے بیٹے کی تعلیم کے لئے دن رات محنت کی تھی اس نے سوائے خاص موقعوں کے کبھی نئے کپڑے یا جوتے نہیں خریدے تھے اسے صرف عمر کے جوتوں اور کپڑوں کی فکر لگی رہتی تھی اس کے تعلیمی اخراجات ہی اس قدر تھے کہ وہ چاہ کر بھی اپنے لئے کوئی نئی چیز نہیں خرید سکتی تھی وہ اب اپنے لئے نہیں اپنے بیٹے عمر کے لئے جی رہی تھی وہی اس کا سب کچھ تھا۔ اب فاطمہ کی محنتوں کا پھل اسے ملنے والا تھا اب وہ اپنے خوابوں کی تعبیر کو بہت واضح دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں کی چمک دوبارہ لوٹ آئی تھی اب کچھ بھی دھندلا نہیں تھا۔ ''میں آج کل کچھ سوچ رہی ہوں فاطمہ نے ٹیبل پر ناشتہ رکھتے ہوئے کہا۔
''کیا سوچ رہی ہیں آپ آج کل؟'' عمر نے تولئے سے منہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔
''یہی کہ میرے بعد تمہارا کون خیال رکھے گا اس لئے میں چاہتی ہوں کہ تمہاری شادی کردوں فاطمہ نے عمر کے پاس بیٹھتے ہوئے کچھ پریشانی سے کہا۔
''امی جان آپ کیسی باتیں کرتی ہیں اللہ کرے آپ کو میری بھی عمر لگ جائے پلیز مجھے چھوڑ کر جانے کی باتیں مت کیا کریں۔'' عمر نے قدرے ناراضی سے کہا۔
''ارے تم کوئی بچے ہو جو میرے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے تم اب جوان ہو اور میں نے تمہیں اتنا مضبوط بنایا ہے کہ تم دوسروں کا سہارا بن سکتے ہو۔'' فاطمہ نے اسے پیار سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔
''کوئی لڑکی دیکھوں یا تم نے خود کوئی پسند کر رکھی ہے ویسے سنا ہے تمہاری یونیورسٹی میں بہت خوبصورت لڑکیاں پڑھتی ہیں۔'' فاطمہ نے عمر کو کریدتے ہوئے کہا۔
''جی ہاں لڑکیاں تو بہت ہیں یونیورسٹی میں لیکن جو میری قسمت میں ہے وہ پتا نہیں دنیا کے کس کونے میں اگی ہوگی۔'' عمر نے شرارتی انداز میں جواب دیا۔
''اے لو وہ کوئی گاجر مولی ہے بھلا جو کہیں اگی ہوگی عجیب بات کرتے ہو تم بھی۔'' فاطمہ نے قدرے خفگی سے کہا۔
''امی جان میں مذاق کر رہا ہوں ابھی تو میرا ڈاکٹریٹ کا فائنل رزلٹ آنا ہے اگر کامیاب ہو گیا تو کراچی کے کسی بڑے اسپتال میں پریکٹس کروں گا اور پھر اپنا کلینک کھولوں گا اور پھر اس سب کے بعد آپ کی اس گاجر مولی کے بارے میں سوچوں گا۔'' عمر نے ایک بار پھر شرارتی انداز میں کہا۔
''تم ضرور کامیاب ہو گے اور ہاں خبردار اگر میری بہو کو دوبارہ گاجر مولی کہا تو۔'' فاطمہ نے مسکرا کر عمر کے کندھے پہ چپت لگاتے ہوئے کہا۔
''اچھا امی جان ابھی میں اپنے ایک دوست کے پاس جا رہا ہوں دوپہر کے کھانے تک واپس آجاؤں گا۔'' عمر نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد عمر تھوڑی دیر کے لیے ستانے کی غرض سے اپنے بستر پر لیٹا ہی تھا کہ باہر کسی عورت کے زور زور سے رونے دھونے اور چیخنے چلانے کی دل دوز آوازیں آنے لگیں۔ عمر ہڑ بڑا کے اٹھا اور باہر کی جانب لپکا۔ اس سے پہلے کہ فاطمہ عمر کو آواز دیتی عمر دروازے کی دہلیز پار کر چکا تھا فاطمہ بھی اس کے پیچھے باہر کو دوڑی باہر ایک ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا فاطمہ نے دیکھا کہ لوگ اس کے ساتھ والے گھر کے سامنے اکٹھا تھے یا اللہ خالہ شائستہ کے گھر کے سامنے اتنے لوگ کیوں اکٹھا ہیں؟ اللہ خیر کرے فاطمہ نے پریشان ہوتے ہوئے خود سے کہا۔

''لوگوں کے ہجوم میں فاطمہ کی نظر عمر پر پڑی۔ فاطمہ نے عمر کو آواز دے کر پاس بلایا۔

''یہ رونے کی آواز تو شائستہ خالہ کی ہے سب خیر تو ہے نا؟'' فاطمہ نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

''امی جان آپ اندر جائیں پلیز میں دیکھتا ہوں کیا ہوا ہے۔'' عمر نے فاطمہ کو اندر کی جانب قدرے دھکیلتے ہوئے کہا۔

''ارے کیسے اندر چلی جاؤں پیچھے ہٹو میں دیکھتی ہوں۔'' فاطمہ عمر کو پیچھے دھکیلتے ہوئے شائستہ خالہ کے گھر کی جانب بڑھی۔

فاطمہ ہجوم کو چیرتی ہوئی جیسے ہی شائستہ خالہ کے گھر میں داخل ہوئی اندر کا منظر دیکھ کر جیسے اس کے پاؤں سے زمین کھسک گئی تھی۔ اندر بڑے سے نیم تاریک کمرے میں چارپائی کے اوپر شائستہ خالہ کے چھوٹے بیٹے عرفان کی جلی ہوئی لاش ٹکڑوں میں بٹی پڑی تھی عرفان کی لاش قابل شناخت نہیں تھی بڑی مشکل سے عرفان کے کپڑوں اور دوسری چند نشانیوں کی مدد سے لاش کو پہچانا گیا تھا کراچی کی ایک مشہور مارکیٹ میں خودکش حملے میں مارے جانے والے معصوم اور بیگناہ شہریوں میں سے ایک عرفان بھی تھا عرفان شائستہ خالہ کے دو بیٹوں میں سے چھوٹا بیٹا تھا بڑا بیٹا احسان ایک ٹانگ سے معذور تھا اور قریبی مارکیٹ میں سبزی کا ٹھیلا لگاتا تھا عرفان دس جماعتیں پڑھ کر ایک فیکٹری میں چھوٹی موٹی نوکری کرتا تھا۔ چھوٹا ہونے کی وجہ سے عرفان شائستہ خالہ کا بہت لاڈلا تھا اور اپنے بڑے بھائی کا ایک واحد سہارا تھا احسان اکثر کہا کرتا تھا کہ اگر عرفان نہ ہوتا تو میں ٹھیلا لگانے کے بھی قابل نہ ہوتا کیونکہ صبح فیکٹری جانے سے پہلے عرفان اپنے بڑے بھائی کے ٹھیلے پر سبزی لگانے میں بھرپور مدد کرتا اور اس کے ٹھیلے کو قریبی مارکیٹ میں لانے اور لے جانے کا فریضہ بھی وہی سرانجام دیتا تھا احسان کا کام بس وہاں بیٹھ کر سبزی بیچنا تھا عمر بڑی مشکل سے فاطمہ کو گھر واپس لایا تھا۔ عمر فاطمہ کی یہ حالت دیکھ کر بہت ڈر گیا تھا اس نے فاطمہ کو اندر لا کر چارپائی پر لٹا کر منہ میں چند قطرے پانی ڈالا اور چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ شام کو فاطمہ کو ہوش آیا تو وہ پھر سے شائستہ خالہ کے گھر کی جانب دوڑی لیکن پاس ہی بیٹھے عمر نے جلدی سے انہیں بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

امی صدمے سے ان کی ایسی حالت ٹھیک نہیں کل تک ہوش میں آجائیں گی آپ پلیز یہاں بیٹھیے اور زیادہ پریشان مت ہوں آپ کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے۔

عمر نے فاطمہ کو کندھے سے پکڑ کر چارپائی پر بٹھاتے ہوئے التجا کی! فاطمہ کے آنسو ایک لڑی کی مانند بہتے جارہے تھے لیکن وہ خاموش تھی جیسے اس کے اندر کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ فاطمہ کو نارمل ہونے میں کچھ دن لگے۔

''عمر بیٹا ایک کام کرو گے؟'' فاطمہ نے عمر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''جی امی جان کہیے۔'' عمر نے مسکراتے ہوئے فاطمہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''احسان ایک ماہ سے گھر پر فارغ بیٹھا ہے ٹھیلے پر سبزی لگانے اور مارکیٹ لے جانے میں اب اس کی مدد کرنے والا کوئی نہیں بھلا کب تک دونوں ماں بیٹا یونہی گزارا کریں گے بیٹا میں چاہتی ہوں کہ کل سے تم عرفان کی جگہ احسان بھائی کے ٹھیلے پر سبزی لگانے اور اسے مارکیٹ تک لے جانے میں اس کی مدد کر دیا کرو میں جانتی ہوں بیٹا تم ڈاکٹر بننے والے ہو اور تمہارے لیے یہ سب کرنا آسان نہیں ہوگا لیکن بیٹا اللہ تمہارے اس ایثار سے بڑا راضی ہوگا اور جب اللہ اپنے کسی بندے سے راضی ہو جاتا ہے نہ تو اسے دوسرے بندوں کے آگے جھکنے نہیں دیتا۔'' فاطمہ نے عمر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پرعزم انداز میں کہا۔

''امی جان آپ نے اپنے بیٹے کی جو تعلیم و تربیت کی

ہے ایسی تعلیم دنیا کی کسی یونیورسٹی میں نہیں دی جاتی مجھے آپ پر، آپ کی سوچ اور آپ کی تعلیم پر فخر ہے میں ڈاکٹر ضرور بننے جا رہا ہوں لیکن ڈاکٹر بننے سے پہلے میں ایک انسان ہوں اور انسانیت کے ناتے میرا یہ فرض ہے کہ میں ایک مجبور انسان کے کام آؤں لہذا آپ بے فکر رہیں میں کل سے ہی آپ کے حکم کی تعمیل بجالاؤں گا عمر نے پرعزم انداز میں کہا۔

فاطمہ نے تشکر بھرے انداز میں عمر کو گلے لگاتے ہوئے کہا

''اور ہاں یہ لو کچھ پیسے اور آتے ہوئے خالہ شائستہ کے لئے آنکھوں میں ڈالنے والا کوئی اچھا سا ڈراپ لیتے آنا۔'' عمر روزانہ احسان کی سبزی کا ٹھیلا لگانے اور اسے مارکیٹ تک پہنچانے میں مدد کرتا رہا اس نے کبھی اس کام میں کسی طرح کی بھی عار محسوس نہیں کی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد فاطمہ اور عمر کچھ دیر کے لئے ٹی وی دیکھتے اور پھر سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے تھے ملک کے مختلف شہروں میں آئے روز کے خودکش دھماکوں نے فاطمہ کو بہت بے چین کر رکھا تھا جہاں بھی کوئی ایسا حادثہ پیش آتا میڈیا وہاں کی لائیو فوٹیج میں لوگوں کے کٹے پھٹے جسم دکھا دکھا کر لوگوں کو ڈپریشن کا مریض بنانے میں پیش پیش تھا جس کی وجہ سے عام لوگوں کے دلوں میں ایک خوف طاری ہو گیا تھا لوگ اپنے پیاروں کو گھر سے رخصت کرتے وقت ایسا محسوس کرنے لگے تھے کہ جیسے ان سے آخری بار مل رہے ہوں اور باہر خدا جانے کہاں ان کا ٹکراؤ ایسے ہی کسی ہولناک دھماکے سے ہو جائے گا اور پھر وہ اپنے پیاروں کو کبھی نہیں ڈھونڈ پائیں گے فاطمہ کے دل میں بھی ایسے ہی وسوسوں نے ڈیرے ڈال لئے تھے عمر اپنے ایم بی بی ایس کے فائنل رزلٹ کے انتظار میں گھر پر نہیں بیٹھنا چاہتا تھا لہذا اس نے اپنے فارغ وقت کو بروئے کار لانے کے لئے اپنے ایک ڈاکٹر دوست کا کلینک جوائن کر لیا تھا وہ صبح ۹ بجے سے لے کر شام ۷ بجے تک اپنے دوست کے ساتھ مختلف مریضوں کو اٹینڈ کرتا اور رات ۸ بجے تک گھر لوٹ آتا تھا شہر کے حالات دن بہ دن بگڑتے جا رہے تھے کہیں لوگ ٹارگٹ کلرز کا شکار ہو رہے تھے تو کہیں خودکش حملہ آوروں کا خوف ہر وقت ذہنوں پہ طاری تھا آئے دن کوئی نہ کوئی ایسی ہولناک خبر سننے کو مل رہی تھی کہ سن کر روح کانپ جاتی تھی ایسی صورت حال میں سب سے زیادہ برا حال ماؤں کا تھا جو اپنے جگر کے ٹکڑوں کی بلائیں لیتی اور دعائیں دیتی ان کو اللہ کے حوالے کرنے پر مجبور تھیں فاطمہ کا حال بھی دوسری ماؤں سے مختلف نہیں تھا آج گھڑی کی سوئیاں ۹ کے ہندسے کو عبور کرتی ہوئی ۱۰ کے ہندسے کو چھو رہی تھیں لیکن عمر گھر لوٹ کر نہیں آیا تھا پتا نہیں ابھی تک عمر واپس کیوں نہیں لوٹا اللہ کرے سب خیر ہو اس نے پہلے کبھی گھر واپس لوٹنے میں اتنی دیر نہیں لگائی میں کیا کروں کیسے اس کا پتا کروں اسے کہاں ڈھونڈنے نکلوں؟ مجھے تو اس کے دوست کے کلینک کا ایڈریس بھی نہیں معلوم کہ وہ شہر کے کس حصے میں ہے یا اللہ میرے بیٹے کو صحیح سلامت گھر پہنچا دے۔''

فاطمہ کی بے چینی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی خدشات اور وسوسوں نے فاطمہ کے لئے سانس لینا مشکل بنا دیا تھا شہر کے حالات جاننے کے لئے اس نے جلدی سے ٹی وی چلایا ٹی وی پر چل رہی ایک بریکنگ نیوز سے فاطمہ کا کلیجہ منہ کو آ گیا تھا بلدیہ ٹاؤن میں ایک فیکٹری میں اچانک آگ لگنے سے سیکڑوں کی تعداد میں لوگوں کی ہلاکت متوقع ہے اس آگ نے اردگرد کی بہت سی دکانوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے ایک نجی ٹی وی پر اینکر حواس باختہ انداز میں بار بار یہی خبر سنا رہا تھا! ایسی صورت حال میں فاطمہ کو کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ وہ کیا کرے پھر اچانک اسے یاد آیا کہ نسرین کا بیٹا شاہد ایک دن عمر سے ملنے اس کلینک میں گیا تھا فاطمہ جلدی سے بڑی سی چادر میں خود کو لپیٹے نسرین کے گھر کی طرف دوڑی۔

''کیا بات ہے فاطمہ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو سب خیریت ہے نا؟'' نسرین نے فاطمہ سے پوچھا۔

''نسرین کیا شاہد گھر پر ہے؟'' فاطمہ نے لڑکھڑائی ہوئی آواز میں نسرین سے پوچھا۔

''ہاں شاہد گھر پر ہی ہے تم اندر آؤ۔'' نسرین نے دروازہ کھولتے ہوئے شاہد کو آواز لگائی اور فاطمہ کو بیٹھنے کے لئے کہہ کر پانی لینے چلی گئی تھوڑی دیر میں شاہد وہاں آیا۔

''خالہ آپ اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہیں سب خیریت ہے نا؟ شاہد نے فاطمہ کے چہرے پر چھائی

پریشانی بھانپتے ہوئے پوچھا۔

"شاہد بیٹا وہ وووہ میں پوچھنے آئی تھی کہ عمر جس کلینک میں کام کرتا ہے اس علاقے کا نام کیا ہے" فاطمہ نے لڑکھڑائی ہوئی زبان میں پوچھا۔ وہ عمر ابھی تک نہیں آیا وہ روزانہ ۸ بجے ہر حال میں گھر لوٹ آتا ہے لیکن آج اس کا کہیں اتا پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے فاطمہ نے روتے ہوئے کہا۔

عمر کے پاس موبائل فون تو ہے نا اسے کال کر کے پوچھ لیتیں۔" نسرین نے کہا۔

"میں نے پی سی او سے اس کے فون پہ بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کا فون بند جا رہا ہے۔" فاطمہ نے پریشان ہوتے ہوئے کہا!

شاہد بیٹا یہ کلینک کس ایریا میں ہے مجھے وہاں لے جاؤ میں خود اپنے بیٹے کو ڈھونڈنے جاؤں گی۔" فاطمہ نے ملتجی انداز میں کہا۔

"خالہ عمر جس کلینک میں کام کرتا ہے وہ بلدیہ ٹاؤن میں ہے۔" شاہد نے کہا۔

بلدیہ ٹاؤن کا نام سنتے ہی جیسے فاطمہ کے جسم سے کسی نے اس کی روح کھینچ لی تھی اس کے ہاتھ پیر برف کی مانند ایسے ٹھنڈے ہو گئے تھے جیسے کسی سرد خانے میں پڑے مردے کے ہوتے ہیں۔

"ہائے میں مر گئی یہ تو وہی علاقہ ہے جہاں ابھی ابھی ٹی وی پر بتا رہے تھے کہ فیکٹری میں آگ لگنے سے سیکڑوں لوگ زندہ جل گئے۔" فاطمہ نے چھاتی پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"فاطمہ تم ایسی حالت میں کہاں جاؤ گی تم فکر نہ کرو میں ابھی شاہد کو بھیجتی ہوں وہ عمر کی خبر لے کر آتا ہے۔" نسرین نے فاطمہ کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں خالہ آپ فکر نہ کریں میں ابھی جاتا ہوں شاہد نے بائیک کی طرف بڑھتے ہوئے کہا!

گھڑی کی سوئیوں کی آواز فاطمہ کے کانوں میں ہتھوڑوں کی طرح لگ رہی تھی ہر گزرتے لمحے اسے اپنے پاؤں تلے سے زمین کھسکتی محسوس ہو رہی تھی اس کی آنکھوں میں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا اور حواس ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے کہ آخر رات گئے دروازے پر دستک سے اچانک وہ

غزل

قلب و نظر میں کس کی ہے حسرت نہ پوچھیے
کس سے ہوئی ہے مجھ کو محبت نہ پوچھیے
ان کی نظر کی آج شرارت نہ پوچھیے
دل میں اتر گئی قیامت نہ پوچھیے
توبہ تو میں ہمیشہ کرتی رہی مگر
کیوں کر ہوئی خراب یہ نیت نہ پوچھیے
طوفان غم سے میں گزرتی چلی گئی
کشتی ہے میری اب بھی سلامت نہ پوچھیے
غم سے مجھے نوازا ہے دنیا نے ہر گھڑی
موجود اس میں کتنی ہے لذت نہ پوچھیے
جس کو نظر سے دیکھا ہے دل اس پر آ گیا
مجھ سے میری نگاہ کی قیمت نہ پوچھیے
ہر دم تمہاری یاد میں بے چین ہے یہ دل
کیوں ہے صدف تم سے محبت نہ پوچھیے

نسیم سکینہ صدف

☆☆

حرف اول

ایک بات تو یہ طے ہے کہ
تاریخ ادب میں جتنا بھی محبت پر لکھا ہے
مردنے ہی لکھا ہے
لیکن اب علم کے درجے طے کرتے ہوئے
مجھے یہ تو پتا چل گیا کہ
کم از کم جو لوگ جس موضوع پر لکھتے ہیں
کبھی کبھی
اس کے حرف اول
سے بھی واقف نہیں ہوتے

امبر گل..... جھڈو سندھ

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ 78/5.L تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

اپنے حواس میں واپس آئی اور دروازے کی طرف دیوانہ وار لپکی۔

''السلام علیکم امی جان۔'' عمر نے اندر آتے ہی سلام کیا۔

''تم......تم تم ٹھیک تو ہونا میرے بیٹے؟'' فاطمہ نے ہذیانی انداز میں عمر کو ٹٹولتے ہوئے کہا!

جی امی جان میں بالکل ٹھیک ہوں۔ عمر نے فاطمہ کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا!

تم کہاں رہ گئے تھے؟ تم نے اتنی دیر کیوں کردی آنے میں؟ تمہیں اندازہ بھی ہے کہ میں نے یہ وقت کیسے انگاروں پہ کاٹا ہے؟ فاطمہ نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہا!

امی جان مجھے معاف کردیں میں آپ کو اطلاع نہیں کر سکا بس صورت حال ہی کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ مجھے اپنا ہوش نہیں رہا تھا آپ نے آج کے سانحے کے بارے میں ٹی وی پہ سنا ہی ہوگا بس آج سارا دن وہاں لوگوں کو مرہم پٹی کرتے گزر گیا میں چاہ کر بھی آپ کو اطلاع نہیں کرسکا جس کے لئے میں بہت شرمندہ ہوں۔ آئندہ ایسی کوتاہی کبھی نہیں کروں گا۔'' عمر نے فاطمہ کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''بیٹا میں نے ان وسوسوں کے ساتھ ایک زندگی گزاری ہے لیکن اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں مزید ان کا سامنا کرسکوں آج کے بعد تم کبھی ایسی بے پرواہی مت کرنا۔'' فاطمہ نے عمر کا چہرہ ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا!

کبھی نہیں کروں گا آپ پلیز روئیے مت عمر نے فاطمہ کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا!

بہت دیر ہوگئی ہے بیٹا اب جا کر تھوڑا آرام کرلو۔'' فاطمہ نے عمر کو بوسہ دیتے ہوئے کہا!

''آج کی رات مجھ پر حرام کردی گئی ہے امی جان آج کی رات میں شاید سو نہ سکوں گا آپ جا کر سو جائیں۔'' عمر نے پریشانی سے کہا!

''بیٹا آیۃ الکرسی پڑھ کر آنکھیں بند کرو نیند خود بہ خود آجائے گی۔'' فاطمہ نے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے امی جان کوشش کروں گا شب بخیر۔'' عمر نے اپنے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے کہا!

عمر کو اس کلینک میں کام کرتے پورے دو ماہ ہوچکے تھے وہ اپنے اس کام کا کوئی معاوضہ نہیں لیتا تھا لیکن اس کا دوست کسی نہ کسی بہانے عمر کی مالی مدد کرتا رہتا تھا اس بار اس نے عمر کو ایک نیا موبائل گفٹ کیا تھا حالانکہ عمر نے اپنے دوست سے کہا بھی کہ اس کے پاس پہلے ہی ایک موبائل ہے پھر اس نئے موبائل کی کیا ضرورت ہے لیکن پھر بھی اس کے دوست نے اصرار کر کے اسے ایک نیا موبائل تھما دیا عمر نے پرانے موبائل کو بیچنے کی بجائے اسے گھر میں رکھ دیا تاکہ کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں فاطمہ اس سے بروقت رابطہ کرسکے فاطمہ کو بھی اس سے کافی سہولت ہوگئی تھی وہ اب کسی بھی وقت اپنے بیٹے کی خیر خبر معلوم کرنے کے لئے اس سے رابطہ کرسکتی تھی

امی جان فائنل رزلٹ آنے میں چند دن باقی ہیں وہ دن دور نہیں جب آپ کا بیٹا ڈاکٹر کی یونیفارم میں آپ کے سامنے کھڑا ہوگا اور آپ فخر سے کہہ سکیں گی کہ میرا بیٹا ایک ڈاکٹر ہے۔'' عمر نے شوخ انداز میں فاطمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا!

انشاءاللہ فاطمہ نے مسکراتے ہوئے کہا!

''مجھے اپنے بیٹے پر ہر حال میں فخر ہے اللہ تمہیں کامیابی عطا کرے اور دنیا کی تمام خوشیاں تمہاری قسمت میں ہوں تمہیں کبھی کسی محرومی اور محتاجی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔'' فاطمہ نے عمر کے قریب آکر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''امی جان میں آپ کی سکھائی تمام باتیں ہمیشہ یاد رکھوں گا اور ان پر عمل کروں گا کیونکہ یہ تعلیم جو آپ نے مجھے دی ہے دنیا کی کوئی یونیورسٹی نہیں دے سکتی آپ میرے لئے مشعل راہ ہیں۔'' امی جان عمر نے تشکر بھرے انداز میں کہا۔

فاطمہ نے عمر کی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے اسے دعائیں دیں اور پھر کھانا بنانے میں مصروف ہوگئی

زندگی بھی کتنے روپ بدلتی ہے کبھی کانٹوں کی سیج تو کبھی پھولوں کا بستر، کبھی تولہ تو کبھی ماشہ، کبھی شہرت تو کبھی تماشا بس اسی طرح زندگی کا ہر فیز دوسرے فیز کی نشاندہی کرتا ہے اگر آج دکھ، غم اور تکلیف ہے تو یقیناً آنے والا کل خوشیوں کی نوید لائے گا اللہ تعالیٰ انسان کو کبھی دے

کر آزماتا ہے اور کبھی لے کر آزماتا ہے یہ آزمائش ہی اصل زندگی کا محور ہے جو اس میں کامیاب ہوجاتا ہے اس پر موت بھی آسان ہوجاتی ہے

آج ایم بی بی ایس کے فائنل رزلٹ کا دن تھا اسی دن کے انتظار میں فاطمہ نے اپنے دن اور رات کا آرام وسکون خود پر حرام کرلیا تھا اسی دن کا اس نے بچپن سے انتظار کیا تھا آج اسے اس کے خواب کی تعبیر ملنے والی تھی آج تعبیر ملنے کا دن تھا آج فاطمہ کے کٹھن سفر کا اختتام تھا اور منزل بانہیں پھیلائے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ فاطمہ فجر کی نماز سے ایک دو گھنٹے پہلے ہی جاگ گئی تھی اور مصلے پر بیٹھ کر اپنے رب کے حضور اپنے بیٹے کی کامیابی کے لئے گڑگڑا کے دعائیں مانگ رہی تھی

آج اس نے عمر کی پسند کا ناشتہ بنایا تھا اور اس کا سفید کرتا پاجامہ اپنے ہاتھوں سے استری کر کے ٹانگ دیا تھا اس کا بس چلتا تو جس راستے سے عمر نے گزرنا تھا وہ اس راستے میں پھول ہی پھول بچھا دیتی فاطمہ آج بہت خوش تھی

"عمر بیٹا تمہارا رزلٹ کس وقت آئے گا؟" فاطمہ نے چائے کی کیتلی چولہے پر چڑھاتے ہوئے کہا!

امی جان دوپہر تک تو امکان ہے کہ رزلٹ آجائے گا عمر نے دانتوں میں برش کرتے ہوئے جواب دیا!

اللہ تمہیں کامیاب کرے بیٹا مجھے پوری امید ہے کہ اللہ تمہیں ضرور کامیاب کرے گا فاطمہ نے پرعزم انداز میں کہا!

انشاء اللہ آپ کی دعا چاہیے بس پھر دیکھئے اللہ کا کرم کیسے ہوتا ہے عمر نے پرجوش انداز میں کہا!

میری تمام دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں بیٹا فاطمہ نے عمر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا! اور ہاں رزلٹ دیکھنے سے پہلے اور بعد میں دو دو نوافل پڑھنا مت بھولنا بیٹا فاطمہ نے عمر کو تاکید کرتے ہوئے کہا!

جی امی جان آپ بے فکر رہیں عمر نے فاطمہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا!

عمر اس سفید کرتے پاجامے میں بہت بھلا لگ رہا تھا اس کے چہرے پر موجود نور تو اس کا خاصہ تھا ہی لیکن آج اس کے چہرے پہ جو چمک دمک تھی وہ دیدنی تھی آج وہ پیار اور ڈھیروں دعائیں لے کر اپنی ماں کے خواب کی تعبیر ڈھونڈنے نکلا تھا آج اس کے لئے بہت بڑا دن تھا آج اس نے اپنی ماں کو اس کی زندگی کا سب سے بڑا تحفہ دینا تھا آج عمر کے ڈاکٹریٹ کے امتحان کا فائنل رزلٹ تھا

عمر لڑکوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا رزلٹ بورڈ کی طرف بڑھا اس کے دل میں جہاں امید تھی وہاں کئی وسوسے بھی اسے کچوکے لگا رہے تھے ایک دفعہ تو اس کی ٹانگیں کانپی اور آنکھیں دھندلائیں جب اس نے رزلٹ بورڈ کی طرف دیکھا اس کا نام سرفہرست تھا وہ نمایاں نمبروں سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کر چکا تھا اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اس نے اپنی ماں کے خواب کی تعبیر ڈھونڈ نکالی تھی رزلٹ دیکھنے کے بعد اس نے شکرانے کے دو نوافل ادا کئے دوستوں کے درمیان مبارک باد کے تبادلے ہوئے اس سب کے بعد عمر نے مٹھائی کی دکان سے فاطمہ کی پسند کی مٹھائی لی اور گھر کو چل دیا

عمر کے راستے میں سبزی منڈی بھی پڑتی تھی اس نے سوچا کیوں نہ گھر جاتے ہوئے کچھ سبزی بھی لیتا جائے وہ جیسے ہی سبزی منڈی میں پہنچا اچانک ایک زوردار دھماکے کی آواز گونجی اور ہر طرف دھواں ہی دھواں چھا گیا لوگوں کی چیخ وپکار سنائی دینے لگی ہر سو جلے ہوئے انسانی گوشت اور خون کی بو پھیل گئی ایک ہی پل میں جیسے سارا نظارہ آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہوگیا تھا کچھ دکھائی دیتا تھا نہ کان پڑی آواز سنائی دیتی تھی بس ہر طرف دل دہلا دینے والی آہ وبکا تھی کس کی تھی؟ کون تھا؟ کس کا کیا لگتا تھا؟ کچھ علم نہ تھا کچھ دیر پہلے جیتے جاگتے، چلتے پھرتے زندگی سے بھرپور لوگ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے سیکڑوں جسم چھوٹے چھوٹے ان گنت ٹکڑوں میں بکھر گئے تھے کس کا ہاتھ تھا، کس کا پاؤں، کس کا سر تھا اور کس کا دھڑ کچھ پتا نہیں تھا کیونکہ کسی کی بھی شناخت ممکن نہیں رہی تھی فاطمہ کا خواب بھی انہیں ٹکڑوں میں کہیں بکھرا پڑا تھا کہاں کسی کو نہیں پتا تھا اس خواب کو بھی نہیں پتا کہ وہ کتنے ٹکڑوں میں بکھر گیا تھا وہ ایک ماں کا خواب تھا ایک جنت کا خواب تھا جسے کسی دوسرے انسان نے جنت کے حصول کی خاطر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سراب بنا دیا تھا ایک ماں کی زندگی بھر کی پونجی صرف ایک جنت کے بدلے لوٹ لی گئی تھی۔

آخری حصہ

عورت زاد

امجد جاوید

عورت زاد۔! کہانی ہے اس حسینہ کی جسے اِس ظالم معاشرے نے جنم دیالیکن اُس نے ظلم قبول نہ کیا اور ظالم کے خلاف بغاوت کر دی۔آہنی ارادوں والی اس ریشم بدن نے زمانے کے بھگنٹ گھوڑے کی لگامیں اپنے ہاتھ میں لے لیں اور اس پر سوار ہو کر وقت کو اپنا قیدی بنالیا۔ اس کا مقصد حقیقی عورت کو آزاد کرنا تھا۔ جس کے لئے وہ خودحالات کی بنائی ہوئی سنگلاخ راہوں چل پڑی۔ آبلہ پائی کے اس سفر میں آگ اورخون سے گذر کر اپنی منزل کی طرف گامزن رہنے والی برق صفت دلربا کو، صنف نازک اپنا مسیحا ماننے لگیں۔ ایک عورت زاد کی سرگذشت،جوباغی دلوں پر حکومت کرناجانتی تھی۔

قارئین کے پسندیدہ قلم کار محترم امجد جاوید کے قلم سے نئے افق کے قارئین کے لیے ہنگامہ خیز سلسلے وار کہانی۔

"میں کچھ وقت تمہارے پاس رہنا چاہتی ہوں۔"
موی نے اس قدر سکون سے کہا کہ نینا نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔وہ چند لمحے اسے حیرانگی سے دیکھتے رہنے کے بعد بولی۔

"حالانکہ تمہیں جلد از جلد مجھ سے چھٹکارا پالینا چاہئے ،میں نے تمہیں اغوا کیا ہے لڑکی، کوئی مہمان بنا کر نہیں لائی ہوں۔کسی بھی وقت میرا دماغ خراب ہو سکتا ہے اور میں تجھے کسی......" نینا نے کہنا چاہا لیکن موی اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولی

"قتل کردوگی نا،تو کردو۔مجھے برہنہ کر کے کوئی وڈیو بنا لوگی ، بنالو، اس وڈیو کو انٹرنیٹ پر وائرل کردوگی ، کردو۔مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"لڑکی تم شاید حالات کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہی ہو یا پھر تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔میں تمہیں صرف عورت ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں کہہ رہی ہوں، ورنہ جو کچھ تیرے باپ اور بھائیوں نے عورت کے ساتھ کیا ہے اس کا بدلہ تیری سے پشتوں ست انتقام لینے کے بعد بھی پورا نہ ہو۔" نینا نے انتہائی غصے میں کہا تو موی سکون سے بولی

"میں جانتی ہوں کہ میرے بھائی اور میرا باپ کیا کرتے رہے ہیں، یہی میں چاہتی ہوں کہ میں بھی اپنی مرضی کروں۔مجھے بھی عیاشی کا اتنا ہی حق ہونا چاہئے۔جتنا میرے باپ اور بھائیوں کو ہے۔جو بھی لڑکا مجھے پسند آئے ،میں اسے حاصل کرلوں۔"

"تو یہ خواہش اپنے باپ اور بھائی سے کہو، مجھے کیوں سنا رہی ہو، اپنی ماں سے کہو۔" نینا نے کہا

"اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ حالات ایسے ہیں، جن کا سہارا لے کر میں اس خواہش کا اظہار کر سکتی ہوں۔" موی نے سکون سے کہا تو نینا اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے بولی

"تم پہیلیاں نہ ڈالو اور نہ مجھے تمہاری باتوں میں اُلجھنے کی ضرورت ہے۔میں نے تمہارے عوض اپنے شعیب کی رہائی چاہی ہے۔وہ رہا ہو گیا ہے۔اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔"

"مگر مجھے تمہاری ضرورت ہے۔" وہ حتمی لہجے میں بولی

"میری ضرورت، وہ کیسے؟" نینا نے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا

"دیکھو،تم میری بات مانو یا نہ مانو لیکن میری بات سن لینا۔" اس نے کہا، جس پر نینا خاموش رہی تب وہ کہتی چلی گئی، "جس طرح تم اپنے شعیب کے لئے اتنا کچھ کر گذری ہو، میں بھی اپنے بہزاد کے لئے اب جاں سے گذر جانا چاہتی ہوں۔تم کہہ سکتی ہو کہ پہلے کیوں نہیں اب کیوں، تو یہ جان لو کہ یہ حوصلہ مجھے تم سے ملا ہے۔میں جس ماحول میں رہتی رہی ہوں ، وہاں عورت کو انسان سمجھا ہی نہیں جاتا۔یوں جیسے وہ جانور ہوں، ان کی کوئی خواہش ہی نہ ہو، کوئی جذبہ نہیں ہے ان کے اندر۔میں بہزاد سے محبت کرتی ہوں، لیکن محض اس لئے اپنی پسند کا اظہار نہیں کر پائی کہ میں عورت ہوں؟"

"یہ تمہارا مسئلہ ہے لڑکی، میں تمہیں آزاد کر رہی ہوں، تم جاؤ اپنی دنیا میں اور لڑو یا مرو جو مرضی کرو۔" نینا نے اکتاتے ہوئے کہا

"مگر میں نہیں جاؤں گی۔یہ پسٹل پکڑو اور مجھے مار دو۔" یہ کہتے ہوئے موی نے صوفے کے نیچے سے پسٹل نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا تو نینا ایک دم سے سٹپٹا گئی۔

اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ موی یوں پسٹل اس کی طرف بڑھا دے گی۔وہ یہی پسٹل اس پر تان سکتی تھی۔اسی پسٹل سے نینا کو یرغمال بنا سکتی تھی۔یہ بعد کی بات تھی کہ وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو سکتی تھی یا نہیں۔وہ موی کی ہتھیلی پر پڑے ہوئے اس پسٹل کو دیکھ رہی تھی جو اس نے خود ہی صوفے کے نیچے رکھا ہوا تھا۔یہ اعصاب کو شل کر دینے والے لمحات تھے۔موی کے اس طرز عمل سے کچھ دوسرا سمجھ میں آئے یا نہ آئے ، لیکن یہ ضرور پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنی بات میں مخلص ہے۔وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔وہ چاہتی بھی وہی ہے جو کہہ رہی ہے۔تبھی نینا نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا

"اس کی ضرورت نہیں ہے، وہیں رکھ دو، خالی ہے۔"

"تو گولیاں بھر لو اس میں۔" موی نے یوں کہا جیسے کوئی بچگانہ حرکت کرتا ہے۔

"اسے وہیں رکھو اور میری بات غور سے سنو۔" یہ کہہ کر وہ انتظار کرنے لگی کہ موی کیا کرتی ہے۔موی چند لمحے سوچتی رہی پھر اس نے پسٹل واپس وہیں رکھ دیا، جہاں سے لیا تھا۔تب نینا اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی

"بتاؤ، میں تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں۔"

"میں بہزاد کو ٹوٹ کر چاہتی ہوں، وہ کوئی امیر زادہ نہیں ہے، مڈل کلاس فیملی کا ایک عام سا لڑکا ہے دنیا کی نگاہ میں۔ اس کا باپ اسی شہر میں چھوٹا سا بزنس کرتا ہے۔ میں اور وہ یونیورسٹی میں پڑھتے رہے ہیں، حالانکہ میں بہت کم جاتی تھی، مگر اسی کے لئے جاتی تھی۔ وہ میرے قریب اس لئے نہیں ہوا کہ میرے بھائی اور میرا باپ اسے مار دیں گے۔"

"جب اس میں اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ تم سے اظہار محبت ہی کر سکے تو پھر تم اس کی طرف کیوں ......" نینا نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

"وہ بھی مجھے چاہتا ہے۔ ہماری بات ہوتی ہے۔ میں اس سے ملتی ہوں، وہ بھی مجھے ملتا ہے۔ ایسے ہی کسی تقریب میں، کل بھی اسے ملنا تھا۔ لیکن ......نہیں مل پائی۔" مومی نے افسردگی سے کہا۔

"او کے، کیا وہ تمہارے لئے اپنی جان دے دے گا۔" نینا نے لبوں میں ہنستے ہوئے پوچھا

"میں کیوں اس کی جان لوں گی۔ میں تو اس کے ساتھ بسنا چاہتی ہوں۔" مومی نے کہا

"بے وقوف، جب تم اس کے ساتھ رہو گی تو کیا تمہارا باپ اسے معاف کر دے گا۔ نہیں وہ تو اسے کبھی بھی زندہ نہیں چھوڑے گا، ویسے بھی جب اسے پتہ چل گیا کہ تمہارا اور اس کا کوئی تعلق ہے، وہ تو گیا اس دنیا سے۔" نینا نے سمجھاتے ہوئے کہا

"کچھ بھی کرو، لیکن مجھے اس سے ملا دو، اتنا وقت دے دو کہ ہم یہاں سے نکل کر کہیں دور چلے جائیں، پھر ہم سامنے ہی نہیں آئیں گے، مجھے میرے باپ کی دنیا سے کچھ نہیں لینا دینا، مجھے بہزاد چاہئے۔" مومی ضدی بھرے لہجے میں کہا

"او کے اس کا سیل نمبر ہے تمہارے پاس تو مجھے دو۔ میں دیکھتی ہوں، کیا کرنا ہے۔" نینا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو مومی ایک دم سے خوش ہو گئی۔ اس نے جلدی سے سیل نمبر بتا دیا۔ نینا نے اسے آرام کرنے کا کہا اور وہاں سے ہٹ گئی۔

اس کے سامنے ایک ایسی صورت حال آ چکی تھی، جس سے وہ بہت حد تک فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ لیکن یہ وقت ایسا تھا، جب اسے سوائے شعیب کے کچھ دوسرا نہیں سوجھ رہا تھا۔ اسے نجانے کیا ہوا تھا، وہ ہوش میں نہیں آ رہا تھا۔ جب تک شعیب کے بارے میں اسے کوئی اچھی خبر نہیں مل جاتی تھی اس وقت تک اسے یونہی لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے ہوش و حواس کھو چکی ہے۔ اس نے یہی سوچا تھا کہ شعیب کی رہائی کے بعد مومی کو واپس کر دے گی۔ ایسا وہ صرف اسی لئے چاہ رہی تھی کہ مومی ایک عورت ہے۔ اگر وہی عورت کی تذلیل کرے گی تو اپنے ضمیر کے سامنے کیا جواب دے گی۔ یہاں وہی اس کے گلے کا ہار بن گئی تھی۔ کیا وہ اس صورت حال سے فائدہ اٹھائے یا پھر مومی کو واپس بھیج دے، جیسا اس نے سوچا تھا، یا پھر مٹھن خان کی بیٹی کو ذلیل کر کے رکھ دے؟ وہ سوچنا چاہ رہی تھی لیکن کوئی جواب بھی اس کے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ اس وقت شعیب ہوتا تو کوئی مشورہ ہی دے دیتا۔ وہ سرد آہ بھر کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

شام ہو چکی تھی۔ نینا فارم ہاؤس کے کاریڈور میں کھڑی تھی۔ اس سے کافی فاصلے پر ایک سیاہ کار آ کر رک گئی تھی۔ اس میں سے پہلے دو افراد نکلے، پھر ایک لمبے سے نوجوان کو لئے ایک آدمی باہر نکلا۔ نوجوان کی آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ آنے والے لوگ نینا کو کاریڈور میں کھڑا دیکھ چکے تھے۔ وہ اس کی طرف آنے لگے۔ تبھی نینا نے نے انہیں وہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ رک گئے۔ اس نے ایک آدمی کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اس کی طرف آنے لگا۔

اس دوران نینا نے اس نوجوان کو دیکھا، مومی کی پسند واقعی ہی بہت اچھی تھی۔ بہزاد گورا چٹا، ہینڈسم لڑکا تھا۔ اچھا قد کاٹھ مضبوط بدن کا مالک تھا۔ کوئی بھی لڑکی اس پر فریفتہ ہو سکتی تھی۔ وہ آدمی اس کے قریب آ گیا تو وہ بولی۔

"اسے اوپر کمرے میں لے جاؤ۔ تم سب وہیں رہو گے، میرے ساتھ رابطے میں رہنا، جیسے ہی کہوں اسے وہاں سے نکال لانا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس بندے نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور واپس مڑ گیا۔ نینا بھی مڑی اور اس خاص کمرے کی سمت بڑھ گئی، جہاں سے سبھی کمروں میں دیکھا جا سکتا تھا۔ ہر کمرے میں کیمرہ لگا ہوا تھا۔ کمپیوٹر اسکرین پر وہ کمرہ

دکھائی دے رہا تھا۔ نینا اس منظر کو دیکھتے ہوئے ایک کرسی پر جا بیٹھی۔ سامنے اسکرین پر موی بیڈ پر بیٹھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور بہزاد اندر داخل ہوا۔ موی کی نگاہ جیسے ہی بہزاد پر پڑی تو وہ والہانہ اس کی جانب بڑھی۔ وہ دونوں یوں ملے جیسے صدیوں سے بچھڑے ہوئے ہوں۔ چند لمحے الگ ہونے کے بعد وہ بیڈ پر ہی بیٹھ گئے۔ ان کی باتیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ دس منٹ سے زیادہ نہیں گزرے ہوں گے۔ وہ دونوں ایک دم سے اٹھے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ اسی وقت وہاں باہر موجود بندے کا فون آ گیا۔ نینا نے فون کال رسیو کی تو اس نے بتایا۔

"وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، انہیں کمرے ہی میں بٹھاؤ، میں آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ دونوں واپس کمرے میں آ گئے تھے۔ چند منٹ بعد وہ ان کے پاس ایک کرسی پر جا بیٹھی۔

"بولو، کیا بات ہے؟" نینا نے پوچھا تو بہزاد بولا

"مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی، آپ مٹھن خان کی دشمن ہو اور ہمیں یہاں سے بھاگ جانے کا موقعہ دے رہی ہو۔ ہم ساری زندگی تو نہیں بھاگ سکتے؟"

"میں تم لوگوں کو نہیں بھگا رہی، یہ موی کی خواہش ہے۔ میری طرف سے تم لوگ جہاں جانا چاہو جاؤ، اسے اس کے گھر چھوڑ دو یا کہیں لے جاؤ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ باقی رہی میری اور مٹھن خان کی دشمنی، دل تو کرتا ہے کہ اس کی نسل سے بچی اس لڑکی کو بھی مار دوں، مگر میں یہ پیغام دینا چاہتی ہوں کہ میں عورت کا احترام کرتی ہوں۔" نینا نے اسے تفصیل سے بتا دیا تو وہ چند لمحے سوچ کر جھجکتے ہوئے بولا

"اس میں سارا نقصان تو میرا ہے نا، اب تک مٹھن خان کو ہمارے بارے میں نہیں معلوم، اسے پتہ چل جائے گا، وہ تو مجھے نہیں چھوڑے گا۔ میرا خاندان تباہ کر دے گا۔"

"یہ تم جانو اور موی جانے، اب نکلو یہاں سے، مجھے اور بہت سارے کام کرنے ہیں۔" نینا نے حتمی لہجے میں کہا تو بہزاد گھبرا گیا۔

"میں لے جاتی ہوں تمہیں، ہم ایک ....." موی نے کہنا چاہا تو بہزاد نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا

"تم نہیں جانتی ہو، کیا ہو سکتا ہے۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں لیکن میری وجہ سے میرے والدین ذلیل و خوار ہوں، یہ میں نہیں چاہتا۔ تمہیں واپس جانا ہوگا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" موی حیرت سے بولی تو بہزاد انتہائی جذباتی انداز میں گویا ہوا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یہاں سے نکلنے کے بعد تمہارا باپ تمہیں تو اپنے ساتھ لے جائے گا اور میرے ساتھ کچھ بھی کرنے کے لئے اس کے پاس یہی جواز کافی ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میرا خاندان مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میرے باپ کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ میرے بارے میں ایسا پتہ چلے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے؟" موی پریشان ہوتے ہوئے بولی

"اس میں نہ سمجھ آنے والی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے سکون سے جواب دیا

"ہم جب واپس جائیں گے ہی نہیں، انہیں پتہ ہی نہیں چلے گا کہ ہم کہاں پر ہیں تو پکڑے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" موی نے دلیل دی

"کہاں جائیں گے ہم، کہاں بھاگتے پھریں گے۔ ایک دن وہ ہمیں تلاش کر لیں گے۔" بہزاد نے سمجھاتے ہوئے کہا

"یہی تو تم غلط سوچ رہے ہو، وہ ہمیں تلاش ہی نہیں کریں گے۔ نینا انہیں بتا دے گی کہ اس نے موی کو قتل کر دیا ہے۔" اس نے بڑی سادگی سے کہہ دیا تو وہ سر مارتے ہوئے بولا

"یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہی ہو۔" یہ کہہ کر اس نے نینا کی طرف دیکھ کر کہا، "آپ سمجھائیں اسے۔"

"مجھے صرف اتنا بتا دو کہ کرنا کیا ہے۔ تم لوگوں کے پاس اتنا ہی وقت ہے جب تک تم لوگ کچھ طے نہیں کر لیتے ہو۔" نینا نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے دلچسپی سے کہا کیونکہ وہ ان دونوں کے چہرے کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ ان کے چہرے بہت کچھ بتا رہے تھے۔

"آپ میری پوزیشن سمجھ سکتی ہیں۔" بہزاد نے دھیمے سے لہجے میں کہا اور سر جھکا لیا۔ ان کے درمیان خاموشی چھا گئی، تب نینا نے کہا۔

"دیکھو، میں مٹھن خان سے بات کرتی ہوں۔ اس کا رد عمل کیا ہے، یہ تم دونوں سن لینا، اس کے بعد کوئی بھی فیصلہ کر لینا۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" دونوں نے یک زبان ہو کر کہا تو اس نے اپنا سیل فون نکال کر کال ملائی، چند لمحوں ہی میں اس نے کال پک کر لی۔ اس نے اسپیکر آن کرتے ہوئے غصے میں دانت پیستے ہوئے کہا۔

"تم نے میری بات نہیں مانی نا، وہ بندے اسپتال نہیں بھیجے جنہوں نے شعیب پر تشدد کیا تھا۔"

"دیکھو، میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ ہم سمجھوتہ کر لیتے ہیں، بندے میرے پاس ہیں، تم انہیں جو چاہو سزا دے لو، مگر میری بیٹی کو چھوڑ دو۔ تم جو کہو میں کرنے کے لئے تیار ہوں۔" اس نے مفاہمانہ لہجے میں کہا

"اپنا آپ مجھے دے سکتے ہو تاکہ میں تمہیں تڑپا تڑپا کر مار سکوں۔" نینا نے غراتے ہوئے کہا

"دیکھو، میں سب کچھ چھوڑ کر اس ملک ہی سے باہر چلا جاؤں گا۔ یہاں رہوں گا ہی نہیں۔ پورا خاندان لے جاؤں گا۔ اس کے بعد تو......" اس نے کہنا چاہا لیکن نینا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے انتہائی نفرت سے کہا۔

"مگر میری بات تو پوری نہیں ہوگی، میں نے تمہیں مارنا ہے، ہر حال میں مارنا ہے۔"

اس دوران نینا اس انداز سے مومی کے چہرے کا جائزہ لیتی رہی کہ اسے پتہ نہ چلے۔ مومی کا چہرہ سپاٹ تھا، جہاں کسی قسم کا بھی کوئی جذبہ نہیں تھا۔ اسی انداز پر نینا کے دماغ میں شک کی ایک لہر دوڑ گئی۔ تبھی مٹھن خان کی آواز ابھری۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے مجھے قابو کر لیا ہے، جو چاہو منوا سکتی ہو لیکن اپنا فائدہ سوچو اور سب ختم کر دو۔ تمہیں جس نے بھی ......" اس نے کہنا چاہا لیکن نینا نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"تو بس ٹھیک ہے، میں نے جو کہا تھا، وہ بات تم نے نہیں مانی۔ میں اب وہ پورا کرتی ہوں، میں نے کہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا۔ جیسے ہی اس نے فون بند کیا، مومی تیزی سے پوچھا

"تم نے میری اور اس کی بات ہی نہیں کی؟"

"میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ لیکن مجھے پہلے بہزاد کے باپ سے بات کرنا ہوگی۔" نینا نے کہا

"ان سے کیوں، وہ تو ناں ہی کہیں گے نا۔" مومی نے جواب دیا تو نینا نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بہزاد کو مخاطب کر کے کہا

"تم آؤ میرے ساتھ۔"

"اسے کہاں لے جا رہی ہیں۔" مومی نے پوچھا

"بتاتی ہوں، تم تیاری کرو، آج رات ہونے سے پہلے میں تم دونوں کو یہاں سے نکال دوں گی۔" نینا نے کہا اور بہزاد کی طرف دیکھا، وہ اٹھ گیا۔ نینا باہر چلی گئی۔

کمرے سے باہر اس کے آدمی کھڑے تھے۔ بہزاد باہر نکل گیا تو نینا نے اپنے خاص آدمی سے دھیمے لہجے میں کہا

"اس لڑکی پر پوری نگاہ رکھنا، مشکوک ہے۔"

اس کی بات سن کر خاص آدمی نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے سر ہلا دیا۔ تب نینا نے آگے بڑھتے ہوئے دو بندوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ گئی۔

بہزاد چند قدم آگے تھا۔ نینا نے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور چلتی چلی گئی۔ نچلی منزل کے ایک کمرے میں آ کر دو بندوں کو باہر ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور بہزاد کو ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے باہر چلی گئی۔

"تم دونوں خیال رکھنا، جیسے ہی بلاؤں اندر آ جانا۔"

"ٹھیک ہے۔" ایک نے کہا تو وہ واپس اندر چلی گئی۔ بہزاد صوفے پر بیٹھا ہوا تھا وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی

"جو پوچھو، سچ سچ بتا دینا، مجھے کسی مشکل میں مت ڈالنا اور نہ خود کسی مشکل میں پڑنا۔"

"پوچھیں۔" وہ اختصار سے بولا

"کیا پلان لے کر آئے ہو؟" اس نے بہزاد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا کوئی پلان نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے میں مومی سے محبت کرتا ہوں لیکن جب مجھے پتہ چلا کہ وہ مٹھن خان کی بیٹی ہے تو میں پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے اس سے شادی کر کے اپنے خاندان کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا۔" اس نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تو نینا نے کہا۔

"جو درست بات ہے وہ کہو، جھوٹ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"میں سمجھا نہیں؟" اس نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جو کہہ رہی ہوں تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔" نینا نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تو وہ سنبھل کر بولا۔

"میں بھی نہیں سمجھا۔"

"میں سمجھاتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے باہر کھڑے بندوں کو آواز دی۔ وہ آواز کی بازگشت میں اندر آگئے۔ تبھی نینا نے بہزاد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، "اس کے سارے کپڑے اُتار دو۔"

یہ سننا تھا کہ وہ دونوں آدمی اس کی طرف بڑھے۔ اس سے پہلے کہ وہ بہزاد کو پکڑتے، وہ صوفے پر سے اسپرنگ کی مانند اچھلا اوران دونوں کو لیتا ہوا قالین پر آگرا۔ پھر بجلی کی سی سرعت سے اس نے ایک بندے کے پسٹل پر ہاتھ ڈالا اوراس سے پسٹل چھین کر اچھلا اور چند دم کے فاصلے پر پسٹل تان کر انہیں کور کرتے ہوئے بولا

"بس گولی، اب تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔ تم ابھی اور اسی وقت مجھے گولی مار بھی دو گی تو پھر بھی تمہارا کھیل ختم، اب تک تیری یہ محفوظ پناہ گاہ، تیرے لئے چوہے دان ثابت ہونے والی ہے۔"

"اچھا، مجھے نہیں پتہ تھا۔ ویسے موی تو بہت چالاک نکلی اور تم اسے بھی زیادہ نڈر اور بہادر، اچھا لگا مجھے۔" نینا نے کہا تو بہزاد ہنستے ہوئے بولا

"کیا تم ہی اس دنیا میں عقل کل ہو۔ تھوڑی دیر بعد دنیا دیکھے گی کہ گولی کون تھی، جو ایک چوہیا کی طرح مر گئی۔ چلو نکلو باہر۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پسٹل کی نال سے اسے باہر کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔

وہ دونوں بندے زمین پر پڑے تھے۔ ایک کے پاس پسٹل ہونا چاہئے تھا۔ مگر وہ اس سے تھوڑے فاصلے پر پڑا تھا۔ دوسرے بندے کا پسٹل بہزاد کے ہاتھ میں تھا۔ نینا اپنا پسٹل نکال نہیں سکتی تھی۔ نینا کی ساری توجہ اس پر تھی۔ تبھی وہ سکون سے مڑ گئی۔ اس نے باہر جانے کے لئے جیسے ہی قدم بڑھایا، بہزاد نے قالین پر پڑے بندے پر فائر کرنا چاہا، اس نے پسٹل کی نال موڑی ہی تھی کہ نینا اسی لمحے کے انتظار میں تھی۔ وہ اڑتی ہوئی بہزاد پر جا پڑی۔ فائر نجانے کہاں لگا تھا، لیکن فائر کی گونج میں بہزاد قالین پر تھا اور نینا اس کے اوپر تھی۔ پسٹل والا ہاتھ نینا نے پکڑا ہوا تھا اور اسے وہ بزور زور سے جھٹک رہی تھی۔ قالین پر پڑے دونوں بندوں کو جیسے ہوش آگیا تھا۔ وہ سرعت سے اٹھے اور اس پر پل پڑے۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں دونوں نے اس سے پسٹل چھین لیا اور اسے رگیدنے لگے۔ لیکن نینا نے اس پر زیادہ وقت ضائع نہیں کرنے دیا۔

"اسے چھوڑ دو اور اس لڑکی کو لے کر فوراً نکلو۔ یہاں کوئی بھی نہ رہے، فوراً نکلو۔" اس نے تیزی سے حکم دیا۔ ان بندوں نے بہزاد کو وہیں چھوڑا اور باہر کی جانب چلے گئے۔ تبھی نینا آگے بڑھی اور اسے اٹھاتے ہوئے بولی

"اب میں اکیلی ہوں، اگر ہمت ہے تو مجھے زیر کر لو۔ تا کہ تمہارے دل میں کوئی حسرت نہ رہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جھٹکا دیا اور ساتھ ہی ایک ٹھوکر اس کے پہلو میں ماری۔ وہ برداشت کر گیا۔ وہ ذرا سا دہرا ہوا اور اس نے اپنا بازو گھما کر نینا کی گردن پر مارا۔ وہ لڑکھڑا گئی۔ تبھی وہ اس پر حاوی ہو گیا۔ اس نے نینا کی گردن کو اپنی بغل میں دبایا اور پوری قوت سے پنچ اس کے سر پر مارا، نینا بے بس سی ہو گئی۔ اس نے دوسرا پنچ اس کی پشت پر مارا۔ تبھی نینا نے اسے کمر سے پکڑ کر اٹھا لیا اور پھر پوری قوت سے قالین پر دے مارا۔ پھر پوری قوت سے ٹھوکر اس کے سر پر ماری۔ دوسری اس نے سینے پر ماری۔ وہ اُوخ کی آواز کے ساتھ سینہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ نینا نے اس بار اسے موقعہ نہیں دیا تھا۔ اسے سر کے بالوں سے پکڑا اور اپنا گھٹنا اس کے سینے پر مارا، بہزاد کا سانس بند ہونے لگا۔ مگر نینا نے بس نہیں کی۔ اس کی جب آنکھیں باہر آنے لگیں تو نینا نے چڑھی سانسوں میں کہا۔

"مٹھن خان نے تجھے مرنے کو یہاں بھیج دیا۔ کوئی کمانڈو بھیجنا ہی تھا تو اتنا بے وقوف بھیجا۔"

"مم...... مگر...... تم اب...... بچو گی نہیں۔" اس نے کہا

"دیکھتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے پھر سے اس کے سینے پر گھٹنا مارا تو وہ دہرا ہوتا چلا گیا۔ پھر اس کے بالوں کو جھٹکتے ہوئے بولی۔

"اب بتا پلان کیا ہے؟ کہاں چھپائی ہوئی ہے تم نے

ڈیوائس، صرف دس سیکنڈ ہیں تیرے پاس۔" نینا نے یہ کہتے ہوئے اس کا سر قالین سے لگا دیا۔ لفظ ابھی نینا کے منہ ہی میں تھے کہ بہزاد نے اس کے پاؤں پکڑ کر اپنی طرف زور سے کھینچ لیے۔ جھٹکا لگنے سے نینا اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائی وہ لڑکھڑائی تو بہزاد نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے سارا وزن اسی پر ڈال دیا۔ نینا بھی قالین پر گر گئی۔ تبھی بہزاد اس پر چھا گیا۔ وہ اس کے سینے پر سوار ہو گیا اور اس نے پوری قوت سے ایک گھونسہ اس کی گردن پر دے مارا تھا۔ اس نے پے در پے گھونسے مارنے شروع کر دیئے۔ نینا بے حواس سی ہو گئی تو وہ ہذیانی لہجے میں کہتا چلا گیا۔

"بتاؤں تجھے کہاں ہے ڈیوائس، سالی گولی بنی پھرتی ہے۔ شاید کسی مرد کا ہاتھ نہیں لگا اسے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں سے نینا کا گلا دبانا شروع کر دیا۔ انہی لمحات میں اس نے پوری قوت سے ٹھوکر اس کی ٹانگوں کے درمیان ماری۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ذرا سی کمزور ہوئی تو وہ تڑپ کر ایک طرف ہو گئی۔ بہزاد اپنی ہی جھونک میں آگے گرا تو نینا اس پر سوار ہو گئی، اس نے پوری قوت سے اس کی گدی میں گھونسہ مارا تو وہ زمین بوس ہو گیا۔ تبھی نینا نے اس کی کنپٹی پر پنچ مارا تو وہ تکلیف کی شدت سے تڑپنے لگا۔ وہ اٹھ گئی۔ اس قریب ہی میز پر پتھر کا گلدان دکھائی دیا۔ اس نے وہ اٹھایا اور اس کی پسلیوں میں مارا، بہزاد کی چیخ نکل گئی۔

"تجھے اب تک کسی وحشی عورت سے پالا نہیں پڑا، تیرا جیسا بے غیرت مرد جس کے ہاتھ لگ جائے، اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ بھاگ سکتا ہے تو بھاگ......" آخری لفظ کہتے ہوئے اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ بہزاد نے اٹھنے کی کوشش کی، ذرا سا اٹھا پھر گر گیا، نینا نے اس کے ٹھوکر ماری۔ وہ بلبلاتا ہوا اٹھ گیا۔ وہ دروازے کی جانب بڑھا، کاریڈور میں آیا تو کافی سارے لوگ وہاں جمع تھے، ان کے ساتھ مومی بھی کھڑی تھی۔ جیسے ہی اس کی نگاہ بہزاد پر پڑی اس کا رنگ پیلا ہونا شروع ہو گیا۔ نینا نے اس کی طرف نہیں بلکہ اپنے ایک آدمی کی طرف دیکھا تو وہ تیزی سے بولا

"سب آ گئے ہیں کوئی نہیں بچا تو نہیں یہاں اس فارم ہاؤس میں؟" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی اس کا فون بج اٹھا اس نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف اس کا ایک افسر تھا

"میڈم۔! جتنی جلدی ہو سکے نکل جائیں، پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ بہت سارے لوگ فارم ہاؤس کے قریب پہنچ رہے ہیں، چند منٹ ہیں آپ کے پاس۔"

یہ سنتے ہی اس نے پسٹل نکالا اور بہزاد کے ماتھے پر رکھ دیا۔ تبھی مومی نے ہذیانی انداز میں کہا،

"نہیں، نہیں خدا کے لیے اسے مت مارو۔ اسے میں نے بلایا تھا، یہ مجھے بچانے آیا تھا۔"

"بچانے کے لیے بلایا تھا، یا مجھے پکڑانے کا ناٹک کر رہی تھی۔ سانپ کا بچہ سنپولیا ہی ہوتا ہے ابھی دیکھتی ہوں تجھے۔" نینا نے کہا اور فائر کر دیا۔ ایک لمحے کے لیے سناٹا چھا گیا۔ بہزاد زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ مومی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ تبھی نینا نے اپنے خاص آدمی سے کہا۔

"پولیس چند منٹ میں پہنچنے والی ہے۔ اسے کسی کار میں لے جا کر دور کہیں پھینک دینا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھی، اس نے مومی کا ہاتھ پکڑا تو وہ مزاحمت کرنے لگی۔ نینا نے اسے گردن سے پکڑ کر دھکا دیا، وہ لڑکھڑاتی ہوئی آگے کی طرف چل پڑی۔ نینا نے اسے فور وہیل میں جا بٹھایا۔ وہاں گاڑیاں زیادہ نہیں تھیں۔ باقی لوگ بھی بیٹھے تو اس نے ڈرائیور کو کھیتوں کی طرف سے چلنے کا کہا۔ کیونکہ عام راستے سے کہیں بھی پولیس سے سامنا ہو سکتا تھا۔ وہ ٹکراؤ سے بچنا چاہتی تھی۔

وہ کھیتوں کے درمیان سے بنی کچی سڑک پر سے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ نینا تیزی سے سوچ رہی تھی۔ یہاں سے نکلنا اور وہ بھی مومی کے ساتھ بہت مشکل تھا۔ اگر اس علاقے کا گھیراؤ ہو گیا تو اتنے سارے لوگوں کے ساتھ نکلنا ناممکن ہو جائے گا۔ اگر وہ دونوں ساتھ نہیں ہوں گی تو یہ سب لوگ آسانی سے نکل سکتے ہیں۔ تبھی اچانک اس کی نگاہ گنے کے ایک بڑے سارے کھیت پر پڑی۔ اس کے دماغ میں آ گیا کہ کیا کرنا ہے۔ اس نے اسی لمحے ڈرائیور کو رکنے کا کہا۔ اس نے فور وہیل روک دی۔

"تم لوگ نکل جاؤ، کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچتے ہی اطلاع کرنا، پھر آگے جو کرنا ہے۔ وہ بتاتی ہوں۔"

"میڈم ہم اگلے موڑ سے الگ الگ ہو جائیں گے۔"
ایک آدمی نے کہا
"نہیں، پولیس جانتی ہے کہ ہم کہاں ہیں، انہوں نے اس علاقے کو گھیر لیا ہوگا۔ موی سب سے بڑی نشانی ہے، تم لوگ میری بات کو سمجھو۔" اس نے تیزی سے کہا اور موی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے نیچے اُترنے لگی۔
"نہیں مجھے تمہارے ساتھ کہیں نہیں جانا۔" موی نے خوف زدہ سے لہجے میں کہا۔ وہ نجانے کیا سمجھ رہی تھی، اس لئے اُترنا نہیں چاہ رہی تھی۔
"او نیچے اُتر، سانپ کے بچے کو دودھ نہیں پلاتے۔" نینا نے کہا اور اس کی گردن سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔ وہ گھسٹتی ہوئی نیچے آ گئی۔ جیسے ہی وہ نیچے آئی ڈرائیور نے فوراً جیپ بڑھا دی۔
"چلو آگے بڑھو۔" نینا نے اسے آگے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا
"تم میرے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہو؟" موی نے لرزتے ہوئے لہجے کے ساتھ پوچھا
"وہی جو تم میرے ساتھ کرنا چاہ رہی تھی۔" نینا نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ لرزتے ہوئے بولی
"مجھے معاف کر دو۔" اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو نینا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور چل دی۔ وہ تقریباً گھسٹتی ہوئی اس کے ساتھ چل دی۔
گنے کے کھیت تک ان میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ دونوں اس میں جا پہنچیں، قدرے صاف جگہ پر بیٹھتے ہوئے اس نے موی کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا تو موی نے پھر سے لرزتے ہوئے لہجے کے ساتھ التجائیہ لہجے میں کہا۔
"مجھے چھوڑ دو، معاف کر دو مجھے، میں تمہارے راستے میں نہیں آؤں گی۔"
"اب تو تم آ چکی ہو میرے راستے میں۔ اب تمہیں معاف صرف ایک صورت میں کیا جا سکتا ہے۔" نینا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
"بولو، میں تمہاری ہر بات مانوں گی۔" وہ تیزی سے بولی تو نینا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔
"آرام اور سکون کے ساتھ یہاں بیٹھ جاؤ۔ جیسے ہی یہ پولیس والوں کا سکون ہوتا ہے، میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔"

ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ انہیں گنے کے کھیت میں چھپے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ ایسے میں انہیں محسوس ہوا کہ ان سے کچھ دور کچی سڑک پر کافی ساری گاڑیاں آن ٹھہری ہیں۔ ایک شور سا اٹھا تھا۔ ایسے میں نینا نے کھیت کے کنارے جا کر دیکھنے کی کوشش کی، اندھیرے میں سامنے کئی گاڑیاں کھڑی دکھائی دی تھیں۔ اس کے دماغ میں خطرے کا الارم بج اٹھا۔ کیا اُس کی مخبری ہو گئی ہے یا وہ لوگ اُسے تلاش کرتے ہوئے یہاں آن پہنچے ہیں؟ کہیں موی کے پاس تو کوئی ایسی شے نہیں جس سے وہ ٹریک ہو جائے؟
اس سے پہلے کہ اس بارے میں وہ مزید سوچتی، اسے موی کا خیال آیا اس نے مڑ کر دیکھا، وہ وہاں پر نہیں تھی۔ اسے اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ وہ ایک دم سے ساکت ہو گئی۔ اگر وہ گنے کے کھیت سے نکل کر گاڑیوں کی جانب بھاگ گئی تو موی تو ہاتھوں سے جائے گی ہی، وہ یہیں پر گھیری جائے گی۔ اب اس کے لئے دو ہی آپشن تھے خود کشی کر لیتی یا پکڑ کر گرفتار ہو جاتی۔ کتنی دیر تک مقابلہ کر سکتی ہے۔ اس دوران اس نے کان لگا کر سنا۔ ایک جانب سے سرسراہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ نینا انتہائی سرعت کے ساتھ تیر کی سی تیزی سے اس جانب بڑھی۔ اگرچہ اس سے تیز سرسراہٹ ابھری تھی لیکن اگلے چند لمحوں میں وہ موی تک جا پہنچی، جو سرکتے ہوئے کھیت سے باہر جا رہی تھی اور بالکل کنارے پر پہنچ چکی تھی۔ موی نے خود کو چھڑاتے ہوئے چیخ مارنا چاہی لیکن نینا نے اس کا منہ دباتے ہوئے ایک گھونسہ اس کی گردن پر دے مارا پھر منہ کو مزید دباتے ہوئے سرد لہجے میں بولی
"خاموش...... ورنہ گلا دبا کر یہیں مار دوں گی۔"
موی ایک دم سے سہم گئی۔ اسے یوں لگا موت نے اسے گھیر لیا ہے اب وہ زندہ نہیں بچے گی۔ نینا نے اس کی گردن بغل میں دبائی، منہ سے ہاتھ ہٹائے بنا اسے کھیت کے اندر تک لے آئی۔ باہر شور کی ہلکی ہلکی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ خاموشی سے آوازوں پر کان دھرے بیٹھی رہی۔
کچھ وقت گذرا، چند لوگ کھیت کے پاس آ گئے۔ ان کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نینا نے موی کا منہ ایک

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

بار پھر دبا لیا۔ نینا اس بات کو سمجھ رہی تھی کہ باہر والے انہیں تلاش کرنے کے "موڈ" میں نہیں بلکہ صرف فارمیلٹی پوری کر رہے ہیں۔ ورنہ وہ خاموشی سے کھیت میں گھستے۔ باتیں کر کے تو وہ خبردار کر رہے تھے۔

آدھے گھنٹے سے زیادہ کا وقت ہو گیا تھا۔ دھیرے دھیرے شور کم ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ بالکل خاموشی ہو گئی۔ ایسے میں نینا کا فون بج اٹھا۔ اسکرین پر اُس کے خاص آدمی کا نمبر تھا۔ اس نے کال رسیو کرتے ہوئے ہولے سے کہا

"ہاں بولو۔"

"سب ٹھکانے پر پہنچ چکے ہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ آپ کدھر ہیں؟" اس نے کہا

"وہیں جہاں چھوڑا تھا۔" اس نے گول مول سا جواب دیا

"میں نزدیک ہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے، قریب آ کر بتانا۔" اس نے جواب دے کر فون بند کر دیا۔

اس کے اندر نجانے کیوں شک اتر گیا تھا۔ اس کے دماغ میں یہی آیا کہ اس کے بندے پکڑے گئے ہیں اور انہوں نے فون کے ذریعے اسے تلاش کرنے کو فون کروایا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے موی کو لیا اور گنے کے کھیت سے نکلتی چلی گئی۔ سامنے کپاس کا کھیت تھا، وہ اس میں سے ہوتی ہوئی آگے نکل گئی۔

کچی سڑک کے پاس سرسوں کا کھیت تھا، وہ اتنا اونچا نہیں تھا کہ کھڑا ہونے سے بندہ چھپ جائے۔ وہ اس میں جا بیٹھی۔ تھوڑی دیر میں ایک کار آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ ان سے ذرا فاصلے پر رُک گئی۔ چند لمحوں بعد اس کا فون بج اٹھا۔ نینا دیکھ رہی تھی کہ وہ اکیلا ہے۔ پھر بھی اس نے تصدیق کی۔ آگے پیچھے دیکھا اور اگلے چند منٹ میں وہ موی کے ساتھ کار میں آ بیٹھی۔ وہ پوری طرح چوکنا تھی۔ وہاں سے نکل پڑی تھی۔ سڑک پر آتے ہی اس نے سوچا کہ کہاں جائے؟ اس کے ذہن میں تھا کہ عورت منزل سے زیادہ محفوظ جگہ کوئی نہیں ہے۔ وہ کم از کم ایک رات وہاں رہنا چاہتی تھی۔ اس ایک رات میں وہ بہت کچھ کر سکتی تھی۔ اس نے ڈرائیور کو اتر جانے کا کہا اور خود سوار ہو گئی لیکن اس سے پہلے موی کو پاند ھنا نہیں بھولی تھی۔ وہ اس کے لئے اب بہت بڑا خطرہ تھی۔

☆......☆......☆

آدھی رات سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ نینا فریش ہو کر کھانا کھا چکی تھی۔ اس نے موی کو بھی زبردستی کھلا دیا تھا۔ وہاں عورت منزل میں اس نے ابھی تک کسی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ یہ لڑکی کون ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ موی کو لے کر کراچی نکل جائے یا پھر نوریا کے کزن کے حوالے کر دے، وہ اسے اپنے پاس رکھے گا۔ وہ مٹھن خان کو اپنی بیٹی کے لئے تڑپانا چاہتی تھی۔ وہ تاجاں سے بھی رابطہ کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ تاجاں کو ایک محفوظ ٹھکانہ دے کر اسے موی کا نگران بنا دے۔ یہ سب کیسے ہوگا؟ یہ ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ فون سامنے رکھ کر یہی سوچ رہی تھی کہ بی بی صاحب کی کال آ گئی۔ وہ موی کے سامنے یہ کال نہیں سننا چاہتی تھی، اس لئے اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس نے بی بی صاحب کے ساتھ کچی باتیں کرنا تھیں اور یہ باتیں وہ موی کے سامنے نہیں کر سکتی تھی۔

"کہاں ہو تم؟" انہوں اسی نرم لہجے میں پوچھا۔

"یہیں اسی شہر میں۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"وہ مٹھن خان کی بیٹی ہے تمہارے پاس یا......؟" انہوں نے نرم سے لہجے میں پوچھتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ہاں، ہے میرے پاس۔" اس نے سچ بول دیا۔

"کیا کرو گی اس کا؟" انہوں نے پوچھا۔

"ابھی میں نے سوچا نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"کیوں، زندہ رکھنا چاہتی ہو اُسے؟" پھر سوال ہوا۔

"کچھ پتہ نہیں، کیونکہ کچھ دیر پہلے وہ میرے ہاتھوں مر جانے والی تھی۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں، یہ جب تک میرے پاس رہی، مٹھن خان اس کے لئے تڑپتا رہے گا۔" اس نے انتہائی نفرت سے کہا تو بی بی صاحب نے اسی نرم سے انداز میں کہا۔

"اگر میں یہ کہوں کہ یہ لڑکی تم مجھے دے دو؟"

"آپ......؟ آپ اس کا کیا کریں گی؟" نینا نے حیرت سے پوچھا تو وہ اسی نرم لہجے میں گویا ہوئیں۔

"میں اس کا کچھ بھی کروں، تم یہ سوال مت کرو۔"

''اوکے، کہاں پہنچاؤں۔'' نینا نے حتمی لہجے میں کہا
''میں ایک نمبر بھیج رہی ہوں۔ اسی کے ساتھ طے کر لینا، وہ اسے مجھ تک پہنچا دے گا۔'' بی بی صاحب نے سکون بھرے لہجے میں کہا
''اوکے۔'' اس نے کہا تو فون بند ہو گیا۔
اسی لمحے نجانے کیوں اس کے اندر متضاد قسم کے جذبات اندر تک سرائیت کر گئے۔ اسے لگا کہ مومی کو یوں دینا اچھا نہیں، مٹھن خان کی کمزوری اس کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ دوسرا جذبہ یہ تھا کہ چلو اس سے نجات ملی۔ ایک بوجھ تھا جو اُتر گیا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے من میں یہ بات آئی کہ بی بی صاحب نے اُسے کیوں لیا ہے؟ بہت سارے خیال اس کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں گھوم گئے۔ مگر اس نے سب خیالوں کو جھٹک دیا۔ کوئی ایک منٹ بعد بی بی صاحب نے وہ نمبر بھیج دیا، اس کے ساتھ ہی اس نمبر سے کال آ گئی۔ دونوں کے درمیان طے پا گیا کہ مومی کو کس طرح ان کے حوالے کرنا ہے۔
رات کا تیسرا پہر تھا، جب وہ مومی کو لے کر نکلی۔ مومی کی حالت بری ہو رہی تھی۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ اب اس کی موت آ گئی، یہ مجھے کہیں باہر لے کر قتل کر دے گی کیونکہ مومی کے لاکھ پوچھنے پر بھی اس نے نہیں بتایا تھا کہ وہ اسے کہاں لے کر جا رہی ہے۔ وہ وہاں سے نکلنا نہیں چاہتی تھی لیکن نینا اسے لے کر چل دی۔
''دیکھو نینا۔ ! تم ایک بار میرے بابا سے بات کر لو، جتنی رقم چاہو، میں تمہیں دلا دوں گی، میرے بابا کی زندگی کے علاوہ جو چاہو میں تمہیں لے کر دوں گی لیکن مجھے معاف کر دو۔'' وہ روہنسا ہوتے ہوئے بولی۔
''کیا میں نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا؟'' نینا نے اس سے سوال کیا۔
''میں مانتی ہوں، تم نے بہت اچھا کیا، میں ہی غلط تھی پلیز خدا کے لئے مجھے مت مارو۔'' وہ روتے ہوئے بولی
''اس کا فیصلہ کوئی اور ہی کرے گا۔'' نینا نے کہا اور پوری توجہ سڑک پر لگا دی۔
شہر کی ایک شاہراہ پر ان لوگوں نے ملنا تھا۔ وہ ایک سیاہ کار میں تھی۔ اس کا فون پر ان لوگوں سے رابطہ تھا۔ ایک خاص مقام پر وہ لوگ کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ان سے تھوڑے فاصلے پر رُک گئی۔
''مومی جاؤ، یہ لوگ تجھے تیرے باپ تک لے جائیں گے۔ اُترو نیچے۔'' نینا نے کہا تو اس نے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''مجھے میرے بابا تک، مطلب......؟''
''ہاں، تجھے تیرے گھر لے جائیں گے۔'' نینا نے کہا۔
''میں جاؤں۔'' اس نے پھر تسلی کرتے ہوئے پوچھا۔
''کہہ رہی ہوں نا جاؤ اور اپنے باپ کو بتا دینا، میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔ اب جاؤ۔'' اس نے کہا اور جانے کے لئے ہاتھ سے اشارہ کیا۔
مومی جلدی سے اتری اور ان کی طرف بڑھ گئی۔ کار میں سے دو عورتیں باہر نکلیں اور انہوں نے مومی کو پکڑ لیا۔ وہ اسے کار کی جانب لے جانے لگیں تو نینا نے کار موڑی اور واپس چل دی۔
اس وقت وہ واپسی کی راہ پر تھی۔ ابھی وہ عورت منزل نہیں پہنچی تھی۔ اس کے ذہن میں شعیب تھا۔ جسے چھڑانے کیلئے اس نے مومی کو اغوا کیا تھا۔ پتہ نہیں وہ اب کیسا ہو گا؟ اس کا جی چاہا کہ وہ شعیب کو دیکھنے اسپتال چلی جائے۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا؟ یہی نا کہ وہ اس سے مل نہیں پائے گی۔ دشمن اس کی راہ تک رہے ہوں۔ لیکن کیا وہ دشمنوں کی خاطر اپنے شعیب کو بھی نہ دیکھے؟ زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا، وہ اس کے قریب نہ جا پائے گی۔ وہ دور ہی سے دیکھ کر آ جائے گی۔ شعیب کا خیال آتے ہی اس سے رہا نہیں جا رہا تھا۔ ایک دم سے اس کا دل بے اختیار ہو گیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ دل اتنا بے اختیار کیوں ہو گیا ہے۔ وہ بے مقصد سڑکوں پر گھومتی رہی۔ پھر اس نے ایک چوراہے سے کار اسپتال کی جانب موڑ لی۔ وہ تیزی سے کار بھگائے جا رہی تھی۔
اس نے کار اسپتال کے پارکنگ ایریا میں کھڑی کی اور اس طرف بڑھ گئی جہاں انتہائی نگہداشت وارڈ میں شعیب کو رکھا گیا تھا۔ وہ بے حد محتاط تھی۔ اس نے آنچل سے اپنا چہرہ چھپا لیا ہوا تھا۔ اس کا پسٹل لوڈ تھا۔ جسے وہ لمحوں میں نکال سکتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے، انتہائی نگہداشت وارڈ میں پہنچ گئی۔ جہاں راہداری میں چند لوگ کھڑے رو رہے تھے۔ اس نے شیشے کے پار شعیب کو

دیکھنا چاہا لیکن وہ اسے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ وہاں کا منظر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ انتہائی سوگوار ماحول تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی رہی تھی، ایک موہوم سے خیال سے ڈرنے لگی تھی۔ وہ وہاں پر کھڑے کسی بندے سے شعیب کے بارے میں پوچھنا نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ خود رو رہے تھے۔ اسے کیا بتاتے۔ ایسے میں ایک ادھیڑ عمر ڈاکٹر انتہائی نگہداشت وارڈ سے باہر آیا، وہ فوراً اس کی جانب بڑھی، قریب جا کر آہستگی سے پوچھا۔

"ایکسکیوزمی ڈاکٹر۔"

وہ رُک گیا اور اس نے استفہامیہ نگاہوں سے کہا۔

"جی بولیں۔"

"یہاں ایک پیشنٹ ہیں، ان کا نام شعیب ہے۔ مجھے ان سے ملنا ہے، وہ یہاں سے دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔" اس نے شیشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"اوہ، کہیں آپ ان مسٹر شعیب کی بات تو نہیں کر رہے ہو جو صاحبزادہ عبدالکریم کے بیٹے ہیں نا؟"

"جی جی وہی۔" اس نے تیزی سے کہا تو ڈاکٹر نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"کیا آپ ان کے والد کو نہیں جانتیں؟"

"جی میں پہلے کبھی ان سے نہیں ملی ہوں۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"اوہ اچھا، وہ سامنے جو بزرگ کھڑے ہیں، وہی صاحبزادہ عبدالکریم ہیں۔" ڈاکٹر نے راہداری میں کھڑے ایک بزرگ سے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو نینا نے صاحبزادہ عبدالکریم کی طرف دیکھ کر کہا۔

"آپ پلیز مجھے شعیب کے بارے میں بتادیں، میں ان سے کیا پوچھوں، وہ ......" اس نے خوف زدہ ہوتے ہوئے پوچھا، اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس پر ڈاکٹر نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"سوری، آپ کچھ دیر لیٹ ہو گئیں۔ ابھی دو گھنٹے پہلے وہ فوت ہو گئے ہیں۔"

"کیا......؟" بے ساختہ اس کے منہ سے چیخ بلند ہو گئی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولی "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، وہ مجھے یوں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

وہ پاگلوں کی طرح بولنے لگی تھی۔ اسے بالکل بھی پتہ نہیں چلا کہ ڈاکٹر جا چکا ہے اور صاحبزادہ عبدالکریم اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہا ہے۔ وہ چند لمحے یونہی کھڑی رہی، پھر تیزی سے انتہائی نگہداشت وارڈ میں داخل ہو گئی۔ وہاں دائیں جانب ایک اسٹریچر پر شعیب آنکھیں بند کئے ہوئے پڑا تھا۔ اس کے اوپر سفید چادر تھی لیکن چہرہ ابھی تک نہیں ڈھکا تھا۔ شعیب اس دنیا کو چھوڑ چکا تھا۔

نینا کو لگا کہ جیسے اس کی اپنی جان بھی نکل گئی ہے۔ اس کے بدن میں کہیں زندگی کی رمق باقی نہیں رہی تھی۔ وہ بھی شعیب کی مانند بے جان ہو گئی ہے۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے شعیب کے چہرے کو دیکھ رہی تھی جہاں تشدد کے واضح نشان موجود تھے۔ وہ اندر سے کٹ کر رہ گئی تھی۔ یہ وہی تھا، جسے اس نے پوری دنیا میں سے چاہا تھا۔ اس کا ساتھی، دوست اور محبت، جسے موت نے اپنے لئے چن لیا۔ وہ رونا چاہتی تھی لیکن ایک بھی آنسو اس کی آنکھ سے نہیں ٹپک رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے شعیب کا چہرہ تکتی چلی جا رہی تھی۔ ایسے میں ایک ڈاکٹر قریب آیا تو اس نے پوچھا

"کیا ہوا تھا؟...... کیسے یہ سب؟"

"میں بتاتا ہوں۔"

اس کی پشت سے آواز آئی تو اس نے گھوم کر دیکھا، پیچھے شعیب کا والد صاحبزادہ عبدالکریم کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ نینا کچھ نہ بولی تو انہوں نے پوچھا۔

"لیکن تم کون ہو؟"

"میں نینا......" اس نے آہستگی سے کہا تو صاحبزادہ عبدالکریم نے یوں دیکھا جیسے اسے اپنے اندازے کی تصدیق ہو گئی ہو تب وہ سکون سے بولا۔

"میری اولاد میری دشمنی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ بہت تشدد کیا تھا انہوں نے اس پر، پتہ نہیں اتنا تشدد سہہ کیسے گیا۔ ڈاکٹر یہ کہتے ہیں کہ اس کے سر اور دل پر گہری چوٹ تھی، اسی باعث وہ زیادہ......" یہ کہتے ہوئے صاحبزادہ عبدالکریم سسک پڑا۔

"یہ سب مٹھن خان نے کیا۔" اس نے یوں کہا جیسے خود کلامی کر رہی ہو۔

"ہاں، اس کی دشمنی میرا سب کچھ لے ڈوبی۔" وہ

سکتے ہوئے بولا تو نینا نے ایک نگاہ شعیب کے چہرے پر ڈالی۔ وہاں موت کا سکوت تھا۔ نینا کے اندر دکھ کی لہر نے اُسے لہولہو کر دیا۔ وہ چند لمحے دیکھتی رہی، پھر پلٹی اور باہر کی جانب بڑھتی چلی گئی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ساری دنیا کی آوازیں ختم ہو گئی ہیں اور اگر کوئی شور ہے تو اس کے اندر ہے۔

اسپتال سے باہر آتے ہی اس نے بی بی صاحب کو فون کیا۔ تیسری بیل پر فون رسیو کر لیا گیا۔

''موی کہاں ہے؟'' اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا تو دوسری طرف سے اسی نرم لہجے میں سوال ہوا۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''مجھے وہ چاہیے، میں نے اس کے بارے فیصلہ کر لیا ہے۔'' نینا نے غراتے ہوئے کہا تو بی بی صاحب بولی۔

''اب دیر ہو چکی ہے۔ اب وہ میرے پاس نہیں ہے۔''

''کہاں گئی؟'' اس نے پوچھا۔

''اپنے باپ کے پاس۔'' نرم سے لہجے میں کہی گئی اس بات میں جو چنگاری تھی، اس نے نینا کے اندر سلگتی ہوئی آگ کو ہوا دے دی، جس نے اُسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس نے چیختے ہوئے کہا۔

''یہ کیا کیا آپ نے؟''

''اس کا واپس جانا میری مجبوری بن چکا تھا اور پھر تم نے خود اسے بھیجا ہے۔ اب کیوں اس کے بارے میں پوچھ رہی ہو؟'' بی بی صاحب نے کہنا چاہا تو نینا تیزی سے بولی۔

''میں نے اسے مٹھن خان کو دینے کے لئے نہیں بھیجا تھا بی بی صاحب، میں نے تو اسے تڑپانا تھا، میں نے اسے آپ کو دیا تھا۔''

''کہیں اسپتال تو نہیں جا پہنچی ہو اور......''

انہوں نے کہنا چاہا لیکن نینا نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''میں اپنی زندگی کھو چکی ہوں، شعیب اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ میرا سب کچھ ختم ہو گیا۔ وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔''

''مجھے پتہ تھا، اسی لئے میں نے موی کو مانگا۔'' بی بی صاحب نے کہا تو نینا حیرت اور دکھ سے بولی۔

''یہ ظلم کیا آپ نے۔ بہت برا کیا، یہ اچھا نہیں کیا۔''

''میں جانتی ہوں، میں نے کیا کیا۔'' بی بی صاحب نے اسی نرم اور پرسکون لہجے میں کہا تو نینا پھٹ پڑی۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ نے کیا کیا، آپ نے دھوکا کیا۔ آپ جانتی تھیں کہ شعیب نہیں رہا تو موی کو مجھ سے مانگنے کا کوئی جواز نہیں تھا، آپ نے دھوکا کیا ہے بی بی صاحب۔ دھوکا کیا۔''

''ایسا نہیں ہے نینا، تم غلط سمجھ رہی ہو...... جب تمہیں پتہ چلے گا کہ یہ فیصلہ کیوں کیا تو تم......'' بی بی صاحب کا لہجہ ذرا بھی نہیں بدلا، اسی نرم اور پرسکون انداز میں کہنے جا رہی تھی کہ نینا نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اب کوئی جواز نہیں رہا۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا۔

غصے میں اس کا سر پھٹ رہا تھا۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اپنی کار تک گئی۔ اس کی ڈرائیونگ پر بیٹھ کر خود پر قابو پایا اور کار سٹارٹ کر کے چل پڑی۔ اس کا دماغ اس کے قابو میں نہیں تھا۔ ایک ساتھ اتنے دُکھ اسے ملنا تھے یہ بھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ یہ گمان بھی نہیں کر سکتی تھی کہ بی بی صاحب اس سے دھوکا کر جائے گی۔ یہ بھی کہاں اسے گمان تھا کہ شعیب اس کا ساتھ چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی سے نکل جائے گا۔

یہ دنیا ہے۔ یہاں کسی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہر کوئی اپنے مفاد کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ یہ کھیل ہی فائدے کا ہے۔ بی بی صاحب کو اس سے کوئی مفاد تھا ہی تو اس نے نینا پر موی کو ترجیح دے دی۔ اس کی زندگی میں آنے والا ہر بندہ کوئی نہ کوئی مفاد ضرور رکھتا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ پوری دنیا کو آگ لگا دے۔ اس جہاں میں کوئی بھی اس کا اپنا نہیں رہا تھا؟

''اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں، میں بھی کسی کی نہیں۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے خود کلامی کی۔ یہ اس کا فیصلہ تھا یا محض جذباتی سوچ، اس بارے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

جس وقت وہ عورت منزل پہنچی، سورج نکلنے کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ وہ بیڈ پر آ کر لیٹی تو اس کا دماغ تپ رہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ ایسی حالت میں کیا جاتا ہے۔ ورنہ

اس کے اندر بگولے اٹھ رہے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہاں سے اٹھے، سیدھی مٹھن خان کے سامنے جا پہنچے اور اسے موت کے گھاٹ اُتار دے۔ پھر اس کے بعد وہ خود بھی مر جاتی ہے تو کوئی بات نہیں۔ مگر وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ ایسا ممکن نہیں ہوگا۔ مٹھن خان تک پہنچنے سے کہیں پہلے وہ خود ماری جائے گی۔ اسے اپنے مرنے کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ اس وقت تو اسے اپنی زندگی کچھ زیادہ ہی بے معنی لگ رہی تھی۔ جس وقت اسے یہ خیال آتا کہ اب وہ اس کی زندگی میں نہیں ہے تو اسے یوں لگتا جیسے آگ کی لہر اٹھتی ہے اور اس کا پورا وجود اس میں جھلسنے لگتا ہے۔ وہ بیڈ پر پڑی نجانے مزید کیا سوچتی کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کب خود سے غافل ہو گئی ہے۔

اس کی آنکھ کھٹکا ہونے سے کھل گئی۔ وہ تیزی سے اٹھی تو اس کے سامنے میڈم فاخرہ بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لئے تو اسے سمجھ میں نہیں آیا لیکن اگلے ہی لمحے سب کچھ اس کے ذہن میں تازہ ہو چکا تھا۔

''پتہ ہے کتنی دیر سوئی ہو؟'' میڈم فاخرہ نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

''پتہ نہیں؟'' وہ بیزاری سے بولی جیسے اسے خود کے سو جانے پر شرمندگی ہو رہی ہو۔

''آٹھ گھنٹے سے زیادہ ہو گئے ہیں سوئے ہوئے۔ میں تو گھبرا گئی کہ خدانخواستہ کہیں ......'' میڈم نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تو نینا نے غصے کی انتہا میں کہا۔

''میں جب تک مٹھن خان کو مار نہیں لیتی، اس وقت تک نہیں مرنے والی۔''

''دیکھو، بہت برا ہوا، مجھے شعیب کے بارے میں پتہ چلا، میں گئی تھی ان کے ہاں۔ ہر کسی کو اس کی جوان موت کا افسوس ہے۔'' میڈم نے افسوس بھرے لہجے میں کہا

''کاش میں اس کے پاس ہوتی، مٹھن خان کے غنڈوں کو اس تک پہنچنے ہی نہ دیتی۔'' اس نے یاسیت سے کہا

''جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ میرے خیال میں اب تمہیں جو قدم بھی اٹھانا ہے، بہت سوچ سمجھ کر۔ کیونکہ اب حالات بالکل مختلف ہو گئے ہیں۔'' میڈم نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا تو نینا نے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

''کیا ہو گیا ہے حالات کو، کیا مٹھن خان مر گیا؟''

''نہیں، مگر میری اطلاع کے مطابق، وہ ملک چھوڑ کر جانے والا ہے۔ وہ چند دن تک چلا جائے گا ایک لمبے عرصے کے لئے۔ باہر جانے کے کچھ ہی عرصے بعد وہ اسمبلی سے استعفیٰ بھی دے گا۔'' میڈم نے اسے بتایا تو وہ بولی۔

''کیا یہ بات صرف آپ ہی کو پتہ ہے یا......''

''نہیں صرف چند لوگوں کو معلوم ہے۔ تاہم مٹھن خان کیسا فیصلہ کرتا ہے، اس بارے بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''ٹھیک۔'' نینا نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا کیونکہ وہ بہت دور تک معاملہ سمجھ گئی تھی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس سمجھ آ گیا تھا اب اسے کیا کرنا ہے۔

''کیا مطلب ٹھیک۔'' میڈم نے پوچھا

''یہی کہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھے اب بہت سوچ کر ہی کچھ کرنا ہوگا۔'' وہ تلخی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

''اچھی بات ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں سوچا ہے کہ تم پندرہ بیس دن، مہینہ کے لئے کسی دوسرے ملک چلی جاؤ۔ تب تک تمہارے ذہن سے کافی حد تک بوجھ اتر جائے گا، پھر سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔'' میڈم نے اسے آفر دی۔

''کیا اس سے شعیب واپس آ جائے گا، میرا دکھ کم ہو جائے گا۔ مٹھن خان مرنے کے لئے خود چل کر میرے پاس آ جائے گا، یا......''

''پاگل مت بنو۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ ایسا جنون اچھا نہیں ہوتا۔''

''کیا کروں گی اب میں؟'' اس نے کہا

''پرسکون ہو جاؤ۔ بدلہ جوش سے نہیں ہوش سے لیا جاتا ہے۔ میری بات مانو پرسکون ہو جاؤ۔'' میڈم نے نرمی سے کہا

''ٹھیک ہے جیسا آپ چاہیں۔'' نینا نے ایک دم سے اس کی بات مان لی۔ وہ میڈم سے کسی قسم کی کوئی بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میڈم فاخرہ کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئی۔ جب اس نے اٹھ کر کھڑکی میں سے باہر جھانکا، شام اُتر رہی تھی۔ وہ فریش ہونے کے لئے چل دی۔

اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا، جب وہ کار میں

عورت منزل سے باہر نکلی۔ کار کی رفتار کچھ اتنی زیادہ نہیں تھی ۔ وہ پرسکون انداز میں کار بڑھائے جا رہی تھی۔ اس کے کسی انداز سے بھی عجلت کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اس نے ہلکے رنگ کا سادہ سی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی ۔ وہ شہر کی شاہراہوں سے ہوتے ہوئے قدیمی شہر کی جانب نکل پڑی ۔ ایک بڑی ساری نہر نئے اور قدیمی شہر کو الگ الگ کرتی تھی ۔ وہ پل پار کر کے قدیمی شہر کی جانب چل پڑی تھی ۔ وہاں ٹیڑھی میڑھی گلیاں اور تنگ سے بازار تھے۔ پرانی طرز کے بنے ہوئے گھر اور دیگر عمارتیں تھیں۔ اس نے ایک بڑی سڑک کے کنارے پارکنگ میں کار روکی، اپنا بڑا سا بیگ اٹھایا اور پیدل ہی نکل پڑی تھی۔ وہ بظاہر پرسکون دکھائی دے رہی تھی لیکن اس کے اندر ایک حشر بپا تھا۔

وہ تقریباً تین چار منٹ پیدل چلی ہو گی۔ ایک چھوٹی سڑک کے ساتھ وہ ایک تنگ گلی کے سامنے تھی ۔ اسے اس گلی میں موجود ایک پرانی سی حویلی تک جانا تھا۔ وہ وہاں اس گلی میں داخل ہو گئی ۔ وہ حویلی کے بڑے سے پھاٹک کے سامنے جا کر رکی ہی تھی کہ بڑے پھاٹک کی چھوٹی کھڑکی سے ایک نوجوان باہر آ گیا۔ اس نے ایک نگاہ نینا پر ڈالی اور مسکراتے ہوئے بولا

”مہمان، نینا جی۔“

”ہاں، ٹوانہ صاحب سے کہو میں.....“

”جیسے ہی آپ نے نہر کا پل پار کیا تھا۔ ہمیں خبر ہو گئی تھی کہ ہمارے مہمان ہمارے علاقے میں آ گئے ہیں۔ ہم تب سے آپ کے منتظر ہیں، آئیں۔“ نوجوان نے جس انداز میں کہا، اسے سمجھ نہیں آئی کہ وہ طنزیہ کہہ رہا ہے یا اس نے یہ بات سنجیدگی میں کہی ہے۔ نوجوان واپس کھڑکی میں سے اندر چلا گیا تو وہ بھی اس کے پیچھے چلی گئی۔ سامنے بڑا سا راصحن تھا۔ اس کے سامنے پرانی طرز کا برآمدہ تھا جس پر چکیں لگی ہوئی تھیں۔ ڈیوڑھی پار کرتے ہوئے اس نوجوان نے بڑے فخر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”ماں باپ نے تو میرا نام ندیم رکھا تھا لیکن جرم کی دنیا میں دیما پھوکر کے نام سے مشہور ہوں، کبھی سنا ہو یہ نام؟“

”نہیں سنا، کیونکہ میں جرم کی دنیا سے تعلق نہیں رکھتی ۔“ نینا نے خشک لہجے میں کہا اور بے پروائی سے حویلی کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھتی گئی۔

”مگر یہاں پر آپ کے بارے میں تو بہت مشہوری ہے۔ بڑی شے بتایا جا رہا ہے تمہیں؟“ اس نے نینا کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا تو نینا نے اس کی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ تب تک وہ برآمدے میں آ گئی تھی۔

وہیں سے آگے ایک بڑا سا داخلی دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اس دروازے میں داخل ہو گئی تو اپنے آپ کو ایک گول کمرے میں پایا۔ جس میں صوفے، کرسیاں اور میز لگے ہوئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے یہاں صرف بیٹھک ہوتی ہے۔ وہ ابھی کمرے کا جائزہ لے رہی تھی کہ دائیں جانب کے دروازے سے ایک جیم شحیم شخص وارد ہوا ۔ اس نے سفید کرتا اور شلوار پہن رکھی تھی ۔ اس کے لمبے لمبے کھچڑی بال تھے۔ نینا پر نگاہ پڑتے ہی اس نے اونچی آواز میں کہا۔

”بیٹھو پتری، بولو کیا پیئو گی۔“

یہ کہتے ہوئے وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا، نینا بھی اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

”کچھ نہیں ٹوانہ صاحب، میرا جی نہیں چاہ رہا۔“ تبھی اس نے نینا کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے دیمے کی طرف دیکھ کر کہا

”جاؤ، اندر سے کوئی تازہ جوس لے کر آؤ۔“ دیمے نے سر ہلایا اور وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ٹوانہ نے کہا، ”میرے خیال میں تمہیں دو چار دن سکون سے یہاں میرے پاس رہنا چاہئے۔ اس دوران ہم ساری معلومات کر لیں گے، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”ٹوانہ صاحب۔! میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ اب ہر کام سکون سے ہو گا۔ آپ دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔“ اس نے کہا تو وہ خوش ہوتا ہوا بولا۔

”میرے بندے تمہارے بارے میں بتاتے رہے ہیں، اس سے مجھے اندازہ ہے۔“

”آپ نے اب تک جتنے بھی بندے بھیجے میری مدد کے لئے انہوں نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا اور......“ اس نے کہنا چاہا تو ٹوانہ نے مسکراتے ہوئے کہا

”او پتری، تم رقم بھی تو ہمارے معیار کی دیتی رہی ہو ۔ یہ تو سیدھا سادہ کاروبار ہے لیکن اب تمہارے ساتھ

ڈیل ہوئی ہے، میں نے اس پر بہت سوچا، کام بہت بڑا ہے، اور رسک بھی۔ مگر تم نے جو رقم دینے کا وعدہ کیا ہے، اس کا کہیں پتہ نہیں؟ ایسا کیسے ہوگا؟"

"آپ میرے پلان کے ساتھ چلیں، سب ہو جائے گا۔" نینا نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے تم پر یقین ہے۔" ٹوانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اتنے میں دیما اندر سے آ گیا۔ اس کے پیچھے ہی ایک لڑکی ٹرے میں جوس رکھے آ گئی۔ سرو کرنے کے بعد وہ جانے لگی تو ٹوانہ نے اس سے کہا، "میڈم کے لئے اوپر والا کمرہ ٹھیک کروا دو۔ اب تمہی نے ان کا خیال رکھنا ہے۔"

"جی ٹھیک ہے۔" اس نے مودب لہجے میں کہا اور پلٹ گئی۔ نینا جوس پینے لگی۔ اس دوران دیما کھڑا رہا ٹوانہ اور نینا کے درمیان شہر میں موجود لوگوں کے بارے میں بات ہوتی رہی، کون کیا کر رہا ہے۔ تبھی اچانک اس نے پوچھا۔

"رات صاحبزادہ عبدالکریم کا لڑکا نہیں رہا۔ سنا ہے اس پر مٹھن خان نے تشدد کیا تھا۔ کیا یہ لڑکا ہی تمہارا دوست تھا؟" ٹوانہ نے پوچھا تو نینا خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"وہ میرا دوست ہی نہیں میرا سب کچھ تھا ٹوانہ صاحب، یہ جتنا میں نے آپ کے ساتھ پلان کیا ہے، یہ سب......" یہ کہتے ہوئے اسے خود پر قابو نہیں رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔ تم پروا مت کرو، میں دیکھ لوں گا سب ہو جائے گا۔" لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ وہی لڑکی آ گئی۔ اس نے نینا کی طرف دیکھ کہا۔

"آئیں۔"

نینا اٹھ کر اس کے ساتھ چل دی۔

اوپری منزل پر وہ ایک ایسے کاریڈور میں پہنچے جہاں ایک کمرے میں وہ لڑکی داخل ہو گئی۔ اس کمرے کے سامنے سے نیچے حویلی کا صحن دکھائی دیتا تھا۔ وہ کمرے میں گئی تو وہاں جدید انداز میں ہر شے تھی۔ بہت آرام دہ کمرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بیگ رکھا اور سیدھے کھڑے ہو کر بولی۔

"میرا نام زوبی ہے۔ یہ سامنے بیل ہے۔ ساتھ میں میرا فون نمبر بھی لکھا ہوا ہے۔ جب چاہیں کال کر لیں۔ ابھی آپ فریش ہو جائیں، میں آپ کے لئے کھانا لاتی ہوں۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" نینا نے کہا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

"چلیں جب آپ کو ضرورت ہو۔" زوبی نے پرسکون سے انداز میں کہا اور واپس پلٹ گئی۔ نجانے کیوں نینا کو وہ زوبی دلچسپ لگی تھی۔ اس کی کیا وجہ تھی اسے خود سمجھ نہ آ سکی۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے ساری سوچوں سے چھٹکارا لینے کے لئے خود کو آزاد چھوڑ دیا۔

عطا ٹوانہ بظاہر ایک درمیانے درجے کا تاجر تھا۔ شہر میں اس کی کئی دکانیں تھیں۔ ایک شاپنگ سنٹر بھی تھا لیکن اس کا اصل "بزنس" کچھ اور ہی تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں جرائم پیشہ لوگوں کی ماں کہا جاتا ہے۔ ہر مجرم کو تحفظ دینا اور پھر اس کے جرم کی نوعیت کے مطابق اس سے کام لینا ہی اس کا اصل دھندہ تھا۔ بظاہر اس کے ارد گرد کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دیتا تھا، جو پولیس کو یا کسی بھی قانون نافذ کرنے والے ادارے کو مطلوب ہو۔ لیکن شہر میں اور شہر کے باہر ایسے ایسے جرائم پیشہ لوگوں کا ایک ہجوم اس کے پاس تھا جو اس کے ایک اشارے پر بہت کچھ کرنے کو تیار رہتے تھے۔ بہت سارے اعلیٰ سطح کے لوگ اس سے کام لیتے تھے۔ کسی کو اپنے سیاسی جلسے میں لوگوں کا رش چاہئے، کسی کو بلوہ کروانا ہو۔ کسی کو احتجاج کروانا ہو، سڑک بلاک کرنی ہو، کہیں آگ لگانی ہے تو کہیں توڑ پھوڑ کرنی ہے۔ یہ سب وہ ایک خاص رقم لے کر کر دیتا تھا۔ اس کے ارد گرد چند لوگ ایسے تھے جو چند گھنٹوں میں ایک جلوس نکال دیتے تھے۔ اس کے علاوہ بہت خاص لوگوں کو سیکورٹی کے لئے بندے مہیا کرتا تھا۔ اس کے پاس ایسے لوگ بھی تھے جو کسی بھی جرم میں کسی کا ساتھ دے سکتے تھے۔

نینا کے ساتھ عطا ٹوانہ کا رابطہ پچھلے ایک برس سے تھا۔ اس دوران نینا نے اس کے لئے کام کیا تھا اور اس سے اپنے لئے مدد بھی لی تھی۔ اس نے کوئی پیسہ نہیں لیا تھا لیکن مدد کے عوض اس نے بڑھ کر رقم دی تھی۔ بات یہ نہیں کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اس کے بارے میں پتہ نہیں تھا۔ سب کچھ معلوم تھا لیکن اسے پکڑنے کے لئے ہمت اور ایسا دل گردے والا بندہ چاہئے تھا جو خود مفاد

پرست نہ ہو اور اس کے ہاتھ صاف ہوں اور ہر ادارہ بھی اس بندے کی پوری حمایت کرتا ہو۔ لیکن کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں جو ایسے کسی سر پھرے بندے کی پوری طرح حمایت کر سکے۔ اس لئے جرم بڑھتا، پھلتا پھولتا ہے۔ لہذا قانون نافذ کرنے والے چشم پوشی سے کام لیتے تھے۔ ممکن حد تک وہ بھی اس سے مدد لے لیتے تھے۔ یوں عطا ٹوانہ کا کام پورے عروج پر تھا۔

نینا مایوس ہو چکی تھی۔ اسے جو دھچکا لگا تھا۔ وہ اس سے سنبھل ہی نہیں پائی تھی۔ اسے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ جب تک وہ ہے، دوسرے اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، اس کے مقصد کی جھلک دکھا کر اس سے اپنا ہی کام نکالتے چلے جا رہے ہیں۔ اتنی کوشش کے باوجود وہ اب تک مٹھن خان تک نہیں پہنچ پائی تھی۔ اگرچہ شعیب نے اس کی بہت مدد کی تھی۔ جو اس کی محبت کا درجہ بھی پا گیا تھا۔ وہ نہیں رہا تو کسی نے اس کا دکھ محسوس نہیں کیا بلکہ ایسے مٹھن خان ہی سے ڈراتے رہے۔ اسے دنیا کی سمجھ آگئی تھی۔ اب وہ دنیا کو اپنے انداز میں برتنا چاہتی تھی۔ اس نے بہت سوچا، پھر جو اس کی سمجھ میں آیا، اس میں عطا ٹوانہ ہی اس کی بھرپور مدد کر سکتا تھا۔ اور وہ یہاں پر آگئی۔ وہ یہاں رہ کر اپنے مقصد کے لئے پلان کر سکتی تھی۔

وہ پوری رات اور پھر اگلا دن کمرے ہی میں پڑی رہی۔ شاید وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ لیکن ایسا ہو نہیں سکا تھا۔ شام کے سائے پھیل گئے تھے۔ وہ نیند سے بیدار ہو کر فریش ہو چکی تھی۔ اسے ایک کال کا انتظار تھا۔ تین دن سے وہ ایک ایسے آدمی کے ساتھ رابطے میں تھی، جو اسے ایک خاص خبر دینا تھی۔ شعیب کے سانحہ کی وجہ سے وہ اس طرف دھیان نہیں دے پائی تھی۔ دوپہر سے پہلے اس نے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ ممکن ہے وہ کسی ایسی صورت حال میں ہو۔ نینا کے سامنے انتہائی دھیمی آواز میں ٹیلی وژن چل رہا تھا۔ مگر اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ اس کے خیالوں میں شعیب تھا۔ جس کے ساتھ گذرا ہوا وقت کو وہ اپنی زندگی کا بہترین وقت سمجھ رہی تھی۔ تبھی اس کا فون منمنا اٹھا۔ اس نے جلدی سے فون اٹھایا، لیکن یہ وہ کال نہیں تھی، جس کا اسے انتظار تھا۔ اسکرین پر شعیب کے اس دوست

ساجد اقبال کا نمبر تھا۔ جس کے فارم ہاؤس میں اس نے بہزاد کو قتل کیا تھا اور وہاں سے بھاگی تھی۔ یہی وہ فارم ہاؤس تھا، جہاں اس نے شعیب کے ساتھ بہت زیادہ وقت گذارا تھا۔ اس نے کال رسیو کر لی۔

"کیسی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"تم جانتے ہو کہ میں کیسی ہو سکتی ہوں۔" نینا نے دکھی لہجے میں جواب دیا۔

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ آج اور ابھی۔ اگر تم مجھے ملنا پسند کرو تو۔" اس نے بڑے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"یہ کیا بات کر رہے ہو ساجد، میں تم سے کیوں نہیں ملوں گی۔ بولو کہاں آنا ہے۔ کہاں ہو تم؟" نینا نے پوچھا۔

"ابھی تو گھر پر ہوں۔ تم بتاؤ کہاں پر......" اس نے پوچھنا چاہا لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی نینا نے اسے ایک خاص پوائنٹ بتایا، جہاں وہ مل سکتے تھے۔ ڈن کرنے کے بعد اس نے کال بند کر دی۔ نینا حیران تھی کہ اس نے پہلے کبھی ملنے کے لئے نہیں کہا تھا۔ یہ اچانک کیوں ملنا چاہتا ہے؟

نینا نے اپنی کار اس شاپنگ سینٹر کے سامنے روکی جہاں اسے ساجد سے ملنا تھا۔ آج تک وہ اس سے ملی نہیں تھی۔ لیکن تصویروں میں کئی بار دیکھا تھا۔ فون کالز پر بے شمار دفعہ اس سے بات ہو چکی تھی۔ آج پہلی بار وہ اس سے ملنے والی تھی۔ اس نے فون پر نمبر ملائے ہی تھے کہ نینا نے اپنی کار کے سامنے ایک تنومند نوجوان کو کھڑے پایا۔ اس نے جینز کے ساتھ ڈھیلی سی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ ہلکے ہلکے بال بہت اچھے لگ رہے تھے۔ وہ اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ نینا نے نمبر تلاش کر کے کال کی اور سامنے کھڑے نوجوان کو دیکھا۔ اس نے اپنا سیل فون نکال لیا، پھر اس کی کال لے کر کہا۔

"میں ادھر ہی ہوں، آ گئی ہو۔"

"یہ تم ہی ہو، کار کے سامنے نیلی جینز میں اور آف وائٹ شرٹ میں؟" نینا نے اپنی کار کا نمبر بتاتے ہوئے کہا تو اس نے کار کی طرف دیکھا، کال بند کی اور کار کی جانب بڑھ آیا۔ اس نے پسنجر سیٹ والا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیسی ہو؟"

"یہ مت پوچھو کہ میں کیسی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے گیئر لگا دیا۔ ساجد خاموش رہا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ایسا اس نے کیوں کہا ہے۔ تبھی نینا نے کہا، "اس کے بغیر تو اب کہیں دل بھی نہیں لگتا۔ بس ایک آگ ہے من میں بھری ہوئی۔ میں جس میں جل تو رہی ہوں، اب اسی آگ میں اس دنیا کو جلانا ہے۔ انہوں نے مجھ سے میرا شعیب چھینا ہے، میں ان سے ہر شے چھین لوں گی۔"

"میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں اور تمہارا دُکھ بھی۔" اس نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ ان کے درمیان خاموشی چھا گئی۔

"کہاں جانا ہے؟" نینا نے پوچھا

"میں بتاتا ہوں۔" اس نے کہا اور اشارے سے سیدھے چلتے رہنے کو کہا۔

مصروف سڑک پر وہ کار بھگائے جا رہی تھی۔ دونوں کی نگاہیں سامنے تھیں۔ ساجد اسے راستہ بتاتا رہا، یہاں تک کہ وہ ایک سنسان چار دیواری کے پاس آن ٹھہرے۔ وہ اس علاقے کا قبرستان تھا۔ نینا نے کار وہیں روک دی۔ دونوں اُتر کر قبرستان کے گیٹ تک جا پہنچے۔

اگرچہ گیٹ پر مدقوق سے بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی تاہم گیٹ کے اندر سے اندھیرا شروع ہو گیا تھا۔ ساجد نے ٹارچ روشن کر لی۔ وہ دونوں خاموشی سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ کافی آگے جا کر وہ ایک تازہ قبر کے پاس رُک گیا۔ اس کے پیچھے نینا بھی رک گئی۔ اس قبر پر کافی تعداد میں تازہ پھول پڑے تھے۔ ابھی تک اس کی مٹی گیلی تھی۔ اس نے ٹارچ کی روشنی کرتے ہوئے کہا

"یہ پڑا ہے شعیب، منوں مٹی کے نیچے۔"

یہ کہتے ہوئے ساجد کے آنسو نکل پڑے لیکن نینا کی آنکھیں کسی بنجر زمین کی مانند خشک تھیں۔ ایک آنسو تو کیا، آنکھیں بھی تر نہیں ہوئیں تھیں۔ یہ اس کا من جانتا تھا کہ اندر لگی ہوئی آگ کس طرح بھانبڑ بن گئی تھی۔ اسے لگا کہ اس کے اندر کی آگ اسے ہی جلا کر خاکستر کر دے گی۔ وہ چند لمحے خاموشی سے کھڑی رہی۔ اسے لگا کہ جیسے وہ پھٹ جائے گی۔ اس نے خود پر قابو پایا اور ایک جھٹکے سے واپس پلٹ پڑی۔ تقریباً بھاگتے ہوئے وہ قبرستان کے گیٹ تک چلی گئی۔ ساجد اسے دیکھتا رہا۔ اس نے سکون سے فاتحہ پڑھی اور قبرستان سے باہر آ گیا۔ نینا وہاں کھڑی لمبے لمبے سانس لیتی ہوئی خود پر قابو پا رہی تھی۔

"کیا ہوا تھا۔" ساجد نے جان بوجھ کر پوچھا تھا حالانکہ وہ نینا کے من کو سمجھ رہا تھا

"ساجد مجھے یوں لگا جیسے مجھے ابھی یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ میں نے بہت غلطی کی یہاں آ کر۔" نینا نے یوں کہا جیسے وہ بہت نادم ہو، بڑی شرمندگی محسوس کر رہی ہو۔

"میں سمجھا نہیں، یہ کیا کہہ رہی ہو؟" ساجد نے حیرت سے یوں پوچھا جیسے اس بات کی توقع نہ رہی ہو

"مجھے اپنے ان سارے دشمنوں کو مار کر یہاں آنا چاہئے تھا، جنہوں نے میرے شعیب پر تشدد کیا تھا۔ اسے مجھ سے چھین لیا۔ یا میں اب تک زندہ کیوں ہوں۔ میں خالی ہاتھ کیا لینے چلی آئی ہوں یہاں؟"

یہ سن کر ساجد چند لمحے خاموش رہا پھر بولا

"میں تمہیں یہاں ایک خاص مقصد کے لئے لایا ہوں۔"

"کس مقصد کے لئے؟" نینا نے پوچھا

"آؤ، کار میں بیٹھو، بتاتا ہوں۔" ساجد نے کہا اور کار کی جانب بڑھ گیا۔ نینا پھر ڈرائیونگ سیٹ پر آن بیٹھی۔ تو ساجد اسے راستہ سمجھانے لگا کہ کدھر جانا ہے۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے نینا کی طرف دیکھ کر کہا۔

"نینا! اب شعیب نہیں رہا، میں جانتا ہوں وہ تمہارا بہت بڑا سہارا تھا، اب کیسے اپنا مقصد حاصل کر پاؤ گی؟"

"مجھے جو کچھ بھی کرنا پڑا، میں وہ کروں گی۔" اس نے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"تمہارے مقصد میں کوئی شریف آدمی تو سہارا دینے سے رہا، اور نہ کوئی ایسا بندہ جو مٹھن خان سے بھی زیادہ طاقتور ہو۔ پھر کیا کرو گی؟" اس نے اپنی بات سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کہا نا کچھ بھی کر لوں گی۔" اس نے جواب دیا۔

"میرے خیال میں جرم کے علاوہ کوئی ایسا راستہ نہیں بچتا جو مجھے تمہیں منزل تک لے جائے گا، کیا تم ......" اس نے کہنا چاہا تھا کہ نینا نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"تم یہی سمجھ لو ساجد، میں نے جرم کی گلی میں قدم رکھ دیا ہے۔ مجھے اپنی زندگی بھی نہیں چاہیے گی، جو دکھوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں دے سکی۔ مجھے صرف اس بندے کو ختم کرنا ہے بس، یہ چاہے جیسے بھی ہو۔" نینا نے بے حد جذباتی ہوتے ہوئے کہا تو ساجد بولا

"یہ تم جہاں پر چلی گئی ہو نا، وہ کوئی اچھی جگہ نہیں، میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں ایسے لوگوں کے ساتھ جڑنا چاہیے۔ وہ ایک ایسی دلدل ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔"

"میں یہ سب اچھی طرح جانتی ہوئی۔ لیکن میرے پاس کوئی چارہ نہیں۔ میرا دشمن اتنا مضبوط ہے یہ تو میں جانتی تھی لیکن میں اس تک پہنچ ہی نہیں پاؤں گی، یہ میں نے سوچا ہی نہیں تھا، ان کی وجہ سے راہوں میں بھٹکتی رہی، جنہوں نے مجھے میرے دشمن تک پہنچانا تھا۔" وہ یوں افسوس بھرے لہجے میں بولی جیسے اس کا سب کچھ کھو گیا ہو۔

"تو کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ یہ لوگ تمہیں اس تک پہنچا دیں گے، ایسا کبھی نہیں ہو گا۔" ساجد نے کہا

"مگر ایک امید تو ہے۔" وہ بڑبڑا دینے والے لہجے میں بولی جیسے اسے خود امید نہ ہو۔ تبھی ساجد تیزی سے بولا۔

"نہیں نینا ایسا نہیں، وہ جرم کی دنیا ہے۔ کیا تمہیں مجرم بننا ہے؟ میں تمہیں جرم کی دنیا کا ایندھن نہیں بننے دوں گا۔"

"تو پھر کیا کروں، میرے پاس اتنے وسائل نہیں، لیکن مجھ پر دشمن کا قرض بڑھ گیا ہے۔" نینا نے بے بسی سے کہا۔

"اگر تم یہ وعدہ کرو کہ پلٹ کر جرم کی دنیا میں نہیں جاؤ گی تو ہم اس پر بات کر سکتے ہیں۔ تمہیں ٹھکانہ چاہیے، وسائل چاہیے مل جائیں گے۔ سب کچھ ملے گا لیکن مجرم نہیں بننا۔" ساجد نے ایک عزم سے کہا تو نینا چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔

"مجھے پھر سے ایک نیا سفر شروع کرنا پڑے گا۔" وہ بولی۔

"یہ جرم کے راستے پر چلنے والا بھی کیا نیا سفر نہیں ہے؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"ہے مگر، میں بہت جلد اپنا مقصد حاصل کر لوں گی۔"

سوال

حضرت علیؓ ایک دشمن سے جنگ لڑ رہے تھے انہوں نے تلوار کا زور سے وار کیا اور اس کی تلوار دو ٹکڑے کر دی۔ حضرت علیؓ غیر مسلح شخص پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے اس لیے فوراً ہاتھ روک لیا وہ شخص کہنے لگا۔

"مجھے تلوار دو میں مقابلہ کروں گا۔"

حضرت علیؓ نے اپنی تلوار دی' وہ حیران ہو کر بولا۔ "تعجب ہے آپ خود غیر مسلح ہو گئے۔"

حضرت علیؓ نے جواب دیا "ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے مانگنے والے کا سوال رد کیا ہو' تم نے مجھ سے تلوار مانگی میرے پاس ایک ہی تلوار تھی' اس لیے میں نے تمہیں وہ دے دی۔"

یہ دیکھ کر وہ کافر مسلمان ہو گیا۔

عظمیٰ فرید خان......ڈی آئی خان

دھوکا

ایک بدصورت فعل کا بدہیت نام ہے۔

عہد وفاداری میں ہو یا محبت میں' غلامی میں ہو یا مختاری میں' انسانی اعصاب پر چیونٹیوں کی مانند چمٹ جاتا ہے جس کے بعد انسان کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس کا وجود کائنات سے کٹ گیا ہو۔ وہ خود کو اتنا خالی محسوس کرتا ہے اور اتنا تنہا کہ اسے پوری دنیا فریب کا جال نظر آنے لگتی ہے۔

رفعت سراج کے شاہکار سے اقتباس

آمنہ امداد......سرگودھا

لطیفہ

چپراسی "پہلوان جی! تم ایک وقت میں کتنے لوگوں کو اٹھا سکتے ہو؟"

پہلوان "کم از کم دس لوگوں کو۔"

چپڑاسی "چھوڑو یار! تم سے تو تگڑا میرا مرغا ہے جو صبح پورے محلے کو اٹھاتا ہے۔"

عائشہ پرویز......کراچی

پھر مجھے نہیں جینا، جی کر کروں گی بھی کیا؟“ اس نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

”چلو۔! اپنے دشمنوں کو ختم کرنے تک تو زندہ رہ سکتی ہونا؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ تو جینا ہے؟“ اس نے جواب دیا۔

”تو چلو پھر میرے ساتھ، مجھے صرف دو دن دے دو، اس کے بعد تم جو چاہئے فیصلہ کرنا۔“ ساجد نے کہا۔

”او کے، جیسا تم چاہو۔“ اس نے کہا۔

ان کے سفر کا اختتام اسی فارم ہاؤس پر ہوا جہاں اس نے بہزاد کو مارا تھا۔ جہاں وہ شعیب کے ساتھ آتی رہی تھی۔ پورچ میں کار کھڑی کر کے جب وہ باہر نکلی تو اسے یوں لگا جیسے ابھی کسی طرف سے شعیب آ جائے گا۔ وہ ساجد کے ساتھ چلتی ہوئی لاؤنج میں آ گئی۔

”کچھ کھاؤ گی؟“ ساجد نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے دھیمے سے لہجے میں جواب دیا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”کیا پولیس نے تمہیں نہیں پوچھا کہ جہاں پر کوئی چھپا ہوا تھا۔ مطلب میں کبھی یہاں پر؟“

”یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ بہزاد کی لاش یہاں سے دور پھنکوا دی، ورنہ اگر وہ یہاں سے ملتا تو بہت مشکل ہو جاتی۔ ثبوت نہیں ملا تو تھوڑے بہت سوالوں کے بعد چھوڑ دیا تھا۔ لیکن میں جانتا ہوں، میں مشکوک اب بھی ہوں۔“ اس نے کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی مزید بات کرتی، اُس کا فون بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر دیکھا تو چونک گئی۔ یہ وہی کال تھی، جس کا اسے انتظار تھا۔ وہ جلدی سے کال ریسیو کرتے ہوئے بولی۔

”ہاں بولو۔“

یہ کہہ کر وہ سنتی رہی۔ تقریباً ایک منٹ بعد اس نے فون کان سے ہٹا کر کال بند کر دی۔

”کیا ہوا؟“ ساجد نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے ابھی اور اسی وقت جانا ہے۔ میں نے غلطی کی یہاں آ کر۔ بہت وقت ضائع ہو گا۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تو ساجد نے پوچھا۔

”بات کیا ہے، کچھ بتاؤ گی؟“

”دشمن خان کے وہ غنڈے جنہوں نے شعیب پر تشدد کیا تھا، ان کے بارے میں پتہ چل گیا ہے۔ وہ اس وقت کہاں ہیں۔ میں یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دوں گی۔“ اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا

”اور یہ غلطی والی بات کیا تھی؟“ ساجد نے پوچھا

”میرے پاس اس وقت صرف پسٹل ہے۔ مجھے ہتھیار اور بندے چاہئے، ان کے لئے مجھے اب دیر ہو گی۔ خیر میں کرتی ہوں کچھ۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے قدم باہر بڑھانے چاہے تو ساجد نے کہا

”اسی فارم ہاؤس میں ہتھیار ختم تو نہیں ہو گئے، یہ تم جانتی ہو۔ تمہیں کسی بندے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے، میں ہوں نا تمہارے ساتھ، بندے نہیں، حوصلہ لڑتا ہے۔“

اس نے کہا تو نینا نے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے اسے ساجد پر بے تحاشا پیار آیا ہو۔ اسے لگا جیسے شعیب اس کی مدد کیلئے کہیں سے آ گیا ہو۔ اس نے شدتِ جذبات میں کہا

”چل پھر نکل۔“

”پہلے ہتھیار تو لے لیں۔“ ساجد نے کہا اور لاؤنج سے اندر کی جانب چلا گیا۔ نینا بھی اس کے پیچھے ہی چل دی۔

☆......☆......☆

اس وقت وہ دونوں ساجد کی ہی فور وہیل پر تھے۔ وہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ نینا نے اپنی کار وہیں فارم ہاؤس میں چھوڑ دی تھی۔ اس کے ذہن میں جو پلان تھا، اسی کے مطابق اس نے ہتھیار لے لیے تھے۔ وہ شہر سے باہر آ چکے تھے۔ اُن کے درمیان خاموشی تھی۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ چپ تھے۔ ان کے سورس نے جو کچھ بتایا تھا، انہوں نے اس پر آپس میں کافی بات کر لی تھی۔ وہ صرف دو تھے اور وہ جانتے تھے کہ جہاں وہ جا رہے ہیں اس ڈیرے پر کافی سارے لوگ ہوں گے۔ ساجد نے ایک جگہ پر آ کر فور وہیل آہستہ کی اور بائیں جانب جاتے ہوئے ذیلی پختہ سڑک کو دیکھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ سڑک کے نیچے فصلیں تھیں۔ ہیولوں کی مانند درخت کھڑے تھے۔ اس نے باہر کا جائزہ لے کر تصدیق کرنے کے لئے نینا سے پوچھا۔

''یہی سڑک ہے نا؟''

''یہی ہے۔'' اس نے تصدیق کر دی۔

ساجد نے اس سڑک پر دور وہیل موڑ دیا۔ تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر بستی تھی، جس سے پہلے ہی وہ ڈیرہ تھا۔ وہ ڈیرہ سڑک ہی سے دکھائی دے رہا تھا۔ نیتا نے اسے سڑک پر رکنے کو کہا اور فون نکال کر اپنے سورس کو کال ملائی۔ پوری بیل بھی نہیں بجنے پائی تھی کہ کال ریسیو کر لی گئی۔

''بولو کہاں ہیں وہ لوگ۔''

''مین گیٹ کے دائیں جانب جو کمروں کی قطار ہے، اس کے برآمدے میں ہیں۔ کچھ وہیں بیٹھے ہوئے تاش کھیل رہے ہیں اور کچھ سو گئے ہیں۔''

''گیٹ پر کون ہیں، بند ہے یا کھلا ہوا ہے ابھی؟'' اس نے پوچھا

''گیٹ پر ایک ہی بندہ ہے ابھی۔ اور گیٹ کھلا ہوا ہے۔ کچھ دیر میں جب دوسرا بندہ آ جائے گا تو گیٹ لگ جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، تم نکل جاؤ ڈیرے سے۔'' نیتا نے کہا

''جی ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا تو نیتا نے کال بند دی۔ پھر اس نے ساجد کو ساری بات بتا دی۔ اس نے فور وہیل کی ہیڈ لائیٹس بند کرتے ہوئے اس کچے راستے پر ڈال دی جو اس ڈیرے کی طرف جاتا تھا۔

نیتا کی بھویں تن گئی تھیں۔ وہ پوری توجہ سے اس ڈیرے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ تقریباً سو میٹر کے فاصلے پر اس نے فور وہیل روک دی۔ نیتا نے اپنے قدموں میں پڑے راکٹ لانچر کو اٹھایا اور نیچے اتر گئی۔ باقی ہتھیار اس کی جیکٹ میں تھے۔ اسی لمحے ساجد نے فور وہیل کو گھمایا اور یوں موڑ کر کھڑی کر دی کہ بھاگتے ہوئے بھی اس میں آن بیٹھیں۔ ساجد تیز قدموں سے چلتے ہوئے نیتا تک آیا اور آتے ہی راکٹ لانچر پکڑ لیا۔ اس نے اپنی جیکٹ میں سے راکٹ نکالا اور لانچر کے بیرل میں لگانے لگا۔ تب تک نیتا نے دو پسٹل نکال لئے تھے۔ اس نے ارد گرد دیکھا اور محتاط انداز میں گیٹ پر جا پہنچی۔

اس نے ہلکے سے گیٹ کھولا تو سامنے ہی ایک آدمی گن لئے کھڑا تھا۔ بائیں جانب برآمدے میں کافی شور مچا ہوا تھا۔ گیٹ سے کچھ دور کھڑے اس بندے کی ساری توجہ برآمدے پر تھی۔ تبھی اسے سمجھ آ گئی کہ گیٹ پر کھڑے بندے کو فور وہیل کے آنے کی آواز کیوں نہیں سنائی دی۔ چارپائیوں پر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تاش کھیلنے میں مشغول تھے۔ وہ زور زور سے باتیں کرنے کے علاوہ گالیاں بھی بک رہے تھے۔ سامنے رہائشی عمارت میں کوئی نہیں تھا۔ خبر دینے والے نے بالکل ٹھیک اطلاع دی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر ساجد کو دیکھا، وہ اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ ساجد سمجھ گیا کہ اب کیا کرنا ہے۔ نیتا نے سامنے کھڑے آدمی پر پسٹل تانتے ہوئے آہستہ سے بڑبڑائی۔

''ایک......دو......تین۔''

تین کہتے ہی اس نے فائر کر دیا۔ نیتا نے جیسے ہی فائر کیا تھا، اس کے ساتھ ہی اس نے نیچے بیٹھتے ہوئے گیٹ کھول دیا۔ فائر کے ساتھ ایک چیخ بلند ہوئی اور اگلے ہی لمحے برآمدے کی جانب راکٹ فائر ہو گیا۔ ایک زبردست دھماکا ہوا۔ ساتھ ہی زور زور سے چیخیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ چند لوگ صحن کی طرف بھاگے، کیونکہ برآمدہ کی چھت سے اینٹیں گرنے لگی تھیں۔ ان کا صحن کی جانب آنا ہی غلطی ثابت ہوا تھا۔ نیتا زمین پر پڑی تاک تاک کر ان کا نشانہ لینے لگی۔ ساجد نے اس وقت تک ایک مزید راکٹ فٹ کر لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس قدر حملہ ہو جانے کے بعد سامنے کے رہائشی حصے میں سے لوگ ضرور باہر نکلیں گے۔ لیکن کوئی باہر نہیں آیا۔ جو سامنے تھے زمین پر پڑے تڑپ رہے تھے۔ نیتا نے رسک لینا مناسب نہیں سمجھا، وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''نکلو، ساجد۔''

یہ کہتے ہوئے وہ گیٹ کی جانب چل دی۔ ایسے میں سامنے کی رہائشی حصے سے فائر ہوا۔ ساجد اور نیتا گیٹ کی اوٹ میں ہو چکے تھے۔ ساجد نے گھوم کر ایک راکٹ وہاں بھی فائر کر دیا۔ ایک دھماکا ہوا اور وہاں پر آگ لگ گئی۔ وہ مزید وہاں دیکھنے کے لئے نہیں رکے بلکہ تب تک یہ دونوں فور وہیل تک آن پہنچے تھے۔ یہ دونوں اس میں بیٹھے اور وہاں سے نکل پڑے۔ ساجد نے انتہائی تیزی میں وہاں سے فور وہیل نکالی تھی۔ نیتا نے اپنے سورس کو کال ملائی

''کہاں ہو؟''

"میں ڈیرے سے کافی دور کھیت میں ہوں۔"
"وہاں جاؤ اور دیکھو۔ میں اس کے بارے میں تفصیل کچھ دیر بعد پوچھتی ہوں۔ رقم تیرے گھر ابھی پہنچ جائیں گی۔ تھوڑی دیر بعد پتہ کر لینا۔"
"جی ٹھیک ہے۔" اس نے کہا تو نینا نے فون بند کر دیا۔ ساجد طوفانی انداز میں فور وہیل بھگائے جا رہا تھا۔ وہ جلد از جلد طے کردہ ٹھکانے پر پہنچ جانا چاہتے تھے۔ راستے میں اس نے اپنے سورس کو فون کر کے پوچھا
"ہاں بتا، کتنے مر گئے کوئی بچا تو نہیں؟"
"سبھی مر گئے ہیں۔ سب کچھ جل رہا ہے۔" اس نے تیزی سے کہا تو نینا بولی۔
"کال بند ہونے کے بعد اپنا فون اس آگ میں پھینک دینا، اب میں تمہیں کال نہیں کروں گی۔"
"جی ٹھیک ہے۔" اس نے کہا تو نینا نے کال بند کر دی۔ کچھ فاصلے پر نہر آئی تو نینا نے اپنا فون نہر میں پھینک دیا۔ اس نے اپنے پاس شعیب کا دیا ہوا فون ہی رکھا۔ باقی وہ سب سے اپنا رابطہ ختم کر دینا چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

صبح کی روشنی نے اس کمرے میں آ کر ہر شے روشن کر دی تھی جہاں وہ سوئی ہوئی تھی۔ وہ بیڈ سے اٹھی تو دائیں جانب بنی کھڑکی کھولی۔ دوسری منزل کے اس کمرے سے سامنے دور دور تک فصلوں کی ہریالی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ فارم ہاؤس نہیں تھا۔ بلکہ شہر سے باہر ساجد کا ایک بنگلہ تھا، جو اس نے نیا تعمیر کروایا تھا۔ ساجد رات اسے وہاں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ نینا اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ یہ ساجد، اچانک کہاں سے آ گیا۔ کیا اس کے دل میں شعیب کی اس قدر محبت ہے کہ اس کا انتقام لینے یہ اس کے ساتھ جڑ گیا ہے؟ یا اس کا بھی اپنا کوئی ذاتی مفاد ہے؟ وہ فوری طور پر کوئی فیصلہ نہیں دے سکتی تھی۔

اس نے اپنے ساتھ رابطے ختم کر دیئے تھے۔ وہ یہ بات سمجھ چکی تھی کہ یہ دنیا اگر کسی کی مدد کرے گی بھی تو پہلے اس کا اپنا ذاتی مفاد ہوگا۔ یہ مفاد وہ کس طرح لیتی ہے، یہ اپنا اپنا طریقہ ہے۔ کون کس طرح اپنا مفاد نکالتا ہے۔ اب اس کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ وہ یونہی لوگوں کے مفاد کے لئے استعمال ہوتی رہے، اور جب بھی موقعہ ملے اپنا مقصد حاصل کر لے، دوسرا وہ لوگوں کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دے اور اپنے مقصد کو خود حاصل کرے۔ وہ ابھی اس پر سوچ ہی رہی تھی کہ پشت پر دروازہ بجا۔ کسی نے دستک دی تھی۔ وہ پلٹ کر دروازے تک آئی۔ تب تک دستک پھر ہوئی اس کے ساتھ ہی ساجد کی آواز آئی
"کھول رہی ہوں۔" نینا نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔
ساجد نے نینا کو سر سے پیر تک دیکھا پھر اس کی جانب ایک شاپنگ بیگ بڑھا کر مسکراتے ہوئے بولا
"یہ کچھ کپڑے ہیں، فریش ہو کر پہن لو، ناشتہ نیچے کرنا ہے آ کر، میں انتظار کر رہا ہوں۔"
"او کے۔" نینا نے کہا اور شاپنگ بیگ پکڑ لیا۔
کچھ دیر بعد وہ نیچے لاؤنج میں آئی تو ناشتہ لگا ہوا تھا۔ ساجد ایک سرے پر بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہ بیٹھی تو ساجد نے کہا
"یہ لو، خبر دیکھو، مٹھن خان نے اسمبلی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔"
"مجھے اس کے استعفیٰ دینے یا نہ دینے سے کیا مطلب، کیا کسی رکن اسمبلی کے گولی نہیں لگتی؟" نینا نے اخبار کی طرف ہاتھ بڑھائے بنا کہا
"اس سے فقط یہ ہوا ہے کہ اس کی طاقت پہلے سے بہت کم ہو گئی ہے۔ پہلے جو حکومت کا اس کے ساتھ سہارا ہوتا تھا، وہ اب نہیں رہا۔" ساجد نے سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا
"ہوں، یہ تو ہے لیکن وہ اپنے ارد گرد زیادہ سیکورٹی کر لے گا۔" اس نے پلیٹ سیدھی کرتے ہوئے کہا
"لیکن خبر یہ ہے کہ وہ اب ملک میں نہیں رہے گا، باہر چلا جائے گا۔ اس میں زیادہ دن نہیں لگیں گے۔ بس یہی دو چار دن، وہ اپنے پورے خاندان کے ساتھ یہاں سے شفٹ ہو جائے گا۔ اس طرح تو زیادہ مشکل نہیں ہو جائے گی۔" ساجد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو نینا نے آنکھیں بند کرتے ہوئے انتہائی غصے میں کہا
"میں اسے یوں نہیں جانے دوں۔"
"کیسے روک پاؤ گی اُسے۔ ایک بار یہاں سے چلا گیا تو پھر بہت مشکل ہو جائے گی۔ مٹھن خان کو مارنا ایک

خواب ہو جائے گا۔" ساجد نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا

"میں اس خواب کو حقیقت بنا دوں گی۔" نینا نے کہا اور خاموش ہو گئی۔ ساجد نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ دونوں ناشتہ کرنے لگے۔ کتنی دیر تک ان میں خاموشی رہی۔ یہاں تک کہ وہ ناشتے سے فارغ ہو گئے۔ ایک ملازمہ برتن اٹھانے لگی تو وہ دونوں اٹھے اور باہر کاریڈور میں جا بیٹھے۔

"نینا مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آ رہی ہے، کیا تم اس کا جواب دے پاؤ گی؟" ساجد نے گہرے لہجے میں پوچھا

"سمجھ تمہیں نہیں آ رہی، جواب میں دوں، یہ کیا بات کر رہے ہو؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولی

"ابھی تم نے کہا کہ تم خواب کو حقیقت بنا دو گی، یہ کیسے ممکن ہو گا؟ کیا تم یہ فقط خود کو حوصلہ دے رہی ہو۔ یا پھر یونہی بڑ ہانک رہی ہو، کیا ہے؟ صرف کہہ دینے سے تو خواب حقیقت میں نہیں بدلتے، اس کے لئے کچھ کرنا پڑتا ہے۔" ساجد نے سخت بات بھی بڑے نرم لہجے میں کی تھی۔ اس پر نینا چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ظاہر ہے کچھ کرنا پڑے گا لیکن! پہلے یہ کنفرم کرنا ہو گا کہ وہ واقعی ہی باہر جا رہا ہے یا اس نے افواہ اڑائی ہے؟ ان سیاست دانوں کا کیا پتہ؟"

"تم چاہو تو اپنے ذرائع سے تصدیق کر سکتی ہو۔ ورنہ کل سے یا شاید آج سے ہی میڈیا میں آ جائے گا۔" ساجد نے گہرے لہجے میں کہا

"اب دیکھنا میں خواب کو حقیقت کیسے بناتی ہوں مجھے یہ کرنا ہو گا۔" وہ ایک عزم سے بولی تو ساجد نے جیب سے ایک سیل فون نکالا اور اسے دیتے ہوئے بولا

"میں ایک فون کال پر ہوں۔ یہ فون لو، مجھ سے رابطہ میں رہنا۔ اگر کچھ سمجھ میں آ جائے تو کال کر لینا۔"

نینا نے فون پکڑ لیا۔ پھر اسے دیکھتے ہوئے بولی

"ٹھیک ہے۔"

ساجد اٹھا اور چلا گیا۔ نینا وہیں بیٹھی سوچ میں پڑ گئی کہ اگر مٹھن خان باہر چلا گیا تو پھر کیا ہو گا؟

زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ اسے خیال آ گیا۔ وہ معلومات لے سکتی تھی۔ اس کے پاس پرانا کوئی فون نہیں تھا لیکن اس نے شعیب والے فون میں اپنے مطلب کے نمبر محفوظ کئے ہوئے تھے۔ وہ ان سے کال کر سکتی تھی۔ اس نے رضیہ کا نمبر ملایا۔ مگر دوسری طرف سے کوئی رنسپانس نہیں ملا۔ اسے لگا جیسے یہ نمبر ہی بند ہو گیا ہو۔ کچھ دیر تک کوشش کرنے کے بعد اس کے دماغ میں عجیب و غریب خیال آنے لگے۔ اگر رضیہ کی معلومات نہ ہوتیں تو وہ مومی کو کبھی اغوا نہیں کر سکتی تھی۔ کہیں اس کے بارے میں پتہ تو نہیں چل گیا؟ وہ پکڑی تو نہیں گئی؟ اس کے ساتھ کچھ ہو نہ گیا ہو؟ یہ سوچتے ہی اسے رضیہ پر بہت ترس آنے لگا تھا۔ اب وہ جب تک اسے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیتی یا اس کے بارے میں کوئی حتمی خبر نہ مل جاتی اس نے بے چین ہی رہنا تھا۔ اس نے خود ملنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن اس کے لئے اُسے شام تک انتظار کرنا تھا۔ وہ اپنے دوسرے سورس تلاش کرنے لگی، جن سے اسے معلومات مل سکتی تھیں۔ ان میں سے ایک بندہ ملا، جس کے ذمے اس نے یہ کام لگایا۔ اس نے بے دلی سے یہ کام لے لیا۔

سہ پہر کے بعد وہ رضیہ کے گھر جانے کے لئے اپنی کار پر نکل پڑی۔ ان کی گلیوں میں کار تو جا سکتی تھی لیکن وہ کار کو گلی میں کھڑی کرنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ اس نے کار مین سڑک پر موجود ایک شاپنگ سینٹر کے پارکنگ میں چھوڑی اور وہاں سے پیدل چلتی ہوئی اس گلی میں جا پہنچی جہاں رضیہ کا گھر تھا۔ اس نے شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک بڑی سی چادر اوڑھی ہوئی تھی جس کے پلو سے اس نے چہرے کو ڈھانپا ہوا تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی اور پھر اندر داخل ہو گئی۔

رضیہ سامنے ہی صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا بچہ اس کے پاس بیٹھا کھیل رہا تھا۔ رضیہ اسے یوں اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ ایک طرف اگر رضیہ کو دیکھنے کے بعد نینا کو اطمینان مل گیا تھا تو دوسری جانب رضیہ کا خوف معنی خیز تھا۔ وہ نینا کو دیکھ کر لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تم، یہاں اس وقت؟"

"کیوں کیا ہوا، تم اتنا ڈر کیوں رہی ہو؟" نینا نے اس سے پوچھا تو ادھر اُدھر دیکھ کر بولی

"خدا کے لیے تم یہاں سے چلی جاؤ، اگر میرے شوہر

نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔ وہ تمہیں پکڑوا دے گا۔''
''کیوں پکڑوا دے گا مجھے، بات کیا ہے؟ تم اتنا ڈری ہوئی کیوں ہو؟'' نینا نے پوچھا
''اندر آؤ، میں تمہیں بتاتی ہوں۔ ٹھہرو، میں دروازے کی کنڈی لگا آؤں۔'' رضیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ تیزی سے بڑھی۔ اس نے باہر والے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ پلٹ کر اس نے اپنے بچے کو اٹھایا اور نینا کا ہاتھ پکڑ کر اندرونی کمرے کی طرف چلی گئی۔
''تمہیں ہوا کیا ہے اتنی خوف زدہ کیوں ہے؟'' بالآخر نینا نے پوچھ ہی لیا۔
''دیکھو تو جتنی جلدی ہو سکتا ہے، یہاں سے چلی جا۔ تمہارا یہاں ہونا، سمجھو تمہارے لئے موت ہے۔'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی تو نینا نے اسے کاندھوں سے پکڑتے ہوئے کہا
''صاف بات کرو، پہیلیاں مت ڈالو۔''
''تم نے جو رقم میرے خاوند کو دی تھی، وہ تو ساری کی ساری جوئے میں ہار گیا۔ اب اس نے مجھ سے کہا ہے کہ تم جب بھی آؤ، تمہیں یہاں بٹھا لوں، وہ مٹھن خان کو بتا دے گا، اور......'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔
''ایسا کیوں کہا اس نے، میں اسے اس سے بھی زیادہ رقم دے سکتی ہوں؟'' نینا نے پوچھا
''اب رقم لے کر بھی وہ تمہارے کام نہیں آ سکتا نا، اب ہم وہاں ملازم نہیں رہے، موی والے حادثے کے بعد انہوں نے سارے ملازمین وہاں سے نکال دیئے ہیں۔''
''اب کہاں ہو؟'' اس نے پوچھا
''ہم اب گھر پر نہیں کہیں، دوسری جگہ کام کرتے ہیں۔ کیونکہ انہیں ہم سب پر شک تھا بلکہ اب بھی ہے۔ ہم تمہیں کوئی خبر نہیں دے سکتے، تو رقم کیسے لے سکتے ہیں۔ اسے تو ایک لمبی رقم اسی صورت مل سکتی ہے کہ تیرے بارے میں انہیں بتا دے۔'' وہ اپنی ہی جھونک میں کہتی چلی گئی تھی۔
''سن۔! تو پھر تم کیا زندہ بچ جاؤ گی؟'' نینا نے کہا
''کیا مطلب؟'' اس نے پوچھا
''مطلب یہ، وہ سارا مدعا تم پر ڈال دے گا، خود رقم لے کر الگ۔ تم نے ایسے نہیں سوچا؟'' نینا نے کہا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی
''نہیں نہیں۔ وہ تو اپنا دامن صاف کرنا چاہتا ہے، اپنی وفاداری کا ثبوت......'' یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے رُکی پھر سوچتے ہوئے بولی، ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''
''بے وقوف، تیرا شوہر تجھے مار ڈالے گا، بچ جا اُس سے۔'' نینا نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا
''اب میں کیا کروں، وہ آ گیا تو......'' رضیہ مزید سہم گئی تھی۔ نینا نے اسے ایک چارپائی پر بٹھاتے ہوئے ڈھارس دی۔ اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔
''کچھ نہیں ہوتا، میں تجھے کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ تم مجھے صرف یہ بتاؤ، انہوں نے تم پر شک تو نہیں کیا؟''
''نہیں، انہیں بالکل بھی پتہ نہیں چلا، انہوں نے سبھی ملازمین پر شک کیا تھا، اب بھی وہ اس تلاش میں ہیں۔ میں نے شکر کیا کہ اب وہاں کام نہیں کر رہی ہوں، ورنہ......'' رضیہ کہتے ہوئے اس نادیدہ سزا سے ڈرتے ہوئے خاموش ہو گئی۔ جو اسے مل سکتی تھی۔ ان دونوں میں خاموشی چھا گئی تھی۔ نینا کو مایوسی ہوئی تھی۔ اُسے بڑی امید تھی کہ رضیہ سے بہت ساری باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ تبھی اس نے پوچھا۔
''اچھا یہ بتاؤ، مٹھن خان اور اس کا خاندان کیا باہر کے ملک جا رہا ہے، ہمیشہ کے لئے؟''
''مجھے نہیں پتہ، اب میں گھر میں نہیں ہوتی، مجھے اس بارے کچھ بھی نہیں پتہ۔'' اس نے خوف زدہ سے آواز میں کہا تو نینا کے ذہن میں ایسے ہی ایک تجسس ابھرا۔ اس لئے پوچھا
''اچھا یہ بتاؤ، موی کی واپسی کے بارے میں پتہ ہے کیسے ہوئی، کس نے اسے چھڑوایا؟''
''مجھے تفصیل سے نہیں پتہ، لیکن اتنا ضرور پتہ ہے کہ کسی عورت سے ڈیل ہوئی تھی ان کی۔'' اس نے یاد کرتے ہوئے کہا تو نینا نے تیزی سے پوچھا
''عورت، کیا نام تھا اس کا؟''
''یہ تو میں بتا نہیں سکتی، عجیب سا نام تھا، جیسے بی بی صاحب، اس نے ڈیل کی تھی لیکن کوئی دوسری عورت تھی جس کی وجہ سے اس نے وہ ڈیل کی، وہ تم ہی تھی؟'' رضیہ نے کہتے ہوئے اس سے تصدیق کی تو نینا نے سوچتے

ہوئے پوچھا۔
"تمہیں بہزاد کے بارے میں پتہ ہے وہ کون تھا؟"
"مجھے اس کے بارے زیادہ پتہ نہیں چل سکا۔ ہمیں تو وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا، کسی کو اندر ہی جانے نہیں دیتے تھے۔" رضیہ نے جواب دیا پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی، "اب تم چلی جاؤ خدا کے لئے، وہ آنے والا ہوگا۔"
"اچھا، چلی جاتی ہوں لیکن اپنے خاوند سے پوچھنا، اگر کوئی بات پتہ چلے تو مجھے ضرور بتانا۔"
"میں بتادوں گی۔" اس نے کمرے سے باہر کی طرف نکلتے ہوئے تیزی سے کہا، اس پر نینا کو بھی وہاں سے نکلنا پڑا۔
وہ پارکنگ تک جاتے ہوئے یہی سوچتی رہی کہ بی بی صاحب کو کس وجہ سے مجبور ہونا پڑا؟ کیا وہ اس قدر طاقت نہیں رکھتیں؟ بی بی صاحب کیوں مجبور ہوگئیں؟ سوال تھے کہ جیسے اس پر برستے ہی چلے جارہے تھے۔ وہ کار لے کر نکلی تو اس کا دماغ گھوم رہا تھا۔ وہ جس قدر سوچتی چلی جا رہی تھی، اسی قدر اس کی بے چینی بڑھتی چلی جارہی تھی۔ اُسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔
وہ کار پورچ میں کھڑی کرنے کے بعد جب لاؤنج میں آئی تو ساجد صوفے پر نیم دراز سیل فون پر کوئی گیم کھیل رہا تھا۔ وہ ساتھ والے صوفے پر بیٹھی تو اس نے فون ایک طرف رکھتے ہوئے کہا
"کچھ پتہ چلا، کب جارہا ہے مٹھن خان یہاں سے ؟ جا بھی رہا ہے کہ نہیں؟"
"نہیں پتہ چلا۔ میرا جو سورس تھا اسے نہیں معلوم، ایک اور ہے، دیکھیں وہ کیا جواب دیتا ہے۔" اس نے بے دلی سے کہا۔
"کیا ہم اسی خبر کے انتظار میں بیٹھے رہیں گے؟" ساجد نے سیدھا ہوتے ہوئے پوچھا
"بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر ہمیں پتہ چل بھی جائے تو اس کے بعد کوئی نہ کوئی لائحہ عمل تو بنانا پڑے گا۔ کیوں نہ پہلے ہی کچھ ایسا کرلیا جائے۔" نینا نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا تو ساجد نے کہا۔
"مثلاً کیا؟"
"اُسے کسی نہ کسی طریقے سے باہر نکالا جائے۔ اسے مجبور کیا جائے کہ وہ عام عوام میں آئے۔" اس نے کہا۔
"وہ کوئی بے وقوف بندہ نہیں ہے۔ ساری زندگی اس نے یہی کھیل کھیلا ہے۔ اپنا اتنا بڑا نقصان کروالیا اس نے۔ ایک بیٹا مروالیا، دوسرا اپاہج بن گیا ہے۔ بیٹی مرتے مرتے بچی ہے۔ وہ بہت کائیاں ہے۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رُکا پھر کہتا چلا گیا، "جہاں تک میری معلومات ہیں، مٹھن خان پچھلے دو ماہ سے اپنے ڈیرے پر بھی نہیں گیا، وہ اس قدر محتاط ہو چکا ہے۔ اس نے اگر شعیب کو مارا تو بھی اُسے ڈیرے پر نہیں رکھا بلکہ اپنے فارم ہاؤس پر رکھا۔ اتنا محتاط ہونے کے باوجود اس کی بیٹی اغوا ہوگئی۔ وہ خوف زدہ ہوگیا ہے۔"
"اگر ہم کوشش کریں تو اسے باہر نکال سکتے ہیں، کچھ نہ کچھ تو ایسا کرنا ہوگا۔" نینا نے اپنی بات منواتے ہوئے کہا۔
"دیکھو۔! اس طرح کی صورت حال میں صرف دو طرح کے لوگ ہی اسے باہر لا سکتے ہیں۔ یا تو اس کے انتہائی قریبی، لوگ جن پر وہ یقین رکھتا ہے یا پھر اس کے انتہائی دشمن، جو اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اس کے خلاف مہم چلانے میں بھی دن لگ جائیں گے۔" ساجد نے سمجھانے والے انداز میں کہا
"ایک بات ہے ساجد، اگر اس پر سوچ لیا جائے تو ......" نینا نے چونکتے ہوئے کہا۔
"وہ کیا؟" اس نے پوچھا۔
"وہ یہاں سے چلا جاتا ہے۔ اس کے یہاں سے چلے جانے کے بعد سب سے زیادہ فائدہ کس کو ہوتا ہے؟" نینا نے پوچھا تو ساجد نے سنجیدگی سے کہا۔
"ظاہر ہے اس کے مخالفین کو اور سب سے زیادہ اُسے جس نے ایم این اے کی سیٹ لینا ہے۔"
"تو کیوں نا مٹھن خان کے جاں نثار دوستوں کے لئے غضب بن جائیں، پھر تو نکلے گا باہر۔ یا پھر مخالفین کو ماریں، دونوں صورتوں میں اپنا تو کام ہوجائے گا۔" نینا نے صلاح دی تو ساجد کچھ دیر سوچتا رہا، پھر انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا
"یہ ایک لمبا، اور بہت زیادہ رسک والا راستہ ہے۔ ہم کہیں بھی اور کسی بھی جگہ گھیرے جاسکتے ہیں۔ مقصد پھر

درمیان میں وہ جائے گا۔"
"تو پھر کیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔" وہ زچ ہوتے ہوئے بولی
"میرے خیال میں جب تک کوئی ایسا راستہ نہیں مل جاتا جس یقینی ہو، تب تک ہم مٹھن خان تک پہنچنے کے لئے کچھ نہیں کریں گے اور نہ کر سکتے ہیں۔" اس نے حتمی لہجے میں جواب دیا تو ایک لمحہ کو اسے یوں لگا جیسے یہ ساجد اس کا حوصلہ ختم کر رہا ہے۔ کہیں یہ مٹھن خان کو محفوظ راستہ تو نہیں دینا چاہتا۔ یہ سوچتے ہی اس کا دل اُوب گیا۔ وہ کافی دیر تک خاموش بیٹھی رہی پھر اٹھ کر واپس چل دی۔ اسے یہاں بیٹھنا بہت بھاری لگ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔
وہ خود کو سنبھالا دینا چاہ رہی تھی۔ شعوری طور پر وہ یادوں کے اسی راستے پر ہولی تھی، جو اس کے اپنے گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ اس کی بے چینی اسے سکون نہیں لینے دے رہی تھی۔ وہ کئی بار اس راستے سے گذری تھی، جہاں سے اس کے گاؤں کو سڑک جاتی تھی۔ وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ وہی دکانیں، وہی لوگ، ویسے ہی بس یا وین کی انتظار میں کھڑے لوگ، سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہ خود تو بدل گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی قسمت پر لکیر پھیر لی ہوئی تھی لیکن جس کے لئے یہ سب کیا تھا، وہ مقصد ابھی تک حاصل نہیں کر پائی تھی۔ وہ وہیں کھڑی تھی جہاں سے چلی تھی۔ اسی سوچ نے اس کے اندر دکھ کی لہریں پھیلا دیں، جس کا درد اس نے پورے وجود میں محسوس کیا۔ اس نے ایک طویل سانس لیا اور ان یادوں سے نکلنے کیلئے کوشش کرنے لگی۔ اسے لگا جیسے وہ مایوسی کی انتہا پر پہنچ چکی ہے۔
جب اس نے اپنی زندگی کے بارے میں سوچا تو اُسے پرانا وقت یاد آنے لگا۔ وہ اس جگہ پر رک گئی جہاں ایک چلتی ہوئی وین سے اس نے چھلانگ لگا دی تھی۔ یادیں یوں در آنے لگیں جیسے اس کے سامنے ایک فلم چل پڑی ہو۔ ذہن میں پرانی یادیں گردش کر رہی تھیں۔ ایسے میں اس کی یادوں سے اس خاتون کانسٹیبل نے جھانکا، جس نے اس کی مدد کی تھی۔ وہ نجانے اب کہاں ہوگی؟ اس کیساتھ ہی ایک مزید چہرہ ابھرا، درمیانے قد کا ادھیڑ عمر شخص، وہ اس کے لئے فرشتہ رحمت ثابت ہوا تھا۔ اگر وہ اس وقت اس کی مدد نہ کرتا تو نجانے وہ اب کہاں ہوتی؟ جس وقت وہ پولیس کی نوکری کر رہی تھی، تب اس نے اس محسن کے بارے میں معلومات لی تھیں۔ اس کا نام سید قدرت اللہ شاہ تھا۔ اس علاقے کے بڑے زمینداروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ لیکن اس میں ایسی کوئی خو بو نہیں تھی جو ان زمینداروں میں ہوتی ہے۔ وہ نہ تو علاقائی سیاست میں حصہ لیتا تھا اور نہ ہی اسے سامنے آنے کا شوق تھا۔ اب پتہ نہیں اس خاتون کانسٹیبل کا اس سے کیا تعلق تھا کہ وہ فوراً ہی اس کی مدد کو آن پہنچا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ لیکن ملی اس لئے نہیں کہ وہ انہیں کیا بتائے گی۔ وہ اسی انتظار میں تھی کہ کبھی آمنا سامنا ہوا تو ان کا شکریہ ادا کر دے گی۔ ان کے پاس جانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ اسے ندامت ہونے لگی، اس نے ٹھان لی کہ وہ اپنے اس محسن سے ایک بار ضرور ملے گی۔ انہی سوچوں میں گھری وہ بیڈ پر پڑی رہی۔
سہ پہر ہو چلی تھی۔ اسے کمرے کا ماحول بھی اچھا نہیں لگنے لگا تھا۔ وہ باہر نکل کر ٹیرس پر آ گئی۔ سارے منظر پھیکے ہو گئے تھے۔ وہ مایوسی کی انتہا پر تھی۔ اس کا دل چاہا کہ یہاں سے نکل جائے۔ اس نے سوچا کیوں نہ وہ اپنے محسن ہی سے ملنے چلی جائے۔ وہ زیادہ دیر ٹیرس میں نہ رک سکی۔ وہ نیچے لاؤنج میں آ گئی۔
☆......☆......☆
ابھی رات کا پہلا پہر بھی نہیں گذرا تھا۔ وہ مضطرب سی لان میں پڑے ایک بینچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ یہ بات سوچ چکی تھی کہ آر یا پار، اسے جی کر تو کچھ نہیں کرنا، لیکن مٹھن خان کو مارے بغیر اس کی روح بے چین رہے گی۔ جس طرح کوئی فدائی حملہ کرتا ہے، اسے بھی ایسا ہی حملہ کرنا ہوگا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ایک بار مٹھن خان کے گھر میں گھس جائے۔ اپنی جان کی پروا کئے بغیر جو راستے میں آتا ہے اسے مار دے۔ یہ اس کی آخری کوشش ہوگی۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اس کا سیل فون ہلکی سی آواز کے ساتھ بجنے لگا۔ وہ ساجد کا فون تھا
"کہاں ہو؟" ساجد نے تیزی سے پوچھا
"لان میں بیٹھی ہوں، خیر ہے؟" اس بتاتے ہوئے

سوال کر دیا تو اس نے کہا

"یہاں آؤ، ہم نے کہیں جانا ہے۔"

"آ رہی ہوں۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

وہ لاؤنج میں آئی تو وہاں ساجد نہیں تھا، اسے احساس ہوا کہ وہ باہر پورچ میں ہے۔ وہ اس تک گئی تو ساجد اسے دیکھتے ہوئے بولا

"آؤ چلیں۔" یہ کہہ کر وہ کار کی جانب بڑھ گیا، نینا کوئی سوال کیے بنا پسنجر سیٹ پر آن بیٹھی۔ ساجد نے کار بڑھا دی۔ کافی دیر تک خاموشی سے ڈرائیونگ کرتے رہنے کے بعد ساجد نے اس سے پوچھا۔

"پوچھو گی نہیں کہاں جانا ہے؟"

"نہیں، اگر تم بہتر سمجھتے ہو تو بتا دو گے، ورنہ منزل پر جا کر پتہ تو چل ہی جانا ہے۔" اس نے ایک زخمی سی مسکان کے ساتھ کہا۔ اس کا انداز یوں تھا جیسے وہ ناراض ہو۔

"ہم اس وقت بی بی صاحب سے ملنے جا رہے ہیں۔" اس نے دھیرے سے کہا تو نینا بری طرح چونک گئی۔ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا

"تم انہیں کیسے جانتے ہو اور....."

"تمہارے سارے سوالوں کا جواب، ان کے پاس جا کر مل جائے گا۔" ساجد نے کہا اور ونڈ اسکرین کے پار سامنے سڑک پر دیکھنے لگا۔ نینا بے چین ہو گئی تھی۔

ان کے سفر کا اختتام شہر کے پوش علاقے میں ہوا۔ وہاں چار کنال سے کم کوئی بھی بنگلہ نہیں تھا۔ نینا کئی بار یہاں سے گذر چکی تھی۔ ساجد نے ایک بڑے سے گیٹ والے بنگلے کے سامنے کار روک دی۔ ہارن دینے پر گیٹ کھل گیا۔ وہ کار سمیت پورچ میں جا پہنچا۔

جیسے ہی کار رکی، چند لوگ فوراً ہی وہاں پر آ گئے۔ کوئی کار کے آگے ہو گیا، کوئی پیچھے کھڑا تھا، ایک نے دروازہ کھولا۔ نینا سمجھ رہی تھی کہ یہ پروٹوکول کیوں ہے؟ یہ ان کی عزت افزائی نہیں، بلکہ یہ ایک طرح سے انہیں چیک کرنا تھا۔ ساجد اور نینا کو وہ اپنے گھیرے میں لے کر داخلی دروازے سے اندر لے گئے۔ لاؤنج پار کرنے کے بعد بھی ایک جگہ رک گئے۔ سامنے دو لڑکیاں کھڑی تھیں، ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر نینا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا

"جائیں، بی بی صاحب، آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

نینا نے قدم بڑھائے تو وہ دونوں لڑکیاں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔

سامنے لان میں ملگجا اندھیرا تھا۔ اس میں ایک بڑا سارا تخت پوش سا رکھا ہوا تھا۔ جس پر ایک اُدھیڑ عمر خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا لباس سفید تھا۔ بڑا سا سفید آنچل اس نے اُوڑھا ہوا تھا۔ اس کا چہرا ملگجے اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر جا کر نینا نے دیکھا کہ بی بی صاحب کے چہرے کے نقوش تیکھے تھے۔ گول چہرے پر بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اس پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ بالکل قریب گئی تو بی بی صاحب نے اسے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھنے کا ہاتھ سے اشارہ کیا۔ نینا اس کرسی پر جا بیٹھی تو بی بی صاحب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسی نرم سے لہجے میں کہا

"نینا۔! مجھے احساس ہے کہ تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتی ہو لیکن میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ تم بہت بڑی بھول میں پڑ چکی ہو۔ جس کا تمہیں نقصان ہو سکتا ہے۔"

"بی بی صاحب۔! یہ جو حالات میرے سامنے ہیں، میں اگر ان پر سوچوں تو نتیجہ کیا ہو گا؟" وہ اطمینان سے بولی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو لیکن تمہارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ تم ہوش سے نہیں، جوش سے کام لیتی ہو۔ یہ تمہارا قصور نہیں ہے، یہ عورت کی فطرت ہے کہ وہ آدھی بات پر ہی اپنا فیصلہ صادر کر دیتی ہے۔ کیا تم نے یہ تحقیق کی کہ میں نے مومی کو مٹھن خان کے حوالے کیوں کیا؟" وہ نرم لہجے میں بولیں۔

"میں کیسے جان سکتی ہوں؟" نینا نے کہا۔

"حالات کو صرف ایک ہی رُخ سے نہیں دیکھا جاتا، اس کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ جنہیں دیکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ جیسے کہ تمہارے معاملے میں ہے۔ خیر، میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ لیکن اس سے پہلے میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہوں گی۔ اس سے یہ مت سمجھنا کہ میں کوئی احسان جتا رہی ہوں۔ کیونکہ میری باتیں کچھ سوال پیدا کریں گی۔ تمہیں پورا حق حاصل ہوگا کہ تم ان کا جواب چاہو۔"

"جی میں پوری توجہ سے سنوں گی۔" نینا نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا، جس کے سامنے اس کا اپنا حسن ماند پڑ گیا تھا۔

"مجھے تمہارے بارے میں سب سے پہلے اس وقت پتہ چلا، جب میڈم کیمرا اور کی بیٹی سائرہ قتل ہو گئیں۔ مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔ میڈم میری بیٹی کی ٹیچر رہی تھیں اور بہت اچھی خاتون تھیں۔ کاش وہ مجھ سے رابطہ کر لیتی۔ مگر ہونی ہو کر رہتی ہے۔ مٹھن خان کے ظلم بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ شاید وہ اتنا ظلم نہ کرتا، جتنا اس کا بیٹا فرحان خان کرتا چلا جا رہا تھا۔ ان دنوں مجھے کوئی ایسا بندہ نہیں مل رہا تھا جو مٹھن خان کے ظلم کا شکار ہو چکا ہو اور اندر سے اس کے ظلم کے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔ کوئی نہیں تھا۔ ایسے میں تم سامنے آئی تو میں نے تمہاری مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تم نے میری سوچ سے بھی بڑھ وہ کچھ جو عام بندہ نہیں کر سکتا تھا۔ قدم قدم پر تمہاری مدد ہوتی رہی۔ دو خفیہ والے تمہارے بارے میں جانتے ہوئے بھی تمہیں نظر انداز کر کے چلے گئے۔ مٹھن خان نے تمہیں تلاش کرنے کے جو حربے استعمال کئے، ان کے بارے میں تم بھی نہیں جانتی ہو لیکن ایک وقت پر آ کر میں بھی سازش کا شکار ہو گئی۔"

"سازش، آپ کے ساتھ؟" نینا نے بے ساختہ پوچھا

"ہاں سازش، کسی جرات مند دشمن کا مقابلہ کرنا، اس کے ساتھ جیت یا ہار جانے کا فیصلہ ہو جاتا ہے لیکن کسی منافق کے ساتھ کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ کسی بھی مخلص بندے کو جب بھی نقصان ہوا ہے منافقین سے ہوا ہے، طاقت ور دشمن بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ پایا۔" نرم لہجے میں دکھ کی ہلکی سی رمق گھل گئی تھی۔

"کون ہے وہ منافق؟" نینا نے پوچھا

"بتاتی ہوں۔" انہوں نے یوں کہا جیسے خود پر قابو پا رہی ہو۔ پھر بولیں، "میڈم فاخرہ۔"

"وہ۔! وہ تو آپ کی......" نینا نے حیرت سے کہنا چاہا تو بی بی صاحب نے یوں انتہائی نرم لہجے میں کہا جیسے وہ خود پر قابو پا چکی ہوں۔

"وہ جو بھی تھی، لیکن اب منافق ہے۔ میں نے ہمیشہ اصول پسند دشمن کو معاف کرنا سیکھا ہے لیکن منافق کو نہیں۔"

"یہ کیا ہوا، مجھے کچھ بتائیں گی آپ؟"

"میں نے بتانے ہی کے لئے تمہیں یہاں بلایا ہے۔" یہ کہہ کر وہ چند ثانیے خاموش رہیں، پھر کہتی ہی چلی گئیں، "تمہاری سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ تم مومی کو لے کر عورت منزل چلی گئی۔ خیر تمہیں بھی پتہ نہیں تھا، تم نے تو وہ محفوظ جگہ بھی تھی لیکن فاخرہ کو پتہ چل گیا کہ تم مومی کو لے کر عورت منزل میں ہو۔ فاخرہ نے اسی وقت مٹھن خان سے رابطہ کر لیا۔ اور پتہ ہے کیا کہا؟"

"جی۔" نینا نے سرسراتے لہجے میں کہا

"کہنے لگی وہ ایم این اے شپ سے استعفیٰ دے کر یہاں سے چلا جائے تو میں مومی اس کے حوالے کر دوں گی۔ اگر چاہو تو نینا بھی اس کے حوالے کی جا سکتی ہے اور مٹھن خان مان گیا۔ اب اسے درمیان میں ایک ضمانتی چاہئے تھا۔ اسی لئے اس نے مجھ سے رابطہ کیا۔ اس میں اس کے دو فائدے تھے۔ وہ براہ راست میری مخالفت نہیں لینا چاہتی تھی۔ دوسرا مومی کی زندگی کی ضمانت چاہتی تھی۔ اس نے کہا نینا بے وقوف ہے، مومی کو لئے پھرتی ہے، اسے استعمال کرتے ہوئے مٹھن خان سے بہت بڑی ڈیل کر سکتی ہے، وہ نہیں کر رہی تو میری ڈیل کروا دو۔" وہ بات نرم لہجے ہی میں کرتے ہوئے بولیں

"آپ کی کیا مجبوری بن گئی تھی؟" نینا کے لبوں پر سوال آ ہی گیا تو بولیں

"تمہاری زندگی، تمہارا اچھا رویہ، تم نے مومی کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ تجھے مٹھن خان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس کا مفاد صرف اتنا تھا مٹھن خان استعفیٰ دے دے اور یہاں سے چلا جائے۔ اس کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ مجھے ناچار تمہیں کہنا پڑا۔" اس بار نرم لہجے میں بے چارگی گھلی ہوئی تھی۔

"مطلب میں نہیں، فاخرہ نے اس کا فائدہ اٹھا لیا۔" نینا نے سوچتے ہوئے کہا

"نینا، تم نہیں جانتی ہو، یہ لوگ کہیں نا کہیں اپنا مفاد مشترک رکھتے ہیں۔ فاخرہ کا داؤ چل گیا۔ حالانکہ کوئی وقت تھا دونوں میں زوروں کا عشق چلا تھا۔ شادی نہیں ہو پائی۔ پھر ایک دوسرے کی مخالفت کرنے لگے۔"

"مٹھن خان اور فاخرہ؟" نینا نے تجسس سے پوچھا

"جی ہاں دونوں، یونیورسٹی کے دنوں میں، خیر ہمارا ان کے تعلقات سے کیا لینا دینا، ہمیں اس وقت سے مطلب ہے جو آج ہماری دسترس سے نکلا جا رہا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم مایوس ہو چکی ہو۔"

"آپ کیسے جانتی ہیں؟" نینا نے تلخ مسکراہٹ سے پوچھا تو نرم لہجے ہی میں بولی

"مجھے معلوم ہے کہ شعیب کے چلے جانے کے بعد تم تنہا ہو گئی ہو، میں نے ہی اس کے دوست ساجد کو مجبور کیا کہ وہ تمہارا ساتھ دے۔ وہ تمہارے ساتھ ہے۔"

"مجھے کیا کرنا ہے؟" نینا نے سوچتے ہوئے پوچھا

"دیکھو، میرا کچھ نہیں گیا، سوائے فاخرہ کے، اب میرا اس کا تعلق نہیں رہا۔ کوئی بات نہیں ہوتا رہتا ہے ایسا۔ مجھے اب کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے تمہاری فکر ہے۔ اگر تم انتقام لینا چاہتی ہو تو تمہارے پاس ایک یا دو دن ہیں، مٹھن خان نے چلے جانا ہے۔ اگلی ایم این اے فاخرہ ہوگی۔ میں مدد دوں گی اور اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ اب تم کچھ نہیں کر سکتی ہو تو یہاں رہو، نورا کے پاس کراچی چلی جاؤ، یا جہاں بھی زندگی گزارنا چاہو۔ میں تجھے تحفظ دے سکتی ہوں۔ فیصلہ تمہارا ہے۔"

"میں نے انتقام لینا ہے۔ آپ یہ سمجھتی ہیں کہ یہی میری زندگی کا واحد مقصد ہے۔" نینا نے پرعزم لہجے میں کہا تو بی بی صاحب نے بڑے سکون سے کہا

"ٹھیک ہے۔ مناسب وقت کا انتظار کرو۔ محض ایک یا دو دن، میں تمہارا بھرپور ساتھ دوں گی، اب تم چاہو تو جا سکتی ہو۔" بی بی صاحب نے اسی نرم لہجے میں کہا اور پہلو بدل لیا۔ ایک لمحہ نہیں گزرا وہ دونوں لڑکیاں یوں نمودار ہوئیں، جیسے اُگ آئی ہوں۔ نینا سمجھ گئی کہ ہو اب مزید نہیں بیٹھ سکتی۔ وہ اٹھ گئی اور کوئی لفظ کہے بنا واپسی کے لئے چل دی۔

☆......☆......☆

روشن صبح نے سارے منظر واضح کر دیئے ہوئے تھے۔ وہ بہت دنوں بعد سکون سے سو سکی تھی۔ اگرچہ وہ رات گئے تک بی بی صاحب کی باتوں پر سوچتی رہی تھی، اب اس کا صرف ایک ہی کام ہے مٹھن خان کو ختم کرنا، جس میں بی بی صاحب نے مدد کا وعدہ کر لیا ہے، بالکل اس طرح جیسے وہ پہلے مدد کرتی چلی آرہی ہے۔ لیکن اسے صرف ایک ہی بات سمجھ میں آئی تھی اور وہ یہ تھی کہ اب اسے جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا ہے۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ اب اس نے کیا کرنا ہے۔ فریش ہو کر ناشتہ کر لینے کے بعد اسے سکون کرنا چاہئے تھا لیکن اب وہ سکون سے نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اس نے اپنی کار لی اور نکل پڑی۔

ایک مصروف مارکیٹ میں اس نے اپنی کار پارکنگ میں لگائی اور مارکیٹ میں گھس گئی۔ یہاں اسے ایک آدمی سے ملنا تھا۔ وہ اس کے لئے ایک بڑی رقم لئے منتظر تھا جو صاحبزادہ عبدالکریم نے بھیجی تھی۔ اس نے کچھ دیر پہلے فون کر کے وہ رقم منگوائی تھی۔ کچھ دیر تک وہاں گھومتے رہنے کے بعد وہ وہاں تک جا پہنچی جہاں اس آدمی نے ملنا تھا۔ اس کے پاس ایک پیکٹ تھا۔ وہ اس نے لیا اور مارکیٹ سے نکلی اور ایک رکشے میں جا بیٹھی۔ اس کا رخ عطا ٹوانہ کی حویلی کی طرف تھا۔ اس نے رکشہ حویلی سے کئی گلیاں پیچھے رکوایا اور پیدل ہی حویلی جا پہنچی۔

عطا ٹوانہ برآمدے ہی میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک لمحہ کو حیران ہوا پھر قریب بیٹھے ایک بندے کو اٹھ کر چلے جانے کا اشارہ کیا تو وہ اس کے پاس جا بیٹھی۔

"یہ اچانک کہاں غائب ہو گئی تھی پتری، میں تو پریشان ہو گیا تھا۔"

"گیم بدل گیا، جو پلان میں نے دیا تھا اب وہ نہیں رہا۔" نینا نے کہا تو ٹوانہ بولا

"مطلب اب کام ختم ہو گیا؟"

"کام تو ہے، لیکن اب اس کی نوعیت بدل گئی ہے۔ اور دوسری بات، پہلے میں نے رقم کام ختم ہونے کے بعد دینا تھی لیکن اب پہلے دے رہی ہوں اور......"

"ایسا کیوں پتری، کیا ہو گیا ہے؟" عطا ٹوانہ نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا

"بات یہ ہے کہ جو کام اب میں کرنے جا رہی ہوں، ممکن ہے میں اس میں ماری جاؤں، میں مر گئی تو پھر رقم کون دے گا؟ اس لئے میں......" اس نے کہنا چاہا لیکن ٹوانہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"ایسی بات نہ کر، اگر لکھی اتنی ہے تو اسے کوئی بڑھا نہیں سکتا لیکن کم از کم میں تمہیں مرنے نہیں دوں

گا۔ تمہیں جو چاہئے، مجھے بتا، میں رقم نہیں لوں گا، اسے اپنے پاس رکھو۔"

"اب بات لڑائی کی تو رہی ہی نہیں ہے۔ مجھے منافقین سے واسطہ پڑ گیا ہے۔ مجھے ان کے اندر کی خبریں چاہئیں۔" نینا نے صاف انداز میں کہا

"ارے یہی تو ہمارے بزنس کی کامیابی ہے، جتنا بڑا بندہ ہوتا ہے، اتنے ہی لوگ اس کے اردگرد چھوڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہم چند دن بھی نہ نکال سکیں۔ ہم تو اندھے ہو جائیں۔ ہمیں پتہ بھی نہ چلے اور ہم ہوا میں خاک کی طرح اُڑ جائیں۔ یہ الگ بات ہے جب تک ہمیں کوئی کچھ نہیں کہتا، ہم بھی کچھ نہیں کرتے، ضرورت کیا ہے۔ تم پلان بولو، کارروائی سب ہو جائے گی۔" عطا ٹوانہ نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں بتاتی ہوں لیکن یہ رقم رکھیں، اب میں اسے کہاں اٹھائے پھروں گی۔" یہ کہہ کر اس نے وہ پیکٹ عطا ٹوانہ کے سامنے رکھ دیا، جسے اس نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ نینا نے دھیرے دھیرے ساری بات اسے سمجھا دی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ ساری بات سن کر عطا ٹوانہ نے کہا

"یہ معمولی کام ہیں، تیرے لئے اس لئے مشکل ہیں کہ تیرے سورس نہیں۔ شام تک سب پتہ چل جائے گا۔ تم فکر نہیں کرو۔ میں تمہیں نیا فون دیتا ہوں تب تک جوس ہی پی لو۔" عطا ٹوانہ نے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ جانے لگی تو وہ مزید بہت ساری باتیں کر چکی تھی۔

"اچھا اب میں چلتی ہوں۔" نینا نے اٹھتے ہوئے کہا

"جاؤ لیکن یہ یاد رکھ، یہ رقم تمہاری میرے پاس امانت ہے بعد میں دیکھ لیں گے۔" اس نے کہا تو نینا باہر کی جانب چل دی۔ جو کچھ اس نے سوچا تھا اگر ویسا ہو جاتا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتی تھی۔

دوپہر ہونے تک وہ واپس بنگلے میں آ چکی تھی۔ لاؤنج میں ساجد بیٹھا ہوا تھا۔

"کہاں تھی، میں کافی دیر سے آیا بیٹھا ہوں۔"

وہ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی

"مجھے ایک فون چاہئے تھا۔ وہ لائی ہوں مارکیٹ سے، کوئی مجھ سے رابطہ ہی نہیں کر سکتا ہے۔"

"ہاں تمہارے پاس وہ فون ہے، جس سے صرف تم ہی کال کر سکتی ہو۔ مجھے کہتی میں لا دیتا۔"

"میرا دل کر رہا تھا باہر نکلنے کو۔ خیر یہ تم میرا نمبر لے لو، رابطے کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"ہاں دو مجھے۔" ساجد نے کہا اور پھر نمبر لے کر بولا

"اب اگر موڈ ہے تو چلیں آج لنچ باہر کریں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا

"اب ہو آئی ہوں، اب دل نہیں دل کر رہا باہر جانے کو۔" اس نے صوفے پر پھیلتے ہوئے کہا

"ٹھیک ہے، آرام کرو، میں بھی ساری رات کا جاگا ہوا ہوں، میں تھوڑی دیر سونا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا اور اٹھ کر اندر کی جانب چلا گیا، نینا اوپر منزل کی جانب بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

جس طرح شام کے سائے پھیلتے چلے جا رہے تھے۔ نینا کے اندر بے چینی اسی قدر بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اسے عطا ٹوانہ کے فون کا انتظار تھا لیکن اس کی طرف سے ابھی تک کوئی کال یا پیغام بھی نہیں ملا تھا۔ وہ مضطرب سی کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اس کی بے چینی لحہ بہ لحہ بڑھنے لگی تھی۔ اس وقت اندھیرا چھانے لگا تھا جب اس کا فون بجا۔

"بھئی معذرت کہ تمہیں فون کرنے میں دیر ہو گئی۔ میں ایک خبر کی تصدیق کر رہا تھا۔" عطا ٹوانہ نے خوش کن لہجے میں کہا تو نینا نے بے صبری سے پوچھا۔

"پر جو میں نے......"

"اس سے بھی بڑی بات ہے۔ خیر پہلے یہ سن لو کہ تم نے جو شک ظاہر کیا تھا، وہ بالکل ٹھیک ہے۔ دو دن بعد فلائیٹ ہے، ٹکٹ تک کنفرم ہو گئی ہے۔ وہ صرف آج کی رات یہاں ہے، اس کے بعد نہیں ہوگا۔"

"اوہ۔! یہ تو پھر......"

"نہیں اس سے بھی آگے کی بات ہے۔ تم جہاں بھی ہو، وہاں سے نکلو، دس منٹ اسی نمبر پر کال کرنا، سب طے ہو جائے گا۔" عطا ٹوانہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔

اگلے پانچ منٹ میں وہ پورچ میں تھی۔ اُسے ڈر یہی تھا کہ ساجد سے کہیں آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ وہ تیزی سے کار میں بیٹھی اور گیٹ پار کرتی چلی گئی۔ بڑی شاہراہ تک جاتے ہوئے اس نے یہ اندازہ لگا لیا کہ کوئی اس کے پیچھے

نہیں آرہا ہے۔ دس منٹ سے بھی اوپر وقت ہو گیا تھا۔ اس نے کال ملائی تو دوسری طرف سے ایک لڑکی کی منمناتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ اپنی گاڑی کہیں پارک کردو، اور اپنی لوکیشن بتاؤ۔"

نینا نے اپنی کار روک دی اور پھر اردگرد دیکھ کر اسے اپنے بارے میں بتادیا، اس نے وہیں فٹ پاتھ پر رکنے کو کہا اور فون بند کردیا۔

دو منٹ سے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا، ایک چھوٹی کار اس کے پاس آن ٹھہری۔ جیسے ہی نینا نے اس میں جھانکا، وہ حیران رہ گئی۔ اس میں زوبی بیٹھی ہوئی تھی، وہی زوبی جس نے عطا ٹوانہ کی حویلی میں اسے جوس پیش کیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی تو وہ مسکراتے ہوئے بولی

"اس دنیا میں رہ کر روپ دھارنا ہی پڑتا ہے۔ ورنہ یہ دنیا جینے نہیں دیتی۔"

"ہاں، کوئی روپ دھارتا ہے اور کوئی چھپ کر رہتا ہے، بولو کیا خبر ہے۔" نینا نے بے صبری سے پوچھا

"وہ بندہ جو پچھلے کچھ عرصے سے باہر نہیں نکل رہا تھا۔ آج وہ کسی سے ملنے جارہا ہے۔ اس کی یہ ملاقات، اس شہر میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"کہاں، تمہارا مطلب مٹھن خان ہی سے ہے نا؟" نینا نے تصدیق کے لئے پوچھا

"اسی کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔" زوبی نے سکون سے کہا

"کہاں ہوگی ملاقات اور کس سے؟"

"اس نئے ایم این اے کے ڈیرے پر جو مٹھن خان کے بعد بنے گا، تیسرا وہی ہوگا۔ ملاقات ایک خاتون سے ہے۔"

"خاتون، کون خاتون؟" نینا نے پوچھا

"یہ تو مجھے بھی نہیں پتہ لیکن وہاں تک کے سارے معاملات ٹھیک ہوگئے ہیں۔ کیسے ہوئے ہیں یہ بعد میں پتہ چلے گا، فی الحال تم میرے ساتھ جارہی ہو، آگے سب کچھ تمہیں ہی کرنا ہے۔" زوبی نے یوں کہا جیسے اسے اطلاع دے رہی ہو۔ نینا یہ سب سن کر خاموش ہوگئی۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کی بات کا یقین کرے یا پھر نہ کرے۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ ساجد کی فون کال آ گئی۔ اس نے پہلے تو سوچا کہ نہ ہی سنے پھر کال ریسیو کرلی۔

"کہاں ہو تم؟" اس نے پوچھا

"یونہی آوارہ گردی، ایک سہیلی کی طرف آئی تھی، اس کے ساتھ ڈنر کے لئے جارہی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ذرا سانس لیا پھر پوچھا۔ "کیوں خیر ہے جو یوں پوچھ رہے ہو۔" اس نے جھوٹ بول دیا تو ساجد نے کہا

"کچھ نہیں، وہ بی بی صاحب تمہارا پوچھ رہی تھیں۔"

"کیا کہتی ہیں۔" اس نے پوچھا

"وہ کوئی اہم بات کرنا چاہ رہی تھیں، تم کال کرلو انہیں۔"

"ٹھیک ہے میں کرتی ہوں انہیں کال۔" نینا نے کہا اور ساجد کی کال بند کردی۔ پھر چند لمحے سوچ کر اس نے بی بی صاحب کو کال ملادی۔ چند تمہیدی باتوں کے بعد اس نے کہا

"سنو۔! مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ آج رات فاخرہ اور مٹھن خان کی ملاقات ہے۔ یہ ملاقات کہاں پر ہے، یہ میں تمہیں کچھ دیر میں بتاتی ہوں، اگر تم رسک لے سکتی ہو تو تیار رہنا، تمہاری مدد کے لئے میں کچھ لوگ بنگلے پر بھیج رہی ہوں۔"

"کہاں ہے بس مجھے بتادیں۔" نینا نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا

"وہ ہی جگہیں ہوسکتی ہیں، فاخرہ کے گھر یا پھر مٹھن خان کی کسی جگہ پر۔ جیسے ہی دونوں ملے میں اطلاع کرتی ہوں۔" بی بی صاحب نے کہا اور فون بند کردیا۔

نینا اس فون کال کے بعد منتشر ہوگئی۔ خبر ایک ہی تھی لیکن اس میں تھوڑا سا اختلاف تھا۔ اب وہ کس کی مانے؟ اگلے ہی لمحے اس نے زوبی کی بات ماننے کا فیصلہ کرلیا۔

وہ اس چھوٹی سی کار میں شہر سے باہر آگئیں۔ جیسے ہی وہ ایک ڈھابے نما ہوٹل کے پاس سے گزریں۔ ان کے ساتھ ایک فور وہیل گاڑی لگ گئی۔ ذرا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ فور وہیل رُک گئی۔

"آؤ نکلو۔" زوبی نے کار روکتے ہوئے کہا۔ وہ بھی اتر کر زوبی کے پیچھے چل دی جو فور وہیل میں جا کر بیٹھ گئی۔ نینا کے بیٹھتے ہی فور وہیل چل پڑی۔ ڈرائیور کے ساتھ پسنجر

سیٹ پر ایک جوان بیٹھا ہوا تھا۔ ذرا سا سفر کرنے کے بعد وہ پلٹا، اس نے ایک کاغذ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا
''یہ اس ڈیرے کا نقشہ ہے، جہاں ہم نے جانا ہے۔ کیسے جانا ہے، اور کیسے وہاں سے نکلنا ہے، یہ سب سرخ لکیر سے واضح ہے۔ اس کی دوسری طرف ڈیرے کا اندرونی نقشہ ہے۔ اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔''
وہ نقشہ ہاتھ سے بنا ہوا تھا۔ دونوں نے سیل فون کی روشنی میں اسے دیکھا اور ذہن نشین کر لیا۔ زوبی نے وہ کاغذ واپس کرتے ہوئے پوچھا
''پلان کیا ہے؟''
''ڈیرے کے چاروں طرف ہمارے لوگ ہوں گے۔ ہم نے ان لوگوں سے پہلے پہنچنا ہے۔ وہاں ان کی بھی سیکورٹی ہوگی، انہیں سنبھالنا ہمارا کام ہوگا۔ تم دونوں کا صرف ایک ہی کام ہے کہ اندر داخل ہو کر اس جگہ تک رسائی لینا ہے جہاں ان کی ملاقات ہوگی۔ مطلب اس جگہ تک پہنچ کر نشانہ ہی کرنی ہے۔ نہیں یاد تو دوبارہ نقشہ دیکھ لو۔'' اس جوان نے تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا
''اندر داخل ہونا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر پہلے ہی کوئی مسئلہ ہو گیا تو؟'' نینا نے کہا
''کیسا مسئلہ.....؟'' نوجوان نے پوچھا
''راستے میں آنے والا کوئی بھی ختم ہو سکتا ہے۔'' نینا نے کہا تو اس جوان نے کہا
''ٹائمنگ، ہمارے درمیان سب طے ہوگا، اس سے زیادہ وقت نہیں لگانا۔ ان کے اور ہمارے اندر جانے میں بہت تھوڑا فرق ہوگا۔ ابھی ایک جگہ رکتے ہیں، وہاں ساری تفصیل بتا دوں گا اور کچھ جدید آلات بھی تاکہ ہم سب کا آپس میں رابطہ رہے۔''
''ٹھیک ہے۔'' نینا نے کہا اور خاموش ہو گئی۔
وہ ایک پرانا سا گیراج تھا۔ جو کسی پرانی بند فیکٹری کے اندر موجود تھا۔ وہاں ایک فور وہیل مزید کھڑی تھی۔ یہ چاروں اُتر کر اس گیراج میں چلے گئے۔ اندر دھیمی روشنی کا چھوٹا سا بلب روشن تھا۔ ایک لمبا سا میز درمیان میں رکھا ہو تھا۔ اس پر لیپ ٹاپ پڑا تھا۔ جس کے اردگرد تین لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ اُن کے چہرے اتنے واضح نہیں تھے۔ وہ بھی ان کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے درمیان کسی بھی قسم کی کوئی ہیلو ہائے نہیں ہوئی۔ ان کے آتے ہی لیپ ٹاپ کی اسکرین ان کی جانب کر دی گئی۔ انہیں میں سے کسی نے کہنا شروع کیا۔
''یہ ڈیرے کے باہر کا شارٹ ہے۔'' اس نے کہا تو لیپ ٹاپ پر فلم متحرک ہو گئی۔ چاروں طرف سے دکھانے کے بعد ایک جگہ روک دی گئی۔ ''یہ جگہ ہے جہاں سے اندر جانا ہے۔ لڑکیاں فوراً ہی کود جائیں گی۔ لیکن کودنے سے پہلے زہریلے گوشت کے دو پیکٹ اندر پھینکے جائیں گے۔ کیونکہ انہیں سب سے پہلے دو کتوں سے واسطہ پڑے گا۔ یہ تسلی کر لینے کے بعد کہ وہ کتے ختم ہو گئے ہیں، وہ آگے بڑھیں گی۔ یہ دیکھیں یہاں سے تقریباً پچیس قدم کے فاصلے پر کچن ہے۔ اس کا ایک دروازہ باہر کی طرف ہے۔ یہیں سے اندر جانا ہے۔ اب یہ کھلا ہوگا یا نہیں، یہ پتہ نہیں ہے۔ لیکن امید ہے کھلا ہوا ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا، پھر ایک نئی شارٹ فلم کے شروع ہوتے ہی وہ بولا، ''یہ اندر کا منظر ہے۔''
وہ سب غور سے دیکھتے رہے۔ جب وہ فلم ختم ہو گئی تو ایک دوسرے جوان نے کہا
''اگر کسی کے پاس سیل فون ہے تو وہ یہیں رکھ دے۔ میرے پاس پانچ بندوں کے لئے ایک فون ہیں جو سب کے ساتھ منسلک ہوں گے اور بھی ایک دوسری کی آواز سن سکیں گے، تاکہ رابطہ رہے۔ سب لوگوں کے پاس صرف تین منٹ ہوں گے۔ یہ وقت اسی وقت شروع ہوگا، جب وہ دونوں اندر آ جائیں گے۔ صرف ایک بات کا خیال رکھنا ہے۔ کام ہو یا نہ ہو، تین منٹ ختم ہوتے ہی باہر آ جانا ہے ورنہ کوئی کسی کا خیال نہ کرتے ہوئے واپس پلٹ جائے گا۔''
''کسی نے کوئی بات پوچھنا ہو؟'' پہلے نے کہا تو زوبی نے پوچھا
''ڈیرے والا بندہ، اسے پتہ ہے؟''
''نہیں، اسے بالکل نہیں پتہ، لیکن وہاں پر دو ملازم ایسے ہیں جو ہمارے بندے ہیں، یہ سب انہوں نے ہی بھیجا ہے۔'' اس نے بتایا
''ٹھیک ہے۔ اب میں بتاتا ہوں ہماری ٹائمنگ کیا ہوگی۔'' یہ کہہ کر اس نے محض ایک منٹ میں سب بتا دیا۔

اس نے آخر میں کہا، "ہتھیار لے لیں، اور باقی سب بھی تیار ہو جائیں۔ سگنل ملتے ہی نکلنا ہے۔" اس جوان نے بات ختم کی تو نینا نے زوبی کو ساتھ لیا اور وہاں سے باہر نکل گئی۔

"کیا بات ہے؟" زوبی نے پوچھا

"مجھے ٹوانہ سے ایک بار بات کرنی ہے۔" نینا نے کہا

"کیا پوچھنا ہے؟ وہ بولی

"ان کے بارے میں بات کرنی ہے۔" نینا نے کہا

"جو بھی پوچھنا ہے، مجھ سے پوچھ لو۔" زوبی نے کہا تو نینا نے پوچھا

"یہ سب دولت کے لئے ہمارے ساتھ جڑے ہیں، کون ہیں؟"

"ہاں، تمہارا ایسا پوچھنا بنتا ہے، خیر، وہ لڑکا جس نے نقشہ دکھایا تھا، اس کے باپ کو مٹھن خان نے مارا ہے۔ اس نے بہت کوشش کی بدلہ لینے کی، مگر اب تک نہیں لے سکا۔ یہ اشتہاری ہے۔ نجانے کیا کچھ کر چکا ہے۔ پچھلے دو سال سے ٹوانہ کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اس کا یہ گینگ ہے، اور جدید ترین آلات استعمال کرتے ہیں۔ خاص طور پر یہ ڈکیتی کے بہت ماہر ہیں۔"

"او کے۔" نینا نے کہا اور زوبی کے ساتھ واپس گیراج میں پلٹ گئی۔ تبھی اس جوان کی نگاہ نینا پر پڑی اس نے آگے بڑھ کر پوچھا

"کوئی خاص بات؟"

"نہیں، ایک بات کنفرم کی تھی۔" نینا نے کہا

"میں جانتا ہوں، ہمارے درمیان بہت سارے سوال اٹھ سکتے ہیں لیکن جس کسی کا کوئی مقصد ہو، ان باتوں پر بعد میں ڈسکس ہو جائے گی۔ سب سن لیں میرا کوڈ ہوگا، لیڈر ڈن؟" اس نے نینا کی طرف دیکھ کر پوچھا تو نینا نے سر ہلاتے ہوئے کہا

"ڈن۔"

"ہتھیار لے لیں۔" یہ کہہ کر وہ مڑ گیا۔

نینا ہتھیار لیتے ہوئے من ہی من میں دعا کر رہی تھی کہ بی بی صاحب اسے یہاں سے نکلنے سے پہلے ہی بتا دے کہ مٹھن خان کی ملاقات کہاں ہونے والی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ وہاں ڈیرے پر پہنچ جائیں اور ان کی ملاقات کہیں دوسری جگہ پر ہو۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ نوجوان نے چلنے کے لئے کہا۔ نینا نے اپنا فون بند کیا، اس میں سے سم نکالی اور فون اس کی جانب بڑھا دیا۔ ایسا ہی زوبی نے کیا۔ سب نے اپنے فون وہیں رکھ دیئے۔ اگلے چند منٹ میں وہ گیراج سے نکل کر گاڑیوں میں بیٹھ چکے تھے۔

☆......☆......☆

نینا اور زوبی ڈیرے کی پشت اور دائیں جانب والے کونے تک جا پہنچی تھیں۔ وہ دونوں طرف موجود جوانوں کو دیکھ رہی تھیں جو وہاں تک آ گئے تھے۔ تبھی نینا نے آہستگی سے کہا

"ہم پہنچ گئی ہیں۔"

اس کے یوں اطلاع دیتے ہی زوبی نے تیزی سے پیکٹ کھولا اور اندر پھینک دیا۔ اس کے بعد دوسرا پیکٹ بھی اندر اچھال دیا۔ وہ وہیں کھڑی انتظار کرنے لگیں۔ کچھ دیر بعد ایک جوان کی آواز ان کے کانوں میں گونجی

"وہ لوگ گیٹ پر آ گئے ہیں۔"

"سکیورٹی چیک کریں۔" لیڈر کی آواز گونجی

"سب دیکھ لی ہے، قابو کر لیں گے۔"

"ٹھیک ہے الرٹ ہو جائیں۔ جیسے ہی اندر جائیں۔" لیڈر نے کہا تو آواز آئی

"وہ پورچ میں ہیں۔ اندر جا رہے ہیں۔"

"سٹارٹ۔" لیڈر کی آواز کے ساتھ ہی دونوں نے لمبے پھل والا خنجر نکالا اور اگلے ہی لمحے وہ دیوار پر چڑھ گئیں۔ اندر جھاڑیاں نما پودے تھے جو دور عمارت پر لگے مدقوق بلب کی روشنی میں دکھائی دے رہے تھے۔ انہی جھاڑیوں نما پودوں میں دو کتے یوں لوٹ رہے تھے جیسے اٹھنا تو چاہتے ہوں لیکن اٹھ نہیں پا رہے ہوں۔ وہ انہیں نظر انداز کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئیں۔ جیسے ہی وہ کچن کے پاس پہنچیں۔ ایک آواز گونجی

"وہ اندر کمرے میں نہیں، اوپر چھت پر جا رہے ہیں۔"

"او کے، میں دیکھ لیتی ہوں، ڈونٹ وری۔" نینا نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔ وہ اپنی منزل کے انتہائی قریب آ چکی تھی۔ چند منٹوں کا فاصلہ تھا۔ اس نے اوپر کی طرف دیکھا۔ پائپ نیچے کی جانب آ رہا تھا۔ اس نے زوبی

سے پوچھا
"تم چڑھ سکتی ہو؟"
"بالکل، کیا میں پہلے......"
"بعد میں آنا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے خنجر پہلو میں رکھا اور اوپر چڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ منڈھیر تک چلی گئی۔ اس نے احتیاط سے اپنا سر ذرا سا اوپر کر کے دیکھا۔ کافی دور تین کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ابھی تک ان پر کوئی آ کر بیٹھا ہی نہیں تھا۔ گھومتی ہوئی صحن کی منڈھیر کی وہ آڑ لے سکتی تھی۔ اسے یہ اپنی زندگی کا سب سے سنہرا موقع لگا۔ وہ منڈھیر سے دوسری جانب کود کر لیٹ گئی۔ پھر سرکتے ہوئے آڑ میں چلی گئی۔ تبھی اس نے اپنی پوزیشن کے بارے میں بتا دیا۔ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ تین لوگ وہاں آ گئے۔ ان میں سے ایک تو مٹھن خان تھا، جسے اس نے صرف ایک بار دیکھا تھا، دوسرا شخص ایسا تھا جیسے وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی، جیسے ہی اس کی نگاہ خاتون پر پڑی، اسے دیکھتے ہی نینا کے ہوش اُڑ گئے۔ اسے خود پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اُس طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے سامنے بی بی صاحب بیٹھی ہوئی تھی۔
"نینا کیا ہوا؟ بولو؟" لیڈر کی آواز گونجی تو اسے ہوش آیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی وحشت عروج پر چلی گئی۔
"وہ تینوں میرے سامنے ہیں۔ میں اٹیک کرنے لگی ہوں۔" وہ تیزی سے بولی تو لیڈر نے کہا
"میں منڈھیر پر ہوں، زوبی فائر ہوتے ہی کودنا۔ ڈن۔"
یہ سنتے ہی نینا نے پہلے ایک پسٹل نکالا، پھر دوسرا نکال کر انتہائی سرعت سے کھڑی ہوئی اور پھر ایک قلابازی کھاتے ہوئے ان کے سر پر پہنچ گئی۔ وہ ہڑبڑا گئے۔
"تم۔!" مٹھن خان کی بجائے بی بی صاحب نے کہا
"آواز نہیں۔" نینا نے یوں غراتے ہوئے کہا جیسے صدیوں کی نفرت اس کے لہجے سے امڈ آئی ہو۔
"تمہیں تو میں بعد میں پوچھتی ہوں، پہلے اس مٹھن خان کا حساب چکا دوں۔" نینا نے خوف زدہ مٹھن خان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا پھر اس پر پسٹل تانا ہی تھا کہ لیڈر چھت پر آ گیا۔ دوسری طرف سے زوبی سیڑھیوں میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے پسٹل تانا ہوا تھا۔

"نہیں تم نہیں، اسے میں نے مارنا ہے۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ میں اپنے باپ کے قاتل کو اپنے ہاتھوں سے ماروں گا۔" لیڈر نے کہا
"اور میں نے اس کے بھیجے میں گولی مارنے کی قسم کھائی ہے۔" نینا نے دانت پیستے ہوئے کہا
"ایک بار سوچ لو لڑکی۔ تم بھی زندہ بچ کر نہیں جاؤ گی۔" بی بی صاحب کی نرم آواز نجانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ یہ لفظ اس نے کرختگی میں کہے تھے۔
"میں تمہیں جان گئی ہوں، تم نے بہت بڑی غلطی کی مجھے مہرہ بنانے کی، نہیں جانتی ہو کچھ مہرے نہیں بنتے، شاطر کو مار دیتے ہیں۔"
"تمہیں شدید غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھی ہی تھی کہ وہ بولی
"تم اب نہیں سمجھی ہو لیکن میں مار دیتی ہوں، یوں......" یہ کہتے ہی اس نے فائر جھونک دیا۔ سناٹے میں فائر کی آواز گونج کر رہ گئی۔ اگلا فائر لیڈر نے مٹھن خان پر کر دیا۔ نینا تیزی سے مڑی اور گرتے ہوئے مٹھن خان تک جا پہنچی۔
"یہ مت سمجھنا کہ میں تمہارے بھیجے میں گولی نہیں اُتار سکی، یہ لو۔" یہ کہہ کر اس نے مٹھن خان کے ماتھے پر پسٹل کی نال رکھی اور فائر کر دیا۔ بی بی صاحب چھت پر پڑی تڑپ رہی تھی۔ ایسے میں نیچے سے بھگدڑ مچنے کی آوازیں آنے لگیں۔ نینا نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا، دستی بم نکالا، اس کی پن کھینچی اور نیچے اچھال دیا۔
"آؤ نکلو۔"
یہ کہتے ہوئے واپس پلٹ کر بھاگ گئی۔ جس وقت خوف ناک دھماکا ہوا وہ منڈھیر سے پائپ تک آن پہنچی تھی۔ نیچے زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ جیسے ہی اس کے پاؤں زمین پر لگے، اس کے پیچھے ہی زوبی آن پہنچی۔ وہ دونوں بھاگتی ہوئی اسی دیوار کی جانب چلی گئی۔ تبھی ایک فائر نینا کی ٹانگ پر آ لگا، دیوار پر چڑھتے ہوئے وہ گر گئی۔ زوبی اس جانب فائر کرنے لگی تو نینا نے کہا
"تم نکلو، میں آتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ سامنے فائر کرنے لگی۔ زوبی نے دیوار پر چڑھتے ہوئے سب کو اطلاع کر دی کہ نینا کو فائر لگ گیا ہے۔ سامنے سے ہونے

والی فائرنگ رُک گئی تو نینا اٹھی اور انتہائی مشکل سے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ زوبی نے اسے پکڑا اور اوپر کھینچنے لگی۔ دونوں نے کوشش کی تو وہ دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئی۔ دوسری طرف دو نوجوان کھڑے تھے۔ انہوں نے سہارا دیا اور بھاگنے لگے۔ فائرنگ مسلسل ہو رہی تھی۔ وہ ایک فور وہیل تک جا پہنچے۔ وقت ختم ہونے میں چند سیکنڈ تھے۔ وہ نکل پڑے۔ پھر اسی طرح لحہ بہ لحہ وہ ڈیرہ دور ہوتا گیا، اس کے ساتھ نینا کے حواس اس کا ساتھ چھوڑتے چلے گئے۔

☆......☆......☆

اسے ہوش آیا تو وہ ایک کمرے میں پڑی تھی۔ اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ کافی دیر تک وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ اسے ہلکا ہلکا یاد آ رہا تھا کہ اس نے مٹھن خان کو قتل کیا تھا۔ پھر بی بی صاحب کا مسخ چہرہ اس کے سامنے آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے سامنے جو چہرہ آیا، وہ میڈم فاخرہ کا تھا۔

”شکر ہے تمہیں ہوش آ گیا۔ گھبراؤ مت، تم میرے پاس ہو پوری حفاظت سے۔ تمہاری طرف کوئی جھانک بھی نہیں سکتا۔“

”کتنی گولیاں لگی تھیں۔“ اس نے سپاٹ چہرے سے پوچھا تو میڈم فاخرہ نے کہا

”دو، وہ بھی ٹانگ پر، خون زیادہ بہہ جانے سے تم بے ہوش رہی ہو، پھر ڈاکٹر نے تمہیں بے ہوش رکھا۔ اب تم ٹھیک ہو۔ تمہیں ہوش آ گیا۔“

”وہ دونوں......“ نینا نے پوچھنا چاہا تو وہ بولی

”دو نہیں تین مرے تھے وہاں پر۔ شہر میں کہرام مچا ہوا ہے۔ دونوں پارٹیاں آپس میں لڑ رہی ہیں۔ ایک دوسرے کو قاتل کہہ رہی ہیں۔ جبکہ بے چاروں کو پتہ ہی نہیں، دونوں ایک ہی تھے۔“

”ایک تھے۔“ اس نے پوچھا

”ہاں ایک، تم ٹھیک ہو جاؤ، میں سب بتا دوں گی تمہیں۔“ میڈم فاخرہ نے کہا

”نہیں ابھی بتائیں۔“

”مٹھن خان اور بی بی، دونوں کبھی عشق کرتے تھے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ یہی بات میرے بارے میں بھی کرتی تھی۔ اس نے اپنا کھیل کسی کو بھی سمجھ میں نہیں آنے دیا۔ وہ بیٹے سے نیا بندہ پالنے کا شوق رکھتی تھی۔ وہ جو تیسرا بندہ مرا، وہ اس کا تازہ شکار تھا۔ اس کے لئے اس نے ساری محنت کی تھی۔ تمہیں پوری طرح استعمال کیا۔ جس دن اس نے تمہیں کراچی بھیجا تھا، اور اس کے بعد شعیب کو اغوا کیا گیا، یہ سب اسی کی سازش تھی۔ مجھے غلط اطلاع دے کر ایک بار تمہیں مروانے کی سازش کی۔ خیر! چھوڑو، وقت گزر گیا۔ اب تم جلدی سے تندرست ہو جاؤ۔ پھر باتیں ہوتی رہیں گی۔“

”یہی بات اگر آپ کے بارے میں کہی جائے کہ یہ سب آپ نے کہا تو......؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولی

”بات یہ نہیں، بات نیت کی ہوتی ہے۔ جس کی نیت اچھی ہوتی ہے، قدرت بھی اس کی مدد کرتی ہے۔“ میڈم نے سنجیدگی سے کہا

”میں نے یہ اس لیئے کہا، کہ آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں......“ اس سے پوچھنا چاہا تو وہ ہنستے ہوئے بولیں

”ساجد، وہ بی بی کا کارندہ نہیں، میرا بھتیجا ہے۔ اسی کا گینگ تمہارے ساتھ تھا۔ وہ ڈکیتی نہیں کرتے بلکہ وہ ملک کی بہترین فورس کے لوگ ہیں۔ یہ چھاپہ تھا جو انہوں نے ملک دشمن عناصر کے خلاف مارا تھا۔ انہوں نے تمہارا ذکر ہی کہیں بھی نہیں آنے دیا۔ وہی تمہیں میرے پاس لائے ہیں اور انہی کے دو ڈاکٹر تمہارا علاج کر رہے ہیں۔“

”تو زوبی بھی......“

”ہاں، وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔ عطا ٹوانہ کوئی مجرم نہیں ایک اچھا انسان ہے۔ میرے دوستوں میں سے ہے۔ خیر تم زیادہ پریشان مت ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میڈم نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا

”آپ کہتی ہیں تو۔“ نینا نے کہا اور آنکھیں موند لیں۔ اس کا من بھر آیا تھا۔ اسے شعیب یاد آ گیا تھا۔ کاش وہ آج اس کے ساتھ ہوتا۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کب آنسو اس کے گال بھگو گئے۔ وہ کھل کر رو دی۔

ختم شد

یہ سلسلے

مہتاب خان

کہتے ہیں اگر یقین کامل ہو تو منزل خود بخود قدموں تلے آ جاتی ہے، بارہا یہ دیکھا گیا ہے کہ مختلف مسائل کا شکار بے بس اور بے اختیار لوگ محض یقین اور پختہ ارادے کے سہارے بحرانوں سے کامرانی سے نکل گئے۔

ایک دیہاتی نوجوان کا فسانہ، اسے ایک سرمایہ دار لڑکی سے عشق ہوگیا تھا

میں ان دنوں محکمہ جنگلات سے وابستہ تھا اور میرا تبادلہ مری کی پرفضا جگہ پر ہوگیا تھا۔ محکمہ کی طرف سے جو رہائش مجھے ملی تھی وہ لب سڑک واقع تھی اور اطراف میں بڑے دل فریب نظارے تھے۔ سڑک سے دس بارہ فٹ نیچے ڈھلوان پر کچھ ہوٹل اور مقامی لوگوں کے گھر تھے۔ عقب میں وسیع و عریض وادی تھی اور وادی میں گھنے درخت تھے جہاں ایک اسکول بھی تھا۔ بائیں طرف چشمے کا پانی ایک آبشار کی صورت نشیب میں گرتا تھا۔ یہاں کچھ کاٹیج بھی بنے ہوئے تھے۔ جن کا کرایہ ہوٹل کی نسبت زیادہ تھا اور ان میں زیادہ تر دولت مند لوگ ہی قیام کرتے تھے۔ جون جولائی کے مہینوں میں یہاں سیاحوں کا بڑا رش ہوا کرتا تھا۔

ان کاٹیجز میں ایک کاٹیج اسد کا بھی تھا۔ یہ نوجوان چوڑے چکلے، صحت مند جسم کا مالک ایک نہایت ہنس مکھ لڑکا تھا۔ یہ کاٹیج اسے باپ سے ترکے میں ملا تھا۔ گرمی کے موسم میں جب لوگ اس پہاڑی مقام پر ہلہ بولتے تھے تو ہر کاٹیج اور ہوٹل کرائے پر چڑھ جاتا تھا۔ یوں اس کو بھی معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔

ان دنوں میری والدہ مجھ سے ملنے آئیں تو دو ماہ میرے پاس رہیں۔ ایک دن وہ چہل قدمی کرتے ہوئے اور اس کاٹیج کی طرف نکل گئیں کہ اچانک کسی پتھر سے ٹھوکر لگی اور ان کا پاؤں رپٹ گیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے وہیں بیٹھ گئیں۔ غالباً پاؤں میں موچ آ گئی تھی۔ اتفاقاً اسد اپنے کاٹیج کی کھلی ہوئی کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا اور امی کو سہارا دے کر گھر لے آیا۔ یوں اس کا ہمارے گھر میں آنا جانا ہوگیا۔ وہ اکثر ہمارے گھر آ جایا کرتا تھا۔ امی بھی اسے بہت پیار کرنے لگی تھیں اور بیٹا کہہ کر بلاتی تھیں۔ وہ میری غیر موجودگی میں امی کو تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیتا تھا۔

دو ماہ بعد امی تو چلی گئیں لیکن میرے اور اسد کے درمیان قریبی تعلق قائم کر گئیں۔ اسد اب اکثر میرے گھر آ جاتا تھا اور ہم بے تکلفی سے ادھر ادھر کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اس میں کوئی لالچ، دھوکا اور فریب نہیں تھا۔ وہ بس اپنے حال میں مگن رہنے والا لڑکا تھا۔

مجھے یاد ہے وہ دسمبر کے آخری دن تھے۔ سردی پورے شباب پر تھی۔ یخ بستہ ہواؤں نے وادی میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ رات کافی برف پڑی تھی۔ برف باری کا نظارہ کرنے والے اکا دکا سیاح ہی وادی میں موجود تھے۔ زیادہ تر کاٹیج خالی تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اسد چند دنوں سے کچھ اداس اور اکھڑا اکھڑا سا ہے۔ میں نے اسے کریدنے کی کوشش کی تو اس نے ہنس کر ٹال دیا۔ میں نے سوچا کہ شاید تنہائی سے گھبرا گیا ہے۔ میں نے اس سے زیادہ پوچھ گچھ مناسب نہیں سمجھی اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

پھر یوں ہوا کہ کئی ہفتے گزر گئے اسد سے ملاقات نہیں ہوئی۔ نہ جانے اسے کیا مصروفیت آن پڑی تھی کہ وہ میرے گھر نہیں آیا۔ مجھے وسوسے ستانے لگے۔ میں نے اس کی خیر خبر لینے کے لیے اس کے کاٹیج جانے کا فیصلہ کیا۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ شیر علی اسد کے کاٹیج کی طرف سے آتا ہوا ملا۔ یہ اسد کا پرانا دوست تھا۔ ایک دو بار اس کے ساتھ میرے گھر بھی آ چکا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ میں نے

سلام کا جواب دیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"ہاں بھئی! یہ تو بتاؤ اسد کدھر ہے کئی ہفتے گزر گئے اسے نہیں دیکھا کہیں وہ چلا تو نہیں گیا؟"

"وہ گھر پر نہیں ہے۔" شیر علی بولا۔

"اس کو ہوا کیا ہے کچھ پتا تو چلے؟"

شیر علی کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد دائیں بائیں دیکھ کر رازداری سے بولا۔

"خود کو روگ لگا بیٹھا ہے۔ ادھر ایک لڑکی ٹھہری تھی ناں اس کے کانیج میں بس اسی کا نام لے لے کر آہیں بھرتا ہے۔"

حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ جس لڑکی کی بات کر رہا تھا وہ بہت تیز طرار اور شوخ لڑکی تھی۔ بے حد حسین اور دلکش تھی نام اس کا شازمہ تھا۔ کسی اعلیٰ گھرانے کی لگتی تھی۔ اس کی دولت کا اندازہ اس کی شاندار کار دیکھ کر ہو گیا تھا۔ ان کے ساتھ ڈرائیور بھی تھا۔ دونوں لڑکیاں انگریزی طرز کے لباس پہنتی تھیں جو اپنی مثال آپ ہی ہوتا تھا۔ جسم سے چپکا ہوا دعوت نظارہ دیتا ہوا۔ یہ لڑکیاں ایک ماہ وادی میں ٹھہری تھیں اور جتنی دیر رہیں تھیں ادھم مچا کر رکھا تھا۔

میں نے جب شیر علی سے اسد کے بارے میں سنا تو حیران رہ گیا۔ کہاں وہ اونچی سوسائٹی کی لڑکی اور کہاں یہ نچلے طبقے کا معمولی سا لڑکا۔ فوراً میرے ذہن میں آیا کہ اسد کے ساتھ ضرور اس نے شرارت کی ہے یا وہ بے وقوف خود ہی کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے۔ شکل سے تو وہ واقعی رومان پسند نظر آتا تھا۔ سوئی سوئی آنکھیں تو جیسے ہر وقت خواب دیکھا کرتی تھیں۔

"وہ پاگل تو نہیں ہو گیا جس لڑکی کا وہ نام لے رہا ہے اس کے تو ملازم بھی اس سے کہیں زیادہ حیثیت والے ہوں گے۔ میرے خیال میں تو وہ ہم جیسے بندوں سے بات کرنا بھی گوارہ نہیں کرتی ہو گی۔" میں نے خیال ظاہر کیا تو شیر علی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ایاز بھائی وہ ہمارے تمہارے جیسے بندوں سے بات کرنا بھی گوارہ نہیں کرتی لیکن یہ اسد تو اس کے ساتھ سیر سپاٹے کر چکا ہے۔ وہ جتنے دن یہاں رہی اسے لیے لیے پھرتی رہتی تھی۔"

"یہ سب میں آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ اسے اس مصیبت سے نکالنے کے لیے کوئی چارہ کریں گے۔ شازمہ جیسے اعلیٰ لوگ اور اسد جیسے کم حیثیت لوگوں کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہوتا ہے۔ پتا نہیں یہ فاصلہ کب گھٹا اور کیسے گھٹا۔ اس نے کیا کہا اور کیا کیا۔ وہ تو اسد کو نیم پاگل بنا کر چھوڑ گئی ہے۔"

میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے پوری تفصیل بتائے۔ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے باتیں کرتے ہوئے ہم میرے گھر آ چکے تھے اور اب برآمدے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شیر علی نے بولنا شروع کیا۔

اور دھیرے دھیرے اسرار و رموز کے پردے اٹھانے لگا۔

"اس نے بتایا کہ شازمہ کو آئے ہفتہ ہی ہوا تھا کہ اس کی ملاقات اسد سے ہوئی۔ اور اسد سے اس نے فرمائش کی کہ

جب تک وہ یہاں ٹھہرے گی اسد اسے وادی کا چپہ چپہ گھمائے گا۔ اسے صبح نو بجے آنا ہوگا اور سات بجے تک اس کے ساتھ رہنا ہوگا۔ جس کا وہ معقول معاوضہ دے گی۔"

"اس پر تو جیسے حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ جیسے ایک حسین خواب میں ڈوب گیا۔ اس نے تو کبھی تصور میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اتنا حسین ساتھ اسے ملے گا۔ اس روز کون سی ایسی خواہش تھی جو پوری نہ ہوئی تھی۔ وہ چند ہفتے جو اسد کی زندگی میں ایک خواب کی طرح آگئے تھے گزر گئے اور شازمہ کی واپسی کا وقت آ گیا۔ اگلے روز جب شازمہ کے پاس آیا تو شازمہ نے نہ اسد سے آنکھ ملائی اور نہ کوئی بات کی خاموشی سے اس کے معاوضے کے پیسے اسے دیئے اور خاموشی سے واپس چلی گئی۔ اب اسد تھا اور اس کی بے قراریاں تھیں۔ وہ شازمہ کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا۔ میں نے شیر علی سے کہا جیسے ہی اسد اسے ملے اسے میرے پاس بھیجنا۔"

چند دن گزرے تھے کہ اسد میرے گھر آیا۔ میں نے دو گھنٹے لگا کر اطمینان سے اسے سمجھایا کہ"۔ جو کچھ ہوا ہے اسے بھول جائے۔" اس نے کہا۔

"ایاز بھائی اس نے خود اپنی محبت کا اعتراف مجھ سے کیا تھا۔ یہاں سے جا کر وہ بھی میری طرح دن رات مجھے یاد کرتی ہوگی۔" مجھے اس کی بے وقوفی پر ہنسی آرہی تھی۔

"بڑے لوگ ایسے مذاق چھوٹے لوگوں سے کرتے رہتے ہیں۔ وہ اسے سنجیدگی سے نہ لے۔" لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کے دماغ پر تو عشق کا بھوت سوار تھا۔ میرے سمجھانے پر وہ ہوں ہاں کرتا رہا اور سر ہلاتا رہا مگر میری بات اس کے دل میں اثر نہیں کر رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شازمہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت تھی۔ اس کے لیے محبت کا تجربہ نیا تھا اور روگ کی طرح اس سے چمٹ گیا تھا۔ وہ بے وقوف یہ خیال کر رہا تھا کہ وہ بھی اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔

"اس نے بڑے فخر سے مجھے بتایا تھا کہ وہ پھر یہاں آرہی ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ برف باری میں آئے گی۔"

دن گزرتے رہے نومبر میں خنکی کچھ روز بڑھ گئی۔ خزاں جو دبے پاؤں ان حسین چوٹیوں کی طرف بڑھ رہی تھی ایک دم جست لگا کر وادی پر چھا گئی۔ نومبر ختم ہوتے ہی برف باری کے آثار نمودار ہونے لگے۔ دسمبر کا شاید دوسرا ہفتہ تھا یہاں شدید برف باری ہوئی۔

مری نے برف کا خوب صورت لباس پہن لیا۔ اسے دیکھنے کے لیے لوگ ٹولیوں کی صورت میں یہاں پہنچنے لگے۔ ہوٹلوں کی ویرانیاں دور ہونے لگیں۔ اسد بڑی شدت سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

کچھ عجیب سی حالت ہو گئی تھی اس کی۔ ہر وقت کھویا کھویا رہتا تھا۔ گھنٹوں چشمے کے کنارے خاموش بیٹھا رہتا تھا۔ کبھی وادی سے نکل جاتا۔ کئی کئی روز اس کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ شازمہ نے اسے دسمبر کے آخری ہفتے میں آنے کا وعدہ کیا تھا۔

جوں جوں دسمبر کا تیسرا ہفتہ نزدیک آرہا تھا۔ اس کی بے قراریاں بڑھتی جارہی تھیں۔ وہ جب بھی مجھ سے ملتا صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ شازمہ کے انتظار کی ایک ایک گھڑی گن گن کر گزار رہا ہے۔ اب زبانی طور پر وہ اس کا اقرار نہیں کرتا تھا۔ کم از کم مجھ پر تو یہی ظاہر کرتا تھا کہ جیسے اس نے شازمہ کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھ سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی ماں کے کہنے کے مطابق وہ برادری میں شادی کرے گا۔

دسمبر کا تیسرا ہفتہ گزرا اور چوتھا ہفتہ بھی گزر گیا۔ لیکن شازمہ نہ آئی۔ اس کی حالت قابل رحم تھی۔ اس کا کھانا پینا چھوٹ گیا تھا۔ لیکن یہ بیماری کب چھپتی ہے۔ اس کی آنکھیں دھندلائی سی رہتی تھیں۔ ہر صبح وہ کاٹیج کی صفائی کرتا تھا اور کاموں سے فارغ ہو کر چشمے کے کنار جا بیٹھتا تھا اور اپنی نگاہیں دور نیچے وادی میں بل کھاتی ہوئی سیاہ سڑک پر لگا دیتا۔ یہاں تک کہ شام ہو جاتی۔

یہ جنوری کی بات ہے چھٹی کا دن تھا۔ اسد میرے پاس آیا وہ بہت بیمار نظر آتا تھا۔ اس کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا تھا۔

"اس نے بتایا کہ وہ ایک ہفتے سے بیمار ہے۔ پہلے سر میں درد ہوا پھر تیز بخار چڑھ گیا۔ ڈاکٹر کی دوا بھی کھائی مگر آرام نہیں آیا۔" اپنے کاٹیج کی چابی اس نے سامنے میز پر رکھی کہ شیر علی کو دے دوں تا کہ وہ اس کا خیال رکھے اور خود اپنے گاؤں جانے کا کہہ کر چلا گیا۔

اس کی واپسی کوئی ایک ماہ بعد ہوئی۔ وہ بے حد کمزور نظر آرہا تھا۔ آنکھوں میں جیسے ایک مستقل آگ سی جل رہی تھی۔

"اس نے مجھے بتایا کہ وہ لاہور جارہا ہے۔ وہاں اس کا خالہ زاد بھائی رہتا ہے۔ وہ سوچ رہا ہے کہ کچھ دن اس کے پاس رہ آئے۔"

میں جانتا تھا کہ بات کچھ اور ہے خالہ زاد بھائی کے پاس جانے کا صرف بہانہ ہے۔ ورنہ وہ لاہور جا کر شازمہ سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسد کو روکنا چاہیے وہ آگ سے کھیلنے کی کوشش کررہا تھا اور اس کا جلنا ضروری تھا۔ اسد کو میری ماں نے بیٹا بولا تھا۔ اس لیے مجھے بھی اس سے ایک بھائی کی طرح محبت ہوگئی تھی۔ وہ میری والدہ کو بہت پسند تھا۔ اس لیے مجھے بھی بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کی سادگی میرے دل میں گھر کرگئی تھی۔

میں نے ارادہ کیا کہ آج رات ہی اسد کے گاؤں جاؤں گا اور اس کے گھر والوں سے کہوں گا کہ وہ جلد سے جلد اسد کی شادی کردیں۔ عاشق شوہر بن کر گھر گرہستی کے چکروں میں ایسا الجھتا ہے کہ ڈھیرے ڈھیرے سب بھول جاتا ہے۔

رات آٹھ بجے کے قریب جب میں اسد کے گاؤں جانے کی تیاری کررہا تھا تو شیر علی میرے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ اسد لاہور جانے کے لیے تین بجے مری سے روانہ ہوگا۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ کوئی بچہ ہوتا تو میں ڈانٹ ڈپٹ کر سمجھا بھی دیتا وہ عاقل و بالغ اور اپنے اچھے برے کا ذمہ دار تھا۔ میں اسے کہاں تک سمجھا سکتا تھا اور پھر میری اپنی بھی مصروفیات تھیں۔

دو ہفتے بعد اس دن اچانک اسد کی ماں اپنی بڑی بیٹی کے ساتھ شیر علی کے ہمراہ میرے گھر آئیں۔ انہوں نے بتایا۔

"اسد اپنے خالہ زاد بھائی جمیل کے پاس دو تین دن ٹھہرا تھا۔ اسے بخار تھا کہنے لگا کہ لاہور کے بڑے اسپتال میں دکھاؤں گا۔ جب سے گیا ہے ابھی تک واپس نہیں آیا۔ جمیل اسے سب جگہ ڈھونڈ چکا ہے۔" دونوں زارو قطار رو رہی تھیں۔ یہ اطلاع میری توقع کے عین مطابق تھی۔ مجھے اس کی بیماری کا پتہ تھا اور اس "بڑے اسپتال" کا بھی جہاں اس کو جانا تھا۔ وہ یقیناً شازمہ کے پاس گیا ہوگا۔

شازمہ لاہور کے ایک جانے مانے صنعت کار چوہدری عثمان کی بیٹی تھی۔

"انہوں نے بتایا کہ اسد نے کافی عرصے سے گھر پیسے بھی نہیں بھیجے تھے۔ یوں یہ گھرانا سخت پریشانی کا شکار تھا۔ مگر یہ تو پتہ چلتا کہ آخر وہ ہے کہاں؟"

"میں نے اس کی ماں اور بہن کو ہر طرح سے تسلی دی کہ میں اور شیر علی خود لاہور جائیں گے اور اسد کو واپس لے کر آئیں گے۔" اور انہیں واپس گاؤں چھوڑ آیا۔

"میں نے انہیں تسلی دی کہ جیسے ہی اسد کا اتہ پتہ معلوم ہوا میں انہیں خود بتانے آؤں گا۔" واپس آتے ہوئے میں نے کچھ دن کا خرچہ چپکے سے ماں جی کے قریب رکھ دیا۔

"میں نے اسد کی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ جلد گاؤں آکر انہیں اسد کی خیر خیریت سے آگاہ کروں گا۔ اور ہوسکتا ہے اسد کو ساتھ ہی لے کر آؤں۔" میں نے دفتر سے چند دن کی چھٹی لی اور شیر علی کو ساتھ لے کر لاہور آگیا۔ شیر علی بھی اسد کی گمشدگی سے بہت پریشان تھا۔

چوہدری عثمان جیسے مشہور صنعت کار کی رہائش گاہ کا پتہ معلوم کرنا ہمارے لیے زیادہ دشوار ثابت نہ ہوا۔ یہ وسیع و عریض رہائش گاہ ماڈل ٹاؤن کے شاندار علاقے میں تھی۔ اس رہائش گاہ میں کوئی ایرا غیرہ شخص قدم بھی نہ رکھ سکتا تھا۔ میں نے یہاں کے پٹھان چوکیدار سے سن گن لینے کی ٹھانی۔

پہاڑی علاقے سے تعلق ہونے کی بناء پر وہ فوراً ہی ہماری مدد پر آمادہ ہوگیا۔

"اس نے بتایا کہ چند دن پہلے ایک نوجوان جس کا حلیہ اسد سے ملتا جلتا تھا گیٹ کے پاس منڈلاتے ہوئے اس نے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے بھی دو تین بار اسے منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے پوچھ گچھ کرتا۔ شازمہ بی بی کے منگیتر کی کار کوٹھی سے نکلی اور اس نوجوان کے پاس رکی۔ وہ نوجوان کھڑکی میں جھک کر باتیں کررہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کار کا دروازہ کھلا اور وہ اس میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اس کے بعد اس نے اسے نہیں دیکھا۔"

شازمہ کے منگیتر کی گاڑی میں بیٹھ کر جانا اسد کا آخری نشان تھا۔ حالات عجیب رخ اختیار کرگئے تھے۔ شازمہ کی منگنی ہوچکی تھی۔ اور اس کے منگیتر کو اسد کو لے جانا ہمارے

لیے حیران کن تھا۔ میں نے چوکیدار سے شازمہ کے منگیتر کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کیں۔ اس کے دفتر کا پتہ وغیرہ حاصل کیا۔ اور دوسرے دن ٹھیک تین بجے شازمہ کے منگیتر سمیر ملک کے دفتر پہنچ گیا۔

سمیر ملک کا دفتر ایک بہت عالی شان عمارت میں تھا۔ یہاں میں تنہا آیا تھا۔ بڑی مشکل سے سمیر نے ایک آراستہ پیراستہ دفتر میں مجھے ملاقات کا اعزاز بخشا تھا۔ وہ شکل و صورت سے ہی فیشن کا دلدادہ اور ایک بگڑا ہوا رئیس نظر آرہا تھا۔ وہ ایک وسیع و عریض میز کے پیچھے بیٹھ خشمگین نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

''بیٹھو۔'' اس نے بھاری بھرکم لہجے میں کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں بیٹھ گیا۔

''کہو کیا کہنا ہے۔ ملازم نے بتایا ہے کہ تم بہت ضروری کام سے مجھ سے ملنا چاہتے ہو اور بہت دور سے آئے ہو۔'' وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا جیسے کہ میں اس کا ذاتی ملازم ہوں۔

''میں نے کہا سمیر صاحب میرا بھائی پچھلے دنوں سے لاپتہ ہے۔ ہم اس کی تلاش میں یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آخری بار آپ کے ساتھ آپ کی گاڑی میں دیکھا گیا تھا۔''

''کیا؟'' وہ اچھل پڑا حیرانی اس کے چہرے پر لکھی تھی۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں۔''

''وہ سولہ تاریخ رات دس بجے چوہدری عثمان کی کوٹھی کے باہر آپ کی گاڑی میں بیٹھا تھا۔ بس آخری بار اسی وقت اسے دیکھا گیا تھا۔'' کچھ دیر بعد میں نے کہا۔

''آپ اس دن چوہدری عثمان کے گھر گئے تھے؟''

''بالکل گیا تھا وہ میرا سسرال ہے اور چوہدری عثمان میرے انکل بھی ہیں۔ لیکن کیا میں تمہیں یہ سب بتانے کا پابند ہوں؟'' ''یہ کیا پولیس والوں کی طرح مجھ سے پوچھ گوچھ کررہے ہو؟''

''آپ سمجھنے کی کوشش کریں میرا بھائی جیسا دوست لاپتہ ہوا ہے۔ وہ اپنے گھر والوں کا اکلوتا سہارا اور کفیل ہے۔ میں چاہتا تو پولیس میں رپورٹ کرواسکتا تھا مگر ابھی میں اپنے طور پر اس کی تلاش کررہا ہوں۔ پلیز آپ میری مدد کیجیے۔''

میں نے سمیر کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ چوکیدار کے بیان پر بھی شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پھر آخر اسد گیا کہاں؟ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

''میں وہاں گیا ضرور تھا مگر میں نے رات دس بجے کسی کو اپنی گاڑی میں نہیں بٹھایا میں وہاں سے بارہ بجے واپس آگیا تھا۔ اس دوران میں کہیں نہیں گیا۔'' اس بار وہ نرم لہجے میں بولا۔

دوسرے دن میں دوبارہ چوہدری عثمان کے چوکیدار کے پاس گیا۔ اور اس سے کہا کہ ''وہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ اس دن سمیر کی گاڑی کون چلا رہا تھا اور ہوسکے تو یہ چٹ کسی طرح شازمہ تک پہنچادے۔'' چوہدری عثمان جیسے اثر ورسوخ والے بندے سے ٹکرانے کا مجھ میں حوصلہ نہیں تھا۔ میں نے کاغذ کی اس چٹ پر مختصر تمام روداد لکھ دی تھی اور ساتھ ہی اپنا فون نمبر بھی لکھ دیا تھا۔

دو تین دن گزرے تھے کہ اس دن رات کا کھانا کھا کر ہم تینوں جمیل کے گھر اپنی سوچوں میں گم بیٹھے تھے کہ اچانک میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اجنبی نمبر فون اسکرین پر نمودار ہوا۔

''ہیلو۔'' میں جلدی سے بولا۔ دوسری طرف شازمہ کا نام سن کر میری رگوں میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ میں نے جلدی سے شیر علی کی طرف کاغذ اور پین کا اشارہ کیا اور کہا وہ نوٹ کرے۔ شازمہ نے گلبرگ کا ایک ایڈریس نوٹ کروایا تھا اور فوراً وہاں پہنچنے کا کہا تھا۔ فون بند کرکے جیسے ہی میں نے جمیل اور شیر علی کی طرف دیکھا وہاں ہزاروں سوال لکھے تھے۔

''جلدی سے تیار ہوجاؤ ہمیں ابھی نکلنا ہے۔ تم نے ایڈریس نوٹ کیا تھا؟'' میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

ہم تینوں شازمہ کے بتائے گئے ایڈریس پر پہنچے۔ دروازہ شازمہ نے ہی کھولا تھا۔ آج وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس نے بڑا خوب صورت لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور دو منٹ انتظار کا کہہ کر اندر کہیں چلی گئی۔ اس کے چہرے پر بڑی جان دار مسکراہٹ تھی۔

پھر وہ ہوا جس کے لیے ہم نے اتنی دور کا سفر کیا تھا۔ جس کے لیے ہم نے در بدر کی ٹھوکریں کھائی تھیں۔ اچانک اسد ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ بہت ہشاش بشاش اور صحت مند نظر آ رہا تھا۔ خوشی اور اطمینان اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ بڑے سلیقے کا لباس اس نے پہنا ہوا تھا۔ اسے یوں زندہ سلامت دیکھنا میرے لیے خوش کن تھا۔ اس کی بوڑھی والدہ اور بہنوں کے چہرے میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ امید تھی کہ میں اسے اس کی والدہ کے پاس لے جا کر ان کے سامنے سرخرو ہو سکوں گا۔

ہم سب صوفے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ساتھ ہی چائے کا دور چل رہا تھا۔ شازمہ نے جو تفصیل بتائی اس کے مطابق مری میں اس کی ملاقات جب اسد سے ہوئی تو اس نے واقعی مذاق میں اس سے محبت کا کھیل کھیلا تھا۔ جسے وہ پریشان چھوڑ کر آ گئی تھی اور ایک معمولی انسان سمجھتی تھی وہ اس کے لیے غیر معمولی بن گیا تھا۔ وہ خود پریشان ہو گئی تھی۔ اسد کا خوب صورت چہرہ وہ بھلائے نہیں بھولتی تھی۔ ہر وقت اس کا چہرہ شازمہ کی نگاہوں میں گھومتا رہتا تھا۔ یہ کہتے ہوئے اس کی حسین آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس لیے کہ میں اس سے سچ مچ میں محبت کرنے لگی تھی۔

مری سے واپس آ کر میں دن رات اس سے ملنے کو ترستی رہی اور ساتھ ہی ساتھ اپنے دل کو سمجھاتی رہی کہ یہ نادانی نہ کرے۔ میں جانتی تھی کہ میری منگنی ہو چکی ہے اور شادی بھی قریب ہے۔ پھر کیوں کسی کے لیے سوچ رہی تھی۔ میں نے اپنے دل کو بہت سمجھانے کی کوشش کی اور اس میں کافی حد تک کامیاب بھی ہو چکی تھی کہ پھر ایک دن اسد میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ میری خاطر اتنی دور چلا آیا تھا۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔

اس دن مجھے اپنی سہیلی کو ایئر پورٹ لینے جانا تھا۔ میں سمیر کی گاڑی لے کر گئی تو گیٹ پر تھوڑا آگے اسد نے راستہ روک لیا۔ میں نے اسے گاڑی میں بٹھا لیا اور اپنی ایک سہیلی کے گھر اس کو لے آئی جو آج کل خالی پڑا ہوا تھا۔

اس کی روداد حیران کن تھی۔ وہ عجیب و غریب لڑکی تھی۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ وہ ایک ایسے شخص کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ جس سے اس جیسی ماڈرن اور اعلیٰ گھرانے کی لڑکی کا محبت کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سب سے دھماکا خیز انکشاف اسد نے کیا وہ یہ تھا کہ اس نے شازمہ سے کورٹ میرج کر لی ہے۔ میں فوری طور پر اس بات پر یقین نہیں کر سکا۔ کوئی ہوش مند کر بھی نہیں سکتا۔ کہاں شہر کے نامور دولت مند کی انتہائی ماڈرن لڑکی شازمہ اور کہاں سیدھا سادا اسد کوئی جوڑ کوئی جواز ہی نہ تھا۔ لیکن میں ایک بات بھول رہا تھا جو جواز تھا نہ "محبت"۔ شازمہ کی اس کے امیر ترین کزن سمیر سے شادی ہونے والی تھی اور اس نے گاؤں کے نوجوان سے کورٹ میرج کر لی تھی۔ اور اسی کالج میں جا کر آباد ہو گئی جہاں سے اس کی محبت کا آغاز ہوا تھا۔

میں ان کی شادی کے بعد اسی کالج کے قریب تقریباً ایک سال رہا۔ شادی کے بعد شازمہ نے اپنے ماضی سے ہر ناتہ توڑ لیا تھا۔ نہ کسی سے ملتی تھی اور نہ کوئی اس سے ملنے آتا تھا۔ کبھی کبھار چوہدری عثمان کی شاندار گاڑی اسی کالج کے دروازے پر کھڑی نظر آ جاتی تھی۔ وہ بھی جس طرح خاموشی سے آتے تھے اسی طرح خاموشی سے چلے جاتے تھے۔ وہ ذہنی طور پر بالکل بدل چکی تھی۔

مجھے ڈر تھا کہ کہیں اسد کی یہ خوشیاں عارضی ثابت نہ ہوں۔ کہیں اس امیر زادی کی آنکھوں سے محبت کی پٹی اترے اور وہ واپس اپنی دنیا میں نہ لوٹ جائے۔ مگر میرے یہ تمام اندیشے اور اندازے غلط ثابت ہوئے۔ گزرنے والے وقت کے ساتھ شازمہ خود کو نئے ماحول میں ڈھالتی چلی گئی۔ اسد کے گھر والوں کو بھی وہ گاؤں سے لے آئی تھی۔ اور مقامی رواج کے مطابق لباس پہننے لگی تھی۔

میرے وہاں سے جانے میں چند ہی روز رہ گئے تھے۔ شام کا وقت تھا میں برآمدے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اسد بھاگتا ہوا میری طرف آیا اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا۔ آتے ہی اس نے مجھے بے تکلفی سے بازوؤں میں بھینچ لیا اور سرگوشی میں بولا۔ میرا بیٹا پیدا ہوا ہے۔ میں نے دل کی گہرائی سے اسے مبارک باد دی۔

دہشت گرد

راحیلہ تاج

ماضی کا ایک کردار وہ کسی اچھے آدمی کی تلاش میں حال میں آ گیا تھا۔

نئے افق کے قارئین کے لیے مختصر سی فنتاسی

تھانہ انچارج کے کمرے کی چق ہٹی اور ایک آدمی اس طرح کمرے میں داخل ہوا جیسے کسی نے پیچھے سے اسے دھکا دے کر اندر پہنچایا ہو اس کے فوراً بعد ایک باوردی پولیس کانسٹیبل نمودار ہوا اس نے کھٹاک کی آواز کے ساتھ ایڑیاں جوڑ کر انچارج کو سیلوٹ کیا۔

''ہاں؟'' گھنی مونچھوں اور درشت چہرے والے بھاری بھرکم انچارج نے بھنوئیں اٹھاتے ہوئے کانسٹیبل کو دیکھا۔

''اسے میں ٹرام چوراہے سے لایا ہوں سر۔''

کانسٹیبل نے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جسے اس نے اپنے سے پہلے کمرے میں دھکا دے کر پہنچایا تھا مجھے یہ کوئی دہشت گرد لگتا ہے مشکوک بندہ ہے سر۔ کھڑا تھا سر کوئی چار گھنٹے سے وہیں رکا ہوا تھا۔ میری ڈیوٹی ادھر تھی اتنی دیر تک کوئی رکتا ہے سر میں نے نگرانی شروع کردی تھی بہت سے لوگوں سے یہ رک رک کر کچھ باتیں بھی کرتا رہا پھر میں نے اس سے سوال کیا تو کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکا۔'' تھانہ انچارج نے اس بار غور سے اس شخص کو دیکھا۔

''کیا نام ہے اس کا کیا کرتا ہے، کچھ بتایا۔'' انچارج نے دوبارہ کانسٹیبل سے پوچھا۔

''سر بڑی عجیب بات کرتا ہے یہ عجیب سا نام ہے کچھ پر ہیت یا پتا نہیں کیا اپنے باپ کا نام بھی اسے نہیں معلوم کہتا ہے میں آج ہی ادھر آیا ہوں کوئی غیر ملکی ہے اس کے پاس کوئی پاسپورٹ کوئی کاغذ نہیں یہ بھی نہیں بتاتا کہ آیا کس جگہ سے ہے۔ رہائش کولمبو وغیرہ کی ہے شاید سر مجھے یہ را وغیرہ کا ایجنٹ لگتا ہے۔ خدا معلوم کسی اچھے آدمی کی تلاش میں آیا ہے۔''

''یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو۔'' انچارج نے کانسٹیبل کو دیکھا۔ یہ لانبے قد کا نہایت سرخ و سفید اور صحت مند جوان تھا ناک نقشہ کمال کا تھا مگر بالوں کا انداز بہت مختلف تھا۔ یہ زیادہ بڑے نہ تھے اور انہیں اس طرح سنوارا گیا تھا کہ سارے بال پیچھے سے ماتھے پر لا کر پھیلائے گئے تھے دوسری بات یہ تھی کہ یہ وجیہہ ہونے کے باوجود کھردرا سا لگتا تھا چہرے پر چند شکنیں ایسی تھیں جو صرف معمر آدمیوں کے ہاں ملتی ہیں اس پر نظر پڑتے ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ کوئی زمانہ ساز شخص ہے عمر رسیدگی اور جوانی کا یہ ایک حیرت انگیز آمیزہ لگتا تھا۔

''تمہارا دماغ تو صحیح ہے کیا کسی پاگل کو اٹھا لائے ہو؟''

''نہیں سر، یہ بالکل ٹھیک ہے سر میرا خیال ہے بن رہا ہے۔''

''اچھا۔'' انچارج نے دوبارہ اس شخص کو دیکھا جسے پکڑ کر لایا گیا تھا۔ وہ خاموشی سے کھڑا بے نیازی سے دونوں کو دیکھ رہا تھا اس بار اسے چونک کر دیکھا اس شخص کے لباس کو اس نے ایک دم سے نوٹ کر لیا جو اس کی شخصیت کی طرح خاصا عجیب سا تھا۔ اس نے غالباً دو چادروں سے خود کو ڈھانپ رکھا تھا اس کے دونوں بازو کاندھوں کے پاس سے کھلے ہوئے تھے۔ ایسا لباس

ہندوؤں میں رائج تھا پنڈتوں اور پجاریوں کا سا لباس تھا مگر یہ ان سے بھی قدرے مختلف تھا دو سپید چادروں سے بنا ہوا ایسا لباس تھانہ انچارج نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔
انچارج نے کڑی نگاہوں سے اسے گھورا یہ آدمی پاگل نہیں لگتا تھا۔ بلکہ اس کی ساری شخصیت نہایت مقناطیسی اور سحر انگیز سی تھی۔ انچارج نے اپنے تاثر کو دباتے ہوئے درشت لہجے میں اس سے کہا۔
"کیا نام ہے تمہارا؟"
"پرمیتھوس۔"
"یہ کیسا نام ہے۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔
"ہندو ہو؟"
"نہیں۔"
"پھر کیا مذہب ہے تمہارا؟"
"میرا کوئی مذہب نہیں۔" آدمی نے سلجھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔
"اچھا کوئی مذہب نہیں؟" الفاظ چبا چبا کر بولتے ہوئے انچارج نے کہا۔
"کہیں باہر سے آئے ہو؟"
"ہاں...... میں گریس سے آیا ہوں۔"
"گریس، کون سی جگہ؟"
"اولمپس۔"
"اولمپس، یہ کیا ہے؟" منہ بناتے ہوئے انچارج نے پوچھا۔
"جگہ ہے میری رہائش گاہ ماؤنٹ اولمپس۔"
"کون سا ملک ہے؟"
"گریس یونان۔"
"تو ایسے بولو نا، تم یونانی ہو۔" انچارج نے بھنا کر اسے دیکھا۔
"سفر کے کاغذات ہیں تمہارے پاس؟"
"میرے پاس کچھ نہیں۔"
"تو پھر کیسے آئے؟" انچارج نے اسے خونی نظروں سے گھورا۔
"بس آ گیا۔"
"واہ......!" انچارج نے اپنے بھیڑیے جیسے دانتوں کی نمائش کی۔
"کہاں ٹھہرے ہو؟"
"کہیں نہیں۔"
آدمی کا جواب سن کر انچارج نے دوبارہ کانسٹیبل کو دیکھا۔
"یہ تو بڑا گہرا بندہ لگتا ہے تمہیں یقین ہے یہ ٹھیک ہے۔"
"سر بالکل بن رہا ہے یا ہمارے ساتھ مخول کر رہا ہے۔"
"ہمارے ساتھ مخول؟" انچارج کی آنکھیں ابل

پڑیں۔

"کیا کر رہے ہو؟" اس نے مڑ کر آدمی کو دیکھا۔

"تلاش کر رہا ہوں؟"

"کیسے؟"

"کسی اچھے آدمی کو۔"

"اچھا تو تم اچھے آدمی کو تلاش کر رہے ہو کوئی نہیں ملا؟"

تمسخرانہ لہجے میں انچارج نے پوچھا۔

"ہوں، ابھی تک تو نہیں بہتوں سے باتیں کر کے اندازہ لگایا مگر فضول اچھا آدمی ایک بھی نہیں یہ آدمی۔ ایک نظر اس نے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔

"اس نے وعدہ کیا ہے کہ یہ مجھے کچھ اچھے آدمیوں سے ملائے گا یہ مجھے اب تمہارے پاس لے آیا ہے۔"

آدمی نے معصومیت اور سادگی سے اپنی روداد بتادی۔

انچارج اسے مسلسل دیکھے جارہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ آدمی کوئی پہنچا ہوا شخص ہے یا کوئی پاگل سوچتے ہوئے اس نے تذبذب سے پوچھا۔

"تمہیں کسی اچھے آدمی کی تلاش کیوں ہے؟"

"اس طرح میری سزا ختم ہو جائے گی۔" آدمی نے اپنے مخصوص سادہ انداز میں بتایا۔

"سزا ختم ہو جائے گی، کیسی سزا، تم میری باتوں کا ٹھیک سے تفصیل سے جواب دو یہ تھانہ ہے یہاں کوئی ڈرامہ بازی کی ضرورت نہیں۔"

آدمی نے اسے تذبذب اور الجھن سے دیکھا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"دیکھو، میں نے سیکڑوں سال پہلے اپنی دانست میں ایک بھلائی کا کام کیا تھا مگر میرے لوگوں کی نگاہ میں وہ ایک جرم تھا پھر مجھے انہوں نے سزا دے دی تھی۔ میری سزا یہ تھی کہ میں ایک بھاری پتھر کو دھکیل کر اوپس کی چوٹی پر پہنچا دوں میں تب سے یہ پتھر دھکیل کر اوپر لے جاتا ہوں مگر چوٹی کے نزدیک پہنچ کر میں اس قدر تھک جاتا ہوں کہ اسے سنبھال نہیں پاتا اور پتھر چوٹی پر پہنچنے سے پہلے ہی پھر نیچے آجاتا ہے۔ مجھے دوسرے دن پھر یہی کوشش کرنی پڑتی ہے ہزار ہا سال سے میں اس کام پر لگا ہوا ہوں مگر پتھر اوپر نہیں پہنچا پاتا۔" رک کر اس نے ذرا توقف کیا پھر بولا "میں بہت زچ ہو گیا تھا پھر میں نے......!"

درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے انچارج نے کانسٹیبل کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔

"یہ سب کیا ہے آخر، یہ تم کسے پکڑ لائے ہو پتا نہیں یہ کیا بک رہا ہے؟"

"تب اس آدمی نے قدرے ناگواری سے انچارج کو دیکھا اور بولا۔ "تم لوگ واقعی بہت برے ہو انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ میں کبھی کوئی اچھا آدمی نہیں ڈھونڈ سکوں گا۔"

انچارج کے چہرے کا رنگ بدل گیا مگر کسی سوچ کے تحت اس نے تحمل کیا اور بولا۔

"آخر یہ تمہیں اچھے آدمی کی اتنی تلاش کیوں ہے جی؟"

"میں یہی بتا رہا تھا مگر تم اسے بکواس قرار دے رہے ہو، تمہیں کچھ نہیں معلوم۔"

"چلو مجھے کیا معلوم ہے اور کیا نہیں یہ میں بعد میں بتا دوں گا تم پہلے ساری بات پوری کرو۔"

"ٹھیک ہے میں کہہ رہا تھا۔" آدمی نے دوبارہ کہنا شروع کیا کہ میں سزا سے اب بے زار ہو گیا تھا۔ میں نے درخواست کی مجھے اب معاف کر دیا جائے انہوں نے میری بات مان لی ہے مگر یہ شرط لگادی ہے کہ میں ان لوگوں کے درمیان جاؤں جن کے لیے مجھ پر عتاب نازل ہوا تھا اور وہاں سے کوئی ایک اچھا آدمی تلاش کروں اچھا آدمی ملتے ہی میری سزا ختم ہو جائے گی مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ کام بھی پتھر والے کام کی طرح بے فیض ہے شاید میں ابد تک یہ سزا بھگتتا رہوں گا۔" رک کر

اس نے ایک لمبی سانس لی۔

''تمہارا جرم کیا تھا؟'' انچارج اب ذرا آرام سے بیٹھ گیا تھا شاید مذاق کے موڈ میں آ گیا تھا۔

''میں نے آگ کا پتا بتا دیا تھا۔'' آدمی نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا۔

''آگ کا پتا کسے بتا دیا تھا؟'' انچارج نے پوچھا۔

''آدمی کو۔''

''آدمی کو؟'' اچھا اور تمہیں سزا کس نے دی تھی؟''

''ملک الموت نے؟''

''نہیں، دیوتاؤں کی مجلس شوریٰ نے میں نے وہ کام کیا تھا جو ممنوع تھا۔ ان کا خیال ہے کہ آدمی اس لائق نہیں کہ اس سے تعاون کیا جائے۔''

''اچھا......اچھا میں سمجھ گیا آدمی کو تم نے آگ کا پتا بتا دیا اور دیوتاؤں نے تمہیں سزا دے دی۔ اب تم اچھا آدمی ڈھونڈ رہے ہو تاکہ تم سزا سے بچ جاؤ کیوں یہی کہانی ہے نا تمہاری؟''

''ہاں بس یہی کہانی ہے؟''

''خوب اب تک کہاں کہاں گئے تم؟'' انچارج نے پوچھا۔

''کہیں نہیں۔'' آدمی نے کہا۔

''ابھی ادھر ہی پہلی بار آیا ہوں مگر میں بہت مایوس ہو چلا ہوں۔''

''ہوائی جہاز سے آئے تھے؟'' انچارج نے پوچھا۔

''ہاں فضائی سفر کے ذریعے۔''

''آرام سے پہنچ گئے تھے؟''

''بالکل سفر میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔''

انچارج اپنی نشست پر ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا اب اس کے تیور پھر بدل گئے تھے اس بار اس نے اپنے ماتحت کو مخاطب کیا اور بولا ''اس کا میڈیکل چیک اپ کرانا ہوگا۔''

''ارے نہیں سر یہ بالکل بھلا چنگا ہے۔'' کانسٹیبل نے کہا۔

''بس تھوڑی خاطر مدارت چاہیے اسے۔''

''ہوں۔'' انچارج نے ہنکارہ بھرا اس نے آدمی سے کہا۔

''میں نے تمہاری کہانی سن لی، اب ایسا کرو اپنی اصلی کہانی بھی سنا دو، شرافت سے بتا دو گے تو تمہی کو فائدہ ہوگا۔''

آدمی نے اسے حیرت سے دیکھا اور بولا۔

''یہ میری اصلی کہانی تھی۔''

''یعنی تم کچھ اور نہیں بتاؤ گے۔'' انچارج نے کڑی نگاہوں سے گھورا۔

''میں اور کیا بتاؤں جو کچھ تھا وہ تمہیں بتا دیا۔''

''سادگی سے آدمی نے کہا اس نے کانسٹیبل کی سمت دیکھا اور بولا۔

''اس نے کہا تھا میری مدد کر سکتا ہے۔''

تب انچارج نے اپنے ماتحت سے کہا ''مجھے لگتا ہے ہمیں دیوتا جی کی مدد کرنی ہی پڑے گی۔''

''جی سر میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔'' کانسٹیبل نے تائید کی۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ لے جاؤ اور ذرا تفصیل سے معلوم کرو۔''

''جی آپ فکر ہی نہ کریں۔'' کانسٹیبل نے سارے دانت باہر نکالتے ہوئے کہا پھر وہ آدمی سے بولا۔

''آؤ جی چلو میرے ساتھ میں تمہیں اچھے آدمیوں سے ملواؤں۔''

کانٹا

خلیل جبار

پروفیسر اور صحافی خلیل جبار کی اب تک کورٹ کہانیاں نئے افق کی زینت بنتی رہی ہیں، قارئین کا ایک طبقہ انہیں اسی حوالے سے جانتا ہے گو زیر نظر کہانی روایت سے ذرا ہٹ کر ہے لیکن اس میں بھی آپ کو انسان دوستی اور ہمدردی کا ایک سبق ملے گا۔

میں اس وقت اپنے ٹرک میں آرام کر رہا تھا۔ میں کراچی سے ٹرک میں مال لوڈ کر کے چلا تھا۔ اور یہ مال صادق آباد پہنچانا تھا۔ صادق آباد ابھی دور تھا۔ تھکن اور نیند سے میری آنکھیں بوجھل تھیں۔ اس وقت میں ٹرک میں اکیلا تھا میرا ساتھی آج میرے ساتھ نہیں تھا۔ اسے اپنے گاؤں نیو سعید آباد میں کام تھا۔ اس لیے وہ اپنا گاؤں آنے پر اتر گیا تھا۔ نیند سے بوجھل آنکھیں مجھے مجبور کر رہی تھیں کہ اب آرام کر لینا چاہیے۔ رات میں ذرا سی آنکھ بند ہونے پر کوئی بھی بڑا سانحہ ہو سکتا تھا۔ ٹرک کچے میں اتر کر الٹ سکتا ہے۔ سامنے آنے والی مسافر بس سے ٹکرا سکتا ہے۔ غرض کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میرے ساتھ میرا ساتھی ہونے پر وہ مجھے باتوں میں لگا کر رکھتا اور میں کسی طرح نیند آنے کے باوجود باتوں میں ڈرائیونگ کرنے کا رسک لے سکتا تھا۔

ڈرائیور اپنے ساتھی سے بات کرنے کے ساتھ باہر عقبی آئینے میں اپنے پیچھے آنے والی گاڑیوں پر بھی آسانی سے نظر رکھے رہتے ہیں۔ کوئی رسک لینے سے بہتر ہے کہ انسان ٹرک کسی ہوٹل کے سامنے کھڑا کر کے سو جائے۔ یا ٹرک زیادہ ہونے پر کسی سڑک کے کنارے ٹرک کھڑا کر کے ہم سو جاتے ہیں۔ البتہ اکیلے میں ایسا کرنے کا رسک نہیں لیتے کہ کوئی بھی لٹیرا آ کر ہمیں لوٹ سکتا ہے۔ ٹرک یا اس میں موجود سامان کو لوٹ سکتا ہے۔ ٹرک مالکان شک کرتے ہیں ہم نے ٹرک کسی کو بیچ دیا ہے اور اب لٹنے کا ڈرامہ کر رہے ہیں۔ اس طرح ٹرک میں جس مالک کا مال ہو وہ بھی یہی شک کرتا ہے کہ تم نے کہیں اور مال اتار کر پیسے کھرے کر لیے ہیں۔ کام کوئی بھی ہو وہ حلوے کی طرح نہیں ہوتا۔ کچھ نہ کچھ پیچیدگیاں ضرور ہوتی ہیں۔ ہر کام آسان ہو جائے تو پھر کام کرنے والوں کی کوئی قدر کیوں کرے۔ خود ہی سارے کام کر لیں۔

میں نے اپنا ٹرک ایک ہوٹل کے نزدیک ہی کھڑا کیا تھا کہ کچھ وقت گزرنے پر دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نیند میں تھا۔ اس لیے دستک پر غور نہیں کیا۔ جب دستک دو تین بار ہوئی تو میں چونکا اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ میرا یہاں کوئی شناسا بھی نہیں ہے۔ جو مجھ سے ملنے آ جائے۔ کہیں کوئی لوٹنے کے ارادے سے تو نہیں آ گیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا میں ابھی انہیں سوچوں میں گم تھا کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ مجبوراً اٹھنا پڑ گیا۔ دروازے کی کھڑکی کا شیشہ ہٹا کر میں نے باہر کی طرف دیکھا وہ کوئی خاتون تھی۔ ضرور ہے کوئی دو نمبر خاتون ہے۔ میرے دل میں خیال آیا۔ اکثر ہمارا ایسی خواتین سے واسطہ پڑتا ہے۔

ہم ڈرائیور لوگ بھی کیا کریں۔ اپنے گھروں سے ایک ماہ' دو ماہ دور رہتے ہیں۔ اس لیے ہمیں اس قسم کی پیشہ ور خواتین کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ ان کی ضرورت پیسہ اور ہماری ضرورت ان کا جسم ہوتا ہے۔ انتہائی کم قیمت پھر دونوں کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے میں نے بھی کسی مجبور عورت کی مجبوری کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ جب پیسوں میں معاملہ طے ہو جاتا ہے پھر مجبوری کہاں سے آ گئی۔ ہم ڈرائیوروں کو بعض دفعہ رات میں ایسے مواقع مل جاتے ہیں کہ کوئی اپنے شوہر کے ظلم کا شکار' کوئی اپنے آشنا سے ملنے یا کسی اور مجبوری میں گھر سے

رات کی تاریکی میں نکل کھڑی ہوتی ہیں۔ انہیں رات کی تاریکی میں فرار ہونا ہوتا ہے۔ رات میں انہیں بس نہیں ملتی۔ اگر سڑک پر سے کوئی بس گزر بھی رہی ہو تو ڈرائیور بس نہیں روکتا انہیں ڈر ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ خاتون ڈاکوؤں سے ملی ہوئی ہو اور ڈاکو درختوں کے جھنڈ یا جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے ہوں۔ جیسے ہی بس رکی وہ جھاڑیوں میں سے نکل آئے۔ اس لیے وہ کسی بھی قسم کا رسک لینے سے گریز کرتے ہیں۔ ہم ٹرک ڈرائیور انسانی ہمدردی کی بنیاد یا موقع سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے ٹرک روک لیتے ہیں۔

میں بھی کوئی پارسا نہیں بلکہ میں نے کچھ ایسے واقعات سنے ہیں جنہیں سن کر میں نے عہد کرلیا تھا کہ میں زندگی میں کبھی بھی ایسا کوئی غلط کام نہیں کروں گا۔ جو عبرت کا نشان بن جاؤں۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے میں بہت کم عمری میں ڈرائیونگ لائن میں آ گیا تھا۔

میرے گھر کے حالات ایسے نہیں تھے کہ میں آگے پڑھ سکتا۔ میرے والد ایک نشئی تھے میری ماں ساجدہ مختلف گھروں میں کام کاج کر کے گھر کا خرچ چلا رہی تھی۔ اس نے مجھے ڈرائیور عمران کے پاس کام سیکھنے کی غرض سے لگا دیا تھا۔ میرا استاد عمران بہت عیاش قسم کا نوجوان تھا۔ ٹرک پر جب بھی جسم فروشی کا دھندا کرنے والی عورت نظر آتی وہ مجھے ٹرک کی صفائی کے کام پر لگا دیتا۔ میں اتنا چھوٹا بچہ نہیں تھا جو نا سمجھ سکتا۔ جب میں جوان ہوا ٹرک چلانا سیکھ چکا تھا۔

ہم ایک گاؤں میں مال اتار کر آ رہے تھے۔ نا جانے وہ کون سا گاؤں تھا۔ ایک جگہ ایک لڑکی نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ استاد نے جو لڑکی کو سڑک پر کھڑا دیکھا خوشی سے اس کی باچھیں کھل اٹھیں تھیں۔ ٹرک کی روشنی میں اس لڑکی کا

چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ بہت ہی خوب صورت لڑکی تھی۔ استاد عمران نے ایک دم ٹرک کو بریک لگا دیا۔ بریک لگنے پر درخت کے پیچھے سے ایک نوجوان بھی سامنے آ گیا۔ ایک لمحے کو استاد عمران کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس سے ٹرک روک کر غلطی ہو گئی ہے۔ ٹرک کو بریک لگ چکا تھا۔ اس لیے مجبوری تھی۔

''ہم بڑی مصیبت میں ہیں پلیز ہماری مدد کرو۔'' نوجوان بولا۔

''کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔'' استاد نے پوچھا۔

''ہمارے پیچھے لوگ لگے ہوئے ہیں وہ ہمیں جان سے مار دینا چاہتے ہیں۔''

''کیوں؟''

''تفصیل ہم بعد میں بتا دیں گے فی الحال ہمیں ٹرک میں سوار ہونے دیں۔'' لڑکی نے کہا۔

''تمہارے پاس کوئی اسلحہ وغیرہ تو نہیں ہے؟'' استاد نے شک بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔

''ہماری تلاشی لے لو۔'' نوجوان نے کہا۔

''ہم تلاشی بعد میں لیں گے فی الحال تم ٹرک پر سوار ہو جاؤ ورنہ تمہارے پیچھے جو لوگ لگے ہوئے ہیں وہ یہاں آ جائیں گے اور ہمارے لیے بھی پریشانی ہو جائے گی۔'' استاد نے کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دونوں ٹرک کے پچھلے حصے میں سوار ہو گئے۔

ان کے ٹرک میں بیٹھتے ہی استاد نے ٹرک چلا دیا۔

استاد کے چہرے پر ایک خاص قسم کی چمک آ گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ استاد کے ذہن میں کوئی شیطانی منصوبہ آ گیا ہے۔ استاد نے اپنے پیچھے کھلنے والی چھوٹی کھڑکی کھول کر نوجوان کو بلایا۔

''ہاں یہ بتاؤ کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟''

''ہم دونوں نے پسند کی شادی کر لی ہے۔ اس لیے لڑکی کے گھر والے ہمارے خلاف ہو گئے ہیں۔ ہم دونوں نے اس گاؤں میں اپنے دوست رضوان کے گھر پناہ لی ہوئی تھی مگر انہیں خبر ہو گئی۔ وہ صبح تک یہاں پہنچنے والے ہیں اس لیے ہمارے پاس یہی راستہ تھا کہ صبح ہونے سے پہلے یہاں سے نکل جائیں۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ تمہارے پناہ لینے کی انہیں خبر ہو گئی ہے۔''

''ہمارے رشتے دار کریم بخش کی زبانی علم ہوا ہے۔ اس نے میرے دوست رضوان کو بتا دیا تھا۔'' نوجوان نے کہا۔

''یہ تم نے اچھا کیا ورنہ وہ لوگ تمہیں زندہ نہیں چھوڑتے۔'' استاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہم رات کی تاریکی میں یہاں سے نکل جائیں گے جب وہ صبح یہاں آئیں گے ہم انہیں نہیں مل پائیں گے۔'' نوجوان نے کہا۔

''تم دونوں نے پسند کی شادی کرنے سے پہلے والدین سے بات کیوں نہیں کی۔ ان سے بات کر لینے پر تمہیں اس گھر سے بے گھر نہ ہونا پڑتا۔''

''میں نے اپنے والدین سے بات کی تھی اور وہ میری پسند پر راضی تھے مگر فرزانہ کے والدین اس رشتے پر تیار نہ ہوئے۔''

''وہ کیوں؟''

''وہ اپنی لڑکیوں کی شادی برادری سے باہر نہیں کرتے اس لیے انہوں نے اس رشتے سے انکار کر دیا۔''

''ہم لوگوں میں یہی خرابی ہے۔ جب لڑکا اور لڑکی تیار ہو تو شادی کر دینی چاہیے۔'' استاد نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

''صبح ہونے میں ابھی خاصا وقت ہے۔'' ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ ٹرک کی ہیڈ لائٹس تاریکی کا سینہ چیر کر راستہ دکھا رہی تھی۔ اچانک ٹرک کو چلتے چلتے بریک لگا اور ٹرک ایک جھٹکے سے رک گیا۔

''اس ٹرک کو کیا ہو گیا ہے۔'' استاد بڑبڑایا۔

دور دور تک کھیت کا سلسلہ تھا۔ کسی کو مدد کے لیے بھی نہیں بلایا جا سکتا تھا۔ استاد ٹرک سے اتر گیا۔ ٹرک کے انجن کو دیکھنے لگا۔ گاڑیاں چلاتے چلاتے ڈرائیور حضرات خود بھی آدھے مکینک بن جاتے ہیں۔ اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے اچانک ایسی جگہ گاڑی خراب ہو جائے جہاں مکینک کا دور دور تک نام و نشان نہ ہو ایسے میں ڈرائیور چھوٹی موٹی خرابی خود ہی درست کر لیتے ہیں اور ہمارے

ساتھ جو دو بندے اور تھے وہ بھی ٹرک سے اتر آئے۔ وہ نوجوان جس کا نام کاشف تھا وہ بھی ٹرک سے اتر آیا۔

’’کیا ہوا؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے پانی ڈالنا پڑے گا اور کچھ دیر انجن کو آرام دینا پڑے گا۔‘‘ استاد نے کہا۔

میری نظر استاد کے چہرے کی طرف ہی تھی اس کے چہرے کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ بظاہر وہ خاموش ہے مگر اس کا ذہن کچھ سوچ رہا ہے۔ وہ اس وقت کیا سوچ رہا ہے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ استاد نے ٹھنڈا پانی ڈال کر انجن کو ٹھنڈا ہونے کے لیے چھوڑ دیا۔ کاشف بڑے غور سے استاد کو ہی دیکھ رہا تھا۔ لڑکی ابھی تک ٹرک کے اندر ہی تھی۔ وہ ٹرک کے ایک کونے میں سہمی ہوئی بیٹھی تھی نا جانے استاد نے میرے ساتھی کلینر رفیق کو کیا اشارہ کیا تھا۔ رفیق نے بڑی پھرتی سے عمران کے سر پر کسی چیز کا وار کیا اور وہ دھم سے زمین بوس ہوگیا۔ عمران کے بے ہوش ہوتے ہی استاد رفیق اور رحمٰن ٹرک میں سوار ہوگئے۔ انہیں ٹرک میں سوار ہوتا دیکھ کر میں بھی ٹرک میں سوار ہوگیا۔ ٹرک پھر سے سڑک پر دوڑنے لگا۔ فرق اتنا تھا کہ اب ڈرائیور کی سیٹ پر رفیق بیٹھا تھا۔ اس کے برابر میں، میں بیٹھا تھا۔ جب کہ استاد اور رحمٰن ٹرک کے پچھلے حصے میں چلے گئے تھے۔

’’وہ کاشف کہاں ہے؟‘‘ لڑکی نے پوچھا۔

’’کاشف بھی آجائے گا اس کی خاطر تم کیوں دبلی ہو رہی ہو۔‘‘ استاد نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔

’’ٹرک کو روکو اور کاشف کو بلاؤ۔‘‘ فرزانہ نے کہا۔

’’دیکھو لڑکی زیادہ شور شرابہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے یہ ٹرک اب نہیں رک سکتا۔‘‘

’’کیوں نہیں رک سکتا اور کاشف کہاں ہے؟‘‘ وہ غصے سے بولی۔

’’تم مجھے سمجھ دار لڑکی لگتی ہو اس لیے میری بات کو غور سے سنو اور اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔‘‘

’’کیا سمجھوں؟‘‘

’’یہی کہ ہمارا کاشف سے سودا ہوگیا ہے اور وہ تمہاری قیمت لے کر رفو چکر ہوگیا ہے۔‘‘ استاد عمران نے صاف جھوٹ بولا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو سچ سچ بولو تم نے کاشف کے ساتھ کیا کیا ہے؟" فرزانہ غصے سے چیخی۔

"زیادہ چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ہے جو کام خاموشی سے ہو جائے وہ اچھا ہوتا ہے تم ہماری بات نہ مان کر نقصان میں رہو گی ہمیں جو کرنا ہے وہ کر کے ہی رہیں گے چاہے چیخو یا خاموش رہو۔"

"تت......تت تم کک کیا کرنا چاہتے ہو؟" لڑکی گھبرا گئی۔

"ہمیں خوش کر دو، پھر جہاں بولو گی ہم تمہیں اتار دیں گے۔"

"نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا' میں کاشف کی امانت ہوں تم بتاتے کیوں نہیں ہو کہ کاشف کہاں ہے اور تم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟"

"جان کر کیا کرو گی چلو میں تمہیں بتائے دیتا ہوں اسے ہم بے ہوش کر کے وہیں چھوڑ آئے ہیں جہاں ٹرک تھوڑی دیر کو رکا تھا۔" استاد نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"مجھے ٹرک سے اتار دو ورنہ میں ٹرک سے چھلانگ لگا دوں گی۔" وہ ٹرک سے کودنے کو لپکی۔

"میری جان اتنی جلدی کیا ہے ٹرک سے کودنے کا اتنا ہی تمہیں شوق ہے تو وہ موقع تمہیں فراہم کر دیں گے پہلے ہمیں خوش کر دو۔" یہ کہتے ہوئے استاد نے لڑکی کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

لڑکی مچلی اس نے خدا اور رسول ﷺ کا انہیں واسطہ دیا مگر استاد کے ذہن پر شیطان سوار ہو گیا تھا وہ کیسے اتر سکتا تھا۔ اس لیے استاد رحمن اور رفیق نے باری' باری اپنی ہوس مٹائی۔ میں ٹرک کی کھڑکی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا مگر میں چھوٹا سا لڑکا کر بھی کیا سکتا تھا۔ استاد نے جی بھر جانے پر لڑکی کو سڑک کے کنارے پھینک دیا تھا اس کی حالت غیر ہو رہی تھی اس نے استاد کو جی بھر کر گالیاں اور بددعائیں دی تھیں اور استاد ڈھیٹ بن کر سنتا رہا اور کہتا رہا۔ "گالیاں دیتی رہ اور بددعائیں بھی، ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔"

یہ استاد کی خوش فہمی تھی لڑکی کی یہ بددعائیں رنگ لائیں ابھی صبح ہوتے بھی نہ پائی تھی کہ ہمارا ٹرک ایک مسافر بس سے ٹکرا کر ٹرک الٹ گیا۔ ٹرک کے ساتھ استاد اور اس کے ساتھی بھی شدید زخمی ہوئے تھے میں بھی اس ٹرک میں موجود تھا لیکن مجھے معجزانہ طور پر معمولی سی خراش نہیں آئی تھی میں خود حیرت زدہ تھا کہ میں کیسے بچ گیا۔

استاد رفیق اور رحمٰن کی حالت انتہائی خراب تھی۔ انہیں اسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا استاد کی ایک ٹانگ کاٹ دی گئی تھی رفیق اور رحمٰن بھی شدید زخمی ہوئے تھے وہ تینوں کئی ماہ تک اسپتال میں زیر علاج رہے۔ اسی نوعیت کے کئی واقعات میں نے سنے تھے۔ جنہیں سن کر میں نے اپنے دل میں یہ عہد کیا تھا کہ کبھی بھی کسی بے بس عورت کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھاؤں گا۔ کوئی اپنی مرضی سے خود کو پیش کرے گی میں اسے نہیں ٹھکراؤں گا۔ وہ دودھیائی رنگت کی مالک خاتون تھی۔ چاند کی روشنی میں اس کا حسن اور بھی دلکش لگ رہا تھا میرے دیکھنے پر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"کیا میں ٹرک میں آ سکتی ہوں؟"

"ٹرک کے اندر۔" میں سوچ میں پڑ گیا۔ "کیا ارادے ہیں تمہارے؟"

"میرا ارادہ کچھ نہیں ہے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"میری مدد کی ضرورت ہے؟" میں چونکا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ میں اندر آ جاؤں پھر تم جو مجھ سے پوچھنا چاہتے ہو وہ پوچھ لینا۔"

میں نے ایک نظر باہر کی طرف ڈالی۔ دور دور تک لوگ نظر نہیں آ رہے تھے اور آتے بھی کیسے یہ رات کا ایسا پہر تھا کہ دن بھر کام میں مصروف رہنے والے لوگ خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہوتے ہیں۔ البتہ ہوٹل میں کام کرنے والے چند ملازم تھے وہ بھی ہوٹل میں کام نہ ہونے پر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

ڈرائیوروں کے ساتھ مختلف حادثات ہوتے رہتے ہیں کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ عجیب و غریب واقعات پیش آ جاتے ہیں۔ ان واقعات میں ویران جگہوں یا ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان سے گزرنے پر اچانک کوئی دوشیزہ سامنے آ جاتی ہے۔ مجبوراً ہمیں ٹرک روکنا پڑتا ہے دوشیزہ ہم سے گزارش کرتی ہے کہ مجھے تھوڑی دور جانا ہے وہاں اتار دینا۔ ہم اس دوشیزہ کو ٹرک میں بٹھا بھی لیتے ہیں مگر جب تھوڑی دور جانے پر

اس سے پوچھتے ہیں کہ تمہیں کہاں اترنا ہے تو اس کا وجود ہی ٹرک میں نہیں ہوتا۔ ایک بار میرے ساتھ بھی ایسا واقعہ ہو چکا تھا جمعہ کا دن تھا۔ میں سانگھڑ مال پہنچانے کی غرض سے روانہ ہوا۔ راستے میں ہی جمعہ کی نماز ادا کی اور سانگھڑ پہنچ کر مال اتارنے اور وہاں سے روانگی میں مجھے دیر ہوگئی تھی میں نے رات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے واپس کراچی روانہ ہوگیا۔ میرا کراچی پہنچنا ضروری تھا۔ ہفتے کی دوپہر کو مجھے ایک جگہ سے مال لوڈ کرا کر کشمور جانا تھا اس لیے میں نے آرام کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ رات کو گھر پہنچ کر آرام کر لینے سے ایک فائدہ تھا کہ میں آسانی سے کشمور پہنچ جاؤں گا۔

میں اس وقت گھنے کھیتوں کے درمیان سے گزر رہا تھا کہ اچانک سڑک پر ایک عورت کھڑی نظر آئی۔ میں نے ٹرک کو روک دیا۔ وہ ٹرک رکنے پر میرے پاس آئی۔

''کیا تم مجھے ٹنڈو آدم چھوڑ دو گے؟''

''ہاں چھوڑ دوں گا' میں بھی وہیں جارہا ہوں۔'' میں نے صاف جھوٹ بولا۔

''مجھے کراچی ہالا روڈ جانا تھا مگر اس خوبصورت عورت کو دیکھ کر میرا دل چاہا کہ وہ میرے ٹرک میں بیٹھ جائے۔ اگر آسانی سے قابو آگئی تو ٹھیک ہے ورنہ اسے ٹنڈو آدم اتار دوں گا وہ میرے ٹرک میں بیٹھ گئی وہ انتہائی خوبصورت دوشیزہ تھی۔ میرا دل اسے دیکھ کر بار بار اس پر مرمٹنے کو تیار ہو رہا تھا میں ٹرک کو ابھی زیادہ دور لے کر نہیں گیا تھا کہ میں نے دیکھا وہی دوشیزہ سڑک پر پڑی ہے اور اس کی گردن کٹی ہوئی ہے مجھے حیرت کا جھٹکا لگا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ تو میرے پاس بیٹھی ہوئی ہے۔ میں نے جب اسے دیکھا وہ زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے غائب ہوگئی میں ٹرک کو بریک لگا چکا تھا۔ میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں' میں کسی طرح بھی ٹرک اس پر سے لے جا سکتا تھا میری یہ مشکل خود بخود حل ہوگئی۔ وہ لاش سڑک پر سے غائب ہوگئی اور میں ٹرک کو تیزی سے آگے بڑھاتا ہوا چلا گیا۔ اس دن میں نے توبہ کر لی کبھی کسی عورت کو ایسی جگہوں پر ٹرک میں سوار نہیں ہونے دوں گا۔ اگر کوئی عورت ہوٹل کے پاس ملے گی تو ضرور ٹرک میں بٹھا لوں گا۔

آجاؤ۔'' میں نے ٹرک کا دروازہ کھولا۔ وہ ٹرک کے اگلے حصے میں چلی آئی۔

''تم اس وقت کہاں جارہے ہو؟''

''میں صادق آباد جاؤں گا۔'' میں نے بتایا۔

''مجھے بھی ساتھ لے چلو۔''

''تمہارے ساتھ اور کون ہے؟''

''میں اکیلی ہوں۔'' وہ بولی

''اس رات میں تمہیں میرے ساتھ سفر کرتے ہوئے ڈر نہیں لگے گا۔''

''جس کا موت پیچھا کر رہی ہو وہ انسان صرف اپنی زندگی بچانے کی فکر کرتا ہے۔''

''موت پیچھا کر رہی ہے۔'' مجھے زوردار جھٹکا لگا۔

''ہاں اگر میں اس علاقے سے نکل جانے میں کامیاب ہو جاتی ہوں تو زندگی بچ جائے گی ورنہ صبح ہونے پر وہ مجھے قتل کر دے گا۔''

''وہ کون؟''

''میرا شوہر رمضان۔'' وہ بولی

''ایسی کیا وجہ ہوگئی ہے کہ تمہارا شوہر دشمن بن گیا ہے۔'' میں حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

''یہ باتیں راستے میں ہو جائیں گی تم ٹرک کو اسٹارٹ کرو۔'' مجھے اس کی کہانی سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔

''دیکھیے محترمہ......''

''مجھے نازو کہتے ہیں۔'' وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''نازو مجھے سخت نیند آرہی تھی نیند کی حالت میں ڈرائیونگ کرنا ایکسیڈنٹ کا سبب بن سکتا ہے اسی بنا پر میں سونے کیلئے رک گیا تھا۔''

''لیکن مجھے رات میں ہی یہاں سے نکلنا ہے اور اس وقت یہاں مجھے گاڑی نہیں مل سکتی میں کیا کروں۔'' وہ پریشان سی ہوگئی۔

''رات کے اس پہر گاڑی تو نہیں مل سکتی۔'' ہاں ایک کام ہو سکتا ہے میں نے کہا۔

''وہ کیا؟'' وہ چونک کر بولی۔

''میرا ساتھی میرے ساتھ نہیں اسے کام تھا اس لیے وہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

راستے میں اتر گیا تھا میں ڈرائیونگ کرنے کو تیار ہوں مگر مجھے ایک ساتھی چاہیے جو دوران ڈرائیونگ مجھ سے باتیں کرتا رہے۔ اس طرح میرا ذہن بیدار رہے گا اور ہم کسی حادثے سے بچے رہیں گے۔"

"ٹھیک ہے میں تم سے باتیں کرتی رہوں گی اور تم ڈرائیونگ کرتے رہنا۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

"پھر ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

"یہی بات یہ تھی مجھے اس میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی وہ میرے من کو بھا گئی تھی اس کے ساتھ میں چند لمحات گزارنا اپنی خوش بختی سمجھ رہا تھا وہ میرے پاس گھبرائی ہوئی آئی تھی مگر میرے ٹرک اسٹارٹ کر کے چلا دینے پر مطمئن ہوگئی تھی میں کچھ دیر پہلے گہری نیند میں ڈوب رہا تھا مگر اس حسینہ نے میری نیند ہی اڑا دی تھی۔

"ایک طرح سے میں تمہیں اپنے شوہر سے دور کر کے بھیانک جرم کر رہا ہوں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس جرم کے لیے میں نے تمہیں مجبور کیا ہے کیونکہ؟"

"زندگی کا سوال ہے، میرے اس جرم نہ کرنے پر تمہارا شوہر رمضان تمہیں قتل کر دے گا۔" میں نے اس کی بات مکمل کر دی۔

"ہاں یہی بات ہے۔" وہ بولی۔

"اب بتاؤ کہ تمہارا شوہر تمہیں کیوں قتل کرنا چاہتا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ایک چڑیل کی خاطر؟" وہ غصے سے بولی۔

"میں نے سنا ہے کہ چڑیل انسان کو نقصان پہنچاتی ہے اب چڑیلیں قتل بھی کرانے لگی ہیں۔" میں زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"وہ لڑکی چڑیل صفت ہے، مجھ سے میرا شوہر چھین کر خود اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

"کسی کا گھر اجاڑ کر اپنا گھر آباد کرنا یہ اچھی بات نہیں ہے۔"

"میرے شوہر رمضان کے پاس مال بہت ہے ٹھیک ٹھاک پراپرٹی ہے بینک بیلنس ہے اس لیے اس چڑیل نے میرے شوہر رمضان کو اپنے جال میں پھانس لیا ہے تاکہ اس سے شادی کر کے عیش کی زندگی گزارے۔"

"تمہارا شوہر رمضان اس کے چکر میں کیسے آ گیا ہے؟"

"نائلہ چڑیل میرے شوہر کی کزن ہے میرا شوہر اس سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر ان دنوں وہ اسحاق کے چکر میں تھی۔ اسحاق کا دبئی میں بڑا کاروبار ہے۔ وہ اس کے ساتھ شادی کر کے دبئی جانا چاہتی تھی میرے شوہر رمضان کے گھر والے جب رشتے کی بات کرنے گئے نائلہ کے گھر والوں نے اس رشتے سے صاف انکار کر دیا۔ میری رمضان سے شادی ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ اسحاق نے بھی دبئی میں مقیم ایک فیملی میں ریحانہ نامی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ اس کے شادی کرنے پر نائلہ پچھتا رہی ہے کہ اسحاق کے چکر میں رمضان بھی گیا۔ ہمارے گاؤں میں رمضان کی مالی پوزیشن بہت اچھی ہے کیونکہ رمضان کے والد اچھی خاصی پراپرٹی و دولت چھوڑ کر انتقال کر چکے ہیں اور ان کے انتقال ہو جانے پر وہ دولت رمضان کو مل گئی ہے۔"

"یہ سب تمہاری باتیں درست مان لیتا ہوں لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ رمضان تمہیں قتل کر دے گا۔" میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"میں نے چھپ کر رمضان کی باتیں سن لی تھیں وہ نائلہ کو موبائل پر کہہ رہا تھا کہ میری جان نائلہ تم فکر نہ کرو میں صبح اس قصے کو ہی ختم کر دوں گا۔ کل صبح میرا رشتہ دار اشرف آئے گا میں گھر میں دونوں کو قتل کر دوں گا اور ان پر کاروکاری کا الزام لگا دوں گا اور پھر ہم دونوں کی شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔"

دوران سفر نازو سے باتیں کر کے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ زبان کی تیز ہے جب کہ نائلہ کی زبان میں مٹھاس زیادہ ہے اسی لیے اس کا شوہر رمضان نائلہ کے زیادہ قریب آ گیا ہے مرد کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جب وہ اپنی بیوی کے پاس جائے وہ شکایات کا انبار لگانے کے بجائے ایسی باتیں کرے جس سے اس کی طبیعت خوش ہو جائے دن بھر کی تھکان دور ہو جائے جب صادق آباد قریب آنے لگا میں نے اس سے پوچھا۔

"صادق آباد میں تم کس کے پاس جاؤ گی۔" نازو

میرے سوال پر سوچ میں پڑ گئی۔

"میرا مطلب ہے صادق آباد میں تمہارے والدین کا گھر ہے یا کسی عزیز رشتے دار کے یہاں پناہ لوں گی۔" میں نے پوچھا۔

"صادق آباد میں ہمارا کوئی بھی نہیں ہے۔"

"پھر تم صادق آباد کیوں آ گئی ہو۔"

"بس تم صادق آباد جا رہے تھے اس لیے میں نے کہہ دیا کہ صادق آباد جانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صادق آباد میں ہمارا کوئی بھی نہیں ہے، میرے والدین کراچی میں رہتے ہیں۔" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے میں تمہیں کراچی لے جاتا ہوں ادھر ادھر بھٹکنے سے بہتر ہے کہ تم اپنے والدین کے گھر چلی جاؤ وہ زیادہ بہتر رہے گا۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"ہاں میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔"

"مجھے صادق آباد میں سامان اتارنا ہے پھر میں واپس کراچی کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

صادق آباد میں جتنی دیر سامان اترتا رہا میں ٹرک پر آرام کرتا رہا سامان اتر جانے پر بھی میں نے کچھ دیر مزید آرام کیا پھر میں کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔ جب کھانے کا وقت ہوتا میں کسی ہوٹل پر ٹرک روک دیتا۔ کھانا کھا کر میں پھر اپنا سفر شروع کر دیتا۔ جب آرام کی ضرورت ہوتی کچھ دیر کو آرام کر لیتا۔ نازو کی ٹرک میں موجودگی سے میں بوریت کا شکار نہیں ہو رہا تھا۔ اس سے بات چیت کرنے میں وقت اچھا کٹ رہا تھا۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنی اچھی بیوی کے ہوتے ہوئے وہ دوسری عورت کی طرف کیوں مائل ہو رہا ہے۔ عورتیں باتونی اور ناسمجھ ہوتی ہیں انہیں اسی انداز سے چلایا جاتا ہے کوئی تیز زبان ہو اس کی یہ سزا تو نہیں ہوتی کہ اسے کاری کے الزام میں مار دیا جائے۔ میں خود نازو کے حسن کو دیکھ کر بے ایمان ہوا جا رہا تھا۔ مگر میں اپنے اصول سے ہٹ نہیں سکتا۔ میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ کسی کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔ ورنہ اس کی سزا جلد یا بدیر ملتی ضرور ہے۔ وہ میری پناہ میں آ گئی تھی اور میرا فرض بن گیا تھا کہ میں اس کی بھرپور طریقے سے حفاظت کروں۔

کراچی آنے پر میں نے اسے ایک جگہ اتار دیا تھا مگر

میں نے اس کا پتہ اور موبائل فون نمبر لے لیا تھا۔ موبائل نمبر دیتے ہوئے وہ تھوڑا سا ہچکچائی تھی جس پر میں نے کہا۔

"گھبراؤ نہیں میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو خواتین کو تنگ کرتے ہیں۔"

"ہاں میں سمجھ گئی ہوں۔"

"وہ کیسے؟" میں چونکا۔

"کسی انسان کی شرافت کا اندازہ اس کے ساتھ سفر کر کے ہو جاتا ہے میں نے تمہارے ساتھ سفر کر کے دیکھ لیا ہے میں مجبور اور بے بس تھی تم نے میری مجبوری کا کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس سے بڑھ کر تمہاری شرافت کا اور کیا سرٹیفکیٹ ہو سکتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"میں نے تمہارے ساتھ سفر کیا ہے اس دوران مجھے تم سے انسیت سی ہو گئی ہے اور میں چاہتا ہوں اگر مستقبل میں تمہیں میری ضرورت یا کسی قسم کی گواہی کی ضرورت پڑ جائے تو میں کام آ جاؤں۔" میں نے کہا۔

"ہاں میں سمجھ رہی ہوں۔" وہ بولی۔

میں نے نازو کو اپنا نمبر دیا جو اس نے اپنے موبائل میں سیو کر لیا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ نازو کو چھوڑ کر مجھے ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ میرا نازو کے سسرال گاؤں جانا پڑ گیا۔ مجھے مال اتروانے میں رات خاصی دیر ہو گئی میں نے بہتر یہی سمجھا کہ وہیں رک جاؤں اور آرام کر لوں۔ جس گودام میں ٹرک سے مال اتارا گیا تھا وہاں دو چار پائیاں اور بستر موجود تھا۔ ایک چار پائی پر چوکیدار سو گیا اور دوسری چار پائی پر میں سو گیا۔ دوسرے دن میرے پاس کوئی مال پہنچانے کا آرڈر نہیں تھا اس لیے دن چڑھے تک سوتا رہا۔

ہوٹل پر ناشتہ کرتے ہوئے میرے دل میں بے اختیار یہ خواہش جاگی کہ کسی طرح رمضان سے ملاقات کروں یہ خیال دل میں آتے ہی میں بے چین ہو گیا مگر میں کس حیثیت سے رمضان سے ملاقات کروں اگر میں نے اسے یہ بتا دیا کہ میں نے نازو کو فرار ہونے میں اس کی مدد کی ہے تو وہ میری جان کا دشمن بھی بن سکتا تھا۔ ممکن ہے وہ مجھے نازو کا آشنا سمجھتے ہوئے قتل کر دے۔ میں اس کا دشمن بھی نہیں تھا۔ تو اسے کسی قسم کا نقصان بھی نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ میں ان دونوں کی بھلائی چاہتا تھا۔ نازو نے میرے ساتھ سفر کیا تھا۔ اس لیے میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو گیا اور میں چاہتا تھا کہ رمضان نائلہ کے چکر میں پڑ کر اپنی زندگی خراب نہ کرے۔

نازو اپنے شوہر رمضان سے بہت محبت کرتی تھی اس کے ساتھ سفر کر کے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ زبان کی تیز ضرور تھی مگر دل کی بری نہیں تھی اور نہ ہی غلط کردار کی تھی میں نازو اور رمضان کا دل سے بھلا چاہ رہا تھا۔ اس لیے میری یہ خواہش پوری ہونے کا خود بخود سلسلہ بن گیا میں ہوٹل سے ناشتہ کر کے فارغ ہوا۔ گودام کا چوکیدار کسی آدمی کو لے کر آ گیا۔

"یہ سائیں رمضان ہیں۔ ان کا مال مختلف شہروں میں جاتا رہتا ہے۔ آج انہیں اپنا مال سانگھڑ پہنچانا تھا مگر جس ٹرک سے مال جاتا ہے وہ اچانک خراب ہو گیا ہے اور انہیں مال آج ہی پہنچانا ہے کیا تم ان کا مال سانگھڑ پہنچا دو گے۔"

"ہاں میں پہنچا دوں گا۔" میں نے کہا۔

"سائیں آپ کا کام بن گیا ہے۔" چوکیدار نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

نازو نے مجھے بتایا تھا کہ رمضان کا بانسوں کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ میں رمضان کے ساتھ اس کے گودام تک چلا آیا۔ میرا ٹرک وہیں کھڑا تھا۔ اس لیے مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ جن مزدوروں کو مال ٹرک میں لوڈ کرانا تھا وہ دوپہر کا کھانا کھانے گھر چلے گئے تھے۔ ان کی واپسی میں دو گھنٹے کا وقت تھا۔ گاؤں میں لوگ دوپہر کا کھانا جلدی کھانے کے عادی ہوتے ہیں۔ اسی لیے مزدور اپنے گھر چلے گئے تھے۔ میں نے ٹرک کو گودام پر لا کر کھڑا کر دیا۔ رمضان اس وقت بالکل فارغ ہی بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے دوپہر کے کھانے کی پیش کش کی مگر میں نے جو ناشتہ کیا تھا وہ ناشتہ بھی اور دوپہر کا کھانا بھی تھا۔ رمضان سے ملاقات اور اس کی فرصت سے فائدہ اٹھانے کا یہ بھرپور موقع تھا۔ میں نے اس سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے بات چیت شروع کر دی۔ باتیں کرتے کرتے میں اصل مطلب کی طرف آ گیا۔

"چند دن پہلے میرا دوست اسحاق اس گاؤں سے گزرا تھا۔ اس نے مجھے عجیب کہانی سنائی۔"

"کیا کہانی سنائی۔" رمضان چونکا۔

"وہ رات کو اس علاقے سے گزر رہا تھا کہ ایک خاتون

نے اس کے ٹرک کو رکنے کا اشارہ کیا۔ اس کے ٹرک روکنے پر اس خاتون نے بتایا کہ اس کا شوہر اسے قتل کرنا چاہتا ہے اور وہ اپنے گھر کراچی جانا چاہتی ہے۔"

"پھر تمہارے دوست نے کیا اسے کراچی پہنچا دیا تھا؟"

"ہاں وہ خاتون اسے بہت مظلوم لگ رہی تھی اس لیے اس نے کراچی لے جا کر چھوڑ دیا تھا۔" میں نے بتایا۔

"تمہارے دوست نے اس کے ساتھ کوئی حرکت تو نہیں کی۔" رمضان نے پوچھا۔ اس کا چہرہ فق سا ہو گیا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا وہ نازو کے بارے میں سن کر نروس ہو گیا تھا۔

"کیسی بات کر رہے ہو رمضان بھائی ہم ڈرائیوروں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں ہم بھی بندی دیکھ کر ہی کچھ حرکت کرتے ہیں۔ مجبور و بے بس خواتین کے ساتھ اپنی ماں بہن جیسا سلوک کرتے ہیں۔ ہم بھی ماں بہن بیٹی والے ہوتے ہیں۔ ہم کسی کی مجبوری کا فائدہ نہیں اٹھاتے۔" میں نے کہا۔

"میں نے کچھ ایسے واقعات سنے ہیں کہ ٹرک ڈرائیوروں نے لڑکی یا عورت کے مل جانے پر خوب مل کر عیش کی۔" رمضان بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہوتا جس کسی نے بھی اگر ایسی بات کی ہے وہ جھوٹ ہے لوگ دوسروں پر اپنی برتری جتانے کو ایسی بات کرتے ہیں حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے جب تک عورت کی خود مرضی نہ ہو مرد کس طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ڈرائیونگ ہماری روزی ہے ہم لوگ کس طرح ایسا کر سکتے ہیں اگر کوئی ڈرائیور زبردستی کسی عورت کے ساتھ زیادتی کر بھی لے تو ایسی عورت اور اس کے لواحقین تھانے پر ایف آئی آر کٹوا دیتے ہیں اور ڈرائیور تھانے میں لاک اپ ہو جاتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہمیں بھی ایسے واقعات کا علم جبھی ہوتا ہے جب کوئی لاک اپ ہوتا ہے اور اس کی خبر اخبار میں شائع ہوتی ہے۔" رمضان نے کہا۔

"ایک دور تھا جب عورت اکیلے سفر کرتے ہوئے ڈرتی تھی اب عورتیں مردوں کے بغیر بے خوف ہو کر بسوں میں سفر کرتی ہیں۔ بس والے بھی ایسی خواتین کی عزت کرتے ہیں اسی لیے خواتین کا حوصلہ بلند ہوا ہے۔"

"میں تمہاری بات سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں آج کا دور پہلے سے بہتر ہے اب خواتین بلاخوف و خطر سفر کرتی ہیں، کیا تم مجھے اپنے دوست کا موبائل نمبر اور گھر کا پتہ بتا سکتے ہو۔" رمضان نے کہا۔

باتیں کچھ خاص

ہمیشہ یہ ہی سوچ کے جیو کہ میرے ربّ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے اگر وہ مجھے میرے اعمال کے برابر دیتا تو میرے پاس آج کچھ بھی نہ ہوتا

دو چیزیں زندگی کی وضاحت کرتی ہیں: "آپ کا صبر جب آپ کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔
آپ کا رویہ جب آپ کے پاس سب کچھ ہو۔"

نادیہ یٰسین..... ساہیوال

☆☆

نفرت اور انتقام

نفرت اور انتقام کی آگ میں ہم خود جل رہے ہوتے ہیں، نفرت بھی تو ہمیں اسی شخص سے ہوتی جسے انتہا کی حدوں تک چاہا ہو۔ انتقام اندھا ہوتا ہے نہ غیروں کو دیکھتا ہے نہ اپنوں کو۔ وقت گزرنے کے ساتھ جب نفرت کی آگ سرد ہوتی ہے تو تب خبر ہوتی ہے کہ نقصان تو خود ہمارا اپنا ہوا ہے۔ اس آگ میں ہم خود جھلسے ہیں۔

فائزہ بلال اقراء آفرین...... جام پور

☆☆

محبت

خدا سے ہو تو بندگی بن جاتی ہے
استاد سے ہو تو دوستی بن جاتی ہے
دولت سے ہو تو مرض بن جاتی ہے
والدین سے ہو تو عبادت بن جاتی ہے

نصرت عارف...... وار برٹن

"مجھے اسحاق کا گھر کا پتا نہیں ہے ہاں البتہ اس کا میں موبائل نمبر دے سکتا ہوں۔"

"کیا نمبر ہے؟" رمضان نے بے چینی سے پوچھا۔

"میرے پاس ٹیلی فون نمبر کی ڈائری اس وقت نہیں ہے۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ آپ کے موبائل پر ایس ایم ایس کردوں گا مگر آپ کیوں اس ......" میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑا۔

رمضان نے ادھر ادھر نظریں گھما کر دیکھا۔ جب اسے وہاں کوئی نظر نہیں آیا وہ میری طرف جھکتے ہوئے بولا۔

"وہ میری بیوی ہی تھی۔"

"ارے پھر تو آپ کا مسئلہ ہی حل ہو گیا اپنے سسرال جا کر بیوی سے ملاقات کر سکتے ہیں۔"

"وہ گھر پر نہیں ہے، میں نے اپنے ذرائع سے بھی اس بات کی تصدیق کر لی ہے۔" رمضان نے بتایا۔

"ویسے آپ کے لیے بہت ہی سنہرا موقع ہے دوسری پسند کی شادی کرنے کا اس موقع کو گنوانا نہیں چاہیے۔"

"تم سے کیا چھپانا اب بازی پلٹ چکی ہے۔"

"بازی پلٹ چکی ہے۔" میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"یہاں میں نائلہ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور نائلہ یہ چاہتی تھی کہ میں نازو کو قتل نہ کروں بلکہ طلاق دے دوں۔ اس دن میری نائلہ سے یہی بات ہو رہی تھی جو نازو نے سن لی تھی اور وہ رات کی تاریکی میں گھر سے فرار ہو گئی نائلہ سمیت گاؤں کے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ نازو فرار نہیں ہوئی بلکہ میں نے اسے قتل کر کے کہیں دفن کر دیا ہے۔"

"نائلہ کو خوش ہونا چاہیے کہ اس کے راستے کا کانٹا ہٹ گیا اور فوراً شادی کو رضامندی ظاہر کر دینا چاہیے۔"

"نائلہ کے دل میں اس واقعہ سے خوف بیٹھ گیا ہے اور وہ یہ سمجھ رہی ہے کہ جب میرا اس سے دل بھر جائے گا اور کوئی لڑکی پسند آ گئی۔ میں اس کے ساتھ بھی ایسا ہی کروں گا اس لیے وہ اب شادی سے انکار کر رہی ہے۔"

"اگر نازو مل جائے تو کیا پھر بھی وہ شادی سے انکار کر دے گی۔" میں نے پوچھا۔

"یہ اس کے ملنے پر ہی پتا چل سکے گا کہ نائلہ کا کیا ارادہ ہے۔" رمضان نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں اسحاق سے مل کر اس کا نمبر لے کر آپ کو ایس ایم ایس کردوں گا۔" میں نے کہا۔

سامان لوڈ کرنے والے مزدوروں کے آنے پر وہ سامان ٹرک میں لوڈ کرنے لگے۔ مزدوروں کے آنے پر رمضان نے مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ ٹرک پر سامان لوڈ ہو جانے پر میں سانگھڑ روانہ ہو گیا۔

راستے بھر میں نازو کے بارے میں ہی سوچتا رہا کہ وہ جب اپنے گھر نہیں گئی ہے تو پھر کہاں چلی گئی ہے۔ اصولاً اسے اپنے گھر جانا چاہیے تھا کہیں اس دن اسے کوئی حادثہ تو نہیں پیش آ گیا اور وہ اپنے گھر نہ پہنچ سکی ہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے گھر میں ہو اور اس کے گھر میں رہنے کا پتا رمضان کو نہ چل سکے۔

"مجھے موبائل پر نازو سے بات کر کے دیکھنا چاہیے کہ وہ کہاں ہے۔" میں نے خود کلامی کی۔ میرا ہاتھ بے اختیار جیب میں چلا گیا۔ میں نے موبائل نکال کر جب نازو کے نمبر پر ڈائل کیا اس کا موبائل آف تھا۔

"موبائل کیوں بند ہے۔" میں نے خود سے سوال کیا۔ پھر خود ہی میرے سوال کا جواب آ گیا۔

"وہ ایسی بے وقوفی ہرگز نہیں کرے گی جس سے وہ رمضان کی گرفت میں آ جائے۔ اس نے جان بوجھ کر نمبر بند کیا ہوا ہے میرا اس سے رابطہ ممکن نہیں تھا جب تک وہ موبائل کو آن نہ کرے۔"

سانگھڑ میں رمضان کا مال اتار کر میں کراچی چلا آیا۔ مجھے کراچی آئے ابھی دو دن ہی ہوتے تھے کہ مجھے ایک کال آئی۔ وہ نمبر میرے لیے نیا تھا پھر میں نے کال او کے کر دی۔ ایک مانوس سی آواز کانوں کی سماعت سے ٹکرائی۔

"میں نازو بات کر رہی ہوں۔"

"وہی نازو جو میرے ٹرک میں صادق آباد اور پھر کراچی آئی تھی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں میں وہی ہوں۔" وہ بھی جواباً ہنس دی۔

"تم کہاں ہو اور یہ کس نمبر سے بات کر رہی ہو۔"

"یہ میرا نیا نمبر ہے اب مجھ سے بات کرنی ہو تو اس نمبر پر ہی بات کرنا اس لیے میں نے تمہیں کال کی ہے۔"

"کیا اس نمبر پر رمضان تنگ کر رہا ہے جو تم نے اسے

بند کر رکھا ہے۔"

"میں نے وہ نمبر مصلحتاً بند کیا ہوا ہے اس نمبر کو آن رکھنے پر باآسانی رمضان کو میرا سراغ مل جائے گا کہ میں کہاں ہوں۔"

"میں سمجھ گیا ہوں' کیا تمہارے گھر والوں کو تمہارے بارے میں خبر ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں میں پہلے گھر پر ہی گئی تھی مگر میرے والد کاظم نے ہی مجھے ایسا کرنے کا مشورہ دیا ہے اور میں ان کے ایک دوست کے گھر پر ہوں۔"

"تم خیریت سے ہو نا؟"

"ہاں میں بالکل خیریت سے ہوں بس تمہیں اس لیے فون کیا تھا کہ اپنی خیریت سے آگاہ کردوں تم بھی سوچ رہے ہوگے کہ کیسی بے مروت عورت ہے جب سے ابھی تک فون کرکے شکریہ کے دو لفظ بھی ادا نہیں کیے۔" نازو بولی۔

"تم نے یہ بہت اچھا کیا کہ مجھ سے رابطہ کرلیا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے مختصراً رمضان سے ملاقات کا احوال بتادیا۔

"بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ تمہاری رمضان سے ملاقات ہوگئی۔" نازو حیرت سے بولی۔

"اس میں حیرت کی کون سی بات ہے ہمارا کام ہی اس نوعیت کا ہے کاروباری حضرات سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔"

"یہ بات بھی تم ٹھیک کررہے ہو۔"

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کس بارے میں؟" وہ چونکی۔

"تمہارا شوہر پریشان ہے۔ اس کی تمہاری پراسرار گمشدگی کے سبب دوسری شادی بھی رک گئی ہے اس بے چارے کا کچھ خیال کرو۔"

"یہ یکایک تمہیں رمضان سے اتنی ہمدردی کیوں ہوگئی ہے۔ حالانکہ تمہیں ہمدردی مجھ سے ہونا چاہئے کہ میں نے کس طرح رات میں گھر سے نکل کر اپنی جان بچائی تھی۔"

"مجھے تم سے ہی ہمدردی ہے جبھی یہ بات کررہا ہوں میں نہیں چاہتا کہ تمہارا گھر برباد ہو۔"

"میں اپنا گھر بچانے کو ہی ایسا کررہی ہوں۔"

"وہ کیسے؟" میں چونکا۔

"میرے والد صاحب کے جاننے والے نظیر بابا ہیں وہ فی سبیل اللہ عملیات کا کام کرتے ہیں۔ نظیر بابا نے استخارہ کرکے بتایا تھا کہ میری جان کو خطرہ ہے اس لیے میرا کچھ عرصہ کو روپوش رہنا ضروری ہے نائلہ نے مجھے طلاق دلوانے کو ایک عمل کیا تھا مگر اس سے وہ عمل پڑھنے میں غلطی ہوگئی ہے جس کی بنا پر رمضان میری جان کا دشمن بن گیا ہے وہ ہر قیمت پر مجھے جان سے ماردینا چاہتا ہے۔ نظیر بابا اس عمل کی کاٹ کررہے ہیں جیسے ہی اس عمل کی کاٹ ہوجائے گی میں اپنی روپوشی ختم کردوں گی۔" نازو نے بتایا۔

"ٹھیک ہے میں اس نمبر پر تم سے رابطہ رکھوں گا۔" میں نے کال بند کردی۔

مجھے یہ بات جان کر خوشی ہورہی تھی کہ نازو خیریت سے ہے۔ بس میں یہی جاننا چاہتا تھا اب آگے کیا ہوگا یہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا تھا۔

مختلف شہروں اور دیہات میں سامان پہنچانے کا اتنا کام تھا کہ مجھے سوچنے کی فرصت ہی نہیں مل سکی۔ کچھ سوچتا تو نازو سے بھی رابطہ کرتا۔ نازو سے بات کیے ایک ماہ کا عرصہ ایسے بیت گیا پتا ہی نہیں چلا جب اس نے مجھ سے دوبارہ رابطہ کیا مجھے اس وقت بڑی شرمندگی ہوئی کہ میں ایک ماہ سے کال کرکے دو لفظوں میں اس کی خیریت نہ کرسکا۔ میں نے بڑی بے مروتی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"کیسے ہیں؟" نازو نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہوں۔ میں کام میں ایسا الجھا رہا کہ تم سے موبائل پر بات ہی نہیں کرسکا۔" میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

"تمہارا کام ہی ایسا ہے۔"

"ہاں نازو کام کرنے سے ہی گھر کا خرچہ اور ضروریات زندگی پوری ہورہی ہیں تم سناؤ تم نے اپنی روپوشی کو برقرار رکھا ہوا ہے یا ختم کردیا۔"

"ہاں میں بہت جلد اپنی روپوشی ختم کرنے والی ہوں نائلہ کا جادو رمضان کے سر سے اتر گیا ہے۔"

"کیا واقعی؟" میں حیرت سے چونکا۔

"ہاں! نظیر بابا بہت پہنچے ہوئے عامل ہیں کالے جادو کی کاٹ کے ماہر ہیں۔"

"خدا کرے تمہارا گھر پھر سے آباد ہو جائے۔" میں نے دعا دی۔

"نظیر بابا نے بھرپور یقین دلایا کہ رمضان کے ذہن سے نائلہ کا بھوت اتر جائے گا۔"

"اللہ تعالیٰ کرے ایسا ہی ہو۔" میں نے کہا۔

"نازو سے بات کیے مجھے دو ماہ ہی ہوئے تھے کہ میرا رمضان کے گاؤں جانا ہوا۔ میرے پاس وقت بھی تھا۔ مجھے ایک جگہ مال اتروانا تھا اور پھر دوپہر کے بعد مجھے ایک دوسری جگہ سے مال لوڈ کرا کے نواب شاہ لے جانا تھا۔ میں نے سوچا جب یہاں آیا ہوں تو رمضان سے بھی ملاقات کر لینے میں کیا حرج ہے۔ میں رمضان سے ملاقات کرنے کو چل دیا راستے میں خیال آیا کہ اگر اس نے مجھ سے پوچھ لیا کہ تم نے اسحاق کا نمبر کیوں نہیں بھیجا تو کہہ دوں گا کہ میرے ذہن سے نکل گیا تھا اب لازمی اسحاق کا نمبر بھیج دوں گا۔ یہ سوچ کر میں مطمئن ہو گیا۔ رمضان دکان پر موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ پہچان گیا۔

"ہاں بھئی بڑے عرصے بعد نظر آئے؟" اس نے پوچھا۔

"میرے پاس ادھر کسی کو مال پہنچانے کا آڈر نہیں تھا اس لیے آنا نہیں ہوا۔" میں نے بتایا۔

"کم از کم موبائل پر رابطہ کر لیا کرو۔ کبھی کبھار ہم نیو سعید آباد والوں کو بھی تمہاری ضرورت پڑ جاتی ہے۔" رمضان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی بات کرنے پر میں اصل موضوع پر آ گیا۔

"مجھے بہت شرمندگی ہو رہی ہے کہ تمہیں اسحاق کا نمبر نہیں دے سکا۔" میں نے کہا۔

"اب اس کی ضرورت بھی نہیں رہی۔"

"وہ کیوں؟" میں چونکا۔

"نازو گھر پر آ گئی ہے اور اس نے مجھے بتا بھی دیا ہے کہ تم نے ہی اسے کراچی پہنچایا تھا۔"

"کک...... کک...... کیا واقعی؟" مجھے ایک جھٹکا لگا۔ مجھے اس وقت یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں نے یہاں آ کر غلطی کر دی ہے اس سے بڑی غلطی نازو نے بتا کر کی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں میں خاموشی سے یہاں سے بھاگنے کی سوچ رہا تھا میں نے رمضان کی بیوی کو فرار ہونے میں مدد فراہم کی تھی۔ اندرون سندھ کے لوگ بڑے غیرت مند ہوتے ہیں میں نے اس کی بیوی کو فرار ہونے میں مدد دے کر اس کی غیرت کو للکارا تھا۔ میں نے اسے خود موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ مجھ سے اپنا بدلہ لے سکے۔

"کن سوچوں میں گم ہو گئے ہو۔" وہ مجھے خاموش دیکھ کر بولا۔

"مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ تمہارا گھر بس گیا ہے۔"

"اس گھر بسنے میں تمہارا بڑا احسان مند ہوں' تم اس رات نازو کو فرار ہونے میں مدد نہ دیتے تو میں قاتل کی حیثیت سے جیل میں ہوتا۔"

"ہم ڈرائیور لوگ خواتین کو لفٹ دیتے ہوئے ڈرتے ہیں اس وقت مجھے نیند بھی بڑے زور کی آ رہی تھی مگر نازو نے جب اپنے قتل ہونے کے بارے میں بتایا کہ اگر میں نے اس کی مدد نہیں کی تو اس کا قتل ہو جائے گا اس لیے میں نے اپنی نیند کی قربانی دے کر اسے ساتھ لے گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ تم نے مجھ پر اس دن بہت بڑا احسان کیا تھا میں تمہارے اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ آؤ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ آج ہم دونوں ساتھ کھانا کھائیں گے۔" رمضان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے رمضان کی کھانے کی آفر قبول کر لی تھی لیکن دل میں ابھی تک یہ خوف تھا کہ کہیں کچھ گڑبڑ نہ ہو جائے جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ مجھے بھی اپنی جان کا خوف تھا۔ رمضان کے گھر میں نازو موجود تھی۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔ کھانے کا رمضان نے اچھا انتظام کیا ہوا تھا کھانا دیکھ کر میں نے رمضان کی طرف دیکھا۔

"کیا میرے آنے کی اطلاع مل گئی تھی؟"

"نہیں نیاز محمد ہمارے یہاں ایسے ہی روز کھانے کا انتظام ہوتا ہے۔ مجھے ایک ہی شوق ہے اچھا کھانا کھانا اور دوست احباب کو کھلانا۔" رمضان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ جب تھوڑی دیر کو کمرے سے باہر گیا میں نے نازو سے پوچھ ہی لیا۔

"نازو تم یہاں آ کر خوش ہو نا؟"

"ہاں میں خوش ہوں۔"

"کہیں نائلہ پھر تمہارے شوہر پر ڈورے ڈالنا شروع کر دے کیونکہ تم روپوشی ختم کر چکی ہو۔"

"ہاں اس سے خطرہ ہے لیکن میں نے نظیر بابا کو کہا ہوا ہے کہ وہ نائلہ کے جادو ٹونے کا توڑ کر دے اور انہوں نے بھی مجھے بھرپور یقین دلایا ہے کہ اب ایسا نہیں ہوگا نائلہ کسی بھی طرح اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوگی۔"

"میں نے جب سنا تم گھر آ گئی ہو اور میرے بارے میں بھی بتا دیا ہے تو میں ڈر گیا تھا۔"

"وہ کیوں؟" وہ چونکی۔

"میں نے سنا ہے کہ گاؤں کے لوگ ذرا ذرا سی بات پر قتل کر دیتے ہیں اور میں نے تمہاری مدد کر کے ایک طرح سے رمضان کی غیرت کو للکارا ہے؟"

"رمضان اچھا انسان ہے جب میں نے اسے تمہارے بارے میں بتایا وہ تمہاری تعریف کرنے لگا کہ اس نے یہ اچھا کیا ہے واقعی مجھے اس رات کیا ہو گیا تھا میں نے تمہارے قتل کا منصوبہ تیار کر لیا تھا اور صبح تم واقعی قتل ہو جاتی۔ اس نے مجھے قاتل ہونے سے بچا لیا ہے۔" نازو نے کہا۔

میں کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر چلا آیا۔ میں بھی خوش تھا کہ اس دن میں نے نازو کو لفٹ دے کر بڑی نیکی کا کام کیا تھا۔

میری اس سے ملاقات کو چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ نازو اپنے گھر پہنچ کر خوش تھی اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ ایک دن میرے موبائل پر نازو کی کال آئی۔ میں ایک لمحے کو وہ نمبر دیکھ کر گھبرا سا گیا کہ اس نے مجھے کیوں یاد کیا ہے کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو گئی ہو۔ میرے بات کرنے پر اندازہ ہوا وہ بہت خوش تھی۔

"نازو آج تم بہت خوش ہو خیریت ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بھئی میں بہت خوش ہوں آج میری زندگی میں آنے والا کانٹا بھی نکل گیا ہے۔"

"کانٹا نکل گیا ہے۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں نائلہ میرے لیے کانٹا بن کر آئی تھی۔"

"کیا ہوا نائلہ کو؟"

"ہونا کیا تھا وہ پھر رمضان کو حاصل کرنا چاہ رہی تھی اس نے رمضان کے نزدیک ہونے کی دوبارہ کوشش کی مگر رمضان نے اس کو منہ نہیں لگایا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ رمضان لفٹ نہیں کرا رہا ہے تو جادو ٹونے کا سہارا لیا۔ اس کے جادو ٹونے سے رمضان کا نائلہ کی طرف دوبارہ جھکاؤ ہونا شروع ہو گیا تھا مگر نائلہ سے ایک غلطی ہو گئی جو ہمارے حق میں اچھا ہو گیا۔"

"کیسی غلطی؟" میں نے پوچھا۔

"اسے رات میں چھت پر کوئی عمل کرنا تھا مگر نیند کے جھونکے آنے پر وہ کچھ غلط سلط پڑ گئی اور یہ ہی اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔ وہ سیڑھیاں سے اتر رہی تھی کہ اسے کسی مخلوق نے زور سے دھکا دے دیا۔ وہ زوردار چیخ کے ساتھ زمین پر گری۔ اس کے سر پر شدید قسم کی چوٹ لگی تھی گھر والوں کو وہ نہیں بتا سکی کہ کسی مخلوق نے اس پر حملہ کیا تھا اور دم توڑ گئی۔ نائلہ کو اتنی بھی مہلت نہ مل سکی وہ اسپتال جا سکتی۔"

"اچھا...... اچھا تم اس لیے خوش ہو۔" میں نے کہا۔

"ہاں یہ بات بتانے کو میں نے تمہیں کال کی ہے۔" نازو نے بتایا۔

"نازو کوشش کرنا اب رمضان کی زندگی میں کوئی نائلہ نہ آئے۔ رمضان کو خوش رکھنا کہ وہ دوبارہ سے بھٹک نہ سکے۔" میں نے اسے نصیحت کی۔

"بے فکر رہو اب ایسا نہیں ہوگا۔" نازو نے یہ کہتے ہوئے موبائل بند کر دیا۔

اس نے مجھے اچھی خبر سنا دی تھی۔ خبر سن کر مجھے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ بات بھی خوشی کی تھی۔ رمضان اور نازو کی زندگی میں زہر گھولنے والی نائلہ ہمیشہ کے لیے ان کی زندگی سے نکل گئی تھی۔

چندا مندا

کے ایم خالد

اس دور کی کہانی جب ایک مخنث ملک کا حکمران بن گیا تھا اس نے مردوں کو گھنگھرو باندھ کر گھر کی دہلیز تک محدود رہنے کا حکم دے رکھا تھا۔
ان لمحوں کی روداد جب ایک محبوبہ نے اپنے محبوب کو اقتدار کی خاطر زہر دے دیا تھا۔

نوٹ: کے ایم خالد کی اس کہانی کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے

چودھویں کا چاند آسمان پر اپنی سنہری کرنیں بکھیر رہا تھا۔ ایک پرانے سے قبرستان میں اس وقت شہنائی کی آواز گونج رہی تھی۔ شہنائی کی آواز کے ساتھ ہی ہارمونیم کی آواز شروع ہوئی پھر گھنگھروؤں کی جھنکار آئی اس کے ساتھ ہی ڈھولک کی تھاپ پر چھنن چھنن کی آوازیں آنے لگیں۔ چاند اپنے پورے عروج پر تھا تقریباً آدھے گھنٹے تک پائل کی جھنکار سنائی دیتی رہی اس کے ساتھ ہی ہر طرف خاموشی چھا گئی، موت کی سی خاموشی۔ اب گھنگھرو کی جھنکار دوبارہ سنائی دی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی الھڑ مٹیار گھنگھرو باندھے تھرک رہی ہو۔ رات کے سناٹے میں یہ آواز بہت عجیب محسوس ہو رہی تھی اس کے ساتھ ہی قبریں کھلنا شروع ہو گئیں اور ان میں سے مردے نکلنے شروع ہو گئے۔ ڈھولک کی تھاپ میں تیزی آتی جا رہی تھی گھنگھرو کی جھنکار میں بھی تیزی آ گئی اس کے ساتھ ہی ہر آواز دم توڑ گئی ہر طرف خاموشی چھا چکی تھی موت کی سی خاموشی۔

قبروں سے نکلنے والے مردے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے، وہ بے نور آنکھوں سے ایک قبر کی طرف دیکھ رہے تھے پھر صرف شہنائی کی آواز سنائی دی۔ آہستہ آہستہ اس آواز میں تیزی آتی چلی گئی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے شہنائی بجانے والے کا دل پھٹ جائے گا۔ اتنی مدھ بھری لے تھی کہ خدا کی پناہ ایسے میں اس قبر سے ایک مردہ اٹھ رہا تھا۔

اب شہنائی کی آواز بھی دم توڑ چکی تھی وہ مردہ بھی نکل کر سامنے آ چکا تھا بھی مردے ایک دائرے میں بیٹھ گئے پھر ایک خوفناک آواز گونجی ایسے جیسے کہیں بجلی گری ہو۔

"اے دنیا کے ناکام عاشقو، اس دنیا نے تمہیں کیا دیا ناکامی، بربادی، ذلت اس عشق نے تمہیں کیا دیا موت اور صرف موت۔ اس دنیا میں کتنے عاشق آئے جل اور جلوت ھکم اور ٹھاہ، بادل اور بجلی، پھول اور موتی، ہیر رانجھا، لیلی مجنوں، شیریں فرہاد اگر میں نام گنوانے لگوں تو یہ رات گزر جائے اور ہمارے پاس پورے مہینے میں ایک ہی چودھویں کی رات ہوتی ہے جب ہم اس قبرستان میں ملتے ہیں دنیا کے ناکام عاشق، ہم ہزاروں سالوں سے اپنی عشق کی داستان سناتے چلے آ رہے ہیں آج کی رات ہماری آخری رات ہے اور آج میرے آخری ناکام عاشق کی داستان سنانے کی باری ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک طرف سے ایک مردہ اٹھا اس کا قد تقریباً دس فٹ تھا اس کی زلفیں بنی سنوری تھیں، آنکھوں میں لگا کاجل بھی صاف دکھائی دے رہا تھا اس نے سفید کفن اوڑھ رکھا تھا اس نے گلا کھنکھار کر کہا۔

"یہ 302 بکرمی کی بات ہے جب میں جوانی کی دہلیز پر پہنچا میں ملک ناپرساں کے شہر لگم گھوٹ میں رہتا تھا خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ہمارے ملک کا بادشاہ مر گیا اب تو ہر طرف رونا پیٹنا مچ گیا چالیس دن بعد اس کی لاش دفن کی گئی۔ ہمارے ملک میں رواج تھا کہ بادشاہ کے مرنے کے ساٹھ روز بعد فضا میں ایک گدھ چھوڑا جاتا تھا جس کے سر پر وہ بیٹھ جاتا اسے بادشاہ بنا دیا جاتا تھا۔

اس دن ساری رعایا ایک گراؤنڈ میں جمع تھی میں خود وہاں موجود تھا ہم سوچ رہے تھے کہ دیکھو اب کس کو بادشاہ

بنا ہے پنجرے کا دروازہ کھول دیا گیا، گدھ فضا میں بلند ہوا تقریباً پندرہ منٹ وہ فضا میں چکر کاٹتا رہا پھر وہ ایک جانب لپکا اور ایک سر پر بیٹھ کر ٹھونگیں مارنے لگا۔ لوگوں نے اس کو اٹھا لیا جس کے سر پر گدھ بیٹھا تھا پہلے تو کسی کو پتہ نہ چلا جب وہ اسٹیج پر آیا تو معلوم ہوا کہ وہ ملک کا مشہور و معروف مخنث ابن جدم تھا۔ اس نے ٹھمک ٹھمک کر ہر چھوٹے بڑے کا شکریہ ادا کیا یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنی مرنے والی بلی سر پر رکھے کہیں پھینکنے جا رہا تھا کہ مجمع دیکھ کر وہ رک گیا اور یوں گدھ صرف مردہ بلی کی بو سونگھ کر اس کے سر پر بیٹھ گیا

ابن جدم نے تخت پر بیٹھتے ہی مردوں کے لئے کچھ احکامات جاری فرمائے جن کے مطابق ہر مرد کو روزانہ کلین شیو کرنے، سر پر دوپٹہ رکھنے اور گھنگھرو باندھنے کا حکم دیا۔ مردوں نے بہت واویلا مچایا مگر اب کیا ہو سکتا تھا حکم حاکم ،مرگ مفاجات۔

اب تو ملک میں عجیب بہار دکھائی دیتی تھی۔ مرد سر پر دوپٹہ رکھے، پیروں میں گھنگھرو باندھے، میک اپ کئے ٹھمکا لگاتے چلے جاتے تھے۔ میں، میری اماں، میرا ابا پتہ ہی نہیں چلتا تھا مرد کون ہے عورت کون ہے۔ مرد اپنی تقدیر پر آنسو بہاتے تھے یہ کیا ہو گیا، اب اس ملک کا کیا ہو گا؟

ایک دن تقریباً سارا دن سوتا رہا جسم بہت درد کر رہا تھا میں نے سوچا چلو گھومنے چلتے ہیں رات کے دس بجے کا وقت تھا میں نے میک اپ کیا سر پر دوپٹہ رکھا، پاؤں میں گھنگھرو باندھے اور چھم چھم کرتا نہر کے کنارے چلنے لگا ۔ابھی میں نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ لڑکیوں کے کھلکھلانے کی آوازیں سنائی دیں سوچا واپس ہو جاؤں بے عزتی ہو گی لیکن لڑکیوں نے مجھے واپس ہونے سے پہلے ہی گھیر لیا وہ مجھے نہر کے کنارے ایک باغ میں لے گئیں ان کی تعداد پندرہ تھی۔ میں لڑکیوں کے بیچ بے یار و مددگار تھا انہوں نے کہا ”پیارے، ناچ کر تو دکھاؤ“۔

میں نے کہا ”مجھے اس فیلڈ میں آئے تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں مجھے ناچنا نہیں آتا“۔

ان میں سے ایک بولی ”دیکھو، میں تمہیں ناچ کر دکھاتی ہوں پھر ایسے تم ناچنا“۔

وہ اتنے خوبصورت انداز میں ناچی کہ میرا دل اس پر فدا ہو گیا میں اس کو ٹک ٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اس نے میری محویت توڑی ”اب ذرا تم ناچ کر دکھاؤ“۔

اب بھلا میں کیسے انکار کر سکتا تھا وہ کہے اور میں انکار کردوں میں نے خوبصورت انداز میں اس کو تھرک کر دکھایا بھی لڑکیاں واہ واہ کرنے لگیں میں نے چند ایک گر تو ابا سے سیکھ لئے تھے اور کچھ اس لڑکی نے سکھا دیئے تھے میں نے اس لڑکی سے پوچھا۔

”ماہ جبیں، تمہارا نام کیا ہے؟“

اس نے اپنے موتی جیسے دانت نکالے اور کہا ”میرا نام چندا ہے، تمہارا کیا نام ہے؟“ اس نے پوچھا

”میرا نام مندا ہے“ میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

”اچھا میں چلتی ہوں، ہم روز یہاں آتی ہیں۔“ پھر وہ

اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں تھرکتی ہوئی چلی گئی۔ میرے دل پر اس کی نظروں کے تیر چل چکے تھے میرا کنوارہ دل دھک دھک کر رہا تھا مجھے آج پتہ چلا کہ پہلی نظر میں محبت کیسے ہو جاتی ہے۔

میں سارا دن سہانے سپنے بنتا رہا وقت تھا کہ گزر ہی نہیں رہا تھا اگلے دن میں وقت سے پہلے ہی بن سنور کر چلا گیا وہ اکیلی تھی میں نے کہا" چندا اکیلی آئی ہو؟"

"ہاں مندا، میں نے سوچا تم سے اکیلے میں ملوں"۔

"وہ کیوں بھلا؟"

"بس دل چاہا"۔ اس نے انداز دلربائی سے کہا۔" دیکھو مندا، تم مرد ہو تمہیں یہ مخنثوں والے کام زیب نہیں دیتے، تم میری خاطر یہ چھوڑ دو، اپنی مونچھیں بڑھاؤ، بال کٹوا دو، گھنگھرو اتار دو، دوپٹہ پھینک دو"۔

میں کانپ اٹھا" نہیں چندا، ایسا نہ کہو، اگر میں ایسا کروں گا تو ابن جدم مجھے سزا کے طور پر گرم تیل میں ڈال دے گا میں مر جاؤں گا تو تم شادی سے پہلے ہی بیوہ ہو جاؤ گی"۔

میری بات سن کر اس کے چہرے پر حیا کی سرخی چھائی اور اس نے کہا

"تم مرد بادشاہ کو شکست تو دے سکتے ہو، اگر کوشش کرو تو تم ایک ایسی جماعت بنا سکتے ہو جو بادشاہ کو معزول کر دے بس ہمت کی بات ہے"۔

میں نے کہا۔" چندا، میں آج رات اس مسئلے پر سوچوں گا"۔

چندا نے میرے ہاتھ کا بوسہ لیا اور ہم اپنی اپنی راہ چل پڑے۔

اس رات میں سو نہ سکا ساری رات سوچتا رہا کیا کروں ایک طرف محبوبہ تھی دوسری طرف وہ ظالم مخنث تھا اس نے اپنے احکامات کی خلاف ورزی کرنے والوں کو بہت سخت سزائیں دی تھیں۔ پھر دل اور دماغ ایک ہی بات پر متفق ہو گئے میں نے فیصلہ کر لیا کہ چندا کی بات مانوں گا پھر میں بے فکر ہو کر سو گیا۔

دوسری رات ہم پھر اکیلے ملے میں نے اس سے کہا۔" چندا میں تمہارے کہنے پر چلوں گا"۔

"کیا واقعی؟" اس کے چہرے پر خوشی کے ساتھ بے یقینی تھی۔

"ہاں چندا، میں رات بھر سوچتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر ہم کوشش کریں تو یہ مشکل کام نہیں"۔

"ٹھیک ہے، مگر میں اب تمہیں ٹھیک ایک ماہ بعد ملوں گی کیونکہ میں دوسرے شہر جا رہی ہوں"۔

میں نے پوچھنے کی بہت کوشش کی مگر اس نے کچھ نہ بتایا میں بڑے بجھے دل کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہوا۔

پورا ایک مہینہ میں اداس رہا بجھے دل سے ہر کام کیا میں نے اس مہینے سے میں نے مونچھیں بڑھانی شروع کر دی تھیں مگر کسی کو ابھی تک پتہ نہیں چلا تھا جب باہر نکلتا تو نقاب کر لیتا تھا۔

وہ پوہ کی بیس تاریخ تھی جب میں سردی سے ٹھٹھرتا، چادر میں لپٹا گھنگھرو بجاتا چلا جا رہا تھا۔ میں اس باغ میں پہنچ گیا مگر ابھی تک چندا نہیں آئی تھی۔ میں سردی میں ٹھٹھر رہا تھا اور سوچ رہا تھا وہ تو وعدے کی پکی ہے ضرور آئے گی۔ ایک آس تھی امید تھی مگر وہ ایک گھنٹہ گزر جانے کے باوجود نہیں آئی۔ میرا سردی سے برا حال تھا میری جیب میں ماچس تھی میں نے سوکھی لکڑیاں تلاش کیں اور ان کو سلگا کر بیٹھ گیا پتہ نہیں میں وہاں کتنی دیر بیٹھا رہا سردی سے میرے ہاتھ پیر سن تھے پھر مجھے اونگھ آ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی میرے ہاتھ چوم رہا ہو میرے ذہن میں خیال پیدا ہوا چندا آ گئی، میری آنکھ کھل گئی ایک کتا میرے ہاتھ چاٹ رہا تھا رات کو گوشت کھایا تھا اور شاید ہاتھ نہیں دھوئے تھے کتے کو شی کر کے بھگایا۔ قریب کی نہر میں جا کر ہاتھ دھوئے آسمان کی طرف دیکھا اور اندازہ لگایا کہ اس وقت رات کے تین بجے کا وقت ہو گا۔ میں نے دل میں سوچا اب چندا نہیں آئے گی مجھے چلنا چاہئے۔ ابھی میں نے قدم بڑھائے ہی تھے کہ ایک آواز نے قدم روک لئے۔

"مندا! ناراض ہو گئے ہو کیا؟"

میں نے دیکھا میرے سامنے چندا اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھی ابھی ہم ایک دوسرے سے دور ہی تھے کہ ایک کرخت آواز میری سماعت سے ٹکرائی

"اچھا تو یہ ہے وہ چھوکرا جس سے ملنے تو رات تین بجے یہاں آئی ہے"۔

میں نے دیکھا ایک مرد جو کلین شیو تھا، سر پر چنریا اور

پاؤں میں گھنگھرو تھے ٹھمک ٹھمک کر کہہ رہا تھا۔
"میں بھی کہوں ہماری چندا کو رات تین بجے رفع حاجت کے لئے اتنی دور کہاں آنا پڑ گیا"۔
اتنے میں چندا بولی۔ "ابا جان! آپ خواہ مخواہ شک کر رہے ہیں یہ لڑکا بہت اچھا ہے اس نے تہیہ کر رکھا ہے کہ ابن جدم سے آپ لوگوں کو رہائی دلائے گا"۔
یہ سن کر ابا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، انہوں نے کہا "دیکھو بیٹی! یہ ناممکن بات ہے، مرد، مرد سے لڑ سکتا ہے ایک مخنث سے نہیں وہ کمینہ تو ٹھمکے مار مار کر ادھ موا کر دیتا ہے اور یہ کل کا چھوکرا جسے ٹھمکے کی کوئی تربیت ہی نہیں اس سے کیا لڑے گا؟"
"ابا! ہم نے کچھ اور ہی پلان بنایا ہے، ہم باغیوں کی ایک جماعت تیار کریں گے جو کہ اس کا تختہ الٹ سکے۔"
بیٹی! اس کی سزائیں بہت سخت ہیں، کوئی اس کام کے لئے راضی نہیں ہوگا"۔
"لیکن، ابا کوشش تو کی جا سکتی ہے"۔
"اچھا بیٹی تمہاری مرضی، اس کی ایک سزا جو اس نے پرسوں ہی ایک شخص کو صرف اس لئے دی ہے کہ اس نے مونچھیں بڑھالی تھیں، گھنگھرو باندھ کر اسے دو دن نچایا گیا جب وہ تھک کر بیٹھ جاتا تو اسے کوڑے مارے جاتے۔ اس مرد نے وہیں اپنی مونچھیں کٹوا دیں"۔
یہ سن کر میرے پیٹ میں گڑبڑیشن شروع ہو گئی کیونکہ میں نے بھی مونچھیں بڑھا رکھی تھیں خیر کل کا وعدہ کر کے چندا اپنے ابا کے ساتھ رخصت ہو گئی اور میں بھی مٹکتا چھم چھم کرتا چل پڑا مگر شاید میری تقدیر خراب تھی ایک پہرے دار نے مجھے ٹھمکا لگا کر روک لیا میں نے بھی جواباً ٹھمکا لگا کر سلام کیا اس نے جواب دیا اور پھر پوچھا "اس وقت کہاں سے آرہے ہو، اپنی شکل شریف تو دکھاؤ"۔
"میں ذرا رفع حاجت کے لئے گیا تھا۔" میں نے بہانہ بنایا
"رہتے کہاں ہو؟" اس نے پوچھا
میں نے اپنے گھر کا پتہ دیا تو اس نے کہا۔ "اپنے گھر کے قریب رفع حاجت نہیں ہوتی کیا؟"
میں نے کہا "بات دراصل یہ ہے۔۔۔ بات دراصل یہ ہے" میں اٹک گیا

قرآنی معلومات

قرآن پاک کی سب سے بڑی سورۃ البقرہ ہے۔
قرآن پاک کی سب سے چھوٹی سورۃ الکوثر ہے۔
قرآن پاک میں 30 پارے' 114 سورتیں اور 558 رکوع ہیں۔
قرآن پاک کی عروس القرآن سورۃ رحمٰن کو کہا جاتا ہے۔
قرآن پاک کا دل سورۃ یٰسین کو کہا جاتا ہے۔ قرآن میں 6666 آیتیں ہیں۔
قرآن پاک کی سب سے بڑی آیت "آیۃ الکرسی" ہے۔
سورۃ التوبہ قرآن پاک کی ایسی سورۃ ہے جس کے شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھی جاتی۔ قرآن پاک میں کل لفظ 323760 ہیں۔
سورۃ الناس قرآن پاک کی ایسی سورۃ ہے جو حرف "س" پر اپنی آیت ختم کرتی ہے۔ قرآن پاک کی سات منزلیں ہیں۔
قرآن پاک میں قل سے شروع ہونے والی کل سورتیں ہیں سورۃ الجن' سورۃ الکافرون' سورۃ الاخلاص' سورۃ الفلق' سورۃ الناس۔

رابعہ ساحر...... جہانیاں

گناہوں کی معافی اور درجات کی بلندی کا ذریعہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "کیا میں تمہیں ایسی بات نہ بتاؤں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے تمہارے گناہوں کو معاف کردے اور تمہارے درجے بلند کردے؟" صحابہ کرامؓ نے عرض کیا "ضرور اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ناگواری اور مشقت کے باوجود کامل طریقے پر وضو کرنا' مسجد کی طرف چل کر جانا' ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا پس یہ تمام اعمال اللہ کی حفاظت اور پناہ میں آنے کا ذریعہ ہیں" (مشکوۃ المصابیح)

سیدہ علیشاہ...... بہاولپور

"سنو، آج کل بادشاہ کے خلاف باغیوں کا ایک گروہ تیار ہو رہا ہے اس لئے رات کو گھر سے نہ نکلا کرو"۔
میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا "میں تو بس چہل قدمی کے لئے دور نکل گیا تھا"۔
"اچھا یہ زرا نقاب الٹ دو تا کہ تمہاری طرف سے اطمینان ہو جائے کہ تم اس گروہ میں شامل نہیں ہو"۔
میں نے دراصل مونچھیں رکھی ہوئی تھیں اس لئے حیل و حجت سے کام لیا اور اس بات نے اس کا شک تیز کر دیا۔ وہ میری طرف بڑھا اور میں بھاگ کھڑا ہوا رات کے سناٹے میں گھنگھرو چھن چھن بج رہے تھے اس نے مجھے جلد ہی پکڑ لیا اس نے میرا نقاب الٹا اور مونچھیں دیکھ کر چیخ پڑا۔
"تم یقیناً ان باغیوں میں شامل ہو چلو بادشاہ سلامت کے دربار میں مجھے ضرور انعام ملے گا۔
میں نے اس کی بہت منت سماجت کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا مجھے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا کر دربار میں لے گیا۔
ابن جدم اس وقت بھی راگ رنگ کی محفل سجائے بیٹھا تھا سازندے راگ درباری گا رہے تھے اور وہ جھوم رہا تھا ۔میں اپنی سزا کے خوف سے لرز رہا تھا مجھے ساتھ لانے والا پکار اٹھا۔
"عالی جاہ! میں نے ایک باغی کو پکڑا ہے"۔
ابن جدم یہ سن کر پوری طرح ہوش میں آ گیا اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور ٹھمکے لگاتا میری طرف بڑھ آیا اس نے میرے چہرے سے پردہ اتار پھینکا میری مونچھیں دیکھ کر اس کا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے بارعب آواز میں کہا
"نوجوان، بہت خوب ہم تمہارے حوصلے کی داد دیتے ہیں"۔
میں نے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے کہا۔ "سنو، ہم تمہیں کوئی سخت سزا نہیں دیں گے بس ہمارے ساتھ ناچو گے بولو منظور ہے یا تیل گرم کرنے کا حکم دیں"۔
میں نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔ "مجھے منظور ہے"۔
سازندوں نے اپنے ساز سنبھال لئے گانا شروع ہوا میں ابن جدم کے ساتھ تھرکنے لگا، ناچنے لگا میں کوشش کر رہا تھا کہ اس کے ہر اسٹیپ پر اس کا ساتھ دوں کچھ اس سے نیا کر سکوں اور سزا سے بچ جاؤں لیکن شاید اسے میرا ڈانس پسند نہیں آ رہا تھا کیونکہ اس نے مجھ پر ٹھمکوں کی بارش کر دی تھی میں ادھ موا ہو کر گر گیا۔ میں فرش پر لیٹا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھایا اور پھر دوبارہ مجھے ٹھمکوں پر رکھ لیا میں یہ تشدد برداشت نہ کر سکا اور بے ہوش ہو گیا۔
جب مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میری مونچھیں صاف کی جا چکی تھیں میرے منہ پر میک اپ کیا جا چکا تھا اور میں گھنگھروؤں کے ساتھ عورتوں والے لباس میں تھا
ابن جدم نے کہا "اب جاؤ تمہارے لئے اتنی ہی سزا کافی ہے"۔
میں نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر گر پڑا۔
اس نے کہا۔ "اب ہم اپنے حکم میں ایک اور اضافہ کریں گے۔ مردوں کے گھر سے نکلنے پر پابندی ہو گی اب صرف عورتیں گھر سے باہر آیا کریں گی مرد گھر کا کام کریں گے اور اب میں شادی پر بھی پابندی لگا رہا ہوں"۔
میرا انجر پنجر ڈھیلا پڑ چکا تھا میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن جسم ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ کافی دیر بعد ہمت کر کے اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا باہر کی جانب چل دیا کسی نے میرا راستہ نہ روکا۔ صبح سات بجے کا وقت تھا جب میں گھر میں داخل ہوا ابا فکر مندی سے ٹہل رہے تھے انہوں نے پریشانی سے پوچھا۔ "بیٹا رات کہاں رہے؟"
میں نے انہیں ہر بات سچ سچ بتا دی۔ ابا کی آنکھوں میں آنسو تھے انہوں نے گلوگیر لہجے میں کہا "بیٹا! اس ظالم سے بچ کر رہنا"۔
میں سارا دن سوتا رہا، شام کو سرکاری طور پر اعلان کر دیا گیا کہ مرد گھر میں رہا کریں عورتیں باہر کا کام کیا کریں گی۔ مردوں نے اس حکم کو حکم حاکم مرگ مفاجات کے مصداق سنا اور گھر میں بیٹھ گئے۔ اب میں اور میرا ابا سارا دن گھر میں پڑے رہتے، میری اماں باہر کے کام کرتیں، سودا سلف لاتیں میں اور ابا پکاتے کبھی خوشی خوشی اور کبھی دکھ کے ساتھ۔
اسی طرح کافی مہینے بیت گئے میرا دل اب اس دنیا سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ میں اس تنہائی سے گھبرا چکا تھا میں

اور ابا کبھی ساز بجاتے کبھی کوئی اور کھیل کھیلتے مگر وقت نہ گزرتا تھا۔

وہ ساون کا مہینہ تھا بادل آتے گھن گھن گرجتے بارش کی بوندیں کن من برستیں اور میں میرا ابا صرف گھر سے ہی باہر کا نظارہ کرتے۔ اس عرصے میں بادشاہ ابن جدم نے بہت سے لوگوں کو باہر نکلنے کے جرم میں موت کی سزا سنا دی تھی اس لئے مردوں نے باہر نکلنا بالکل ہی بند کر دیا تھا۔ میں سوچتا رہتا تھا کہ ہمارے کیا بنے گا کیا ساری زندگی ہم اسی کال کوٹھری میں گزار دیں گے کب اس ظالم مخنث سے ہماری جان چھوٹے گی اس کے ساتھ ہی مجھے چندا کی بہت یاد آئی جس کو میں پورے چھ ماہ سے مل نہیں سکا تھا میں رونے لگا ابا نے کہا۔ ”کیا بات ہے پیٹ میں درد ہے کیا ؟“

”میں نے کہا۔“ ابا! چندا بہت یاد آ رہی ہے۔ میرا دل آج باہر جانے کو کر رہا ہے کیا میں باہر چلا جاؤں“۔

”دیکھو بیٹا! اچھی بات یہ ہے کہ اس ذلت کی زندگی سے موت بہتر ہے، جا چلا جا یوں گھٹ گھٹ کر مرنے کا فائدہ ایک ہی دن مرنا بہتر ہے“۔

یہ سن کر میں نے اچھی طرح کلین شیو کی اماں کے کپڑے پہنے، لمبے لمبے بالوں میں کنگھی کی، پاؤں میں اونچی ہیل والے جوتے پہنے، ناک میں کوکا ڈالا کانوں میں بالیاں، گلے میں ہار۔ سب بناؤ سنگھار کر کے میں نے ابا کے پاؤں چھوئے اور باہر نکل آیا۔

میری حالت کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو کبھی قید میں رہا ہو۔ مجھے ایک اور ہی دنیا محسوس ہو رہی تھی۔ بارش کی بوندیں میرے چہرے پر پڑیں تو مجھے بہت سکون محسوس ہوا۔ میں نے آزاد فضا میں لمبے لمبے سانس لئے اور اسی جانب چل پڑا جہاں مجھے چندا ملا کرتی تھی۔ میں بارش میں بھیگتا وہاں پہنچ گیا میں نے دیکھا وہاں موجود ساری لڑکیاں بارش سے لطف اندوز ہو رہی تھیں میری بے قرار نگاہیں چندا کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں نے دیکھا چندا ایک درخت کی اوٹ میں بیٹھی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ واپس چلا جاؤں مجھے اس حال میں دیکھ کر اس کا دل دکھے گا۔ مگر اس کی آنکھوں سے لگی آنسوؤں کی جھڑی دیکھ کر میں نے ارادہ بدل دیا۔ ایک دو لڑکیوں نے میری طرف توجہ کی

سچے موتی

☆ محبت بانٹنے سے بڑھتی ہے۔

☆ درد بانٹنے سے کم ہوتے ہیں۔

☆ مسکراہٹ درد چھپانے کا اوزار ہے۔

☆ جو سوچو گے وہی پا لو گے اس لیے اپنی سوچ مثبت اور تعمیری رکھیں۔

☆ شک رشتوں کو کھوکھلا اور جذبات کو پامال کر دیتا ہے۔

☆ بامقصد زندگی انسانیت کا پتا دیتی ہے۔

☆ دنیا سے مانگ کر شرمندگی اٹھانے کے بجائے ربّ کائنات سے مانگ کر سرخرو ہونا بہتر ہے۔

☆ نیکی صرف مغرب کی جانب منہ پھیر لینا نہیں کسی کی آنکھ سے اشک چرا لینا' چہروں پر مسکراہٹیں بکھیرنا بھی نیکی اور صدقہ ہے۔

سیدہ جیا عباس کاظمی ...... تلہ گنگ

لیکن مجھے لڑکی سمجھ کر پھر اپنے کھیل تماشے میں مصروف ہو گئیں۔ میں پیچھے سے جا کر چندا کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ اس نے میرے ہاتھوں کو چھوئے بغیر دکھی لہجے میں کہا

”ہٹو، مذاق نہ کرو، جاؤ جا کر کھیلو۔“ وہ مجھے کوئی لڑکی سمجھی تھی

میں نے اس کی آنکھوں سے ہاتھ ہٹائے اور اس کے سامنے چلا گیا اس نے مجھے دیکھا اور دیکھتی چلی گئی وہ روتے ہوئے میرے گلے لگ گئی اس نے ہچکیوں میں کہا۔ ”مندا! تم کہاں چلے گئے تھے، میں نے تمہیں بہت تلاش کیا مگر تم نہ ملے“۔

میں نے اسے اپنے سے الگ کیا ”چندا میری جان، دھیرج میں تمہیں سب بتاتا ہوں“۔ میں نے اسے ساری باتیں سچ سچ بتا دیں ”اب میں اس زندگی سے اکتا چکا ہوں قید کی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے“۔

”پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“

"دیکھو چندا! میں تم سے محبت کرتا ہوں، اب اس حال میں تو میں تم سے شادی نہیں کر سکتا کیوں بادشاہ سلامت مخنث جناب ابن جدم نے شادی پر بھی پابندی عائد کر دی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ اس ملک سے نکل جائیں جو اتنی آسان بات نہیں۔ اب اس کا یہی حل ہے کہ ہم دونوں موت کو گلے لگالیں"۔

"میرے پیارے، اتنا بددل ہونے کی ضرورت نہیں ہم جلد ہی اس ظالم سے نجات حاصل کر لیں گے"۔ چندا نے دلاسا دیا

"وہ کیسے، میں بھی تو سنوں مجھ میں تو اتنی ہمت نہیں"۔

"ہم لڑکیوں نے اس کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا ہے جلد ہی ہم اس کا تختہ الٹ دیں گے"۔

اچانک لڑکیوں نے مجھے پکڑ لیا میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر وہ تعداد میں زیادہ تھیں میں بے بس ہو گیا۔ چندا نے کہا "چھوڑ دو یہ میرا محبوب ہے"۔

ان میں سے ایک بولی۔ "اتنی مشکل سے ہمیں آزادی ملی ہے گھر کے سارے کام مرد کرتے ہیں ہم صرف گھومتی ہیں سیر سپاٹا کرتی ہیں۔ تم چاہتی ہو ہم پھر مردوں کی محکوم بن جائیں۔ نہیں چندا ایسا نہیں ہوگا ہم تمہیں اور اور تمہارے محبوب کو بادشاہ سلامت کے حضور پیش کریں گے"۔

یہ سن کر میں تو میں چندا بھی اچھل پڑی۔

"یاد رکھو، تم نے میرے ساتھ غداری کی ہے اس کی بہت بڑی سزا ملے گی"۔

ان میں سے ایک بولی "کیا سزا ملے گی؟"

"اب کسی لڑکی کی شادی نہیں ہوگی"۔ چندا نے اپنی طرف سے بڑا تیر چھوڑا "تو نہ ہو شادی ہم شادی کے بغیر ہی ٹھیک ہیں کم از کم آزادی تو ہے"۔

یہاں تو ساری گیم الٹ چکی تھی۔ لڑکیوں نے ہمیں دوپٹوں سے باندھا اور ابن جدم کے دربار کی طرف چل پڑیں۔

ابن جدم برسات کے سہانے موسم میں سازندوں کی باندھی ہوئی لے پر تھرک رہا تھا اس نے لڑکیوں کو دیکھ کر ساز بند کرنے کا اشارہ کیا اور لڑکیوں سے کہا۔ "کیا بات ہے ان کو کیوں باندھ رکھا ہے؟"

ان میں سے ایک لڑکی بولی "عالی جاہ! یہ دونوں غدار ہیں آپ کے خلاف سازش کر رہے تھے ہم نے انہیں رنگے ہاتھوں پکڑا ہے"۔

ابن جدم نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے "ہوں" کہا پھر شائد مجھے پہچان گیا "نوجوان تم تو پہلے ہی سزا یافتہ ہو ہم تمہیں پہلے بھی سزا دے چکے ہیں اس سزا نے شاید تمہیں سیدھا نہیں کیا"۔

"جی ہاں عالم پناہ! لیکن جناب میں گھر میں رہ رہ کر تھک چکا تھا، آج ذرا گھر سے باہر نکل آیا اور ان لڑکیوں نے مجھے پکڑ لیا اور مجھے یہاں لے آئیں"۔ میں نے صفائی پیش کی۔

"دیکھو نوجوان، تمہارا مقدر یہی ہے اس لئے اسے دل وجان سے قبول کر لو، گھروں میں بیٹھنا سیکھو۔ کیوں کہ میں نے شادی والا معاملہ ختم کر دیا تھا لیکن اب میں تم مردوں پر ترس کھا کر آج سے حکم جاری کرتا ہوں کہ شادی اب ضرور ہو گی لیکن پہلے جیسی نہیں اب لڑکی لڑکے کے گھر بارات لے کر جایا کرے گی اور لڑکے کو بیاہ کر اپنے گھر لے کر آئے گی شادی کے بعد بھی تم مردوں کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہو گی تم اچھے شوہروں کی طرح گھر کے کام کاج کرو گے اور عورتیں باہر کا کام کریں گی"۔

شادی کا سن کر جہاں خوشی ہوئی وہاں یہ غم بھی ہوا کہ ہم پہلے کی طرح گھروں کے غلام ہی رہیں گے۔ اس کے بعد ابن جدم نے کہا۔

"پہلی بار میں نے تمہیں چھوڑ دیا کہ تمہاری پہلی خطا تھی مگر اب نہ چھوڑوں گا"۔ پھر وہ لڑکیوں سے مخاطب ہوا "جاؤ ان دونوں کو یہاں چھوڑ جاؤ اور تم جاؤ"۔

لڑکیاں خاموشی سے دربار سے نکل گئیں پھر ابن جدم بولا "دیکھو میں محبت کرنے والوں کی قدر کرتا ہوں، میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں مگر اب میرے خلاف ایسی بات نہیں ہونی چاہئے"۔

پھر اس نے چندا اور مجھ کو بندھے ہوئے دوپٹے سے الگ کیا اور چندا اپنے ساتھ کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا میرا دل دھک دھک کرنے لگا وہ چپ چاپ ابن جدم کے ساتھ کمرے میں چلی گئی جب وہ واپس آئی تو میں نے

دیکھا اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہا۔

''منداچلیں''۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا میں نے اس سے پوچھا

ابن جدم نے تمہیں کمرے میں کیا کہا ہے؟''

وہ میری بات گول کر گئی اور بولی'' مندا میں تم سے شادی کروں گی اگلے ہفتے میں گھوڑے پر بارات لے کر تمہیں بیاہنے آؤں گی''۔

میں نے اس سے پوچھا'' اکیلا دولہا ہی چاہئے کہ ساتھ میں جہیز بھی ہو''۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ میں بھی پھر چھیڑا۔'' اپنے دولہے کا گھر بھی دیکھ لو''۔

''اچھا رات کو ابا کے ساتھ تمہارے گھر آؤں گی'' ۔اس کے بعد ہم نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ لیکن میرے حلق سے چندا کے ابن جدم کے کمرے سے خوش خوش باہر آنے کی بات نہیں اتر رہی تھی۔

ایک ہفتے بعد چندا گھوڑے پر بارات لے کر مجھے بیاہنے آ گئی ایک عجیب طرح کی شادی تھی دلہن خود دولہا کو لینے آئی تھی اس کی بارات صرف لڑکیوں پر مشتمل تھی ہمارے گھر کے مردوں کو بھی گھر کی حدود سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

میں چندا کی حجلہ عروسی میں بیٹھا آنے والی زندگی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ چندا مجھے ابھی آئی کا کہہ کر گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب اس گھر سے تو میرا جنازہ ہی نکلے گا پتہ نہیں مجھے میرے میکے والوں سے ملنے کی اجازت بھی ہو گی یا نہیں۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر میں سوچوں سے نکلا مندا کے ہاتھ میں دو دودھ کے گلاس تھے۔ وہ میرے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گئی اس نے ایک گلاس میرے ہاتھ میں پکڑایا'' لو مندا !دودھ پیو''۔

میں نے گلاس ہونٹوں سے لگایا وہ کن اکھیوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی اس نے بھی دودھ کا گلاس ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ اچانک اس کے ابا کی آواز آئی'' بیٹی چندا میری بات سننا''۔

''مندا میں ابھی آتی ہوں''۔

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی میں نے آئندہ زندگی کی سوچوں میں دودھ پیا اور لیٹ گیا۔ میرا نہ صرف جی متلانے لگا بلکہ دل بھی گھبراہٹ کا شکار ہو گیا مجھے ابکائیاں آ رہی تھیں پھر مجھے زوردار قے ہوئی اور میں یہ دیکھ کر لرز اٹھا کہ اس قے میں خون ہی خون تھا مجھے قے پر قے آ رہی تھی کمرہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی بکرے کو ذبح کر دیا گیا ہو میں سوچ رہا تھا کیا چندا نے مجھے دودھ میں زہر دیا ہے۔ اب میرے ذہن میں چندا کے ابن جدم کے ساتھ کمرے میں جانے اور خوش خوش باہر آنے کی بات واضح ہو گئی تھی۔ ابن جدم نے ضرور اسے ملکہ بنانے کا کہا ہو گا مگر وہ تو مخنث ہے، ہو سکتا ہے مخنث نہ ہو یہ سارے اس کے شوق ہوں میں بھی تو اگر میک اپ کروں تو پورا مخنث بن جاتا ہوں ذہن نے مجھے تسلی بخش جواب دیا۔ میری آنکھیں بے نور ہوتی جا رہی تھیں میں سوچ رہا تھا کہ میں نے عورت پر اعتبار کیوں کیا ؟میں صرف ایک بار اس کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا میں نے اسے آواز دی۔

اس نے آتے ہی مجھ سے کہا'' مندا !یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

میں نے اپنی بے ترتیب سانسوں کے درمیان کہا'' چندا !تم نے مجھے زہر دیا ہے۔ میں نے تم سے محبت کی تم نے اس کا یہ صلہ دیا ہے تم بے وفا ہو، تم بے وفا ہو''۔

اس نے کہا'' مندا میں تمہیں ہرگز نہ مارتی مگر عورت کبھی بادشاہت نہیں ٹھکرا سکتی۔ اب میں ابن جدم سے شادی کروں گی ملکہ کہلاؤں گی اگر تم مجھے کبھی ملے تو ایک بات ضرور بتانا مردوں نے ہمیشہ عورت کی خاطر تاج و تخت کو ٹھکرایا ہے کبھی کسی عورت کو بھی ایسا کرتے دیکھا ہے''۔

پھر اس کے ساتھ ہی شہنائی کی آواز سنائی دی، گھنگھرو کی جھنکار، پھر ڈھولک کی تھاپ۔ ہارمونیم کی آواز، چاند بادلوں کی اوٹ میں کہیں چھپ چکا تھا، ہر طرف تاریکی کا راج تھا مندا اپنی کہانی ختم کر چکا تھا پھر مردے اٹھے صرف شہنائی کی درد بھری لے قبرستان میں گونج رہی تھی۔ مردے ایک بار پھر قبروں میں اتر رہے تھے صرف قیامت کے دن اٹھنے کے لئے جس دن مندا، چندا کے سوال کا جواب دے گا۔

الیکٹرونک میڈیا کے ناجائز استعمال سے جنم لینے والے واقعات کا شاخسانہ۔
اس ماں کی کہانی جس نے اپنی محبت کے کھو جانے کا انتقام اپنی بیٹی کی محبت چھین کر لیا۔
اس نوجوان کی داستان الم جس نے محبت کے حصول کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔
معروف ادیب ریاض حسین شاہد کے قلم سے سسپنس سے بھرپور سلسلے وار کہانی۔

پھر اس کی میت کراچی سے ہری پور لائی گئی۔ پچھلے دس روز سے بچھڑی ہوئی بیٹی ماں سے اس حال میں ملاقات کو آئی۔ نا گلے لگ کر پیار دیا۔ نا اتنے دنوں کا احوال پوچھا کہ ''تم میرے بن کس حال میں رہ کر وقت گزار رہی ہو؟ تمہارے اسکول کے امتحان کیسے ہوئے؟'' کچھ بھی تو نہ پوچھا۔ بس اسے روتا بلکتا چھوڑ کر زندگی کے کڑے امتحانوں کی آغوش میں ڈال کر چپکے سے رخصت ہوگئی۔

باپ کا دستِ شفقت پانچ ماہ تک سر پر رہا۔ پھر پاپا جان نے اپنے لئے نئے ہمسفر کو تلاش کیا اور ایک ماہ بعد راولپنڈی جا کر نئی دنیا آباد کر لی۔ معصوم سی بیٹی کو دادو اور دادا جان کے سپرد کر دیا گیا۔ انہوں نے سندس کی تربیت اور اچھی نشوونما میں کوئی کسر تک نہ رکھی۔ مگر والدین کی کمی سندس کو ہر قدم پر احساس کمتری دلاتی رہی۔ گھر میں تمام کام ملازم اور ملازمہ سر انجام دیتے تھے۔ سندس اپنی پڑھائی اور اپنے کمرے تک محدود ہو کر زندگی کا سفر طے کر رہی تھی۔ ابھی بی اے کے امتحانات ہو رہے تھے کہ دادا جان نے اپنے کمرے میں بلایا اور اپنی پوتی کو یہ نوید دی۔

''سندس بیٹا! ایک بہت ہی امیر گھرانے سے رشتے کی آفر آئی ہے۔ لڑکا پی آئی اے میں ملازم ہے۔ پہلے شادی ہوئی مگر اولاد نہ ہو سکی۔ دو سال بعد ہی طلاق ہو گئی۔ بیٹا یہ رشتہ ہر لحاظ سے تمہارے لئے بہت موزوں رہے گا۔ میں نے تمہارے پاپا سے بات کی ہے۔ اس نے یہ کہہ دیا ہے کہ سندس سے مشاورت کر لیں۔ اگر وہ رضا مند ہے تو میری طرف سے آپ کو اجازت ہے۔ آپ رشتہ کر کے بیٹی کو رخصت کر دیں۔ اب یہ فیصلہ آپ نے کرنا ہے بیٹا اور مجھے امید ہے کہ آپ میرے فیصلے کو رد نہیں کریں گی'' دادا جان نے فیصلے کا حق دے کر بھی فیصلہ اپنے ہاتھ میں مضبوط رکھا۔

سندس کے دل و دماغ پر ایک وزنی پہاڑ سا آن گرا۔ پل بھر میں اتنا بڑا فیصلہ۔ ایک شادی شدہ انسان سے زندگی گزارنے کی بات کتنی آسانی سے کہہ دی گئی تھی کہ وہ تمہارے لئے بہت موزوں ہے۔ سندس کو اس وقت اپنی مما کی کمی کا احساس شدت سے ہوا۔ کاش کہ وہ زندہ ہوتی تو ان کے گلے لگ کر کہہ تو سکتی کہ مما میں یہ نہیں کر سکتی۔ پھر باپ کا خیال آیا کہ انہوں نے تو اس پرپوزل کو قبول کر لیا ہے۔ باپ کی اس بے رحمی پر خنجر مارنے کو جی چاہا۔ دادا جان نے اگر اسے بیٹی کی طرح پال پوس کر بڑا کیا تھا تو آج اسکے فیصلے کو رد کیسے کر دیتی؟ لہٰذا صرف اتنا کہہ سکی کہ'' بابا حضور آپ کا ہر فیصلہ مجھے منظور ہے اور بھاگ کر کمرے سے باہر چلی گئی''۔

دادا کی اپنی پوتی سے محبت جیت گئی اور پوتی کی دادا سے محبت ایثار وفا کی بھینٹ چڑھ گئی۔

بی اے کے امتحانات سے فراغت پا کر سندس زندگی کے پریکٹیکل امتحانات میں داخل ہو گئی۔ ایک پر وقار تقریب میں اسے پیا کے سنگ رخصت کر دیا گیا۔ سگا باپ ایک رات کیلئے اپنی شریک سفر کو لے کر آیا۔ بیٹی کے سر پر دستِ شفقت رکھا۔ نقدی کی صورت میں چیک پیش کیا اور صبح بیٹی کی رخصتی کے ساتھ ہی واپس لوٹ گیا۔

سندس کا شریک سفر ذوہیب بظاہر تو ایک تنومند خوبصورت خدوخال کا دراز قد شخص تھا۔ مگر اس کی میڈیکل رپورٹ میں وہ کبھی بھی باپ بننے کی صلاحیت سے محروم تھا۔ اس کی پہلی بیوی نے اسی وجہ سے اس سے ڈائیورس لے لی تھی۔ مگر یہ بات اس کے والدین نے سندس کے لواحقین سے شیئر نہیں کی تھی۔ ورنہ شاید وہ بھی انکار کر دیتے۔ مگر سندس کے نصیب میں یہ سب لکھ دیا گیا تھا اور نصیب اٹل ہوتا ہے۔

سندس کو جب اپنے شوہر کی اس محرومی کا انکشاف ہوا۔ وہ چکرا سی گئی۔ مگر اس نے اسے اپنا مقدر سمجھ کر ذوہیب کا ساتھ دینے کا ارادہ کر لیا۔ وہ اپنے طور پر اچھے سے اچھے ڈاکٹر سے رابطہ کر کے ان سے وقت لیتی۔ ذوہیب جو کہ ایک ہفتے بعد اسلام آباد سے گھر آتا تھا۔ دو رات گھر قیام کرتا اور پھر اپنی ڈیوٹی پر چلا جاتا۔ اس کی چھٹی کے دو دن سندس اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا ارادہ ظاہر کرتی تو وہ کسی نہ کسی بہانے ٹال جاتا یا پھر مقررہ وقت پر گھر سے باہر چلا جاتا۔ کئی بار ایسا ہوا۔

بہت اصرار کے بعد ایک بار اسے اسلام آباد ڈاکٹر

کے پاس لے جاتے میں کامیاب بھی ہوئی۔ ٹیسٹ لئے گئے۔ اگلے دن سندس نے خود جا کر ٹیسٹ رپورٹ لی تو اسے حقیقت سے آشنا ہونا پڑا کہ یہ شجر تو سدا کیلئے خزاں رسیدہ ہے۔ اس پر کبھی بہار آنے کی امید بھی نہیں۔ اس دن وہ جی بھر کر روئی۔ اب اسے چیک اپ کیلئے بیرون ملک لے جانا چاہتی تھے۔ مگر ذوہیب کسی طور پر بھی راضی نہ ہو رہا تھا۔ بلکہ اب وہ سندس سے کھنچا کھنچا سا رہنے لگا۔ ہفتے بعد گھر آتا تو اپنی مما کے پاس بیٹھا رہتا۔ گیارہ بجے آ کر اپنے بیڈ پر لیٹ جاتا۔ سندس اس سے بات کو ترستی رہتی اور وہ سو جاتا۔ اپنی تمام تر کوششیں ناکام دیکھ کر سندس بھی ذوہیب سے دل برداشتہ ہونے لگی۔ اب ان دونوں میں تکرار سی ہونے لگی۔ پھر یہ تکرار کبھی کبھار جھگڑے کی صورت بھی اختیار کر جاتی۔

سندس نے اپنے پاپا سے ساری بات ڈسکس کی تو باپ کا ردعمل خاصا مایوس کن رہا۔ اس نے بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں بیٹا! اگر تمہارے مقدر میں ہوا تو اولاد بھی ہو جائے گی اور تو تمہیں گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے نا۔ زندگی انجوائے کرو۔ ذوہیب کے علاج کی بھی کوشش کرتی رہو۔ فارن چلی جاؤ۔ میں بھی آپ کو سپورٹ کر دونگا۔ اس بات کی ٹینشن نہ لو۔ اوکے۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔ بائے۔"

باپ کے اس ناروا برتاؤ پر سندس جیتے جی مر ہی تو گئی۔ وہ کمرے میں چھپ کر جی بھر کر بین کر کے رو دی۔ پھر ایک دن اس نے ذوہیب سے ہاتھ باندھ کر یہ بات بھی کہہ ہی دی۔

"میری پیاسی ممتا صرف ایک بے بی کی طلبگار ہے۔ اگر آپ اس قابل نہیں۔ میرے ساتھ فارن جا کر اپنا چیک اپ کروانے پر بھی رضامند نہیں تو ذوہیب مجھے ڈائیورس دے دو۔ پلیز ذوہیب مجھے ڈائیورس دے دو۔ میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی"۔

ذوہیب یہ بات سن کر ٹپٹا سا گیا اور سندس کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو جھٹک کر اس نے سندس کے آگے ہاتھ باندھ کر گڑگڑانے کے انداز میں کہا۔

"سوری سندس میں بے بس ہوں۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ مگر خدا کیلئے مجھے چھوڑ کر جانے کی بات نہ کرو۔ مجھے تم سے بے حد پیار ہے اور میں کسی بھی صورت تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ آج کے بعد بھی ایسی بات نہ کرنا۔ ورنہ میں مر جاؤں گا"۔

ذوہیب بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو سا دیا۔ سندس کو اس کی حالت پر بہت ترس آیا۔ اس نے ذوہیب کے بندھے ہاتھ کھول دیئے اور اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ کر اپنے مقدر پر سارے آنسو بہا دیئے۔

اس بیری محبت کے ذرا تقاضے تو دیکھو۔ ذوہیب کی محبت سندس سے اپنے لئے وفا مانگ رہی ہے۔ سندس کی محبت ممتا کی تشنگی مٹانے کا تقاضا کر رہی ہے۔ ذوہیب کے والدین کی اپنے بیٹے سے محبت کے تقاضے نے دو لڑکیوں کو اپنی جوانی برباد کرنا پڑی۔ سندس کے باپ کی اپنی نئی بیوی کے ساتھ محبت کا تقاضا تھا کہ بیٹی کی محبت چھوڑ کر میری محبت کا دم بھر واور وہ بھرنے لگا۔

"اے محبت تو ہم انسانوں سے آخر چاہتی کیا ہے؟ کوئی تیرے تقاضے کہاں تک پورے کرے؟ تیرا نام محبت ہے۔ مگر تو دشمن ہے ہماری۔ تیرا ہر تقاضا انوکھا، تیری ہر خواہش مجرمانہ، تیری ادا بھی دھوکہ، تیری وفا بھی دھوکہ۔ اے محبت چھوڑ دے ہمارا پیچھا۔ ہمیں زندگی گزارنے کا کوئی اور ہنر سیکھنے دے۔ جب تو نہ رہے گی تو پھر نفرت کا وجود بھی ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ تو تیرے دم سے قائم ہے۔ وہ تیرے سائے کی مانند ہے۔ تیرے بعد وہ ہستی سے مٹ جائے گی اور ہم انسان آزاد ہو جائیں گے۔ ورنہ ہر معاشرے میں، ہر طبقے میں، ہر شہر اور ہر گھر میں محبت کی جنگ بلکہ محبت کے تقاضوں کی جنگ لڑی جاتی رہے گی۔

پھر محبت کے ہاتھوں ہری پور کی سندس برباد ہو گئی تو چنیوٹ کی عائشہ بھی محبت کے زخم سینے پر سجائے گھٹ گھٹ کر زندگی کی سانسوں کا سفر پورا کرنے پر مجبور ہو گئی۔ جس نے ایک ہنستے مسکراتے خوشحال گھرانے میں جنم لیا اور تین سال کی عمر میں ہی ننھیال اپنے ماموں کے ہاں رہنے لگی۔ ماموں اس سے بہت پیار کرتے

تھے۔ ممانی بھی اس پر جان چھڑکتی تھی۔ یہ وجہ ہے کہ وہ ننھیال میں لڑکپن اور بچپن کی حدیں پار کر گئی۔ اس کی بچپن سے عادات لڑکوں جیسی تھی۔ مثلاً اس نے ہمیشہ لڑکوں جیسا لباس اور جوتا پہنا ہے۔ ہیر کٹنگ ہمیشہ لڑکوں جیسی رکھتی ہے۔

دیکھنے میں وہ لڑکا ہی دکھائی دیتی تھی۔ لڑکوں کے ساتھ ہی اس نے کھیل کر بچپن کے دن گزارے۔ سائیکل چلانا سیکھ لی اور گلیوں میں سائیکل لئے نکل کھڑی ہوئی۔ گھر میں کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ اسکول میں نام درج ہوا تو وہاں بھی بے خوف وخطر لڑکوں کی طرح بن ٹھن کر رہتی۔ محلے میں، بستی میں، جس گھر میں شادی ہوتی پتلون شرٹ پہن کر ٹہلتی ہوئی شادی والے گھر پہنچ جاتی۔ شامیانے میں کھانے کی میز پر کرسی سنبھال لیتی۔ مزے سے کھانا کھاتی۔ ڈرنک نوش کرتی اور ڈکار لیتی ہوئی گھر آجاتی۔

بن بلائے شادی کھانا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا اور کبھی کسی نے اسے نہیں روکا تھا کہ تم کون ہو؟ کس کے ساتھ آئے ہو؟ اس کے بارے میں کوئی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ مسٹر درحقیقت میڈم صاحبہ ہیں اور یہ بن بلائے یہاں مہمان ہیں۔ سبھی اسے لڑکا سمجھتے اور اگر کسی لڑکے نے اس کے ساتھ بدتمیزی کر لی تو پھر اس کی خیر نہیں۔ دس برس کی عمر تک تو وہ گلی میں لڑکوں کے ساتھ گولیاں اور آنکھ مچولی کھیلتی رہتی تھی۔ پھر جب اس کے ماموں کا انتقال ہو گیا تو چند دن بعد ہی عائشہ اپنے گھر آگئی۔ مگر یہاں بھی اس کے لچھن یہی رہے۔ اس کے ابو، اس کے بھائی، بہنیں، مما سبھی اسے آوارہ گردی کرنے اور لڑکوں کے ساتھ کھیلنے سے منع کرتے مگر وہ باز نہ آتی۔

پھر جب اس کی بڑی سسٹر کی شادی فیصل آباد کے نواح میں ایک گاؤں میں ہو گئی تو اس نے گھر میں اعلان کر دیا کہ میں نے بھی باجی کے پاس اس کے سسرال میں رہنا ہے۔ یہاں میرا دل نہیں لگتا۔ سب بڑے پریشان ہوئے کہ بیٹا بہن کے گھر تمہارا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ لوگ کیا سوچیں گے؟ اب تم بچی نہیں رہیں۔ یہاں اسکول میں تمہارا نام درج کراتے ہیں تم پڑھ لو۔ گھر میں دل بھی لگ جائے گا۔ مگر عائشہ صاف انکار کرتی رہی۔ مجبوراً تنگ آکر اسے بڑی باجی نمرہ اپنے ساتھ لے گئی۔ وہیں اس کا نام اسکول میں درج کرایا گیا۔

شروع شروع میں تو اس کی عادات سب کو بڑی معیوب سی لگیں۔ مگر رفتہ رفتہ سبھی اس کی عادتوں سے واقف ہو گئے۔ اب یہاں وہ آوارہ گردی تو نہیں کرتی تھی۔ مگر سکول میں اور آتے جاتے وہ کسی نہ کسی طرح اپنا شوق پورا کر ہی لیتی تھی۔ پڑھائی کی طرف اس کی کوئی خاص توجہ نہ تھی۔ اس لئے اگلے چار سالوں میں اس نے بمشکل مڈل پاس کیا۔ اب وہ سولہ برس کی ایک نٹ کھٹ دوشیزہ بن چکی تھی۔ اب اسے مجبوراً لڑکیوں جیسا لباس پہننا پڑتا تھا۔ پھر بھی وہ پتلون کا زیادہ استعمال کرتی۔ اس کی بہن نمرہ کا دیور ظفر جو میٹرک کے بعد پڑھنا چھوڑ کر شہر میں کار ڈرائیونگ سیکھنے جایا کرتا تھا۔ اسے پڑھائی سے زیادہ ڈرائیونگ کا شوق تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے والدین سے کہہ دیا کہ میں نے ڈرائیونگ سیکھنی ہے اور ٹیکسی چلانا ہے۔

چھ ماہ بعد اس نے لائسنس حاصل کر کے شہر میں کسی کی گاڑی ٹیکسی ڈرائیور کے طور پر چلانے لگا۔ شام کو گاڑی لے کر وہ گاؤں اپنے گھر آجاتا تھا۔ اب اس کے گھر والوں کو بھی بڑی آسانی ہو گئی تھی کہ وہ صبح اس کے ساتھ مفت میں شہر چلے جاتے اور کئی بار وہ انہیں گھر بھی ڈراپ کر جاتا یا پھر وہ چنگ چی پر لوٹ آتے۔ عائشہ اور اس کی بہن نمرہ نے جب میکے گھر جانا ہوتا تو ظفر انہیں چھوڑ دیتا۔ ظفر شروع سے ہی عائشہ میں دلچسپی رکھتا تھا۔ مگر عائشہ نے کبھی اس کے بارے میں سوچا بھی نا تھا۔

ایک روز وہ عائشہ کو اس کے والدین کے گھر چھوڑنے چنیوٹ جا رہا تھا کہ راستے میں اس نے عائشہ سے اپنے دل کا حال بیان کیا۔

"میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میں تمہیں ہی اپنا جیون ساتھی بناؤں گا۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پلیز میرا دل نہ توڑنا۔ تم مجھے بہت اچھی لگتی

ہو۔ پوری دنیا میں تمہارے جیسی کوئی حسین لڑکی میں نے نہیں دیکھی“۔ عائشہ اس کی باتیں سن کر پہلے تو بڑی حیران ہوئی۔ پھر حیرت سے پوچھا۔

”اچھا۔ لیکن مجھے تو ابھی ان باتوں کا پتہ ہی نہیں اور نا ہی ابھی میں نے اس طرح کا کچھ سوچا ہے۔“ وہ ٹکہ سا جواب سن کر ظفر کا چہرہ بجھ سا گیا۔ مگر اس نے عائشہ کو متوجہ کرنے کی ہر کوشش جاری رکھی۔ پھر ایک وقت آیا عائشہ نے اس کے ساتھ محبت کا دم بھرا۔ ظفر کی محبت کا تقاضا پورا کیا اور اپنی محبت کی ننی کونپل کو ظفر کے نام سے دل میں پھوٹنے دیا۔ جو جلد ہی کلی، غنچہ اور پھول بن کر مہک اٹھا اور وہ ظفر کی محبت کا دم بھرنے لگی۔ ہر ہفتے وہ اپنی باجی سے کہتی۔

”میں نے امی ابو سے ملنے جانا ہے“۔

ظفر کے ساتھ پہلے ہی پروگرام طے ہوتا۔ ظفر سر شام ہی گھر آجاتا۔ نمرہ اسے کہتی ”ظفر عائشہ نے آج چنیوٹ جانا تھا۔ اگر آپ اسے چھوڑ آتے تو......“

”ٹھیک ہے“۔

ظفر کا جواب ہاں میں ہوتا اور عائشہ کو لئے شہر چل دیتا۔ ایک سترہ برس کی جوان لڑکی کو ایک بیس سالہ نوجوان کے ساتھ رات کو سفر پر روانہ کرنا کس قدر عقلمندی اور دور اندیش سوچ رکھنے سے محروم ذہن کا کام ہی ہوسکتا ہے۔ دو دن بعد شام کو عائشہ ظفر کے ساتھ واپس گھر آتی اور پھر یہ سلسلہ ہر ہفتے مستقل طور پر جاری رہنے کی صورت اختیار کر گیا۔ دونوں فیصل آباد اور چنیوٹ کی سڑکوں پارکوں اور سینما گھروں میں وقت گزاری کرتے۔ نا ادھر کسی کو خبر اور نا ادھر کسی کو معلوم کہ ہماری جواں سال بیٹی اس وقت کہاں اور کس حال میں ہے؟

بات بہت آگے تک نکل گئی۔ اب دونوں کورٹ میرج کرنا چاہتے تھے کہ ظفر کی والدہ شدید بیمار ہو گئیں۔ انہیں الائیڈ ہسپتال فیصل آباد کے سینی ٹوریم وارڈ میں داخل کرایا گیا۔ وہ تپ دق کی مریضہ تھیں۔ دو ماہ کیلئے انہیں داخل کیا گیا تھا۔ تبھی اس کی دونوں بیٹیاں جو شادی شدہ تھیں۔ مریضہ کے پاس ٹھہر جاتیں۔ زیادہ تر نمرہ کو اپنی ساس کے پاس رہنا پڑتا۔

پھر طے کیا گیا کہ رات کو جب ظفر گھر آجاتا ہے تو یہ عائشہ کو لے کر آجایا کریں گے تو نمرہ بچوں کو اسکول بھیج کر اسپتال میں جایا کرے گی۔ اب ان دونوں کو ہر رات اکٹھے رہنے کا موقع بھی فراہم ہو گیا اور ہر دن صبح شام گاڑی کے سفر میں تنہائی بھی میسر آگئی۔ عائشہ اور ظفر نے اس موقع کو اپنے لئے سنہرا موقع سمجھا اور اس سے فائدہ اٹھانے کا پروگرام طے کر لیا۔ چند دوستوں کو اپنے اس منصوبے میں شامل کیا۔ جن میں شہر کے زیادہ ٹیکسی ڈرائیور تھے۔ سب نے مل کر مالی طور پر بھی ظفر کی مدد کی۔

ایک ہوٹل میں نکاح کا پروگرام طے پایا گیا۔ نرس کو ایک بڑا سا نوٹ دے کر اسے پابند کر دیا گیا کہ آج کی رات آپ ہماری مریضہ کی مکمل دیکھ بھال کریں گی۔ نمرہ بھابی کو گھر چھوڑ کر ظفر عائشہ کو لئے ہسپتال پہنچا۔ امی جان کو کھانا وغیرہ کھلایا اور نرس کو آن ڈیوٹی کر کے دونوں ہوٹل پہنچ گئے۔ جہاں تمام انتظام مکمل تھا۔ مولوی صاحب نے نکاح پڑھایا۔ نکاح خواں نے نکاح درج کیا۔ دو لڑکی کے گواہ بنے اور دو لڑکے کے گواہ بن کر کاغذی کارروائی مکمل کی گئی۔ سب نے ایک ساتھ مل کر کھانا کھایا اور پھر اس جوڑے کو ہوٹل کے ریزور کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

صبح طلوع ہوئی تو نو بیاہتا جوڑا اپنے اصل کپڑوں میں گاؤں پہنچا اور نمرہ بھابی کو ہسپتال چھوڑ دیا گیا۔ اب دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے۔ دو ماہ بعد مریضہ گھر آگئی۔ اب عائشہ اور ظفر کو چنیوٹ جانے پر ملنے کا موقع میسر ہوتا۔

دو ماہ بعد ہی عائشہ حاملہ ہو گئی۔ اب وہ ظفر پر زور دے رہی تھی کہ ہمیں گھر والوں کو اپنا نکاح نامہ دکھا کر اس ڈرامے کا ڈراپ سین کر دینا چاہیے۔ تاکہ میں ان کی اپنی طرف اٹھنے والی سوالیہ نگاہوں کا جواب دے سکوں۔ مگر ظفر اس بات پر اڑا تھا کہ میں آپ کو میڈیسن لا کر دیتا ہوں۔ آپ اس ڈلیوری کو مس کر دیں۔ ہمیں ابھی بچوں کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی ابھی ہمیں اپنا نکاح شو کرنے کی ضرورت ہے۔ عائشہ یہ بات سن کر آگ بگولہ ہو گئی۔ اس کے اندر ہمت جاگ اٹھی۔ وہ چیخ اٹھی۔

"خبردار ظفر! جواب تم نے دوبارہ کوئی ایسی بات کی تو؟ میں اپنے بچے کا قتل نہیں ہونے دونگی۔ میں آپ کی قانونی اور شرعی بیوی ہوں۔ یہ کوئی حرام کی اولاد تو نہیں ہے۔ جس کو میں اپنے ہاتھوں سے ضائع کر دوں"۔

عائشہ کی بات سن کر ظفر بھی کچھ دیر کیلئے سٹپٹا سا گیا۔ مگر خاموشی اختیار کر لی۔ چند روز تک وہ کوئی منصوبہ بندی کرتا رہا۔ پھر جس روز اس نے عائشہ کو چنیوٹ لے کر جانا تھا۔ اس دن سر شام ہی وہ گھر آیا اور نمرہ بھابی کو بتایا۔

"آج مجھے رات واپس فیصل آباد جانا ہے۔ وہاں سے کل ایک بارات لے کر ہمیں لاہور جانا ہے۔ اس لئے میں ابھی عائشہ کو لے جاتا ہوں۔ اسے چنیوٹ چھوڑ کر واپس فیصل آباد آجاؤں گا"۔

عائشہ نے بھی اس بات کو سچ جانا۔ مگر جب وہ اسے لئے فیصل آباد ایک ہوٹل پہ پہنچا تو عائشہ نے حیرت سے یہاں آنے کی وجہ پوچھی۔

"بس یہاں کھانا کھائیں گے۔ کچھ دیر بیٹھیں گے۔ پھر چلے جائیں گے"۔

ظفر عائشہ کو لئے پہلے سے ریزور شدہ کمرے میں پہنچا۔ جوس وغیرہ پیا اور پھر ظفر نے اپنی شریک حیات کو اس قدر جنسی تشدد کا نشانہ بنایا کہ اسے بلیڈنگ شروع ہو گئی۔ فوری اسے لے کر ہاسپٹل پہنچا۔ چیک اپ کے بعد انہیں بتایا گیا کہ آپ کا کیس ضائع کرنا پڑے گا۔ بلیڈنگ بہت ہو چکی ہے۔ لہذا عائشہ کا ابارشن کر دیا گیا۔ اسے میڈیسن دے کر بیڈ ریسٹ کا کہہ کر صبح صبح ہی ڈسچارج کر دیا گیا۔ ظفر اسے لئے چنیوٹ پہنچا۔ عائشہ اس سے سخت ناراض تھی۔

"تو نے جان بوجھ کر یہ سب کچھ میرے ساتھ کیا ہے۔ تو اپنے بچے کا قاتل ہے میں تجھے بھی معاف نہیں کروں گی"۔

وہ پورا ہفتہ عائشہ اپنے والدین کے گھر بیڈ ریسٹ پہ رہی۔ ذرا سی تنہائی اسے رلا دیتی۔ بچے کی یاد اور ظفر کی

سنگدلی پر وہ کٹ کر رہ گئی تھی۔ کبھی گھر والے اس کی اسی کیفیت سے پریشان تھے۔ مگر وہ کسی کو کچھ نہیں بتا رہی تھی کہ میں زندگی کی کتنی منزلیں عبور کر چکی ہوں۔ جن کا آپ کو علم ہی نہیں۔ ظاہر ہے جو والدین اپنی جوان بیٹی کو کسی غیر کے ہاتھوں اس قدر آزادانہ گھومنے پھرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ ان کو عبرت ناک انجام سے تو دو چار ہونا ہی پڑتا ہے نا۔

اگلے ہفتے ظفر اسے لینے آیا تو بغیر کسی چوں چراں کے اسے پھر سے بھیج دیا گیا۔ عائشہ نے تمام رستے میں ظفر سے اس کی سنگدلی اس کی بے حسی پر بہت کچھ کہا۔ مگر وہ ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ بس اس دن کے بعد وہ بجھی بجھی سی رہنے لگی۔

پھر ایک دن ظفر ایک فائل لے کر عائشہ کے کمرے میں آیا اور اسے بتایا کہ "میں بینک سے لون لینے لگا ہوں۔ کچھ تمہارے نام سے اور کچھ اپنے نام سے۔ میں اپنی گاڑی لینا چاہتا ہوں۔ اب مجھ سے لوگوں کی نوکری نہیں ہوتی۔ بس تم یہاں سائن کر دو"۔

پھر جہاں جہاں اس نے کہا۔ عائشہ نے اپنے سائن کر دیئے۔ جب وہ کمرے سے جانے لگا تو عائشہ سے بولا۔

"یہ جو تم نے سائن کیے ہیں۔ یہ کون سا فارم تھا؟ یہ سب کیا ہے؟ کل پرسوں تک تمہیں اس بات کا پتہ چل جائے گا"۔

یہ کہہ کر وہ مسکراتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

عائشہ کافی دیر سوچتی رہی کہ پتہ نہیں کیا کہہ گیا ہے؟ پہلے بینک سے لون لینے کی بات کر رہا تھا اور آخر میں کوئی اور ہی پہیلی ڈال کر چلا گیا ہے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ بھی نہ سوچ سکی۔ مگر تیسرے دن جب ظفر ایک لفافہ لئے کمرے میں اس کے پاس پہنچا۔ لفافہ کھولا۔ سبز رنگ کے دو تین اوراق تھے۔

"یہ دیکھو عائشہ یہ کیا ہے"؟

"مجھے کیا پتہ کیا ہے؟ بتاؤ گے تو پتہ چلے گا نا" عائشہ نے بے پروائی سے کہا۔

"یہ طلاق نامہ ہے۔ جو میں تمہیں دے چکا ہوں اور تم نے خود دستخط بھی کر دیئے تھے۔ یاد ہے نا۔ پرسوں اسی جگہ بیٹھ کر تم نے سائن کئے تھے"۔

"ظفر۔۔۔۔! یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔۔۔۔"؟ عائشہ کا دماغ ہی گھوم گیا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں عائشہ۔ یہ طلاق نامہ ہے۔ اب تم میری بیوی نہیں رہیں۔ جہاں تمہارے گھر والے چاہیں گے وہاں تمہاری شادی کر دیں گے۔ مجھے بس تم بھول جانا۔۔۔ ہاں۔۔۔ اور جس طرح ہماری شادی خفیہ راز ہی رہی۔ اسی طرح اب یہ طلاق بھی کسی پر ظاہر نہ ہو۔ ورنہ رسوائی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ اوکے۔ میں جا رہا ہوں اور میں ہمیشہ آپ کو یاد رکھوں گا۔" ظفر نے کہا اور کمرے کو خالی چھوڑ گیا۔

عائشہ سکتے کی حالت میں بیٹھی رہی۔ وہ گلا پھاڑ کر چیخنا چاہتی تھی۔ مگر جیسے کسی نے اس کے گلے میں کوئی پھانس ڈال دی ہو۔ بس وہ بیڈ پر اوندھے منہ گر سی گئی۔ رات کو کچھ نہیں کھایا۔ ظفر رات کو گھر آیا ہی نہیں تھا۔ اس کی بہن نمرہ اسے بہت کرید رہی تھی کہ "آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟ کیوں بت بن گئی ہو؟ کیوں خاموشی اختیار کر لی ہے تم نے؟"

مگر عائشہ تو پتھر کا مجسمہ بن کر رہ گئی تھی۔ اس کے پاس کسی کے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ اگلے ہی دن اس نے اپنی بہن سے کہہ دیا کہ میں گھر جانا چاہتی ہوں اور اب یہاں کبھی نہیں آؤں گی۔ اس کی بہن نمرہ پھر بھی نہیں سمجھ سکی۔

"آخر یہ سب کیوں کر رہی ہو تم؟ کیا قیامت گزر چکی ہے تم پر؟ جو اس قدر حواس باختہ اور چپ چاپ ہو گئی ہو تم"۔

وہ پوچھتی رہی اور وہ آنکھیں پھاڑے اسے تکتی رہی اور اسی روز چنگ چی میں بیٹھ کر چنیوٹ آ گئی۔ اس کا باپ فالج زدہ مریض تھا اور گھر کی بالائی چھت پر بیڈ پر پڑا رہتا تھا۔ عائشہ نے اپنا تمام وقت اپنے باپ کے نام کر دیا۔ پورا دن وہ چھت پر رہتی۔ وہیں چولھا رکھا تھا۔ بھابھی آٹا گوندھ کر اوپر چھوڑ آتی۔ عائشہ روٹیاں لگا دیتی۔ چند دنوں میں ہی اس نے خانہ داری سیکھ لی اور

کچن کا کام سنبھال لیا۔

دن بھر ظفر کے ساتھ گزارے لمحوں کو دہراتی رہتی۔ کئی بار رو لیتی۔ اس کا باپ بول نہیں سکتا تھا اور نا ہی خود کروٹ بدل سکتا تھا۔ اس کے بھائی مارکیٹ میں اپنا کاروبار کرتے تھے۔ اس کی بڑی بھابھی عائشہ کا رشتہ اپنے بڑے بھائی سے کرنا چاہتی تھی۔ وہ لوگ عائشہ کو دیکھنے آئے اور پسند بھی کر لیا۔ عائشہ کے والدین بھی رضا مند ہو گئے۔ مگر عائشہ نے انکار کر دیا کہ میں نے زندگی بھر شادی کرنی ہی نہیں۔ اس کے اس طرح صاف انکار پر وہ لوگ مایوس واپس لوٹ گئے۔ جس کا عائشہ کی بھابھی کو بہت دکھ ہوا۔ بس اس دن سے اس نے عائشہ سے عداوت پال لی اور بات بات پہ اس سے جھگڑا کرنے لگی۔ عائشہ کے بھائی نے بھی بہن پر بہت زور دیا۔ مگر وہ نہیں مانی۔ بھائی نے بھی اس سے بات کرنا چھوڑ دیا۔

وہ آٹھ ماہ تک ظفر کی بیوی بن کر رہی تھی اور آٹھ مہینوں میں ظفر اسے کہاں کہاں نہ لے کر گیا تھا۔ ایک بار گھر سے چنیوٹ جانے کیلئے نکلے اور رات رات میں مری پہنچ گئے۔ پورا دن وہاں گزارا۔ رات ہوٹل میں ٹھہرے اور اگلی صبح صبح واپسی کیلئے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک بار لاہور لے کر گیا۔ وہاں ہوٹل میں ٹھہر کر سارا دن شہر کے مشہور تاریخی مقامات کی سیر کی۔ دوبارہ اسلام آباد گئے۔ پھر ایک بار ظفر اسے اپنے آبائی گاؤں لے کر گیا اور وہاں سب کو بتایا کہ میں نے شادی کی ہے۔ یہ میری بیوی ہے۔ وہاں کئی گھروں سے ان کو کھانے کی دعوت ملی۔ کپڑے نقدی اور تحفے بھی ملے۔

آج عائشہ کی رنگت زرد پڑ چکی تھی۔ طبیعت نحیف سی ہو کر رہ گئی تھی اور وہ برسوں کی مریضہ نظر آ رہی تھی۔ کئی اچھے اچھے طبیبوں اور ڈاکٹروں سے علاج بھی کرایا۔ مگر کوئی خاص افاقہ نہ ہوا۔ جانے کیوں اسے آج بھی ظفر کا انتظار ہے؟

تین سال ہونے کو آ گئے۔ مگر ظفر نے ایک بار بھی اس کا حال نہیں پوچھا۔ اس نے شادی کر لی۔ اس کے ہاں بچے بھی پیدا ہو گئے۔ مگر عائشہ کا دل اسے کہتا ہے کہ ایک دن میرا ظفر ضرور مجھ سے ملنے آئے گا اور مجھے پھر سے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ یہ اس کی محبت کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے محبوب کی جفا کے بدلے میں بھی اس سے محبت کرے اور اس سے وفا کی امید رکھے۔ جبکہ اس کے محبوب ظفر کی محبت اس سے تقاضا کر رہی تھی کہ بیوی اور بچوں کی محبت سے بڑھ کر کوئی محبت نہیں ہوتی۔

آہ محبت!!!! تیری ان کاری ضربوں سے کیونکر بچا جائے۔

......☆☆☆......

ادھر معیز کے گھر والے اس پر زور دے رہے تھے۔

"ہم جلد تمہاری شادی کر دینا چاہتے ہیں۔ جس نایاب سے تم محبت کر رہے ہو۔ وہ تو بیڈ پر پڑی ہے۔ دو بار اسے شدید اٹیک ہو چکا ہے۔ اس کا بائی پاس ہو چکا ہے۔ اب بھلا وہ کیسے تم سے شادی کر پائے گی؟ بیٹا تمہارے لئے نایاب سے بڑھ کر حسین اور مالدار لڑکیوں کے رشتے موجود ہیں۔ تم ہماری بات مانو اور شادی کر لو۔ بے شک نایاب سے ملتے جلتے رہو۔ اس سے دوستی رکھو۔ مگر بیٹا اب وہ شادی کے قابل نہیں رہی ہے۔ تم کیوں ہمیں بھی انتظار کی سولی پر لٹکائے ہوئے ہو؟ ہم جیتے جی تمہاری خوشیاں دیکھنا چاہتے ہیں۔"

معیز کی مما نے پرزور انداز میں بیٹے سے بات کی۔ تو معیز کا ذہن الجھ سا گیا۔ وہ نایاب کے بغیر اور کسی لڑکی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مما کی بات بھی کسی حد تک سچ تھی۔ کہ وہ ابھی شادی کرنے کے قابل نہ تھی۔ ابھی تو ابھی ڈاکٹرز نے لمبی ریسٹ کرنے کی ہدایت کی تھی۔ چھ ماہ بعد پھر سے اس کے نئے ٹیسٹ ہونا تھے۔

"بس بیٹا! میں آج ہی تیری بات کرتی ہوں۔ کل ہی وہ لوگ تمہیں دیکھنے آ جائیں گے۔ بہت ہو چکا۔ اب مزید انتظار ہم نہیں کر سکتے"۔

معیز کی مما اپنے بیٹے سے اپنی محبت کا تقاضا کر رہی تھی اور معیز کی محبت کا تقاضا صرف نایاب تھی۔

"اچھا مما مجھے سوچنے دو۔ ابھی میں فوری کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا" معیز نے مما کے جواب میں کہا۔

"ٹھیک ہے رات بھر سوچ لو۔ مگر اب مزید ویٹ کرنے کی کوئی شرط نہیں مانی جائے گی"۔

معیز رات گئے تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ مگر کسی حتمی نتیجے تک نہ پہنچ سکا۔ پھر اس نے پہلے نایاب کی مما سے بات کا سوچا۔ اسے کال کر کے اپنی تازہ ترین پریشانی کا بتا کر پوچھا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ بیگم کامران بھی پریشان ہو گئیں۔

"یہ تو بڑی الجھن بن گئی بیٹا۔ نایاب تو یہ سنتے ہی مر جائے گی۔ اسے تو ایسی کوئی بات بھی نہیں بتائی جا سکتی۔ جو اسے ذرا بھی پریشان کر سکے اور یہ تو اسکی زندگی کے سب سے اہم فیصلے کی خبر ہے۔ وہ تو سنتے ہی اٹیک کی حالت کو پہنچ جائیگی۔

او گاڈ! ویری سیڈ! مگر بیٹا تمہاری مما تو اپنی جگہ سچ کہہ رہی ہیں۔ ہر ماں کے کچھ خواب ہوتے ہیں۔ نایاب تو ابھی ایسی صورت حال میں نہیں ہے کہ اس کی شادی کا سوچا جائے۔ مجھے کچھ وقت دو بیٹا۔ بہت سوچ سمجھ کر ہمیں کوئی قدم اٹھانا ہوگا"۔

"مگر آنٹی میں نے کل مما کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا ہے۔ پلیز میری مدد کیجئے"۔ معیز نے نہایت پریشانی سے پوچھا۔ "ریلیکس بیٹا۔ صبح تک میں کوئی نا کوئی حل ضرور ڈھونڈ لوں گی۔ اللہ ہماری مدد کرے گا"۔

صبح جو فیصلہ آنٹی نے معیز سے ڈسکس کیا تو معیز بھی چونک کر رہ گیا۔ آنٹی نے بتایا۔

"بیٹا میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ بچار کے کیا ہے۔ اس میں نایاب کو بھی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور تمہارے گھر والوں کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ مگر اس میں تمہیں ثابت قدم رہنا پڑے گا۔ تمہاری ذرا سی نایاب سے بے اعتنائی یا اس سے دوری اسے مشکوک کر دے گی۔ پھر وہ اس بات کی کرید کرے گی اور اگر وہ اس انکشاف سے آگاہ ہو گئی تو پھر سمجھو کہ اپنے ہاتھوں ہم نے اس کا گلا دبوچ کر اسے موت کی نیند سلا دیا"۔

"مگر آنٹی۔ وہ فیصلہ ہے کیا"؟ معیز نے بے چینی سے پوچھا۔

"تم چپکے سے شادی کر لو اور نایاب کو اس بات سے

لفظ لفظ موتی

- جب نیکی کر کے تجھے خوشی ہو اور برائی کر کے پچھتاوا ہو تو تو مومن ہے (ارشاد نبوی ﷺ)
- اللہ پاک ہے اور صرف پاک مال قبول کرتا ہے۔
- آخرت کی لذت ہرگز اس کو نہیں ملتی جو شہرت اور عزت کا چاہنے والا ہو (حضرت بشر حافیؒ)
- تعجب ہے اس پر جو تقدیر کو پہچانتا ہے اور پھر جانے والی چیز کا دکھ بھی کرتا ہے (حضرت عثمانؓ)
- صدقہ رب کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور بُری موت کو دفع کرتا ہے (ترمذی)
- یتیم کی پرورش کرنے والا جنت میں میرے ساتھ ہوگا (ارشاد نبوی ﷺ)

ماروی یاسمین .... کراچی

مختصر مختصر

جو اچھا لگتا ہے اسے غور سے مت دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کوئی برائی نکل آئے۔

جو بُرا لگتا ہے اسے غور سے دیکھو ممکن ہے کوئی اچھائی نظر آ جائے۔

اینہ رؤف ...... جہلم

احسان

بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس وقت بھی اس پر چار احسان فرماتا ہے۔

- پہلا اس کا رزق بند نہیں کرتا
- دوسرا اس کی طاقت سلب نہیں کرتا
- تیسرا اس کے گناہوں کو سلب نہیں کرتا
- چوتھا اس کو فوراً سزا نہیں دیتا

تو ہم پھر بھی ایسے احسان کرنے والے کی نافرمانی کرتے ہیں۔

اریب افشاں ...... اوکاڑہ

بے خبر رکھو۔ اسے پہلے کی طرح ملتے جلتے رہو اور اسے کسی قسم کا شک نا ہونے دو کہ اب تم اس سے کبھی نہیں مل سکو گے"۔

"کیا" ؟معیز حیرانی سے چونک اٹھا۔

"ہاں بیٹا۔ اب یہ ہم سب کی مجبوری ہے۔ تمہاری مما کی جگہ اگر میں بھی ہوتی تو تمہیں شادی کرنے پر مجبور کرتی"۔

"مگر آنٹی۔ میں کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ نایاب میری زندگی ہے۔ وہ ٹھیک نہیں ہوگی تو میں زندگی بھر شادی ہی نہیں کروں گا۔ اب میں اسے دھوکے میں رکھوں؟ نہیں آنٹی۔ یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔ سمجھا لونگا میں مما کو کہ ابھی ایک سال میں نے شادی کرنی ہی نہیں۔ وہ مان جائیں گی میری بات"۔

معیز انکاری ہو گیا تو آنٹی نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

"ایک سال کی کیا وارنٹی ہے تمہارے پاس؟ کہ نایاب شادی کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ ہاں اور اگر وہ اس قابل ہو جاتی ہے تو تم اس سے بھی نکاح کر لینا۔ کیا ایک مرد دو بیویاں نہیں رکھ سکتا"؟ آنٹی کا مشورہ تھا۔

"کیا؟ یہ کیا کہہ رہی ہیں آنٹی آپ؟ کیا نایاب یہ بات قبول کرے گی؟ کہ وہ میرے پاس میری بیوی کی سوتن بن کر رہے۔ کبھی بھی نہیں مانے گی"۔

"وہ اسی گھر میں رہے گی۔ وہ ہماری اکلوتی بیٹی ہے۔ ہمارے بعد یہ گھر اس کا رہے گا۔ وہ یہاں کی خود مختار مالکن ہوگی۔ تمہاری بیوی بن کر اس گھر میں رہے گی۔ دوسری تمہاری بیوی ادھر اپنے گھر میں رہے گی۔ زندگی بھر گھر کے تمام اخراجات وہ خود اٹھائے گی۔ تم ادھر سے فکر مند نہیں رہو گے۔ پھر بھی تم اسے بیوی کا سچا پیار نہیں دے سکو گے کیا؟ بس یہ ہمارا آخری فیصلہ ہے۔ تم اپنی والدہ سے ابھی جا کر کہہ دو کہ میں نے آپ کی بات مان لی ہے۔ پھر مجھے بتا دینا۔ میں خود تمہاری تمام خوشیوں میں شرکت کروں گی" آنٹی جان نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

معیز کافی دیر تک آنکھیں پھاڑے سکتے کی حالت میں بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ان تمام باتوں پر غور کیا تو اسے آنٹی کے انوکھے فیصلے کی تائید کرنے کا خیال ابھرنے لگا۔ شام تک اس نے اپنی مما سے بات کرنے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کر ہی لیا اور پھر جب مما نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا کیا سوچا ہے تم نے"؟

"مما بہتر تو تھا کہ آپ ایک سال اور انتظار کر لیتیں۔ اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو ٹھیک ہے میں آپ لوگوں کی خواہش ٹھکرا بھی تو نہیں سکتا" معیز نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر اپنی ہاں کا اظہار کیا۔

"اسی مہینے کے اندر اندر شادی کی تاریخ طے کر رہے ہیں ہم۔ کل شام تک وہ لوگ آ رہے ہیں تمہیں دیکھنے۔ تمہارے پاپا کے قریبی دوست ہیں۔ شانزہ ایم بی بی ایس کر چکی ہے اور آج کل ایبٹ آباد سی ایم ایچ میں پریکٹس کر رہی ہے۔ پری جیسی ہے میری بہو" مما نے بیٹے کا ماتھا چوم کر کہا تو معیز کے دل میں ایک کانٹا سا چبھ گیا۔

معیز کی رضا مندی نے گھر بھر کی فضا ہی بدل ڈالی۔ ہر سو خوشی کے شادیانے گونجنے لگے۔ ان کی کوٹھی مختلف روشنیوں میں نہانے لگی۔ پنڈی سے حیات خان کی بیٹی شانزہ اس حویلی میں بہو بن کر آنے والی تھی۔ جس دن وہ لوگ پہلی بار معیز کو دیکھنے کیلئے آئے تو گھر میں شادی کا سا سماں تھا۔ معیز کے بھائی اور دو بیاہی بہنیں آئی ہوئی تھیں۔ بہت سے کھانوں کا اہتمام کیا گیا۔ معیز کی ساس خالہ نے معیز کو بہت سا پیار دیا۔ ہتھیلی پر بھاری رقم کا چیک اور گولڈ کی انگوٹھی رکھی۔ بات طے پا گئی۔ ایک ماہ بعد شادی کی رسومات ادا کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا گیا۔

معیز نایاب سے ملنے بدستور جا رہا تھا۔ منگنی کے اگلے روز جب اسکے پاس پہنچا تو نایاب اسے دیکھ کر گلاب کی طرح کھل گئی اور معیز غنچے کی طرح سمٹ سا گیا۔

"رات آپ بتا رہے تھے کہ مہمان آ رہے ہیں۔ کہاں سے آئے تھے مہمان؟" نایاب نے اچانک غیر متوقع پوچھا تو معیز چونک کر رہ گیا۔

"وہ پنڈی سے آئے تھے۔ ابو کے دوست ہیں۔ ان

کی بیوی اور بچے ملنے آئے تھے"۔

"پھر تو وہ دو چار دن ادھر ہی ٹھہریں گے" نایاب نے معیز کی بات اچک کر کہا۔

"نن۔نہیں وہ آج چلے بھی گئے" معیز نے نایاب سے آنکھ چرا کر کہا۔

"حیرت ہے اتنی جلدی چلے گئے۔ بھئی اتنی دور سے آئے تھے۔ایک دو دن تو رکتے" نایاب نے حیرت سے پوچھا۔

"ابو نے رات کے کھانے پر بلایا تھا۔بس وہ آئے بھی اور چلے بھی گئے" معیز کو بات کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ایسے میں نایاب کی مما کمرے میں آگئیں اور ملازمہ معیز کیلئے بہت سی چیزیں لئے اندر آپہنچی اور ہر چیز ٹیبل پر سجادی۔

"کیسے ہو بیٹا"؟ آنٹی نے پوچھا۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں آنٹی" معیز نے مدھم سے لہجے میں کہا۔آنٹی بھی کرسی پر آبیٹھی۔

"لونا بیٹا" آنٹی نے پلیٹ سے نمکین ٹکڑا اپنے لئے اٹھاتے ہوئے معیز سے کہا۔معیز نے بوتل سے اپنے لئے گلاس میں پانی انڈیلا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔

"کچھ لونا معیز۔کن سوچوں میں گم ہو"؟ نایاب نے بھی اپنا رخ ٹیبل کی طرف کیا اور معیز کو مخاطب کیا۔معیز نے مکس ڈرائی فروٹ سے چٹکی سی بھری اور منہ میں ڈال لی۔

"بیٹا تمہارے مما پاپا تمہارا گھر بسانے کا تو سوچ رہے ہوں گے"۔ آنٹی نے جانے کیا سوچ کرنا پک چھیڑ دیا۔معیز اندر سے لرز کر رہ گیا اور نایاب مسکراتے ہوئے معیز کا چہرہ تکنے لگی۔معیز نے ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔پھر آنٹی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہاں آنٹی۔گھر میں میرا تذکرہ چل رہا ہے۔سبھی زور دے رہے ہیں۔مگر"

"مگر کیا"؟ نایاب نے جیسے چیخ کر پوچھا۔

"مگر میں ابھی خاموش ہوں۔سب میرے فیصلے کے منتظر ہیں" معیز نے آنٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو آپ ان کو اپنا فیصلہ کیوں نہیں دے رہے"؟ آنٹی نے پوچھا۔

"مما یہ میری بیماری کی وجہ سے خاموش ہیں۔یہ بات وہ بھی جانتے ہیں" نایاب نے معیز کی جگہ اپنی مما سے بات کی۔

معیز کی نگاہ پھر آنٹی کے چہرے پر مرکوز ہو گئی۔مما نے پھر بات کو بدلنا چاہا۔

"مگر بیٹا۔تم تو ابھی زیر علاج ہو۔ہارٹ کا مسئلہ ہے۔دوبارہ ٹیسٹ ہوں گے۔پھر رپورٹ آئے گی۔یوں مہینوں لگ جائیں گے"۔

"تو آپ کا کیا مطلب ہے مما؟ ابھی معیز بارات سجا کر آئے اور مجھے بیاہ کر چلا جائے" نایاب نے اپنی مما سے الجھتے ہوئے کہا۔

"اوہو بیٹا! یہ تو آپ لوگوں کا فیصلہ ہے نا۔معیز کے تمام گھر والوں کی رائے بھی تو ہونا چاہیے نا۔آخر یہ ان کا بیٹا ہے۔جانے وہ کیا سوچ رہے ہوں گے"؟ آنٹی نے اشاروں میں نایاب کو سمجھانا چاہا تو نایاب کی سوالیہ نگاہیں بھی معیز کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔معیز کی سانس صلیب پر لٹک گئی تھی۔بولے تو کیونکر؟ جواب دے تو کیا؟ پاؤں کی انگلیوں تک جوتے کے اندر رہتے ہوئے بھی کسمسا رہی تھیں۔پل کی خاموشی صدیوں پر بھاری تھی۔

"ہاں وہ بھی۔نایاب کی بیماری کی وجہ سے پریشان ہیں۔مگر۔وہ پھر بھی ہماری رائے کو مقدم سمجھیں گے" معیز نے بمشکل اس پھانس کو گلے سے نگلا اور اصل بات کے انکشاف سے آنکھ چرا کر گرتی دیوار کو سہارا دیا۔

"مگر بیٹا آپ دونوں کو ان کی رائے سے متفق ہونا چاہیے نا" آنٹی نے بھی اس کی حمایت میں یہ بات کہہ دی اور جانے کو اٹھی۔

"اچھا بیٹا آپ لوگ بیٹھیں میں چلوں گی۔بس جاتے جاتے یہ آپ سے کہوں گی کہ ماں باپ کی آنکھوں میں اولاد کیلئے بڑے حسین خواب سجے ہوتے ہیں۔بس کوشش کرنا کہ ان کے خواب کہیں ٹوٹ کر بکھر نہ جائیں" آنٹی کمرے سے چلی گئی اور کچھ دیر کیلئے کمرے

میں گھبراہٹ کا ساچھا گیا۔

"یہ آج مما کیسی گہری گہری سی باتیں کر کے گئی ہیں؟ انہوں نے تو پہلے کبھی اس طرح سے کچھ نہیں کہا۔ وہ جو آخر میں خوابوں کی بات کہہ کر گئی ہیں۔ وہ کوئی ہمیں میسج دے گئی ہیں۔ آخر بات کیا ہے؟ آپ بھی آج کسی گہری سوچ میں ڈوبے لگتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کے گھر والے آپ پر زور دے رہے ہوں کہ نایاب ابھی بیمار ہے۔ کیونکہ آپ خود ابھی بتا چکے ہیں کہ گھر میں یہ بات چل رہی ہے اور آپ پر زور دیا جا رہا ہے۔ مگر آپ ابھی خاموش ہیں۔ جیسے کسی فیصلے پر نہ پہنچ رہے ہیں۔ میری محبت آپ کے آڑے آ رہی ہے اور گھر والوں کی رائے کو بھی آپ ناٹھکرا پا رہے ہوں۔ او معیز۔ پلیز اگر کچھ ایسا ہے تو مجھے بتا دو۔ میری وجہ سے آپ کسی ذہنی دباؤ کا شکار نہ ہوں۔ پلیز"۔ نایاب نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے تمام باتوں کی کڑیاں ملا کر سب کچھ کہہ دیا۔ جو معیز اور آنٹی مل کر بھی اس سے نہ کہہ سکے تھے۔

"ایسی کوئی بات بھی نہیں ہے نایاب۔ پلیز آپ پریشان نہ ہوں۔ جب آپ ٹھیک ہو جائیں گی نا۔ تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ خواہ مخواہ ٹینشن نہ لیں۔ آپ کی طبیعت پھر متاثر ہو جائے گی۔ ہاں۔ پلیز" معیز نے چہرے پر مصنوعی سی طمانیت سجا کر ڈھارس دینے کی کوشش کی اور ساتھ ہی جوس کا پیک اٹھا کر نایاب کو دیا۔ نایاب نے ڈبہ تھام کر پائپ ہونٹوں میں دبایا۔ معیز کی آنکھوں میں بغور جھانکا اور چند گھونٹ حلق سے نیچے اتار لئے۔

"چہرے کبھی جھوٹ نہیں بولتے معیز۔ انسان جتنا بھی جھوٹ بول لے۔ چہرے آئینہ کی طرح ہوتے ہیں۔ شفاف۔ سب کچھ صاف بتا دیتے ہیں۔ آپ کا چہرہ بھی اس وقت جو تصویر مجھے دکھا رہا ہے۔ وہ آپ کے اندر کی کیفیت کا برملا اظہار ہے۔ آپ کسی وزنی دباؤ سے دوچار ہیں۔ مگر مجھے صرف اس لئے نہیں بتانا چاہتے کہ میں ہارٹ پیشنٹ ہوں۔ کہیں مجھے پھر سے کچھ پرابلم پیش نہ آ جائے۔ دیکھو معیز! میں آپ کیلئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرنا چاہتی۔ اگر آپ کے بڑے کسی جگہ آپ کیلئے لائف پارٹنر ڈھونڈ رہے ہیں یا کر چکے ہیں اور آپ کو اپنے فیصلے پر اگری کرنا چاہتے ہیں تو پلیز معیز۔ لائیک یو۔ آپ ان کا فیصلہ قبول کر لیں۔ شاید یہ آپ کی تقدیر کا فیصلہ ہو اور آپ کے حق میں یہ فیصلہ مجھ سے کہیں بہتر ثابت ہو"

نایاب اتنے ٹھوس انداز میں بات کر رہی تھی۔ جیسے اس کے اندر سے کوئی غیبی طاقت بول رہی ہو۔ معیز ہونقوں کی طرح اس کی صورت تکے جا رہا تھا۔

"ہاں معیز یہ میں کہہ رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ میری زندگی ہو اور آپ بھی مجھ سے دیوانہ وار عشق کرتے ہیں۔ مگر اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہم اپنی خوشیوں کیلئے اپنے جنم دینے والوں کی خوشیاں بھی لوٹ لیں اور ان کے خواب بھی چکنا چور کر دیں۔ نہیں معیز نہیں۔ میں ایسا کبھی نہیں چاہوں گی۔ میں تو موت کی کھلی بانہوں میں سانسیں لے رہی ہوں۔ جانے کس لمحے وہ مجھے گلے سے لگا لے۔ پھر میں کسی کی زندگی کو کیوں کسی آزمائش میں ڈالوں۔ بس یہ میرا فیصلہ ہے معیز۔ تم میرج کرا لو۔ میں خود تمہاری خوشیوں میں شامل ہوں گی۔ ہاں یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ بس آپ نے یہ کرنا ہے کہ جب تک میری زندگی کی کشتی اپنے ساحل سے نہیں مل پاتی۔ تب تک آپ میری خبر رکھیں گے۔ مجھ سے اپنائیت کا ناتہ نہیں توڑیں گے"۔

"یہ کیسی عجیب سی باتیں کر رہی ہو نایاب؟ میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ یہ ساری باتیں آپ نے سوچ کیسے لیں؟ اور اتنے بڑے فیصلے کو پل بھر میں حتمی شکل کیسے دے دی؟ میں حیران ہوں۔ یہ ساری باتیں آپ نے پہلے سے تو نہیں پلان کر رکھی تھیں۔ جن کا اظہار آج کر رہی ہو" معیز نے تذبذب کی حالت میں پوچھا۔

"ہاں معیز۔ میں جب سے عارضہ قلب میں مبتلا ہوئی ہوں۔ میں تنہا بیڈ پر پڑی ساری باتیں سوچتی رہتی ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا۔ جب لندن میں مجھے آپریٹ کیلئے لے جایا جا رہا تھا تو میں نے ایک بند لفافہ آپ کو دیا

تھا کہ اسے میری زندگی کے بعد کھولنا۔وہ میرا ایک وصیت نامہ تھا"۔

"ہاں مجھے یاد ہے۔جو آپ نے واپس لے لیا تھا اور مجھے اس کی حقیقت نہیں بتائی تھی"معیز نے اسکی تائید میں کہا۔

"ہاں وہی۔اس میں میں نے یہی بات لکھی تھی کہ میرے بعد تم نے جس ہمسفر کا انتخاب کرنا ہے۔وہ لڑکی یہ ہوگی اور جانتے ہو وہ لڑکی کون تھی"؟نایاب نے پوچھا۔

"نہیں"معیز نے انکار میں گردن ہلادی۔

"وہ لڑکی پنڈی والی مدیحہ تھی۔جو دو بچوں کی ماں ہے اور اسے ڈائیورس ہو چکی ہے۔مگر یہ میرا اس وقت فیصلہ تھا۔جو۔۔۔نہیں اس وقت میں میں نے کیا سوچ کر کیا تھا۔اب جو بھی آپ کے پیرنٹس آپ کیلئے سلیکٹ کریں گے۔آپ کو وہ قبول کرنا ہوگا اور میں اپنے ہاتھوں سے اسے آپ کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا سرپرائز سمجھ کر پیش کروں گی"۔

نایاب پورے اعتماد سے بات کر رہی تھی اور معیز حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوتا جا رہا تھا۔وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نایاب اس کے لیے اتنا کچھ سوچ چکی ہے۔

"میری بات مانو گے نا۔پرامس کرو"نایاب نے معیز کو جانے سے پہلے روک کر اس کے سامنے اپنی ہتھیلی پھیلا کر پرامس مانگا۔پھر جس لمحے معیز اس کی ہتھیلی پر پرامس کرنے کیلئے ہاتھ ملا رہا تھا۔اس کے اندر کی دیواریں ریت کی طرح گرتی جا رہی تھیں اور نایاب کے دکھتے دل میں خون کی سرکولیشن ماند پڑتی چلی گئی۔بلڈ لو ہونے لگا اور معیز کے جاتے ہی وہ بیڈ پر دھم سے گر سی گئی۔

معیز نے نایاب کو یہ بات ہرگز نا بتائی کہ نا صرف میرا رشتہ طے ہو چکا ہے۔بلکہ منگنی کی رسم بھی رات کو ادا ہو چکی ہے اور شادی کی تاریخ بھی متعین کر دی گئی ہے۔اس نے گو نایاب کو کسی ذہنی صدمے سے بچانے کیلئے اس سے یہ بات چھپائی تھی۔دوسرے لفظوں میں اسے دھوکے میں رکھا تھا۔اس کے دل میں نایاب کو چھوڑ کر نئے ساتھی کو قبول کر لینے کا خیال پیدا ہو چکا تھا تو پھر یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ نایاب کے دل میں بسی معیز کی محبت قائم رہ جاتی۔یہ تو دلوں کے معاملے ہیں نا۔ایک دل میں ذرا سی دراڑ پیدا ہوئی تو فوری دوسرے دل میں بھی بھونچال سا آیا اور دراڑ کی لکیریں نمایاں ہونے لگی۔

نایاب نے معیز کو بے دھڑک کہہ دیا کہ آپ اپنے لئے نیا ساتھی چن لیں۔یہ کوئی اتفاقیہ بات نہ تھی۔یہ ایک دل نے دوسرے دل میں کھوٹ دیکھ کر فیصلہ کیا۔

تیسرے دن معیز نے نایاب کو کال کر کے یہ بات بتائی کہ"میری منگنی کی رسم ادا کر دی گئی ہے اور پچیس دن بعد پندرہ نومبر کو میری بارات پنڈی جائے گی۔میں نے آپ کے فیصلے کو عملی جامہ تو پہنا دیا ہے۔مگر میرے دل کی دنیا اجڑ چکی ہے۔میں آپ کو بھی فراموش نہیں کر سکتا۔نایاب کبھی بھی نہیں اور اب تمہارا سامنا کرنے کی بھی مجھ میں ہمت نہ ہے۔میں کیا کروں؟تمہارے بن بے چین ہوں۔مگر تمہارے پاس آنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہو رہی۔نایاب۔میں مسلسل عذاب سے گزر رہا ہوں۔بہت بڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے آپ نے مجھے"معیز بہت جذباتی ہو رہا تھا۔لمحے بھر کو تو ادھر خاموشی سی چھا گئی۔پھر نایاب کی آواز معیز کی قوت سماعت سے ٹکرانے لگی۔

"مبارک ہو معیز۔آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے میرا فیصلہ قبول کرتے ہوئے اپنے مستقبل کا فیصلہ کر لیا۔مگر اتنا تو کرتے کہ منگنی کی خبر کال پر ہی کر دیتے تو میں چل کر آپ کے گھر آتی اور اپنے دل میں لئے خوابوں کی تعبیر دیکھ تو لیتی۔مگر آپ تو یہ بھی نہ کر سکے۔تین دن سے تمہارے انتظار میں لگی ہوئی آنکھیں پتھرانے لگی ہیں۔اپنی ایک جھلک تو دکھا جاؤ کہ میری سانسوں کا توازن برقرار رہے۔دل کے زخموں سے پھر سے نہ لہو ٹپکنے لگے۔"نایاب کی آواز بھیگتی گئی۔

"آئی ایم سوری نایاب۔آئی ایم سوسوری یار۔میں ابھی آ رہا ہوں"معیز نے کال ڈراپ کی اور گاڑی کا رخ مارکیٹ جانے کی بجائے ڈیفنس کی طرف موڑ دیا۔وہ

مجرموں کی طرح نایاب کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا اور نایاب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے مسلسل دیکھے چلی جا رہی تھی۔

"نایاب خدا کیلئے کوئی بات کرو۔ میں آپ کی خاموش نگاہوں کی تپش نہیں سہہ سکتا۔ میرے اندر کی حالت بڑی کرب ناک ہے۔ میرا ضمیر مجھے کچلے جا رہا ہے۔ میرے اندر بسی ہوئی نایاب نہ تو میرے دل کا دامن چھوڑنا چاہتی ہے اور نہ ہی میرا دل اسے اپنے سے جدا کرنے کی بات مان رہا ہے۔ لگتا ہے جیسے جسم سے روح کو الگ کیا جا رہا ہو۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا نایاب۔ میرے لئے یہ ناممکن ہے۔ کہ میں پھول سے خوشبو کو جدا کر لوں" معیز جذبات کی رو میں بری طرح بہہ رہا تھا۔

"میں جانتی ہوں معیز کہ جس موڑ پر آج ہم کھڑے ہیں۔ یہاں سے ایک دوسرے کو چھوڑ کر نئی راہوں کا تعین کرنا بہت مشکل کام ہے۔ مگر گردشِ حالات انسان کو روزِ ازل سے مجبور و بے بس کر دیتی ہے اور بسا اوقات انہیں اپنا بیش بہا خزانہ بھی اپنے ہاتھوں لٹا دینا پڑتا ہے اور اپنوں سے بچھڑنا بھی گوارا کرنا پڑتا ہے۔ کتنے لاکھ انسان دیارِ غیر میں دولت کمانے کیلئے اپنے بہت پیاروں سے سالوں دور رہنے پر مجبور ہیں۔ محبت جسمانی اتصال کا نام تو نہیں ہوتا معیز۔ محبت کا رشتہ دلوں سے ہے اور یہ اندر سے جنم لیتا ہے۔ یہ رشتہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ جو ظاہر ہونے لگتا ہے۔ ہمارا محبت کا رشتہ بہت اٹوٹ ہے۔ یہ ٹوٹ کر بھی بکھرے گا نہیں۔ بلکہ اور مستحکم ہوگا۔ کیونکہ یہ ازل سے ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کیلئے بسا ہے"۔

"تو پھر ہم اپنے ہاتھوں سے اسے جدا ہی کیوں ہونے دیں؟" معیز نایاب کی بات کاٹ کر بولا۔

"تو کیا کریں؟ اپنے عظیم رشتوں خونی رشتوں کی محبت کا حصار توڑ کر اپنی محبت کو پروان چڑھائیں۔ ہمارے دو دل ملنے سے کتنے دل ہم سے دور ہو جائیں گے۔ یہ بات سوچی آپ نے" نایاب نے دلیل پیش کی۔

"محبت کسی دلیل، کسی مجبوری اور کسی فلسفے کی محتاج نہیں ہوتی نایاب۔ محبت میرے نزدیک ایک لافانی جذبے کا نام ہے اور اس جذبے کو جس قدر دبانے اور اسے ہستی سے مٹانے کی کوشش کی جائے۔ یہ سوا چند ہو کر سامنے آتا ہے۔ گیند کی طرح اس کو جتنا زور سے زمین پر پھینکا جائے۔ وہ اتنی ہی زیادہ بلندی کی طرف اٹھتی ہے۔ ہماری محبت کو بھی نہ تو اوروں کی مجبوریاں ختم کر سکتی ہیں اور نہ ہی جان لیوا بیماریاں اس جذبے کو پابہ زنجیر کر سکتی ہیں۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ بیماریوں میں موت نہیں ہوتی۔ ایک تندرست بندہ بھی پل بھر میں مر سکتا ہے اور ایک برسوں کا مریض چند گھونٹ پانی سے بھی سالوں جی سکتا ہے۔ بس ہم سے بھی یہ جدائی کا زہر نہیں پیا جا سکتا۔ ہم ایک ہو ں گے۔ تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔ ہماری محبت کے بہتے دریا کی راہ میں جو بھی رکاوٹ حائل ہوگی۔ ہم اسے عبور کر کے پار اتر جائیں گے۔ ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا" معیز نے پر جوش انداز میں گویا اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم معیز؟ امپوسیبل یار۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ تمہاری منگنی ہو چکی ہے۔ میرج ڈیٹ فائنل کر دی گئی ہے۔ میں بیڈ ریسٹ پر ہوں۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں"؟ نایاب نے حیرت سے سٹپٹا کر پوچھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ہینڈل کر لوں گا سب کچھ۔ کچھ بھی امپوسیبل نہیں ہے۔ تم دیکھنا۔ یہ سب پوسیبل کیسے ہو جاتا ہے بھلا"۔

معیز اپنی منگیتر کی تصویریں تو دیکھ چکا تھا۔ مگر ابھی اس سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ گھر پہنچا تو مما نے بتایا۔

"بیٹا ہم پنڈی جا رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ تمہاری بہن بھی جانا چاہتی ہے۔ لہٰذا کل کی ڈیٹ میں تین ٹکٹ او کے کروالو"۔

"کیا مجھے بھی جانا ہے آپ کے ساتھ مما؟" معیز نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا وہ لوگ کب سے ہمارے منتظر ہیں۔ شازمہ تم سے ملنا چاہتی ہے اور پھر تمہیں بھی تو اس

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ 78/5.L تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

سے ملنا چاہیے نا۔تم اس سے نئی زندگی کا آغاز کرنے جا رہے ہو بیٹا۔تمہیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں آسانی ہو گی''مما نے اپنے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔معیز نے بھی فوری دل میں ایک فیصلہ کیا اور ریزرویشن آفس کال کرنے لگا۔

صبح نو بجے کی فلائٹ سے معیز اپنی مما اپنی بڑی بہن اور ایک ملازمہ کو بھی اس کی مما نے اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش کی۔تاکہ وہ ان کی خدمت کیلئے وہاں وقف رہے۔ائرپورٹ پر ان کو ریسیو کرنے کیلئے حیات خان کا ڈرائیور گاڑی لئے موجود تھا۔گھر میں استقبال کرنے کیلئے مسز حیات خان، ان کی بہو، ان کی چھوٹی بیٹی فرخندہ اور شانزہ موجود تھیں۔ان کی ملازمہ نے ان کا سامان گاڑی سے اندر پہنچایا۔

شانزہ چاکلیٹ کلر میں ملبوس اپنی دراز قامت سڈول جسم اور خوبصورت خدوخال کے ساتھ چہرے پہ مسکان سجائے سب کو اپنی طرف متوجہ کئے جا رہی تھی۔مسز حیات خان نے باری باری سب کو سر جھکا کر بڑے ادب سے سلام کہا اور سب سے ہاتھ ملائے۔معیز کی مما سے پیار کا تبادلہ کیا۔معیز کی بہن بڑی گرم جوشی کے ساتھ شانزہ سے گلے ملی اور تپاک سے ہاتھ ملایا۔پھر شانزہ نے معیز کو اپنی گھنیری پلکیں اٹھا کر دیکھا۔لبوں پہ مسکراہٹ سجائے ہاتھ بڑھایا۔معیز نے اسکی نرم و گداز ہتھیلی تھام کر سلام کیا۔پھر سبھی ایک ساتھ گیسٹ روم آ بیٹھے۔ڈرنکس وغیرہ پیش کی گئی۔معیز کے چہرے پر سنجیدگی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔شانزہ پوری طرح معیز کی طرف متوجہ تھی۔مگر معیز اس سے نظریں چرائے جا رہا تھا۔باقی سب لوگ خوش گپیوں اور قہقہوں میں مشغول تھے۔مگر ادھر ان دونوں کے مابین ایک کشمکش کی کیفیت سی پیدا ہونے لگی تھی۔

''مما میں اپنے کمرے میں چلی جاؤں''بالآخر شانزہ نے اپنی خفت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں بیٹا۔معیز کو بھی ساتھ لے جاؤ۔بیٹا جاؤ نا آپ بھی''مسز حیات نے معیز کو بھی شانزہ کے ساتھ جانے کی دعوت دی۔

معیز حکم کی بجا آوری کرتے ہوئے صوفے سے اٹھا اور شانزہ کے تعاقب میں ہو لیا۔شانزہ نے اسے اپنے تعاقب میں دیکھا تو ٹھہر گئی اور ہاتھ سے اشارہ دیا۔

''پلیز آئیں''۔

معیز کو پہلی نظر دیکھتے ہی شانزہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔جیسے دل کا در کھلا ہو اور پل بھر میں کسی کو اندر بٹھا کر کواڑ ایک جھٹکے سے بند کر دیتے ہیں۔مگر ذرا دیر بعد ہی اسے احساس ہونے لگا کہ اندر آنے والا تو یہاں پہنچ کر بہت بے چینی محسوس کر رہا ہے۔

اب تنہا کمرے میں وہ دونوں ایک دوسرے کے روبرو تھے۔شانزہ کی دھڑکنوں میں طلاطم سا پا تھا اور معیز کے دل کا دریا اپنے دھارے پر بہے جا رہا تھا۔وہ نہیں جانتا تھا کہ اس میں کون اترا ہے؟ کس قدر ڈوبا ہے؟ اور اب کس حال میں ہے؟ اسے تو بس اپنی روانی عزیز تھی۔قیامت خیز سناٹا تھا۔

''معیز صاحب! میں نہیں جانتی کہ آپ سنجیدہ طبیعت رکھتے ہیں۔یا پھر یہاں پہنچ کر آپ کو سنجیدگی اختیار کرنے کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔پلیز۔میں بہت عجیب سا فیل کر رہی ہوں۔مجھے لگتا ہے جیسے آپ مجھے دیکھ کر خاصے مایوس ہوئے ہیں۔اگر ایسی کوئی بات ہے تو آپ پر کوئی زبردستی نہیں ہے۔آپ اپنی چوائس کا حق رکھتے ہیں۔ابھی تو وقت ہے۔ہم اپنے پیرنٹس سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے بہترین ہمسفر نہیں بن سکتے۔آپ لوگ ہمیں مجبور نہ کریں''۔

شانزہ بڑے مدہم اور ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بات کر رہی تھی اور معیز اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسری میں پھنسا کر دونوں انگوٹھوں میں لگاتار نیچے اوپر حرکت دیئے جا رہا تھا اور اس کی نگاہیں شانزہ کے دائیں کندھے کے اوپر سے گزر کر دیوار پر مرکوز تھیں۔

''ایسی بات نہیں ہے۔شانزہ دوران سفر جیسا بھی ہمسفر پاس آ بیٹھے سفر تو پھر بھی کٹ ہی جاتا ہے۔ہم اسے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ آپ میرے ساتھ نہ بیٹھیں اور بسا اوقات نا چاہتے ہوئے بھی تنہا سفر کرنا پڑتا ہے۔کئی اجنبی ہم سفر بہت اچھے ہمسفر ثابت ہوتے ہیں اور کئی

بہت اچھے ہمسفر دوران سفر بہت اذیت کا باعث بن جاتے ہیں۔ فیصلہ کرنا مشکل ہے" معیز نے پوری ہتھیلی سر پر پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں اپنے متعلق تو آپ سے کوئی دعویٰ نہیں کرسکتی کہ میں آپ کیلئے کیسی ہم سفر ثابت ہوں گی۔ مگر آپ کو پہلی نظر دیکھ کر جو گمان مجھے گزرا تھا۔ اس کے مطابق آپ سے بڑھ کر میرے لئے کوئی اور اچھا ہمسفر نہیں بن سکتا"۔

شانزہ نے بڑے حسرت بھرے لہجے میں کہا اور آخر میں نظر جھکا سی لیں۔ معیز اپنی جگہ پہ لرز کر رہ گیا تھا اور اس کے دل کے کسی گوشے میں ذرا سی شانزہ کیلئے ہمدردی پیدا ہوئی تھی۔

"یہ تو آپ کا حسن ظن ہے شانزہ۔ ورنہ مجھ میں تو کوئی ایسی بات نہیں"۔

"دیکھیں معیز صاحب! بڑی سیدھی سی بات ہے۔ اگر آپ اپنے لئے کسی ہمسفر کا انتخاب کرچکے ہیں تو اللہ آپ کو اس کی ہمسفری مبارک کرے اور اگر آپ نے مجھے دیکھنے کے بعد کوئی فیصلہ کرنا ہے تو میں آپ کے فیصلے کا انتظار کرسکتی ہوں۔ مگر یہ خیال رکھنا کہ اپنے فیصلے میں اقرباء پروری اور کسی مجبوری کی زد میں آ کر اپنے آپ سے ناانصافی نہ کر بیٹھنا۔ فیصلہ اپنے دل کی گہرائی سے کرنا اور پھر اس پہ ڈٹ جانا۔ بس اس سے زیادہ میں آپ سے کچھ نہیں کہوں گی" شانزہ نے بڑی صاف سی بات کی اور بے حد وزنی بات کی۔ جسے معیز نے بھی سراہا۔ ایسے میں ملازمہ ان کیلئے فروٹ چاٹ کے پیالے ٹرے میں سجائے اندر پہنچی۔

"بینا چائے بھی لے آؤ"۔

شانزہ نے اپنی کنیز سے کہا تو وہ باہر چل دی۔ شانزہ نے پیالے میں چمچ سجا کر چاٹ معیز کو پیش کی۔

"تھینکس" معیز نے شانزہ کی آنکھوں میں جھانک کر اس سے پیالہ تھام لیا۔

شانزہ کی مہمان نوازی، اس کی مدبرانہ گفتگو، اس کی دلبرانہ ادائیں، اس کا بار بار اپنے دراز گیسوؤں کا ہاتھ سے ہلکا سا سر کو جھٹکا کر سنوارنا دیکھنے والے کو بے حد متاثر کئے دے رہا تھا۔ نجانے شانزہ بطور خاص ایسی نزاکت کا مظاہرہ کر رہی تھی یا وہ ہمیشہ ہی ایسی عادات رکھنے کی شائق تھیں۔

معیز بے اختیار اس کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے ایک اور خوبصورت سی ہستی اپنے پیکر اپنے نازک پر لئے اپنی بولتی آنکھوں کے ساتھ اسکے روبرو آجاتی تو وہ سنبھل سا جاتا۔

"پلیز لیں نا معیز صاحب" شانزہ نے اپنا چمچ پیالے سے بھرا تو اسے بھی دعوت دی۔ اب دونوں ایک ساتھ چاٹ کھا رہے تھے۔ ماحول کچھ خوشگوار ہو رہا تھا۔ ایسے میں ان کی چائے بھی ٹیبل پر سجادی گئی۔

"میں کب تک پھر آپ کے فیصلے کا انتظار کروں؟ ہمارے بڑے تو ہمیں ایک بندھن میں باندھنے کی تاریخ بھی طے کرچکے ہیں اور دونوں طرف سے بھرپور تیاری بھی کی جارہی ہے۔ ویسے کیا ہی اچھا ہوتا۔ ہم پہلے ایک دوسرے سے ٹاک کر لیتے تو شاید یہ ساری صورتحال پیش نہ آتی"۔

"ہاں۔ یہ بات میں اپنی مما سے کرچکا ہوں کہ آپ نے بہت جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہے۔ کاش ہم پہلے مل چکے ہوتے"

معیز نے جواب دیا۔

"تو پھر اب موجودہ صورت حال میں ہم کیا کریں؟ ہماری پوری فیملی میں یہ خبر پہنچ چکی ہے کہ حیات خان کی بیٹی لاہور بیاہ کر جارہی ہے۔ اب اگر ہم اس رشتے سے انکاری ہوتے ہیں تو میرے اور آپ کے پیرنٹس کیلئے کتنا مشکل ہو جائے گا سنبھالنا۔ کس کس کو کس کس طرح سے مطمئن کر پائیں گے بھلا؟ کتنی کوفت ہو گی انہیں؟ کتنی رسوائی ہوگی ہم سب کی" شانزہ تلملا کر بولی۔ معیز بھی بہت فکرمند دکھائی دینے لگا۔

"ہم مل کر اپنے اپنے اہل خانہ کو روک لیتے ہیں کہ وہ کچھ وقت ہمیں دیں" معیز نے کہا۔

"پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ اگر آپ کا فیصلہ ہمارے حق میں نا اترا تو کیا وہ پھر کسی کو جواب دہ نہیں ہوں گے اور کیا پھر ان کی رسوائی نہیں ہوگی؟ او معیز صاحب! ویری

سیڈ" شانزہ نے ہاتھوں سے سر تھام کر کہا۔

"تو پھر اس تمام رسوائی سے بچنے کی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے۔ آپ وہ اختیار کرلیں"۔

"وہ کیا؟" شانزہ نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ کے پیرنٹس تمام تر الزام ہمارے سر تھوپ کر سب کو بتادیں کہ لڑکا پہلے سے شادی شدہ تھا۔ اس لئے ہم نے رشتہ طے کرنے سے انکار کردیا ہے۔ اس طرح زمانہ بھی خاموش ہوجائے گا اور آپ کی عزت بھی محفوظ رہے گی" معیز نے بے دھڑک کہہ دیا تو شانزہ حیرت زدہ رہ گئی۔

"معیز صاحب یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اتنی آسانی سے آپ نے اتنی بڑی بات کہہ دی۔ جیسے یہ کوئی بچوں کا کھیل ہو کہ ابھی ابھی سب مل کر کھیل رہے تھے اور ذرا سی بات پر بگڑ کر ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ جاؤ ہم تمہارے ساتھ نہیں کھیلتے۔ جب آپ کا ارادہ ہی نہیں تھا۔ تو پھر پہلے دن روک لیتے اپنے والدین کو۔ اب جب بات شادی کی تاریخ تک آپہنچی ہے تو آپ انکار کر رہے ہیں اور پھر آپ خود چل کر ہمارے گھر آئے بیٹھے ہیں۔ آپ کیوں ساتھ آئے؟ آپ لوگوں کا یہاں آنے کا مقصد کیا تھا؟ ہمیں ذلیل اور رسوا کرنے آئے ہو یہاں"؟ شانزہ بگڑ گئی اور نہایت غصے کی حالت میں چلانے لگی۔

"دیکھو شانزہ پلیز۔ مت چیخو۔ نہ خود کو تماشا بناؤ۔ نہ ہماری تذلیل کرو۔ آپ خاموش رہیں۔ میں بات کرلیتا ہوں ان سے" معیز نے اپنی نشست چھوڑتے ہوئے کہا۔ ایسے میں اچانک شانزہ کی مما کمرے میں داخل ہوئیں۔

"یہ کیا ہورہا ہے اندر؟ کون سی جنگ لڑی جارہی تھی ابھی یہاں کہ ہمیں شور سنائی دے رہا تھا۔ شانزہ بیٹی کیا ہوا ہے آپ لوگوں کو؟"

اتنے میں معیز کی مما اس کی بہن شانزہ کی بہن سبھی لوگ کمرے میں آپہنچے۔

"آنٹی میں بتاتا ہوں آپ کو۔ ہمارا جھگڑا کس بات پہ چل رہا تھا" معیز نے آنٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے آنٹی۔ میں آپ لوگوں کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ یہ بات ابھی تک میرے مما پاپا کو بھی معلوم نہیں کہ میں اپنی گرل فرینڈ سے نکاح کرچکا ہوں"۔

"کیا؟" سب کے منہ سے بے اختیار نکلا اور سب بھونچکے رہ گئے۔ شانزہ نے ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر رخ دوسری طرف پھیرلیا۔ معیز کی مما جگر پر ہاتھ رکھے بیڈ کی طرف بڑھیں تو بیٹی نے انہیں سنبھال کر صوفے پر لا بٹھایا۔ شانزہ کی مما سر تھام کر حیرت زدہ کھڑی تھیں۔ لگتا تھا ابھی ابھی کمرے میں کوئی وزنی دھماکا ہوا ہے۔ جس نے سب کو لمحے بھر کیلئے حواس باختہ سا کردیا ہے۔

"جھوٹ بول رہے ہو بھائی تم۔ کوئی نکاح نہیں کیا تم نے۔ نایاب تو بیمار ہے۔ ہارٹ کی مریض ہے وہ۔ بائی پاس ابھی دو ماہ قبل ہوا ہے اس کا۔ وہ شادی کے قابل ہی نہیں ہے۔ پھر تم کیوں جھوٹ بول کر ہمیں سب کے سامنے شرمندہ کررہے ہو؟" معیز کی بہن فہمیدہ نے اپنے بھائی کا بازو پکڑ کر اسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

"اف خدایا یہ سب کیا ہورہا ہے ہمارے ساتھ؟" بیگم حیات خان الجھ کر بولیں اور کرسی پر بیٹھ رہیں۔

"معیز بیٹا تمہارا مقصد کیا ہے؟ تم اس وقت کیا کہنا چاہتے ہو؟ یہاں سے میری بہو لے کر جانا چاہو گے یا میری ڈیڈ باڈی گھر لے کر جانا پسند کروگے۔ بس دو ٹوک جواب چاہیے مجھے" معیز کی مما نے گویا اسے الٹی میٹم دے دیا۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے بمشکل بول رہی تھیں۔

"نہیں آنٹی یہ آپ زبردستی کررہی ہیں معیز کے ساتھ۔ دوسرے لفظوں میں بلیک میل کررہی ہیں اسے آپ۔ جب وہ اپنا فیصلہ ہمیں دے چکا ہے تو کیا آپ جبراً اسے میرے پلے باندھنا چاہتی ہیں؟ سوری آنٹی مجھے آپ کا یہ فیصلہ قبول نہیں ہے۔ میں معیز سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ بس میرا انکار سمجھیں" شانزہ نے

آنٹی کی امید کا چراغ ہی بجھا دیا۔

"او مائی گاڈ! میں مر کیوں نہیں جاتی؟ اس قدر میرا بیٹا مجھے جان سے مارے گا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا" معیز کی مما ہلکان ہوئے جا رہی تھی۔

"پلیز مما خود کو سنبھالئے۔ میں پاپا کو کال کرتی ہوں۔ وہی سنبھالیں گے سب کچھ" فہمیدہ نے اپنے پاپا کا نمبر ڈائل کیا اور انہیں موجودہ صورت حال سے آگاہ کیا۔

"معیز اس رشتے سے انکار کر چکا ہے۔ وہ ہر حال میں نایاب سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ہم لوگ اس وقت بہت ٹینشن میں ہیں پاپا۔ پلیز آپ ہی معیز کو سمجھائیں" فہمیدہ نے کہا اور سیل معیز کی طرف بڑھا دیا۔

"جی پاپا! میں اپنا فیصلہ دے چکا ہوں۔ اب آپ جو بھی طریقہ اختیار کریں گے۔ وہ میرے ساتھ زبردستی ہو گی۔ آئی ایم سوری پاپا۔ آئی ایم سوری' معیز نے دوبارہ کہا اور کال آف کر کے سیل فہمیدہ کی طرف بڑھا دیا۔ اسی لمحے اس سیل پر کال آنے لگی۔

"جی پاپا" فہمیدہ بات سن رہی تھی۔ سب تماشائی بن کر دیکھ رہے ہیں۔

"ٹھیک ہے پاپا آپ مما سے بات کر لیں" سیل مما کی طرف بڑھایا گیا۔

"حامد سن لی تم نے اپنے بیٹے کی بات۔ کیا معیز بھی ہمارے ساتھ کبھی ایسا کر سکتا تھا؟ کبھی سوچا تھا ہم نے اور پھر کس موڑ پر؟ ہم کہاں موجود ہیں؟ کتنے گہرے مراسم ہیں ہمارے ان لوگوں سے؟ جو پل بھر میں ٹوٹ گئے۔ مجھ پر قیامت گزر رہی ہے حامد۔ کچھ کر لو۔ ہم یہ رشتہ جوڑنے آئے تھے توڑنے نہیں" بیگم حامد روہانسی آواز میں بہت جذباتی ہو رہی تھیں۔

پھر جب کال اختتام کو پہنچی تو بیگم حامد نے شانزہ کی مما کی طرف دیکھتے اسے ڈھارس آمیز لہجے میں کہا۔

"حامد علی اگلے چار گھنٹوں میں یہاں پہنچ رہے ہیں۔ ہمیں انہوں نے اپنے آنے تک یہاں ٹھہرنے کی ہدایت کی ہے۔ پلیز آپ لوگ ڈسٹرب نہ ہوں۔ یہ ہم سب کا مشترکہ معاملہ ہے اور ہم اسے احسن طریقے سے نبھائیں گے۔ بچوں کی باتوں میں آکر خلوص بھرے ان رشتوں کو ختم تو نہیں کیا جا سکتا ناں"۔

بیگم حیات خان اس کی بیٹی اور شانزہ چپکے سے انہیں کمرے میں چھوڑ کر رخصت ہو گئیں۔ اب کمرے میں معیز اپنی بہن اور مما کے ساتھ تنہا موجود تھا۔ ماں رونے لگی۔ بہن ماں کو تسلیاں دینے لگی اور بیٹا ٹھوڑی اور گال کو ہتھیلی پر سجائے اکلوتے صوفے پر انتہائی ٹینشن میں خاموش بیٹھا تھا۔

"بہت شرمسار کیا ہے تم نے آج ہمیں معیز۔ تمہارا ارادہ نہیں تھا تو ہمارے ساتھ آئے کیوں تھے یہاں؟ اگر تم نہ آتے تو ہم یہاں اس قدر ان کے سامنے بے عزت تو نا ہوتے۔ کیوں کیا تم نے آخر ہمارے ساتھ ایسا؟" فہمیدہ غصے میں چلا رہی تھی۔

"بس کرو بیٹا بس کرو۔ مت کرو اس سے بات۔ آج اس نے ماں باپ کی عزت کو برباد کر کے ہمیں بتا دیا ہے کہ میرے دل میں تمہارے لیے کتنی محبت ہے اور کتنا ادب و احترام ہے؟ ایک لڑکی کی محبت نے اسے اتنا بے حس کر دیا ہے کہ اس کے دل سے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی محبت ویسے ہی ختم ہو گئی ہے"۔

"مما پلیز ایسے تو نہ کہیے" معیز نے تڑپ کر کہا اور اٹھ کر ماں کے پاؤں چھو لینا چاہے۔ مگر ماں نے منع کر دیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اب مجھے بنانے کی۔ بہت عزت کر لی تم نے ہماری۔ جنازہ نکال دیا ہے آج تم نے ہماری عزت و آبرو کا۔ اگر زمین جگہ دیتی تو ہم سما جاتے ہیں۔ اس جگہ پر بیٹھنے کے اب قابل نہیں ہیں ہم۔ مگر حامد پتہ نہیں اب یہاں پہنچ کر کیا نیا قدم اٹھانے والا ہے؟ کیسے ان ٹوٹے رشتوں کو بچا پاتا ہے وہ؟ اس کے آنے تک کا وقت گزارنا کتنا مشکل ہو رہا ہے؟"

جب معیز کا باپ حامد علی پہنچا تو وہ اکیلا نہیں تھا۔ وہ اپنے معیز سے چھوٹے بیٹے سبط کو ساتھ لے کر آیا تھا۔ حیات خان نے اپنے دوست کا مسکراتے چہرے سے استقبال کیا۔ پھر سبھی لوگ ایک ٹیبل پر جمع ہوئے۔ حامد علی نے اپنے بیٹے کی بات کو گستاخی سے تعبیر

کیا اور سب سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"معیز کا انکار بھی ہمارے فیصلے کو توڑ نہیں سکتا اور نہ ہی ہماری اس دوستی کے رشتے کو ختم کر سکتا ہے۔ یہ میرا بیٹا سبیط ہے جو کہ بی ایس سی کر چکا ہے۔ میں نے اس سے بات کی ہے کہ بیٹا تمہارے بھائی معیز نے شانزہ بیٹی کی جگہ اپنی دوست نایاب کو اپنانے کا فیصلہ کیا ہے اور یوں ہمارے تمہارے انکل حیات خان سے تعلقات منقطع ہو نے جا رہے ہیں۔ اب تمہاری کیا رائے ہے؟ تو میرے بیٹے نے کہا ہے۔ ابو جان ہم انکل سے یہ پرانا تعلق ختم نہیں کریں گے۔ اگر وہ اس بات کو قبول کریں تو میں شانزہ کو اپنانے کیلئے تیار ہوں"۔

حامد علی کی بات نے سب کو چونکا کر رکھ دیا۔ شانزہ کی مما بھی ششدر رہ گئیں۔

"کیوں بیٹا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟ آپ خود سب کو بتاؤ" باپ نے بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا۔

"جی پاپا میں آپ کو اپنی رائے دے چکا ہوں۔ مجھے خوشی ہو گی کہ میرے اس فیصلے سے دونوں خاندانوں کے تعلقات ٹوٹ کر بکھرنے سے محفوظ رہیں گے" سبیط نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

"جیتے رہو بیٹا۔ ہمیں بھی تمہارا فیصلہ منظور ہے۔ معیز نا سہی سبیط بھی تو حامد علی کا بیٹا ہے نا"۔ حیات خان نے بخوشی یہ بات مان لی۔ تو اس کی ماں نے بھی بڑے سبیط کو بڑے پیار کی نگاہ سے دیکھا۔ پل بھر گھر کی فضا نئے سرے سے پھر چہک اٹھی۔ شانزہ کچھ دیر کیلئے تو رک سی گئی۔ پھر جب سبیط کو اس کے کمرے میں بھیجا گیا تو شانزہ نے اسے دل سے ویلکم کر لیا اور یوں ٹوٹتے رشتے پھر سے ایک بندھن میں بندھ گئے۔ منگنی کی انگوٹھی معیز نے خود اپنے ہاتھوں اپنے بھائی کو پہنائی۔ سب نے خوشی کے گیت گا کر مبارکبادیں دیں۔ طے پایا کہ بارات مقررہ ڈیٹ کو ہی آئے گی۔ ایسے واقعات دیکھ کر تقدیر پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ یہ بات سوچی بھی نہیں جا سکتی تھی کہ شانزہ معیز کے ہاتھوں سبیط کی ہو جائے گی۔ تقدیر کے آگے کچھ بھی ممکن نا ممکن ہو جاتا ہے اور نا ممکن بھی ممکن بن سکتا ہے۔ مقدر کے فیصلے اٹل ہوا کرتے ہیں۔

☆☆☆......

پوری شان وشوکت سے بارات پہنچی اور شانزہ کو سبیط بیاہ لایا۔ وہ لمحہ بڑی دید کے قابل تھا۔ جب معیز شانزہ کو سلامی دے رہا تھا۔ دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر جھک سی گئی تھیں۔ جو بات زبان نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ بس محسوس کر لی جایا کرتی ہے۔ محبتوں اور نفرتوں کی باتیں تو بس ایسے ہی سمجھ لی جایا کرتی ہیں نا۔

معیز کا اپنے گھر والوں سے ناروا سلوک اسے ندامت کا احساس ہر پل دلاتا تھا۔ اس کی مما اور اس کے پاپا نے معیز سے کہہ دیا تھا کہ " آپ نے ہمارے فیصلے کو رد کر دیا ہے۔ اب ہم نے آپ کے کسی معاملے میں دخل اندازی نہیں کرنی۔ جو آپ کا دل چاہے وہ آپ کریں۔ آپ نے ہماری خوشیوں کی قدر نہیں کی۔ ہم بھی اب آپ کیلئے بیگانے بن کر رہیں گے"۔

نایاب پورے حالات سے آگاہ تھی کہ اس کے معیز نے اس کی خاطر کس قدر گھر والوں کو اذیت دی ہے۔ انہیں کتنے مشکل فیصلے بروقت کرنے پڑے ہیں اور اب معیز کی تمام گھر والوں کی نگاہ میں کتنی عزت باقی ہے؟ معیز خاموش سا رہا تھا۔

"بیٹا تم اس قدر کیوں پریشان ہو؟" ایک دن نایاب کی ماما نے معیز سے پوچھ ہی لیا۔

"کچھ نہیں آنٹی جان۔ مما اور پاپا مجھ سے خفا ہیں۔ وہ مجھ سے بات نہیں کرتے۔ بہن بھائیوں کا رویہ بھی سرد سا ہے۔ سبیط بھائی اور شانزہ کی گھر میں بہت شان بلند ہے۔ سب انہی کے دیوانے ہیں۔ میں نے ان سب کی نگاہ میں جیسے کوئی بہت بڑا جرم کر دیا ہے۔ بس اسی وجہ سے ٹینشن لے لیتا ہوں۔ دماغ ہر وقت ڈسٹرب رہتا ہے" معیز نے بتایا۔

"بیٹا جن حالات سے وہ گزرے ہیں اور آپ کی وجہ سے انہیں جتنی ذہنی کوفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ آپ سے ناراضگی کا حق رکھتے ہیں۔ اپنے بڑوں کے فیصلوں کو ٹھکرانا اور اپنی مرضی کے فیصلے منوانے کا اولاد کو

حق نہیں۔ مگر ایک حد تک۔ کوئی بھی چیز، کوئی بھی بات جب حد سے تجاوز کر جائے تو اسکے نتائج بھی اچھے برآمد نہیں ہوتے۔ والدین ہمیشہ اپنی اولاد کی بھلائی چاہتے ہیں اور ان کی زندگی سے متعلق بڑی دوراندیشی سے سوچ سمجھ کر فیصلے کرتے ہیں۔ اولاد جتنی بھی تعلیم یافتہ اور سمجھدار ہو جائے گی۔ اپنے بڑوں کی برابری نہیں کر سکتی۔ انہیں ہمیشہ اپنے بڑوں کا ادب و لحاظ بھی رکھنا چاہیے اور ان کے فیصلوں کو بغیر کچھ سوچے سمجھے اگنور نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں ان کو بڑے ادب سے سمجھانے کے انداز میں یہ ضرور گائیڈنس دینا چاہیے کہ آپ کا فیصلہ تو درست ہے مگر اس میں یہ بات مناسب نہیں لگتی۔ جب آپ ان سے اس انداز میں پیش آئیں گے تو وہ فوری آپ کی بات مان لینے پر تیار ہو جائیں گے۔ اگر سختی سے پیش آتے ہوئے انہیں اپنے فیصلے پر ایگری کرنے کی کوشش کرو گے، انہیں دھمکی دو گے، بلیک میل کرو گے تو وہ آپ کی بات مان تو جائیں گے مگر مجبوراً مانیں گے۔ پھر جو فیصلہ آپ ان سے اپنے حق میں زبردستی کروائیں گے۔ بھی آپ کا وہ فیصلہ سودمند ثابت نہیں ہوگا۔

ایک وقت آئے گا۔ آپ کو پچھتانا پڑے گا کہ میں نے یہ غلط فیصلہ کیا ہے۔ اس لئے بیٹا میں تو کہوں گی کہ اب بھی وقت ہے کہ اپنی مما اور پاپا کو جیسے بھی ہو منا لو۔ ان کے پاؤں تھام لو، سر جھکا کر ہاتھ باندھے ہوئے نہایت ادب سے اپنی غلطی کا ازالہ کرو۔ وہ ضرور آپ کو معاف کر دیں گے اور آپ کی خوشی میں شریک ہو جائیں گے۔ اگر وہ آپ سے ناراض رہے تو آپ کو آپ کی خواہش کی تکمیل کبھی کوئی خوشی نہیں دے سکے گی۔ آپ پریشان حال رہیں گے۔ ماں باپ کا دل اولاد کیلئے بہت نرم گوشہ رہتا ہے۔ کوئی انکے قریب ہو کر تو دیکھے" آنٹی نے معیز کو بہت خوبصورت راہ دکھائی۔

تمام باتیں اس کے دل پر اثر انگیز ہوئیں اور پھر اس نے عملی طور پر اس کا مظاہرہ کیا۔ پہلے وہ اپنے پاپا کے کمرے میں گیا۔ پاپا نے اسے دیکھ کر نگاہ چرالی۔ معیز کے دل پر قیامت سی گزر گئی۔ اسے لگا جیسے مجھ سے خدا روٹھ گیا ہو۔ اس کا دل غم سے بھر آیا۔ اس نے دونوں ہاتھ باندھے اور اپنے پاپا کے قریب پہنچا۔ پاپا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ معیز دیوانہ وار ان کے قدموں پر جھکا اور سر جھکاتے ہوئے شدت غم سے رو دیا۔

"آئی ایم سوری پاپا۔ آئی ایم سوری۔ آئی ایم سوری پاپا۔ آئی ایم سوری"۔

وہ غم سے چھلک رہا تھا کہ ایک دست شفقت اس کے سر پر آ کر ٹھہرا۔ کسی نے اس کا چہرہ اٹھا کر شدت سے چوما اور پھر اسے گلے لگا کر اس کی کمر تھپتھپاتے ہوئے اسے کہا۔

"پاگل ہو گئے ہو۔ میں بھلا کوئی تم سے روٹھا ہوں۔ وہ تو تم نے ہمارا دل دکھایا تھا۔ تمہاری مما جانتے ہو تم سے کتنا پیار کرتی ہے اور تم نے اسے اپنے ساتھ لے جا کر ایک پرائے گھر میں کتنا بے عزت کیا ہے؟ کس قدر اس کا دل دکھایا ہے؟ اگر یہ بات تو مجھ سے پہلے کر لیتا تو میں بھی تمہیں ایسا کرنے پر مجبور نہ کرتا۔ بہت بڑی غلطی کی ہے تم نے۔ چلو آج اگر تمہیں اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو گیا ہے تو ہم تمہیں معاف کرتے ہیں۔ مگر پہلے اپنی مما سے جا کر معافی طلب کرو"۔ باپ نے شفقت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے معیز کو معاف کر دیا۔ پھر جب وہ اپنی مما کے پاس پہنچا تو پھر اس پر رقت سی چھا گئی۔ اس کی مما لیٹ رہی تھی۔ معیز نے جاتے ہی ماں کے پاؤں تھام کر تلوے چوم ڈالے اور گھٹنوں پر سر رکھ کر سارے آنسو بہا دیے۔ ماں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کچھ لمحے سکتے کی حالت میں بیٹھی یہ عجیب و غریب منظر دیکھتی رہی۔ پھر اس کے اندر سے ممتا کا دریا جوش میں آیا۔ اس نے بیٹے کا چہرہ ہاتھوں میں بھرا اور اپنی جانب کھینچ لیا۔

"وے ماں مرے۔ یہ آج تم نے کیا کر دیا؟" ماں نے دردبھری آواز میں کہا اور ساتھ ہی رونے لگی۔ پھر وہ بار بار بیٹے کا چہرہ بھی چومتی گئی اور اسے گلے سے لگا کر اس پر ممتا کی ساری محبت نچھاور بھی کرتی گئی۔ بے شک ماں کی محبت کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ یہ بے لوث بھی ہوتی ہے اور چاشنی سے لبریز بھی۔ اب ممتا اپنے بیٹے سے مخاطب تھی۔

"جب سے میں تم سے ناراض ہوں۔ تب سے میں

تمہاری وجہ سے بے چین بھی ہوں۔ بظاہر تو میں تمہاری وجہ سے روٹھی رہی۔ مگر تمہاری یاد مجھے رلاتی رہی۔ اب دن بدن میرے ضبط کے بندھن ٹوٹتے جا رہے ہیں اور تمہاری جدائی سے میرا جگر پھٹا جاتا تھا۔ دکھ مجھے اس بات کا تھا کہ ایک لڑکی کی محبت نے میرے بیٹے کے دل سے ماں کی محبت کو بھی ختم کر دیا۔ مگر دیکھ لو بیٹا۔ ممتا کی محبت نے تجھے آنے پر مجبور کر ہی دیا نا"۔

"ہاں مما۔ میں خود آپ کے بغیر ادھورا ہوں، نامکمل ہوں۔ جب میں آپ کو اور پاپا کو اپنے سے خفا دیکھتا تھا تو میرا کلیجہ میرے منہ کو آنے لگتا تھا۔ مجھے معاف کر دو مما۔ میں نے آپ کا بہت دل دکھایا ہے۔ خدا کیلئے مجھے معاف کر دو مما۔ پلیز آئی ایم سوری مما۔ آئی ایم سوری"۔

"بس بیٹا بس۔ میں نے معاف کر دیا تمہیں۔ اللہ تمہیں ہمیشہ سلامت رکھے۔ تم ہی تو میری آنکھوں کی بینائی ہو۔ بیٹا آپ لوگ ہی تو ہمارا مان ہو۔ بس ہمارے اس مان کو کبھی ٹوٹنے نہ دینا بیٹا۔ نہیں تو ہم جیتے جی مر جائیں گے"۔

"اب ایسا کبھی نہیں ہوگا مما۔ ہم نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا کہ ماں باپ کی عزت و تکریم کرنے سے کس قدر ذہنی سکون ملتا ہے۔ کس قدر قلبی راحت کا احساس ہوتا ہے اور کس قدر اس سے سچی خوشی ملتی ہے اور مما یہ ساری باتیں نایاب کی مما نے سمجھائی ہیں"۔

"اب میں ان سے ضرور ملوں گی بیٹا۔ وہ اتنے اچھے لوگ ہیں۔ اب تو میں نایاب کو اپنے ہاتھوں اپنی بہو بنا کر اس گھر میں لے آؤں گی" مما نے بیٹے کا ماتھا چوم کر کہا۔

شانزہ اور سبیط کو بے پناہ خوشی ہوئی کہ معیز نے مما پاپا سے سوری کر لی ہے اور مما پاپا نے اسے نا صرف معاف کر دیا ہے۔ بلکہ اس کو گھر کی سربراہی کے فرائض ادا کرنے کی ذمہ داری بھی سونپ دی ہے۔ معیز کی تمام بہنوں کو شام کے کھانے پر بلایا گیا۔ سب معیز بھائی سے آ ملیں اور جو بہن بھائیوں کے درمیان خاموش سی چپقلش چل رہی تھی۔ اس کا ازالہ ہوا۔ ماں نے اپنی ساری اولاد سے کہہ دیا کہ میں اپنے بیٹے کی شادی اسکی پسند نایاب سے کرنے کا اعلان کرتی ہوں اور کل ہی میں اپنی بہو شانزہ اپنے بیٹے سبیط اور اور اپنی بیٹی فہمیدہ کو لے کر کامران بھائی کے گھر جا رہی ہوں۔ سب نے مما کے فیصلے کی تائید کی۔

"مبارک ہو معیز۔ آپ کی محبت آپ کو ملنے جا رہی ہے" شانزہ نے معیز کے قریب کھڑے ہوئے ذرا سا جھک کر ذرا سرگوشی میں کہا تو معیز مسکرا کر رہ گیا۔

"تھینکس شانزہ۔ یہ سب اب آپ کے ہاتھوں سے انجام تک پہنچے گا" معیز نے شانزہ کی عزت افزائی کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ضرور کیوں نہیں؟ میں بھی کل مما کے ساتھ جا رہی ہوں نایاب سے ملنے۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں گے نا؟" شانزہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"بھئی یہ کیوں نہیں جائیں گے۔ ان کے سسرال کا گھر ہے؟" فہمیدہ نے شرارت سے کہا تو سارے کھلا کر ہنس پڑے۔ معیز نے آنٹی اور نایاب کو کال کر کے بتایا کہ کل میری فیملی کے تمام ممبر بن بلائے آپ کے مہمان بننے جا رہے ہیں۔ وہ دونوں بہت خوش ہوئیں اور انہیں ویلکم کرنے کا کہا۔ ساتھ ہی معیز کو تائید کر دی۔

"آپ نے اب ان لوگوں کو لے کر کل ہر حال آنا ہے۔ ہم چشم براہ رہیں گے اور روانگی پر ہمیں پہلے مطلع کر دینا۔ تا کہ ہم دروازے پر ان کے استقبال کو موجود رہیں"۔

پھر انہوں نے معیز کی مما اسکی بہن فہمیدہ بیٹے سبیط اور بہو شانزہ کا پرتپاک استقبال کیا۔

نایاب مما، فہمیدہ اور شانزہ سے بالخصوص گلے لپٹ کر ملی۔ گیسٹ روم میں بھی روبرو آ بیٹھے۔ سب کو ایک دوسرے سے معیز نے متعارف کرایا۔ نایاب تو اس لمحے یہ بھی بھول گئی تھی کہ وہ بیمار ہے یا وہ کمزور ہے۔ بالکل بھی نہیں۔ وہ سب پر نچھاور ہوئے جاتی تھی۔ پھر وہ فہمیدہ اور شانزہ کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ معیز اور سبیط آنٹی کے پاس تھے۔ نایاب اور معیز کی مما دونوں یوں گھل مل گئی تھیں۔ جیسے برسوں سے گہری شناسائی چلی آ رہی

ہو۔ ادھر نایاب شانزہ سے مخاطب تھی۔
"آپکا معیز سے کیسے رشتہ طے ہوا؟ کیسے تمہاری منگنی ہوئی؟ معیز کے وہاں جانے سے تمہارے گھر میں کیا حالات پیدا ہوئے؟ مجھے سب باتوں کا علم ہے۔ ان تمام تر واقعات میں جتنے صبر وضبط اور بردباری کا مظاہرہ آپ کے پیرنٹس نے کیا ہے۔ اسکی میں داد دیتی ہوں۔ میں اور میری مما نے معیز سے کہا کہ یہ تم نے بہت کم ظرفی کا مظاہرہ کیا ہے۔ تمہیں وہاں جا کر ایسا ہرگز ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے جو بھی آپ لوگوں کے ساتھ کیا میری محبت کو پانے کیلئے کیا۔ لہٰذا آپ کی جتنی بھی دل آزاری ہوئی وہ میری وجہ سے ہوئی اور میں اس کی آپ سے ہاتھ باندھ کر معافی طلب کرتی ہوں۔ سو سوری پلیز" نایاب نے شانزہ سے کہا تو وہ اچھل پڑی۔
"نایاب یہ کیا کہہ رہی ہو تم بھئی؟ مجھے شرمندہ کر رہی ہو۔ پلیز ایسا ہرگز نہ کریں۔ وہ جو بھی ہوا اب بھول جائیں اسے۔
معیز نے یوں تو اچھا کیا کہ بروقت ہمیں اصل حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ اگر ہماری شادی کے بعد یہ انکشاف منظر عام پہ آتا تو نہ صرف ہماری زندگیاں برباد ہو جاتیں۔ بلکہ تین گھرانے اس حادثے کی نذر ہو جاتے۔ مگر معیز سے ہمارا گلہ یہ رہا کہ یہ اسے اپنی منگنی سے پہلے ہی فیصلہ لینا چاہیے تھا۔ اس نے بروقت ایسا نہ کر کے بہت سے لوگوں کی دل آزاری کی" شانزہ نے وضاحت کی۔
"ویسے نایاب آپ کو میری بھابی شانزہ کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ کیونکہ پتہ ہے معیز بھائی نے جب وہاں یہ اعلان کیا کہ میں اپنی دوست نایاب سے نکاح کر چکا ہوں تو مما نے اسے کیا کہا تھا؟ معیز تمہارے سامنے دو آپشن ہیں یا تو اس گھر سے شانزہ کو میری بہو بنا کر لے جانے کا وعدہ کرو یا پھر میری ڈیڈ باڈی تمہارے ساتھ جائے گی تو شانزہ نے آگے بڑھ کر مما سے کہا تھا کہ آنٹی یہ آپ معیز کے ساتھ زبردستی کر رہی ہیں۔ اسے بلیک میل کر کے اسے میرے ساتھ بیاہنا چاہتی ہیں۔ میں معیز سے شادی ہرگز نہیں کروں گی۔ میں صاف انکار کرتی ہوں۔ تب جا کر صورت حال تبدیل ہوئی۔ ورنہ مما تو معیز کو مجبور کرنے پر کمربستہ ہو گئی تھیں۔ وہ تو اللہ بھلا کرے شانزہ کا جس نے مما کو اپنا فیصلہ چینج کرنے پر مجبور کیا"۔
"تھینک یو ڈارلنگ۔ بڑی سمارٹ ہو یار" نایاب نے شانزہ کو کس کرتے ہوئے پیار سے کہا تو شانزہ نے بھی نایاب کو کس لوٹا دی۔ ماحول بہت خوشگوار تھا۔ رات گئے تک محفل جمی رہی۔ طے پایا کہ بہت جلد نایاب اور معیز کو ایک کر دیا جائے گا۔ دو گھرانوں میں تمام دوریاں ختم ہو گئیں اور اپنائیت کا رشتہ استوار ہونے لگا۔

......☆☆☆......

ادھر فریال اور مہک کی شادی ایک تھکا دینے والے سفر کے بعد طے پا چکی تھی۔ فریال نے اپنے دوست عمیر خاں رتھ کو شادی سے ایک ہفتہ پہلے اپنے پاس بلوایا تھا اور خریداری کے تمام مراحل میں اسے ساتھ لیے ہوئے تھا۔ عمیر خاں بے حد خوش تھا کہ اس کے دوست فریال کو اس کی محبت ملنے جا رہی تھی۔ مہک جہاں فریال سے بات کرتی۔ وہاں عمیر خاں سے بھی کسی نہ کسی بات پر مشورہ کر لیتی یا پھر اسے فریال خاں کو مشورہ دینے کی خواہش کرتی۔ کچھ عرصہ کیلئے مہک اور نایاب کا رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ جن دنوں نایاب اپنے بابی پاس کیلئے انگلینڈ گئی تھی۔ ان دنوں مہک کشمیر اپنے ننھیال گئی ہوئی تھی۔ پھر جب نایاب لوٹ کر وطن واپس آئی تو مہک اس کی تیمارداری کو فوراً پہنچ گئی۔ پھر دونوں کا رابطہ کال پر بھی جاری رہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے تمام حالات سے باخبر تھیں۔
نایاب بھی بے پناہ امتحانوں اور کڑی آزمائشوں کے بعد معیز کا مقدر بن رہی تھی اور مہک بھی اپنی مما کی سازشوں اور نفرتوں کا مقابلہ کرتے کرتے اپنی منزل تک پہنچ پا رہی تھی۔ محبت امتحان لیتی ہے۔ محبت کے تقاضے پورے کرنا بڑا دشوار اور صبر آزما کام ہے۔ یہ محبت ہیپاٹائٹس سی سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ چپکے سے انسان کے وجود میں داخل ہوتی ہے اور دل پر اثر انگیز ہونا شروع کرتی ہے۔ جس کا اثر پورے جسم پر محیط ہونے لگتا

ہے اور محبت زدہ شخص تن من اور دھن سب کچھ اپنی محبت پر قربان کرنے پر تل جاتا ہے۔

فریال کی شادی سے ایک دن قبل اس کے تمام قریبی دوست فریال کی پرزور درخواست پر چلے آئے۔ سب سے عمیر خان کا تعارف کروایا گیا۔ رات کھانے کے بعد سب کو ہال کمرے میں گپ شپ کیلئے موقع فراہم کیا گیا فریال کی کئی کزن لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ دوسری طرف فریال کے دوست جن میں عمیر خاں بھی شامل تھا اور اسے فریال نے بطور خاص سب سے نمایاں طور پر متعارف کرایا تھا۔ فریال کے ایک کزن شرجیل نے عمیر خان سے قہقہہ لگاتے ہوئے ایک بات کہی تو سب ادھر متوجہ ہو گئے۔ بالخصوص لڑکیاں بھی ان کی گفتگو میں کود پڑیں۔ شرجیل نے کہا تھا۔

”عمیر صاحب آج کل کی یہ شریف زادیاں سب کو بیوقوف بنا رہی ہیں۔ ان پر اعتماد کرنا حماقت ہے“۔

”یہ بات آپ کیسے وثوق سے کہہ رہے ہیں کہ لڑکیاں لڑکوں کو بیوقوف بنا رہی ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آج کل کا درجہ ہائی میں پڑھنے والا طالب علم اور کالج یونیورسٹی کا سٹوڈنٹ سب ایک ہی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ ایک وقت میں الگ الگ کتنی معصوم لڑکیوں کو اپنی محبت کے سبز باغ دکھا کر وقت گزاری کر رہے ہیں۔ وہ بیچاری گھروں میں اپنے مستقبل کے حسین خواب دیکھتی رہتی ہیں اور یہ ان کو اعتماد میں لے کر ان کی آبرو کو بھی پامال کرنے سے باز نہیں آتے۔ پھر آنکھیں پھیر لیتے ہیں اور نئے شکار کی تلاش میں نکل جاتے ہیں“ ماہا نے لڑکوں کو موڈی ٹھہراتے ہوئے کہا۔

”ہم لڑکیاں اپنی کسی دوست سے بھی بات کر رہی ہوں اور اس دوران ان کی کال نہ لی جائے تو فوراً کہہ دیں گے۔ یہ آج کس سے بات کر رہی تھیں تم۔ جو میری کال ہی نہیں لی۔ آج تمہارا نمبر کیوں بند تھا؟ ہماری ہر بات پہ اعتراض ہوتا ہے انہیں۔ بات بات پر موڈ آف کر لیتے ہیں“۔

ٹینا نے بڑی صاف گوئی سے بتایا

”اور تو اور ہمارا کسی اڑوس پڑوس کی دوست یا کسی عزیز رشتے دار کے گھر جانا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ پتہ نہیں حقوق نسواں کا پرچار کرنے والے ایسے طبقے کے لوگوں کا احتساب کیوں نہیں کرتے“۔

پیچھے بیٹھی ہوئی انیلا نے بھی لقمہ دیا۔

”ہاں ہاں آپ تو جیسے بڑی مظلوم، بے بس اور کمزور سی لڑکی ہیں نا۔ سب کی عزت کی بڑی پاسداری کرتی ہیں۔ اپنے گھر والوں کے اعتماد کو بھی چکنا چور کرنے سے باز نہیں آتیں۔ گھر میں بیٹھ کر ہوم ورک کرتے ہوئے سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بیگ میں چھپے سیل پر چیٹنگ بھی کر رہی ہوتی ہیں اور ہوم ورک بھی۔ دوران سفر پردہ داری کی چادر کی اوٹ میں بھی انگلیاں چیٹ پر محو حرکت ہوتی ہیں اور آنکھوں پر سجا نقاب بہت پردہ دار اور شریف زادی ہونے کا اعلان کرتا رہتا ہے۔ دوران پیریڈ بھی کسی کو ایس ایم ایس کر کے یہ بتایا جاتا ہے کہ ٹیچر آ چکے ہیں۔ پلیز ویٹ“ ادھر سے شرجیل نے بھی جوابی حملے کے طور پر انہیں آئینہ دکھا دیا

”او ہو بھئی آپ لوگ تو ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے لگے۔ پلیز ہم یہاں ایک دوسرے سے لڑنے نہیں آئے۔ ایک دوست کی خوشی میں شامل ہیں پلیز آپ لوگ ٹاک ضرور کریں مگر ایک دوسرے کے دلائل سے ساتھ بات کریں۔ یہ موبائل فون کا استعمال جس طرز پر خصوصاً ینگ جنریشن میں کیا جا رہا ہے۔ اس کے نقصانات کس حد تک بڑھ رہے ہیں اور ان کا تدارک کیونکر ممکن ہے“ عمیر خان نے دونوں فریقین سے درخواست کرتے ہوئے کہا۔

”عمیر صاحب موبائل کا وائرس ہماری رگوں میں اس قدر سرایت کر چکا ہے کہ اب اس سے گریز کرنا ناممکن سا ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے موجد نے اسے صرف اپنی ضرورت کے وقت استعمال کرنے کیلئے ایجاد کیا تھا۔ مگر آج ہم نے اسے ہر وقت اپنے پاس رکھنا اور بلا ضرورت اس سے کھیلتے رہنا اپنی مجبوری بنا لیا ہے۔ اب ہم کھانے کے بغیر تو کچھ وقت گزار سکتے ہیں۔ مگر موبائل سیٹ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔

آج ہمارے ہاں پیدا ہونے والا بچہ دودھ پینے کی

عمر میں بھی موبائل اگر اس کے ہاتھ میں دیا جائے تو فوراً اسے کان سے لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ آج کے بچے اپنے کھیل کا آغاز ہی موبائل فون سے کرتے ہیں۔ پھر ان کی عمر کے ساتھ ساتھ موبائل کے استعمال کا شوق بھی بڑھتا چلا جاتا ہے اور بچے کو گھر میں ہر وقت کہیں نا کہیں سے ایک چیز با آسانی دستیاب ہو رہی ہو تو وہ اس کی طرف ہی مائل ہوتا رہتا ہے۔ ہم بچے کو بہلانے کیلئے بھی اس کے ہاتھ میں موبائل سیٹ دے دیتے ہیں۔ پھر انہیں پہلے گیم دکھا کر بہلاتے ہیں پھر انہیں گیم سکھا کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ گیم کھیلنے کا شوق بچوں کو اور موبائل سیٹ کے قریب کرتا ہے۔ اب وہ ضد کرتا ہے اور تقاضا کر کے سیل حاصل کر لیتا ہے کہ میں نے گیم کھیلنا ہے۔ اب جس بچے کو اس کی گھٹی میں ہی موبائل دے دیا جائے۔ اس کی بگڑتی ہوئی عادات اس کے بگڑتے ہوئے ماحول کا کس کو مورد الزام ٹھہرایا جائے گا۔ یقیناً اس کے والدین کو۔ جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے کانٹوں کی فصل بوئی اور اب ان سے گلابوں کی توقع لئے بیٹھے ہیں۔ اب ان کو سنبھالنا بہت مشکل کام ہوگا۔ عمیر صاحب موبائل کا وائرس واقعی ہی ایک لاعلاج مرض ہے۔"

شکیل نے پورا لیکچر ہی دے دیا۔ مگر سب نے اس کی بات کو تحمل سے سنا اور سنجیدگی سے سمجھا۔

"تو پھر ہمیں بگاڑنے میں ہمارے پیرنٹس کا ہاتھ ہی ہے نہ۔ کیوں کرتے ہیں وہ ایسا؟" انیلا نے بڑے دکھ سے بات کی۔

"اور پھر اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ اگر ہم اپنے گھر والوں کی نظروں میں دھول جھونک کر انہیں بیوقوف بنا رہی ہیں تو لڑکے کیا کر رہے ہیں۔ ہمیں تو گھر میں چھپ کر ایسا کرنا پڑتا ہے اور وہ گھر سے باہر آزاد رہ کر کیا کچھ اس موبائل کے ہاتھوں نہیں کر رہے" ماہا نے بھی انیلا کی تائید میں کہا۔

"ہاں یہ تو سچ بات ہے۔ کسی ایک صنف کو نشانہ بنانا یا اسے دوسرے سے زیادہ مظلوم ظاہر کرنا تو سراسر ناانصافی ہے۔ قصور وار ہیں تو دونوں اور اگر نردوش ہیں تو بھی دونوں۔ بے شک والدین کے لاڈ اور پیار نے ان کو اس مقام تک پہنچانے میں اہم رول ادا کیا۔ اس لئے زیادہ قصور وار بچوں کے والدین بنتے ہیں" عمیر خان نے فیصلہ دیا۔

ان کی اس بحث کے دوران ہی شبانہ اور ماہا کی ماما بھی اندر آ بیٹھیں اور دلچسپی سے ان کی تکرار سننے لگیں۔ جب بات والدین کو اپنی اولاد کے بگاڑنے تک آ پہنچی۔ تو وہ بھی اس مناظرے میں شامل گفتگو ہو گئیں۔

"یہ تو آپ لوگ ہمارے والدین پر بلیم لگا رہے ہو بھئی۔ بھلا کوئی ماں باپ بھی اپنی اولاد کی تربیت اس طرز پر کرنا پسند کرتا ہے کہ اس کی اولاد کی عادات بگڑ جائیں۔ کبھی بھی نہیں ایسا ہو سکتا کہ بچوں کو لاڈ پیار دینا ان کی ننھی ننھی خواہشوں کو پورا کرنا ان کا حق بنتا ہے۔ کیا ہمیں ان کو اس حق سے محروم کر دینا چاہیے؟ کیا وہ ایسا کرنے سے احساس محرومی کا شکار نہیں ہو جائیں گے؟ ان کے معصوم سے ذہنوں پر برا اثر نہیں پڑے گا؟" شبانہ کی ماما نے دلائل کے ساتھ اپنا موقف پیش کیا۔

"یہ بات ہم کب کہہ رہے ہیں آنٹی جان کہ بچوں کو لاڈ پیار نہ دو اور ان کے حقوق کا خیال نہ رکھو۔ ہمارا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اچھی عادات اور ان کی جائز خواہشات کا احترام کیا جائے۔ نا کہ ان کو ایسی چیزیں کھیلنے کو دیں۔ جو ان کی تربیت میں بگاڑ کا باعث بنیں۔ مثلاً موبائل سیٹ، ریوالور، اسلحہ نما کھلونے، ٹی وی کا ریموٹ، بائیک اور گاڑی کی چابی۔ یہ ساری چیزیں ان کے ذہنوں پر ان تمام چیزوں کو پانے اور انہیں استعمال کرنے کی ترغیب کے اثرات مرتب کریں گی۔ معصوم بچے ہر بات کی فوری نقل کرتے ہیں۔ اگر ان کے سامنے آپ کتابوں کا مطالعہ کرتے رہا کریں گے تو یہ بھی کتابوں کی طرف مائل ہوں گے۔ آپ گھر میں نماز پڑھیں گے۔ یہ بھی نقل کرنے لگیں گے۔ آپ ان کی موجودگی میں موبائل، ٹی وی، ڈش پر زیادہ وقت صرف کریں گے تو یہ بھی ادھر مائل ہوں گے۔ بچے کے پہلے پانچ سال ماں کی گود میں گزرتے ہیں اور ان پانچ

سالوں کی تربیت ان کی تمام زندگی پر اپنے اثرات باقی رکھتی ہے" آصف نے تفصیلی بات سے اپنی سوچ کا اظہار کیا۔

"ماشاءاللہ شادی ابھی نہیں کی مگر باتیں ساری تجربہ شدہ بتا رہے ہیں آصف صاحب۔ یار کم از کم سارے تالی ہی بجادو" احسن نے آصف پر ہوٹنگ کرتے ہوئے محفل کو زعفران بنانے کی کوشش میں کہا۔

"نہیں یار ویسے بندہ بڑا دور اندیش ہے۔ باتیں کام کی بتائی ہیں اس نے۔ کم از کم میں تو اپنی عملی زندگی میں ان پر ضرور عمل درآمد کروں گا" شرجیل نے بھی مسکا لگادیا تو ایک بار پھر پورا کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

"بیٹا ہمارے ماں باپ نے بھی ہم سے بچپن میں سارے لاڈ لڑائے تھے۔ مگر ہماری عادات تو اس قدر نہیں بگڑیں جتنی آج پیدا ہونے والی نئی نسل کے چلن بدلے ہوئے ہیں۔ بہت تیز طرار، بہت ذہین اور بہت جلدی اثر قبول کر کے فوری اپنا ردعمل ظاہر کرنے والی نرسری کی پود جنم لے رہی ہے۔ اب جو چیزیں گھر میں موجود ہیں ان کو ان کی زد سے کیونکر بچایا جائے۔ کیا گھر میں ٹی وی نہ رکھا جائے؟ ڈش، کیبل، موویز دیکھنے کے ذرائع اور موبائل سیٹ گھر میں نہ رکھنے کی قسم کھالی جائے۔ تاکہ یہ چیزیں ہماری اولاد کی تربیت میں رخنہ نہ ڈال سکیں۔ کیا یہ ممکن ہے؟ موبائل سیٹ رکھنے سے کسی پر سختی برتی جائے اور اگر ایسا کر بھی لیا جائے تو کیا وہ ہماری بات مان لیں گے؟ وہ کسی ناجائز طریقے سے بھی یہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ پھر کیا ان سے جنگ لڑی جائے کہ بیٹا ہم نے آپ کو موبائل سیٹ تو پاس رکھنے دینا ہی نہیں۔ امپوسبل بیٹا۔ یہ ممکن نہیں ہے" آنٹی نے بے بسی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"ناٹ امپوسبل آنٹی۔ دنیا میں کوئی کام ناممکن نہیں ہے۔ بارش اگر طوفانی بھی ہو رہی ہو تو چھتری لینے والا کافی حد تک خود کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اگر تمام والدین گھروں میں اور اساتذہ تعلیمی اداروں میں موبائل کے استعمال پر سختی برتتے ہیں تو نتائج بہتر ثابت ہو سکتے ہیں۔ آنٹی جان۔ آپ کے زمانے میں یہ ساری چیزیں اس قدر عام میسر نہ تھیں۔

دور حاضر کی جدت نے جس قدر سائنسی ترقی کی ہے۔ نئی نسل کا شعور بھی اتنا ہی پختہ اور ہر چیز کو اکسپرٹ کرنے کا اہل پیدا ہو رہا ہے۔ یہ سب فطری تقاضے ہیں۔ یہ سب وقت کی اب ضرورت بھی ہے۔ زمانے کی دوڑ کے ساتھ ساتھ چلنا اب مجبوری بن گیا ہے۔ مگر ہمارے نظام میں گڑبڑ ہے۔ وہ اسے ٹھیک طرح سے ہینڈل نہیں کر پا رہے۔ پوری قوم کے اندر شعور پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمارے پاس تمام تر وسائل اور ذرائع موجود ہیں۔ مگر ہم ان سے اصلاح کا کام نہیں لے رہے۔ ہم سب کو مل کر کوشش کرنا ہو گی۔ پھر کچھ بھی ناممکن نہ رہے گا" عمیر خان نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"واہ عمیر صاحب کیا زبردست ویوز دیئے ہیں آپ نے۔ جو واقعی قابل توجہ ہیں۔ اب ذرا دور حاضر میں کی جانے والی محبت پر بھی روشنی ڈال دو۔ ہمارے پیارے دوست فریال کو اپنی محبت کی تکمیل کیلئے جن دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑا ہے۔ اب ہر جوڑا جو محبت کا پرچار کر رہا ہے۔ وہ اتنی سخت آزمائشوں اور حالات کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا۔ تو کیا وہ اپنی محبت کا گلا گھونٹ دے؟ یا پھر حالات کی بھینٹ چڑھ جائے" شکیل نے عمیر خان سے تفصیل چاہی۔

"آپ کس محبت کی بات کرتے ہیں شکیل بھائی۔ کوئی ذرا مجھے محبت کی وضاحت تو کر کے بتائے کہ محبت کا مفہوم کیا ہے؟ اور محبت کا مقام کیا ہے؟ دور حاضر میں تو روزمرہ کی اشیاء مارکیٹ سے اصل نہیں ملتی۔ سب دو نمبر کا بیوپار ہو رہا ہے اور آپ اصل اور خالص محبت کی بات کر رہے ہیں۔ یہ آنے والا دور جدید کہلاتا ہے اور ہر گزرا دور قدیم کہلانے لگتا ہے۔ ہر نئے دور نئی نسل پروان چڑھتی ہے اور جدت کی کھوج کرتی ہے۔ ترقی کے راستوں پر چل کر کامیابی کی منزلیں عبور کرتی ہے۔ ہر نئے دور اور ہر نئی نسل کے تقاضے بھی نئے ہوتے ہیں۔

محبت بھی ان بدلتے زمانوں کے ساتھ اپنا روپ
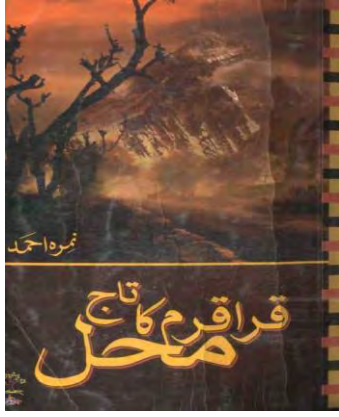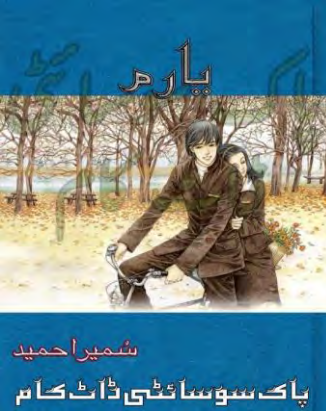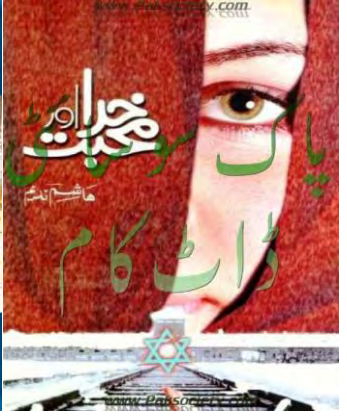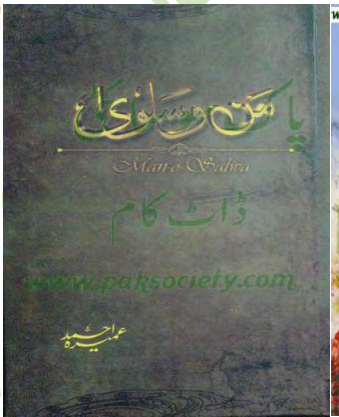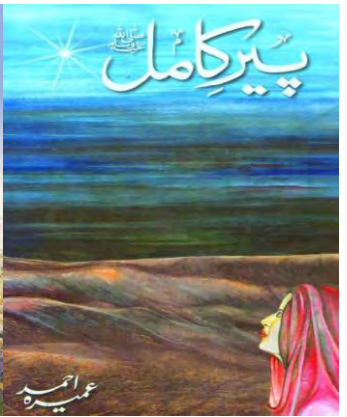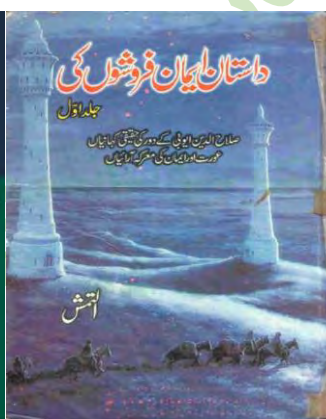
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

بدلتی رہی ہے۔ آپ ذرا تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں۔ لیلیٰ مجنوں کی محبت کا قصہ پتھر دور کے زمانے سے بھی پہلے کی بات ہے۔ محبت نے ان کرداروں کو کس قدر سخت آزمائش سے گزارا۔ قیس کو محبوب کی گلی میں پتھر کھانے پڑتے تھے۔ مگر ان کی زبان پر گلہ نہیں بجتا تھا۔ فرہاد کو شیریں کی محبت حاصل کرنے کیلئے دودھ کی نہر کھودنے کی آزمائش میں ڈالا گیا۔ سوہنی نے محبت کی لاج نبھانے کیلئے دریائے چناب میں کچے گھڑے پر بازی لگانے سے بھی گریز نہ کیا۔ پندرہویں صدی میں ہیر کو جام زہر نوش کرنا پڑا۔ مغلیہ دور میں مہرالنساء جس کو نور جہاں کا لقب ملا۔ جہانگیر کی محبت نے اس سے اس کا شوہر شیر افگن چھین لیا۔ اسے اپنی بیٹی لاڈلی بیگم کے ساتھ جہانگیر کی شریک سفر بننا پڑا۔

محبت کی طلب نے ایک انسان کی جان لے کر اپنی محبت کو انجام دیا۔ اس کے بعد جو دور آیا اس میں بڑوں کا ادب واحترام ضروری سمجھا جاتا تھا اور شرم حیا کی لاج کو نبھایا جاتا تھا۔ محبت کے کردار اس دور میں بھی نمایاں کردار ادا کر رہے تھے۔ مگر پردہ غیب میں رہ کر پروان چڑھتے اور پھر منطقی انجام تک پہنچنے کیلئے انہیں زمانے بھر میں رسوا ہونا پڑتا۔ انہیں عزت کی نگاہ سے نہ دیکھا جاتا جس کے باعث وہ نادم سے رہ کر زندگی بسر کرتے۔

1950ء تک کا زمانہ جنگل میں رہنے والوں کا زمانہ تصور کیا جاتا ہے۔ جب ذرائع معاش کا انحصار صرف جانور تھے۔ گائے بھینس، بھیڑ بکریاں، اونٹ، گھوڑے ریوڑوں کی شکل میں چار سو دکھائی دیتے تھے۔ پھر آبپاشی کیلئے انگریز نے ملک میں نہری نظام رائج کیا۔ ریل کی پٹڑیاں بچھائی گئیں۔ سڑکیں تعمیر ہوئیں۔ ڈیم بنے۔ زراعت نے جنم لیا۔ کنویں بیلوں کی مدد سے چلنے لگے۔ زمانہ ترقی کی طرف گامزن ہوا۔

ریاست بہاولپور کے نواب صبح صادق کے پیرو مرشد حضرت خواجہ غلام فرید کوٹ مٹھن شریف تھے۔ عرصہ دراز سے ملاقات کرنے نواب صاحب اپنی بگھی پر گھوڑ سواروں کے دستے کے ساتھ پہنچا تو پتہ چلا کہ خواجہ صاحب پچھلے کئی ماہ سے گھر لوٹ کر نہیں آئے۔ خانہ بدوش قبیلے کی ایک لڑکی پر عاشق ہو گئے ہیں۔ اب جہاں وہ قبیلہ ہجرت کر کے جاتا ہے۔ خواجہ صاحب بھی ان کے تعاقب میں وہاں چلے جاتے ہیں۔ ان سے ذرا دور کٹیا بنا کر بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ لڑکی دوسری عورتوں کے ساتھ پانی بھرنے دریائے ستلج پر جاتی ہے تو خواجہ صاحب دور کھڑے اسے دیکھتے ہیں۔ نہ کبھی اس لڑکی سے ملنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی اس سے دور رہتے ہیں۔ بس دیوانہ وار اسے دیکھتے رہتے ہیں۔

نواب صاحب یہ بات سن کر دنگ رہ گئے۔ فوراً گھر واپس پہنچے اور اپنی پوری ریاست میں محرام دوڑا دے کہ ریاست بہاولپور کے تمام خانہ بدوش قبیلے اس اسلامی مہینے کے اختتام تک ہجرت کر کے ڈیرہ نواب پہنچ جائیں۔ جو قبیلہ وہاں نہ پہنچا اسے ریاست بہاولپور سے ہمیشہ کیلئے نکال دیا جائے گا۔ تمام خانہ بدوش بڑے پریشان ہوئے۔ نا جانے ہم سے کیا خطا ہو گئی جو ہمیں بلایا جا رہا ہے۔

نواب صاحب کے حکم کی تعمیل کی گئی اور تمام خانہ بدوش ڈیرہ نواب پہنچ گئے۔ خواجہ غلام فرید بھی اپنے مطلوبہ قبیلے کا تعاقب کرتے ہوئے ڈیرہ نواب آپہنچے اور اپنی الگ کٹیا لگالی۔ کسی نے نواب صاحب کو اطلاع دی کہ خواجہ غلام فرید بھی تشریف لا چکے ہیں۔ نواب صاحب فوراً اپنا حفاظتی دستہ لئے پیدل چل کر پیرو مرشد کے پاس پہنچے۔ سر جھکا کر ادب سے سلام عرض کیا اور اپنے ساتھ اپنے محل میں چلنے کی درخواست پیش کی۔ آپ نے فرمایا۔

”ہم فقیر لوگ ہیں۔ محلوں کی زندگی ہمیں راس نہیں ہم بس یہاں ٹھیک ہیں“۔

نواب نے عرض کی۔

”حضور یہاں کہاں ان قبیلے والوں کے ساتھ صحراء صحراء، جنگل جنگل مارے مارے پھرتے ہیں“۔

خواجہ صاحب نے فرمایا۔

”اپنے یار کی کھوج میں مارا مارا پھرتا تھا۔ وہ مجھے اس قبیلے میں نظر آگیا۔ بس اس کے درشن کی پیاس ہی نگر نگر لئے پھرتی ہے“۔

مطلوبہ قبیلے کے سربراہ کو طلب کیا گیا اور نواب صاحب نے اس کی بیٹی کا رشتہ اپنے پیرو مرشد کیلئے طلب کیا۔ جو کسی پس و پیش کے قبول کرلیا گیا۔ بلکہ سارے قبیلوں نے مبارک بادیں دیں کہ ہمارے قبیلے کی بیٹی ایک اللہ کے برگزیدہ بندے کی خدمت گزار بننے جارہی ہے۔ مجاز نے حقیقت کا روپ دھارا تو وصال یار کی منزلیں آسان ہوگئی ہیں اور محبت کی ساکھ محفوظ رہی۔ مگر بدلتے زمانوں کی تند و تیز موجوں نے پیکر محبت کی کشتی کو زیر و زبر کرکے رکھ دیا۔ محبت اَمر ہے اور ہمیشہ امر رہے گی۔ مگر ہم آج محبت کو صرف بازاری چیز سمجھ کر اس کے وجود کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ہم نے محبت کی قدر و قیمت کھو دی ہے اور محبت کی شکل و صورت کو مسخ کرکے رکھ دیا ہے۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ محبت سے ہمارا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ ہم صرف اپنی محبت کو سچ سمجھتے ہیں۔ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ دنیا میں مجھ سے زیادہ محبت کرنے والا شخص پیدا ہی نہیں ہوا۔ دوسرے کی محبت پر ہمیں یقین ہی نہیں ہے۔ بیوی کو شوہر کی محبت پر شک ہے۔ شوہر بیوی کی محبت سے مطمئن نہیں۔ اس سائنسی دور کی محبت آئی لو یو کے مقام پر آکر بکھر گئی ہے۔

دو شدید محبت کرنے والوں میں سے کسی ایک کو کوئی تیسرا فرد آئی لو یو کہہ دے تو وہ فوری اس کی طرف متوجہ ہوجائے گا اور یوں اس کی پہلی محبت بکھر جائے گی۔ اب اس کا موقف یہ ہے کہ مجھے اس نے محبت کی دعوت دی ہے تو میں کیا کروں۔ میں اس کی محبت کا جواب نفرت سے بھلا کیسے دوں؟ تب اس سے محبت کرنے والا کسی اور کی طرف راغب ہوجاتا ہے۔ کیونکہ اسے بھی محبت کی دعوت مل جاتی ہے۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ پہلے کسی کو کسی سے محبت ہو جایا کرتی تھی۔ مگر اس جدید دور میں اب محبت کی جاتی ہے۔ جو آپ کسی سے بھی کرسکتے ہیں۔ ایک وقت میں ایک سے زیادہ محبتیں بھی کی جاسکتی ہیں اور ضرورت کے بعد محبت کو تبدیل بھی کیا جاسکتا ہے۔ جہاں اور لاکھوں کاروبار ہورہے ہیں۔ وہاں محبت کا کاروبار بھی اس عہد میں بام عروج پہ ہے"۔

عمیر خاں نے بات مکمل کرکے پوری محفل کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو چاروں طرف سے اس پر سوالات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔

"ہم آپ کی رائے سے اتفاق نہیں کرتے عمیر صاحب۔ آج کے دور میں محبت کرنے والے ہزاروں مجنوں، رانجھے اور فرہاد بھی موجود ہیں اور زہر پینے والی ہیریں بھی۔ چناب میں ڈوبنے والی سوہنیاں بھی ہر طبقے کے لوگوں میں موجود ہیں اور اپنی محبت کو دوسروں کی محبت پر قربان کرنے والے جاں نثار بھی اسی معاشرے میں آباد ہیں۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آج کی محبت بھی رسمی اور کاروباری بن کر رہ گئی ہے۔ فریال اور مہک کی محبت پر بھی آپ کو شک ہے۔ یہ تو زندہ مثال آپ کے سامنے ہے۔ ان کو تو کسی اور نے اپنی طرف راغب نہیں کرلیا۔ ان کا تو محبت پر اعتماد نہیں ٹوٹا" شکیل نے عمیر پر حملہ آور ہوتے ہوئے کہا۔

"جناب عمیر صاحب اس سائنسی دور کی محبت نے محبت کو مستحکم کیا ہے۔ پہلے دور میں کی جانے والی محبتیں گونگی اور اپاہج تھیں۔ اپنے جذبوں کا اظہار نہیں کرسکتی تھیں۔ اپنے ہونے کا احساس نہیں دلاسکتی تھیں۔ محبوب کے پاس رہ کر بھی اجنبی بنی رہتی تھیں۔ آج سائنس نے ایسے آلے ایجاد کردیئے ہیں کہ آپ اپنے گھر میں بیٹھ کر اپنا بھرپور اظہار کرسکتے ہیں۔ کہنے میں مشکل ہو تو لکھ کر دوسرے ہی لمحے مطلوبہ شخص کی مٹھی میں پیغام پہنچا سکتے ہیں۔ ہر وقت ہر پل اس کی خیریت سے آگاہ رہ سکتے ہیں اور زمانے کی نظروں سے اوجھل رہ کر رسوائیوں سے بھی محفوظ رہ سکتے ہیں۔ پھر بھی آپ الیکٹرونک دور کی محبت کو جدید طریقوں سے پایہ تکمیل تک پہنچانے کی اہمیت کو ماننے سے انکاری ہو رہے ہیں"۔

یہ آصف کے خیالات تھے۔

"عمیر صاحب آپ بھی ہماری طرح ینگ جنریشن کے فرد ہیں۔ پھر بھی آپ دقیانوسی اور جاہل زمانے کے لوگوں کی محبت کو آج کی محبت پر فوقیت دے رہے ہیں۔ بڑے دکھ کی بات ہے۔ آج ہم دوسرے پر اپنی

محبت کی اہمیت جتا کر اسے احساس دلاتے ہیں کہ ہم تمہارے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہماری محبت کو پہچانو اور ہمیں چھوڑ کر کسی اور طرف نہ جاؤ اور ہماری محبت کی توہین نہ کرو‘‘ ماہا نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا۔

’’نہیں، نہیں عمیر صاحب۔ آپ نے دور حاضر میں کی جانے والی محبت کو بے معنی اور کاروباری بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا کچھ نہیں۔ محبت کبھی بھی کسی بھی دور میں اپنے اثرات تبدیل نہیں کرتی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر دور کے لوگوں نے اسے اپنی اپنی سوچ کے مطابق قبول کیا اور محبت کے تقاضوں پر پورا اترنے کی کوشش کی۔ محبت میں پیغام رسانی کا ذریعہ تو کبوتر بھی بنائے گئے۔ تار ٹیلی گرام اور پھر خطوط کا سلسلہ تادیر قائم رہا۔ مگر دور حاضر میں جدید ٹیکنالوجی نے پوری دنیا سمیٹ کر آپ کی مٹھی میں بند کر دی ہے۔ دیار غیر میں بسنے والے ہر وقت آپ سے بات کر سکتے ہیں۔ دوریاں نزدیکیوں میں سمٹ کر رہ گئی ہیں۔ محبت کی شکل کو ہرگز مسخ نہیں کیا۔ محبت کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے اس میں آسانی پیدا کی گئی ہے‘‘۔

ردا نے بھی عمیر خاں کو دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی۔ ایسے میں شبانہ کی ماما نے ردا کی بات کو اچک لیا۔

’’بیٹا ہم کب اس جدید ٹیکنالوجی کی ایجادات کے خلاف بات کر رہے ہیں۔ آپ کے تمام تو دلائل اپنی جگہ۔ لیکن بیٹا ذرا اس کے منفی اثرات پر بھی تو غور کرو۔ پچھلے دنوں میں اپنی بہن سے ملنے گاؤں گئی ہوئی تھی تو میری بہن نے مجھے بتایا کہ ہمارے پڑوسی زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ گھر میں دولت کی فراوانی ہے۔ ایک جوان بیٹی جو ابھی سیکنڈ ائیر کی طالبہ ہے۔ اکیڈمی بھی جوائن کرتی ہے۔ اس کے ماما پاپا نے گھر میں رکھی جانے والی رقم کی چابی بیٹی کو سونپ رکھی تھی۔ پچھلے ہفتے وہ اس روز اکیڈمی نہیں گئی۔ بلکہ اپنے کپڑے اور زیور وغیرہ بیگ میں سمیٹا۔ پھر بیگ کمرے سے بیٹھک میں لے آئی۔ جس کا ایک دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ وہ لڑکا بائیک پر آیا۔ اسے کال کی۔ لڑکی بیٹھک سے برآمد ہوئی اور بائیک پر سوار ہو کر ماں باپ کی عزت کو برباد کر کے چلی گئی۔ یہ سب کیونکر ہوا؟ موبائل فون نے انہیں یہ قدم اٹھانے میں بھرپور مدد دی۔ ورنہ عام حالت میں ایسا ہونا مشکل تھا۔ لڑکیوں کو بلیک میل کیا جا رہا ہے۔ رونگ میسج کر کے نئے نئے روابط جنم لے رہے ہیں۔ جو کسی انہونے واقعہ کا سبب بن جاتے ہیں۔ رونگ نمبر سے رونگ تعلقات قائم کیے جاتے ہیں۔

فیس بک کی ٹائم لائن میں کیا کچھ نہیں ایڈ کیا جا رہا۔ جو ناسمجھ اور کم فہم ذہنوں کی غلط نشوونما کا باعث بھی بنتا ہے اور جواں سال ذہنوں کو پراگندہ کرنے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ جہاں سے برائی جنم لیتی ہے۔ برے خیالات شخصیت کو بربادی کی طرف دھکیلتے ہیں۔ ایک طالب علم اس برائی کو اپنے دوست کی طرف منتقل کرتا ہے۔ بس پھر دوست تو دوست ان کے گھرانوں کے بچوں کو بھی اس آگ کی لپیٹ میں جلنا پڑتا ہے۔ جن کی شرافت کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ یہ سب کچھ محبت کی آڑ میں ہو رہا ہے۔ دوستوں کے ہاتھوں میں تباہ کن وائرس کو فروغ مل رہا ہے۔

محبت کی آڑ میں مطلب پرستی چھپی ہے۔ جن کی محبت بے لوث اور پرستش کے قابل ہے۔ ان کو جوابی محبت ویسی نہیں مل سکتی۔ یہ ایک فطری عمل ہے۔ بہت کم ایسے اتفاقات ہوتے ہیں کہ دونوں کی محبت یکساں رہی ہو۔ بے وزن محبت بے اعتنائی اور بے وفائی کا باعث بنتی ہے۔

عمیر صاحب نے ٹھیک کہا ہے کہ محبت کے اعتماد کو چکنا چور کیا جا رہا ہے۔ دلوں میں محبت کے ساتھ ساتھ شکوک کا جنم لینا ہی محبت کو ختم کرنے کا باعث بنتا ہے اور آج ہر بات کو شک کی نگاہ سے ضرور دیکھا جاتا ہے۔ جو نہیں دیکھتے دوسروں پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ ان کے اعتماد کو زبردست ٹھیس پہنچتی ہے‘‘۔

آنٹی نے عمیر خاں کی حمایت میں کچھ حقائق سے پردہ اٹھایا۔ مگر ینگ جنریشن اپنے موقف پر قائم رہی کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں محبت کو جدید خدوخال کے

ساتھ بھرپور طریقے سے نبھایا جا رہا ہے اور اس کے تقدس کو ہرگز پامال نہیں کیا جا رہا۔

.......☆☆☆.......

فریال کی بارات سجی۔ دولہا پر دوستوں نے منوں گلاب کی پتیاں نچھاور کیں اور خوب ہلہ گلہ کیا۔ گاڑیوں کی ایک پوری قطار پوری سج دھج کے اپنی منزل پہ پہنچی۔ پرتپاک استقبال کرنے والوں میں جہاں مہک کے پاپا اس کے بھائی خوبصورت مالائیں لیے کھڑے تھے۔ وہاں میر داد بھی کلیوں سے سجا ہار لئے فریال کا منتظر کھڑا تھا۔ رسم نکاح ادا ہو گئی۔ مبارک بادوں کا شور اٹھا۔ دولہا دلہن پر سرخ پتیوں کی بارش کی گئی۔ معراج بیگم نے اپنے داماد فریال کو نا صرف آشیر باد دیا۔ بلکہ سلامی بھی پیش کی۔ شہنائی کی گونج میں رات گئے رخصتی ہوئی۔ بیٹی بابل کا گھر چھوڑ کر جانے لگی تو گھر کی فضا نمناک ضرور ہو جایا کرتی ہے۔ خواہ بیٹی غریب کی کٹھیا سے رخصت ہو خواہ امیر کے بنگلے سے۔ منظر ایک جیسا ہوتا ہے۔ معراج بیگم نے بیٹی کو گلے لگا کر پیار دیا۔ مہک کے کندھے تھپتھپائے اور انگلیوں سے آنکھوں میں اتری نمی کو صاف کرنے لگی۔ میر داد نے بھی مہک بیٹی کو گلے لگا کر حقیقی بیٹی کی طرح رخصت کیا۔ جب وہ مہک کو جھک کر گلے مل رہا تھا۔ معراج بیگم نچلے ہونٹ دانتوں میں دبائے شدت غم سے چھلک رہی تھی۔ کسی کی محبت نے اسے بے قابو کر دیا تھا۔

سسرال پہنچ کر مہک کو فریال کے دوستوں جن میں عمیر خاں سرفہرست تھا سب نے گھیرے میں لے لیا اور منہ دکھائی کی رسم ادا کی۔ مہک کی دیرینہ اور بہت پیار کرنے والی دوست نایاب بھی شریک تھی اور جب عمیر خاں مہک کو سلامی پیش کر رہا تھا تو مہک نے نایاب کو بتایا

۔

”یہ عمیر خاں ہیں۔ فریال کے دوست جو بہت بڑے زمیندار ہیں۔ نایاب نے بھی عمیر خاں کو سلام کہا تو اس کی بے پناہ تصویریں لی گئیں۔ پھر فریال مہک کے دائیں جانب اور عمیر خاں بائیں جانب بیٹھا تو ان کی یادگار لمحوں کو کیمروں نے اپنے اندر محفوظ کر لیا۔ تب فریال نے کھڑے ہو کر سب دوستوں کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

”دوستو جب میں اور مہک بدترین حالات سے گزر رہے تھے تو میرے اس پیارے دوست عمیر خاں نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ میرا دل کہتا ہے اور مجھے یقین کامل ہے کہ تمہارے خلاف کی جانے والی ساری سازشیں ناکام ہوں گی۔ اس وقت مہک کی ایک جگہ منگنی کی جا رہی تھی۔ میں اور مہک قطعی ناامید ہو چکے تھے۔ مگر عمیر خاں نے ہر قدم پر ہمیں ڈھارس دیئے رکھی کہ انشاء اللہ ایک وقت آئے گا جب آپ کا ملن ہو گا اور وہ لمحہ آج آپ کے سامنے ہے۔ مجھے عمیر خاں کی دوستی پر فخر ہے۔ کیونکہ دوست تو وہی ہوتا ہے نا جو مشکل میں کام آئے اور عمیر خاں نے ہمارے مایوس دلوں میں امید کی کرن جگائے رکھی۔ جس نے ہمیں کامیابی سے ہمکنار کیا۔ اب میری بھی خواہش ہے کہ میں بھی عمیر خاں کی خوشیوں میں شامل ہوں اور ایسی ہی تقریب میں اپنی بھابھی کو سلامی پیش کروں“۔

سب نے تالیاں بجا کر ان کی دوستی کو داد دی۔ معراج بیگم اور میر داد کی کھوئی ہوئی محبت نے پینتیس سال بعد بھی انہیں اپنی گرفت سے آزاد نا ہونے دیا۔ بلکہ انہوں نے اپنی محبت کو فریال اور مہک کی محبت کے گلے میں سنجوگ کی مالا پہنا کر اسے اَمر کر دیا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

میں نہیں جانتی

صداقت حسین ساجد

لہو برسا ہے بہے آنسو ، لٹے راہ رو ، کٹے رشتے
ابھی تک نا مکمل ہے مگر تعمیر ِ آزادی

آندھیاں غم کی یوں چلیں باغ اجڑ کر رہ گیا
سمجھے تھے آبرا جسے وہی بچھڑ کر رہ گیا
پوچھو نہ داستان غم اجڑے ہیں کس طرح سے ہم
گھر کا چراغ کیا بجھا گھر ہی اجڑ کر رہ گیا

یہ اشعار اس کے منہ سے بے اختیار نکلے۔ گم صم سی سکینہ بیٹھی خلا میں تک رہی تھی۔ قریب ہی پڑے ریڈیو سے صداکار کی آواز نے اعلان کیا۔

"کل صبح آٹھ بجے ایوان صدر میں صدرِ مملکت یوم آزادی کے سلسلے میں پرچم کشائی کی تقریب کی صدارت فرمائیں گے۔"

اس اعلان کے بعد اس نے کہا۔

سو گیا قوم کی تقدیر جگانے والا
اب کہاں خواب کی تعبیر بتانے والا
خود حفاظت کرو دیس کی لوگو! ورنہ
اب کوئی قائد اعظم نہیں آنے والا

اور اب آپ ملی نغمہ سنیں۔"

اس کے ساتھ ہی مشہور ملی نغمہ ریڈیو پر نشر ہونے لگا۔

جیوے جیوے پاکستان
پاکستان پاکستان جیوے پاکستان
مہکی مہکی، روشن روشن، پیاری پیاری نیاری
رنگ برنگے پھولوں سے اک سجی ہوئی پھلواری
پاکستان

اسی ملی نغمے کو سن کر ہی تو اس کے منہ سے اشعار نکلے تھے۔ آخر وہ بھی تو ان لوگوں میں شامل تھی، جنھوں نے پاکستان کو حاصل کرنے کے لیے قربانیاں دی تھیں۔

"آہ......!!!"

اس نے ایک طویل سرد آہ بھری۔ اسے وہ دن یاد آنے لگا جب......

......☆☆☆......

اس دن سکینہ اپنے ساس سسر اور تین نندوں کے ساتھ گھر میں موجود تھی۔ ان دنوں پاکستان بن چکا تھا اور مسلمان پاکستان کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ ہندو بلوائیوں نے سکھوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر حملے کر کے انھیں گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ سکینہ کے گھر والے اس لیے ابھی تک وہاں ٹکے ہوئے تھے کہ انھیں یقین تھا کہ یہاں کے ہندو انھیں کچھ نہیں کہیں گے، لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی، جو جلد ہی دور ہو گئی۔

اس دن ان کے گھر پر ان ہندوؤں نے دھاوا بولا تھا، جن کے ساتھ ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے اور یہ تعلقات ایک دو دن سے نہیں، بلکہ کئی سالوں سے چلے آ رہے تھے۔ ان ظالموں نے چند ہی لمحوں میں ان کا ہنستا بستا گھر اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کے سسر اور ساس کو ان ظالموں نے گولیوں سے چھلنی کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کا شوہر اور دیور کسی کام کی وجہ سے باہر گئے تھے۔ سکینہ اور اس کی تین نندیں موجود تھیں۔ سکینہ کی عمر

اس وقت یہی کوئی اٹھارہ انیس برس تھی۔ والدین نے کم عمری میں ہی اس کی شادی کر دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک چاند سے بیٹے سے نواز رکھا تھا۔

بلوائیوں نے گھر میں موجود ہر قیمتی چیز اپنے قبضے میں کر لی۔ پھر چار نوجوان لڑکیوں کو دیکھ کر ان ظالموں میں شیطانیت جاگ اٹھی۔ ان کی رال ٹپکنے لگی۔ ان میں سے ایک بولا۔

"مال زبردست ہے۔"

یہ سن کر دوسرا بولا۔

"کون سا مال؟"

"لگتا ہے، تم اندھے ہو گئے، اس لیے سامنے موجود مال دکھائی نہیں دے رہا۔"

یہ سن کر دونوں نے چونک کر سامنے دیکھا۔

"اچھا! اب سمجھ آئی۔"

"شکر ہے...... سمجھ گئے ہو...... کیوں ناں انھیں ساتھ لے جایا جائے۔"

"ہاں، ہاں! بالکل! بھلا کبھی کسی نے مال غنیمت بھی چھوڑا ہے۔" دوسرا بولا، تو باقی دو نے بھی اثبات میں سر ہلا دیے۔

وہ چاروں شیطانی قہقہے لگاتے ہوئے اس کونے کی طرف بڑھے، جہاں وہ لڑکیاں خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ سکینہ نے اس وقت اپنے ڈیڑھ سالہ بیٹے کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ ان چار شیطانوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ چلائیں۔

"تمھیں خدا اور رسول ﷺ کا واسطہ! ہمیں چھوڑ دو۔"

"ہمارا تو کوئی خدا ہے اور نہ رسول...... وہ تو تم مسلوں کے ہیں۔" ایک ظالم بولا۔

"ہم نے تمھارا کیا بگاڑا ہے، جو تم ہمارے پیچھے پڑ گئے ہو؟"

"تم نے ہماری بھارت ماتا کے ٹکڑے کیے، اس کی سزا تو تمھیں ملے گی...... اب زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

پھر ان چاروں نے لڑکیوں کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور بندوق کی نوک پر بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے ہوئے اپنے ٹھکانے کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ چاروں رو رہی تھیں۔ گڑگڑا کر آہ و بکا کر رہی تھیں، فریادیں کر رہی تھیں۔

"او ظالمو! ہمیں جانے دو۔"

"ہم نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟"

"کیا تمھاری مائیں بہنیں نہیں ہیں؟"

"ہمیں ستا کر تمھیں کیا ملے گا؟"

مگر ان ظالموں پر ان کے رونے، گڑگڑانے، آہ و بکا اور فریادیں کرنے کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ ان کی چیخیں، ان کی آہ و بکا اور فریادیں سن کر وہ قہقہے لگاتے اور کہتے۔

''ہاہاہاہا...... ہاہاہاہا...... ہم تمھیں کیوں جانے دیں؟ تم لوگوں نے ہمارا ملک تقسیم کر دیا ہے...... ہماری زمین ہم سے چھینی ہے اور پھر بھی کہتے ہو کہ ہم نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟ تمھارے ساتھ تو ہم وہ سلوک کریں گے کہ دوسرے جنم میں بھی تمھاری آتما (روح) تڑپتی رہے گی۔''

سفر تھا کہ کٹ ہی نہیں رہا تھا۔ چلتے چلتے راستے میں ایک نہر آگئی۔ نہر کو دیکھتے ہی سکینہ نے فوراً ہی ایک فیصلہ کر لیا۔ عزت بچانے کا ایک ہی راستہ تھا۔ ان ظالموں سے بچنے کے لیے سکینہ نے اپنے بیٹے سمیت آناً فاناً نہر میں چھلانگ لگا دی۔ ایک چھپاکا ہوا، تو ہندو چونک پڑے۔

''ارے! یہ کک...... کک...... کیا ہوا؟'' ایک ہندو بولا۔

''اس عورت نے اپنے بچے سمیت نہر میں چھلانگ لگا دی ہے۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

''لگتا ہے کہ اس کے پاس کوئی قیمتی چیز، روپیا پیسا یا زیور تھا، اس لیے تو وہ نہر میں کود گئی ہے۔''

''ہمیں بھی نہر میں کود کر اس سے وہ چیز حاصل کرنی چاہیے۔'' تیسرا بولا، تو سبھی نے اس کی تائید کر دی۔

پھر تین ہندو نہر میں چھلانگ لگانے کو تیار ہو گئے، جب کہ چوتھا ان تین لڑکیوں کو قابو کر رہا تھا۔ جب انھوں نے چھلانگیں لگائیں اور پہرہ دینے والے ہندو کا دھیان ادھر بٹا، تو تینوں لڑکیوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور بھاگ کھڑی ہوئیں۔

بھاگتے قدموں کی آواز سن کر ان کی نگرانی کرنے والا ہندو چونک کر پلٹا۔ ان تینوں کو بھاگتے دیکھ کر اس کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ بندوق سیدھی کر کے گولیاں داغنے لگا۔ یکے بعد دیگرے تین چیخیں بلند ہوئیں اور وہ تینوں لڑکیاں لہراتی ہوئی زمین پر گر پڑیں اور پھر نہ اٹھ سکیں۔ گرتے ساتھ ہی ان کی روحیں پرواز کر گئی تھیں۔ اب ان کے چہروں پر تکلیف کے بجائے سکون ہی سکون تھا۔ انھوں نے جو سوچا تھا، وہی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے ہاتھوں ان کی عزت محفوظ رکھی تھی۔

اتنے میں نہر میں کودنے والے تینوں ہندو سکینہ کو باہر نکال لائے۔ انھوں نے دیکھا، تو پتا چلا کہ وہ مر چکی ہے۔ ظالموں نے اس کی اچھی طرح تلاشی لی، لیکن کچھ برآمد نہ ہو سکا۔ مایوس ہو کر وہ چاروں ظالم آگے بڑھ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ہر طرف سے ناکامی سے دوچار کر دیا تھا۔

......☆☆☆......

جب سکینہ کا شوہر نعیم اور دیور عمیر واپس آئے، تو اپنے محلے میں مسلمانوں کے گھروں کی حالت دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے گھر کی طرف بڑھے، تو اس کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔ ان پر تو قیامت ٹوٹ پڑی، لیکن انھوں نے ہمت نہ ہاری، کیوں کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے تو جانے کتنی قربانیاں دینا پڑی ہیں۔ انھوں نے جلدی جلدی وہیں گڑھا کھود کر اپنے والدین کو دفن کر دیا۔ پھر سکینہ اور اپنی تینوں بہنوں کی تلاش میں نکل گئے۔ راستے میں ایک قافلہ مل گیا۔ ایک بوڑھے کو جب ان کی کہانی معلوم ہوئی، تو وہ کہنے لگا۔

''بیٹا! ان چاروں کو بھول جاؤ، جو ہونا تھا، وہ ہو چکا......''

''یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''اب اگر تم ان کی تلاش میں نکلو گے، تو اپنی جانیں بھی گنوا دو گے، کیوں کہ نوزائیدہ ملک پاکستان کو اور جانے کتنی ماؤں بہنوں کو تمھاری ضرورت ہوگی۔''

یہ سن کر انھوں نے اپنے سینے پر پتھر کی سل رکھ لی۔ حالات نے انھیں کیا سے کیا بنا دیا تھا۔

رات ہو رہی تھی۔ قافلے نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ رات کو بلوائیوں کے حملے کے خوف سے نیند نہ آئی، تو انھوں نے پھر چلنا شروع کر دیا۔

چلتے چلتے راستے میں ایک نہر آ گئی۔ اچانک ایک آدمی کی نظر ایک لاش پر پڑی، تو وہ چلا اٹھا۔

"وہ...... وہ...... وہ ایک لاش پڑی ہے۔"

"کدھر؟" کوئی چلایا۔

"وہ رہی۔"

اس نے ایک طرف اشارہ کیا، تو کئی لوگ اس طرف لپکے۔ یہ وہ لوگ تھے، جن کے رشتے دار لاپتا ہو گئے۔ انھوں نے سوچا کہ شاید یہ ان کا اپنا ہو۔

نعیم اور عمیر بھی ایک موہوم سی امید کے سہارے اس طرف گئے۔ نعیم جوں ہی قریب پہنچا، وہ چلا اٹھا۔

"یہ...... یہ تو میری بیوی ہے۔"

وہ بھاگ کر اس کے قریب گیا۔ نبض دیکھی، تو وہ چل رہی تھی۔ وہ رنج اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بولا۔

"یہ...... یہ تو زندہ ہے۔"

نعیم ایک ڈسپنسر تھا۔ اس نے ابتدائی طبی امداد کے طریقہ کار کے مطابق اس کے پیٹ کو دبا کر اس کے جسم میں سے سارا پانی نکال دیا، جو نہر میں کودنے سے اس کے جسم میں داخل ہو گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ ہوش میں آئی، تو نعیم نے پوچھا۔

"سکینہ! میری بہنیں اور بیٹا کہاں ہے؟"

یہ سنتے ہی وہ پھر سے بے ہوش ہو گئی۔ نعیم اور عمیر اسے اٹھا کر قافلے میں لائے اور ایک بیل گاڑی میں اسے لٹا دیا۔ پھر وہ آس پاس اپنی بہنوں کو تلاش کرنے لگے۔ جلد ہی انھیں ان تینوں کی لاشیں مل گئیں۔ اپنے آشیانے کو یوں تباہ و برباد دیکھ کر ان کی چیخیں نکل گئیں۔ قافلے میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا، جس کی آنکھ نم نہ ہوئی ہو۔

آخر کار ان تینوں کو وہیں گڑھا کھود کر دفنا دیا گیا۔

اگلے روز سکینہ کی طبیعت کافی سنبھل چکی تھی۔ نعیم نے اس سے اپنی بہنوں کے بارے میں کچھ نہ پوچھا، کیوں کہ وہ ان کے بارے میں تو جان چکا تھا کہ وہ ظالموں کے ہاتھوں شہادت کا رتبہ پا چکی تھیں۔ اس نے ہمت کر کے اس سے پوچھا۔

"سکینہ! ہمارا بیٹا کہاں ہے؟"

یہ سنتے ہی ایک بار پھر وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ تیسرے دن وہ تمام کہانی سنانے کے قابل ہوئی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟

"جب میں نہر میں کودی، تو دو غوطوں تک تو بیٹا ساتھ تھا...... پھر...... پھر کیا ہوا؟...... میں نہیں جانتی۔"

......☆☆☆......

اچانک وہ چونک پڑی اور اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اسے کوئی پکار رہا تھا۔

"دادی اماں...... دادی اماں! آ کر کھانا کھا لیں...... کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

اس نے دیکھا کہ اس کی پوتی اسے پکار رہی تھی۔ وہ اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

آگے کی کہانی بس اتنی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح گرتے پڑتے پاکستان پہنچ گئے۔ جہاں نعیم کو ملازمت مل گئی، جب کہ عمیر پڑھنے لگا۔ سکینہ کو اللہ تعالیٰ نے چار بیٹوں اور تین بیٹیوں سے نوازا۔ وہ سبھی اپنے اپنے گھروں میں خوش حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اب جب بھی اگست کا مہینہ آتا ہے، سکینہ اداس ہو جاتی ہے۔ اس کی اداسی کی وجہ پاکستان کے موجودہ حالات ہیں۔ اس کے خیال میں......

کالا باغ

عارف شیخ

عارف شیخ معاشرے کے بڑے بڑے مسائل پر بڑے ہلکے پھلکے انداز میں تبصرہ کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں آپ بڑے عرصے بعد نئے افق میں ایک علامتی کہانی کے لے حاضر ہوئے ہیں۔

میرا نام صفدر ہے عمر کوئی چھبیس برس کے قریب ہوگی میرا تعلق ایک دور افتادہ علاقے سے تھا، جہاں میں نے آٹھ جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی چھوٹی موٹی مزدوری کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں کسی بڑے شہر میں جا کر اپنی قسمت آزمائی کروں گا لہٰذا اپنے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے میں آج شہر جانے کے لیے صبح سویرے ہی نکل پڑا تھا، سامان کی شکل میں میرے پاس صرف دو جوڑے کپڑوں کے تھے اس کے علاوہ چند سو روپے جو میں نے سال بھر کی بچت کر کے حاصل کیے تھے۔

میرے گاؤں سے کوئی بس شہر تک نہیں جاتی تھی اور پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے ریل گاڑی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا شہر سے متعلق بھی صرف اتنی ہی معلومات تھی کہ وہاں آسانی سے کام مل جاتا ہے اور کمائی بھی خوب ہو جاتی ہے۔ شہر کی معلومات کا ذریعہ بھی وہ چند افراد تھے جو مجھ سے پہلے شہر جا کر کام کر رہے تھے۔

خیر مجھے گاؤں سے باہر ایک چھوٹا سا پہاڑی جنگل پار کرنا تھا اس جنگل کے پار ایک چھوٹا شہر تھا جو شہر جانے والی سڑک کے کنارے پر تھا وہیں سے مجھے شہر جانے کی بس پکڑنا تھی۔

میرا گاؤں اب کافی پیچھے رہ گیا تھا میں پہاڑ کی چڑھائی چڑھتے ہوئے سوچا کہ شام تک میں سڑک تک پہنچ جاؤں گا اور معلومات کے مطابق آخری بس شام ہی کو نکلتی ہے میں یہ بھی جانتا تھا کہ اگر میں نے دیر کر دی تو بس کو نہ پا سکوں گا جس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑے گا کہ مجھے اگلی بس کے لیے صبح تک انتظار کرنا پڑے گا اور میرے رات بسر کرنے کا کوئی بندوبست نہیں تھا لہٰذا میں اپنی رفتار کو تیز رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔

میں دوپہر کی گہری دھوپ کے باوجود گھنے درختوں کے درمیان کم روشنی میں اپنے سفر کو جاری رکھے ہوئے تھا میں پہاڑ کی بلندی پر پہنچ چکا تھا اور اب مجھے ڈھلان کی طرف سفر کرنا تھا جو کہ نسبتاً آسان تھا لہٰذا میں نے تھکن کا احساس کرتے ہوئے چند لمحے آرام کر کے بکھری سانسوں کو سنبھالا دینا تھا اس لیے میں ایک درخت سے کمر ٹکا کر بیٹھ گیا آنکھوں کو آرام نہیں دینا چاہتا تھا اس کی وجہ دو تھیں ایک تو کہیں نیند کا غلبہ نہ آ جائے دوسرے جنگل میں کسی جانور کا خوف بھی ہوتا ہے لہٰذا میں آنکھیں کھولے اپنے چاروں اطراف کا جائزہ

لے رہا تھا۔

اچانک مجھے اپنے سے چند گز کے فاصلے پر ایک اونچے سے درخت پر بندر نظر آیا میں نے دیکھا کہ وہ میری طرف سے بے پروا کسی اور طرف دیکھ رہا ہے جب میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا تو دیکھا کہ وہ ایک دوسرے بندر کو دیکھ رہا ہے جو اس کے نزدیک ایک اور درخت پر موجود ہے، تھوڑی دیر میں مجھے معلوم ہو گیا کہ یہاں پر چار بندر ہیں اور چاروں الگ الگ درختوں پر چڑھے بیٹھے ہیں۔

مجھے اس بات پر سخت حیرانی تھی کہ یہ چاروں الگ الگ درختوں پر تنہا کیوں ہیں جبکہ میرے علم کے مطابق بندر تو برادری کی شکل میں ایک ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں ایک اور چیز مجھے حیران کر رہی تھی کہ وہ چاروں ایک دوسرے سے ناراض دکھائی دے رہے تھے۔

دفعتاً میں نے دیکھا کہ ایک بڑے سائز کا بندر درخت سے نیچے اترنے لگا باقی تینوں اسے بغور دیکھ رہے تھے وہ بڑا بندر زمین پر آ گیا اب وہ اپنے ساتھی بندروں کو نہیں بلکہ زمین پر پڑی ایک پوٹلی نما تھیلی کو دیکھ رہا تھا یہ تھیلی کپڑے کی دکھائی دے رہی تھی اور اس پر میری نگاہ پہلی بار پڑی تھی۔

میں نے دیکھا کہ دوسرے تینوں بندر بھی اب نیچے کی طرف آ رہے تھے لیکن ان کی رفتار بہت سست تھی جیسے وہ حالات کا جائزہ لے رہے ہوں بڑا والا بندر بھی کسی بڑے معرکہ کے لیے تیار دکھائی دے رہا تھا۔

میں دلچسپی سے یہ سب دیکھ رہا تھا ایک بات تو میں بخوبی سمجھ گیا تھا کہ یہ چاروں ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور وجہ شاید یہ پوٹلی ہے اور اچانک جیسے جنگ ہی چھڑ گئی ہو۔

بڑے بندر نے پوٹلی پر جھپٹا مارا اس کے ساتھ ہی دوسرے تینوں بندر اس پر ٹوٹ پڑے۔

خوں خوں کی غراہٹوں کے ساتھ جنگل میں دور تک آواز سنائی دے رہی تھی چند منٹوں کی لڑائی کے بعد چاروں اس پوٹلی کے اطراف میں بیٹھے تھے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ اس تھیلی کے نزدیک جاتا۔ میری دلچسپی حد درجے بڑھ گئی تھی کہ اس پوٹلی میں کیا ہے جس کے لیے یہ چاروں ایک دوسرے کو زخم دے رہے ہیں۔

میں نے اپنی برداشت ختم کرتے ہوئے خود کو اپنی ٹانگوں پر کھڑا کیا ویسے بھی میرا آرام مکمل ہو چکا تھا مجھے اپنے سفر کو ایک بار پھر سے شروع کرنا تھا مجھے کھڑے ہوتے دیکھ کر وہ چاروں پہلی بار میری طرف متوجہ ہوئے تھے اور پریشان آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ یہ کون ہے دشمن یا دوست۔ میں نے ان کی پریشانی فوراً ہی ختم کردی جب میں نزدیک موجود ایک لکڑی ہاتھ میں تھامی جنگل میں لکڑیوں کی تو کمی تھی نہیں، اس لکڑی کو میں نے ہوا میں لہرا کر بندروں کو سمجھایا کہ میں ان سے خوف زدہ نہیں ہوں، میری ترکیب کامیاب رہی جیسے ہی میں بندروں کی طرف بڑھا وہ خوفزدہ ہو کر چیختے ہوئے اپنے اپنے درختوں پر جا چڑھے۔

وہ برابر مجھے ہی دیکھ رہے تھے مجھے جب یہ اطمینان ہو گیا کہ میں محفوظ ہوں وہ بندر مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے تو میں اس پوٹلی کے نزدیک آیا میں نے اسے لکڑی سے الٹ پلٹ کر دیکھا جب کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا تو پھر اس تھیلی نما پوٹلی کو اٹھا لیا میں نے دیکھا کہ تھیلی پر کچھ لکھا ہوا ہے۔

آج میری آٹھ جماعت کی پڑھائی کام آ گئی تھی میں نے پڑھ لیا کہ تھیلی پر تحریر تھا کالا باغ میں بڑبڑایا۔

''کالا باغ''

اب میں نے تھیلی کا منہ کھولا تو اندر کھانے کی اشیا تھیں گنڈیریاں، گڑھ، روٹی میں سمجھ گیا یہ کسی دیہاتی مسافر کا کھانا ہے جو کسی وجہ سے یہاں گر گیا اور اب یہ بندر اس پر لڑ رہے ہیں۔

میرے پاس کیونکہ اپنا کھانا موجود تھا لہذا مجھے اس کھانے کی ضرورت نہیں تھی لہذا میں نے اس پوٹلی کا کھانا وہیں چھوڑنے کا فیصلہ کرتے ہوئے پوٹلی کا پورا منہ کھول کر ایک پتھر پر تمام کھانے کی اشیا طریقے سے رکھ دی اور تھیلی دور پھینک دی اس سارے عمل کے بعد میں اپنی کپڑوں اور کھانے کی تھیلی لینے لوٹ گیا تھیلا کندھے پر لے کر میں روانہ ہوا چند گز جانے کے بعد میں نے پلٹ کر دیکھا تو حیرت اور خوشی دونوں مجھے میسر آ گئی میں نے دیکھا کہ چاروں بندر بغیر لڑے دعوت اڑا رہے تھے۔

میرا سفر پھر رک گیا تھا میں ان چاروں کو دور سے دیکھ رہا تھا چاروں بندروں نے کھانے کی تمام اشیا کھانے کے بعد ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر حیران کن عمل ہوا وہ چاروں ایک ہی درخت پر جا چڑھے۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ چاروں کیوں لڑ رہے تھے کیا وجہ وہ تھیلی تھی بہرحال میں نے بھی اپنی سمجھ کو بہت نہیں تھکایا کیونکہ مجھے بس پڑنا تھی لہذا میں تیز قدموں سے ڈھلان اترنے لگا۔

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی
رنگا رنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھو لیں گی

ابو نے جھوٹ کیوں بولا	امین الدین صدر بھایانی
عید	محمد شعیب
ملاقات	میر شاہد حسین
شہر خموشاں	وقار احمد ملک
کرسٹل	فاطمہ ایم اے خان
مس ہیلمٹ	پروفیسر شیخ محمد اقبال
کوئی عید ایسی ہو	قراۃ العین سکندر

ابو آپ نے جھوٹ کیوں بولا......؟

امین صدر الدین بھایانی

صبح کا وقت تھا۔ بنک میں کم و بیش سارے ہی کاؤنٹروں پر طویل قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ میں اپنے شیشے کے کیبن میں بیٹھا بڑی مستعدی سے باہر ہال میں لگی قطاروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ بھیڑ کو بڑھتے دیکھ کر تیزی کے ساتھ کیبن سے باہر آیا اور اسٹاف کے چند ذمہ دار افراد کو فوری طور پر تین کاؤنٹر کھول کر وہاں موجود گاہکوں کو سہولیات فراہم کرنے کا حکم جاری کیا۔ جس پر فوری طور پر عملدرآمد ہونے سے پہلی پانچ قطاروں میں لگے افراد کی تعداد میں نمایاں کمی ہوئی اور کام میں بھی قابلِ ذکر حد تک تیزی نظر آنے لگی۔ دراصل اُس روز یکم تاریخ تھی۔ چونکہ ہفتے کا روز تھا لہٰذا بنک محدود اوقاتِ کار کے لیے ہی کھلا رہتا ہے۔ بنک صنعتی علاقے میں قائم ہے، اردگرد کی تمام ترفیکٹریوں کے کارکنان اپنی تنخواہ کے چیک بھنانے آرہے تھے۔

اُن سارے انتظامات سے فارغ ہو کر جیسے ہی پلٹا تو سامنے بنک کے دروازے سے بڑی عمر کے ایک صاحب اندر داخل ہوتے نظر آئے۔

"ارے متین انکل......! میرے منہ سے بے اختیار نکلے الفاظ سن کر وہ صاحب میری طرف حیران ہو کر دیکھنے لگے۔ میں آگے بڑھا اور مصافحہ کے لیے اُن کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ جواباً انہوں نے بھی اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھما تو دیا مگر اُن کی آنکھوں میں ایک گہری حیرت تھی۔ "ارے متین انکل......! یہ میں ہوں......! امتیاز احمد......! آپ کے بچپن کے دوست ابرار احمد کا بیٹا......!!!۔ میری اِس بات پر یکلخت اُن کے چہرے کے تاثرات بدلے اور ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے مجھے گلے لگا لیا۔ چند ہی لمحات کے بعد ہم دونوں میرے کیبن میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ متین انکل چائے میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھا رہے تھے......! بالکل ابو کی طرح......!!!۔

"جی انکل اب بتائیں کیسے آنا ہوا؟" جیسے ہی وہ چائے سے فارغ ہوئے میں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"ارے بھئی یہاں، اس برانچ میں ایک صاحب ہوتے ہیں، جمیل الدین خان، بس اُنہی سے کچھ کام تھا اور کام بھی کیا تھا، بس اُنہیں یہ چیک دینا تھا" انہوں نے اپنی قمیص کی جیب سے چیک نکالتے ہوئے کہا۔ "میاں، تم تو جانتے ہو کہ برسوں پہلے میں یہاں کراچی سے لاہور بسلسلہ ملازمت منتقل ہو گیا تھا۔ گذشتہ ماہ ہی اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد دوبارہ کراچی منتقل ہوا ہوں۔ فی الحال انہی صاحب کا گھر کرائے پر لیا ہے۔ انہوں نے کل فون کر کے یہیں آکر چیک دے جانے کا کہا تھا تو میں چیک دینے چلا آیا۔ معلوم نہ تھا کہ یہاں تم سے بھی ملاقات ہو جائے گی"۔

"جی انکل، آپ کی دعاؤں سے میں یہاں برانچ منیجر ہوں"

"ماشاءاللہ......! ماشاءاللہ......!!!" میری بات سن کر وہ خوشی سے بولے۔

"میں اپنی اِس جاب اور پوسٹ کا سارا کریڈٹ ابو کو دیتا ہوں" میں نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"ہاں بھئی، یہ بات تو تم نے سچ کہی۔ ہر کامیاب اولاد کی پشت پر والد کا ہاتھ ہوتا ہے"

"جی آپ نے بالکل درست فرمایا، انکل۔" میں سر ہلاتا ہوا بولا۔ "اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ شعبہ بنکاری میں حساب کتاب اور ریاضی میں مہارت کی کس قدر اہمیت ہے۔ سو آج میری یہ پوسٹ ابو کی ریاضی میں مہارت اور اُس مہارت کی مجھ تک منتقلی ہی کی مرہونِ منت ہے"

میری بات سن کر متین انکل کے چہرے پر ایک ایسا تاثر اُبھرا جسے میں کوئی معنی نہ پہنا سکا۔ وہ کچھ بولے تو نہیں مگر

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کچھ کہتے کہتے رہ گئے ہوں۔ انہیں خاموش دیکھ کر میں پھر گویا ہوا۔ "آپ تو جانتے ہی ہیں نا کہ ابو اپنے اسکول اور کالج کے زمانے میں ریاضی کے مضمون میں چیمپئن رہے ہیں۔ سو انہوں نے میٹرک تک مجھے جی جان سے ریاضی کے سبق یوں پڑھائے کہ میں بھی ابو ہی کی طرح اپنے اسکول میں ریاضی کا چیمپئن مانا جاتا تھا اور میٹرک میں تو میں نے ریاضی کے مضمون میں ٹاپ کیا تھا"

اب کی بار متین انکل کے چہرے پر ایک عجب سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ایک گہرا سانس لیا اور بولے۔ "یار اِس ابرار کے بچے سے تو نبٹنا ہی پڑے گا۔ آج اتنے سال ہو گئے۔ اپنے اُسی جھوٹ پر اڑا ہوا ہے۔ بکواس کرتا ہے......! کوئی چیمپئن ویمپئن نہیں تھا وہ ریاضی کا۔ چیمپئن تو میں تھا اور تمہارا باپ تو کھینچ تان کر تینتیس فیصدی نمبر حاصل کر کے بمشکل پاس ہوا کرتا تھا ریاضی کے پرچے میں"۔

ایک لمحے کے لیے تو میں نے سوچا کہ شاید متین انکل مذاق کر رہے ہیں۔ ابو کے لنگوٹیے یار جو ٹھہرے۔ اِسی خیال کے زیرِ اثر مسکراتے ہوئے بولا۔ "مانا آپ ابو کے بچپن کے دوست ہیں اور آپ کا حق ہے مذاق کرنا۔ مگر بھلا مجھ سے بہتر اور کون جان سکتا ہے کہ ابو ریاضی کے مضمون میں کس قدر مشاق تھے۔ جماعتِ اول سے لے کر میٹرک تک انہوں نے ہی تو مجھے ریاضی پڑھائی اور اُسی پڑھائی کے بل بوتے پر ہی تو میں نے پورے اُسکول میں ریاضی کے مضمون میں ٹاپ کیا تھا"

"ہاں تو اُس کے لیے تمھیں اپنے ابو سے زیادہ میرا شکر گزار ہونا چاہیے"۔

"وہ کیوں بھلا؟......!میں نے حیرت زدہ لہجے میں دریافت کیا۔ "بھئی وہ اِس لیے کہ تمہارا باپ تم کو پڑھانے سے قبل راتوں کو کئی کئی گھنٹوں تک میرے گھر پر آ کر تمھاری ریاضی کی درسی کتاب کی مشقیں مجھ سے حل کرنا سیکھتا اور پھر وہی مشقیں اگلے روز وہ تمھیں حل کرنا سکھاتا"

میں متین انکل کی بات سن کر حیرت میں پڑ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ سچ بول رہے ہیں یا مذاق کر رہے ہیں؟ اگر تو وہ سچ بول رہے ہیں تو ابو کو یہ سب کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟

ابھی میں اُسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ متین انکل بولے۔ "ویسے یہ بہت اچھا ہوا کہ میری تم سے ملاقات ہو گئی۔ ورنہ میں تو سوچ رہا تھا کہ نہ جانے ابرار سے کیسے ملاقات ہو گی۔ تم کالج کے سالِ اول میں ہی تھے جب میں لاہور منتقل ہو گیا۔ کچھ عرصے تک تو ہمارا رابطہ رہا پھر ہم دونوں ہی اپنی اپنی معروفیات میں کچھ یوں ڈوبتے چلے گئے کہ ایک دوسرے سے رابطہ بھی نہ رکھ سکے۔ ہاں بھئی...... ابرار کو مت بتانا کہ میری تم سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں ان شاء اللہ ایک آدھ ہفتے میں خود اچانک آ کر سرپرائز دوں گا"۔

متین انکل تو اتنا کہہ کر گھر کا پتہ لے کر چلتے بنے مگر مجھے سوچوں کے گہرے بھنور میں دھکیل گئے۔ دوپہر ایک بجے برانچ کے اوقاتِ کار کے اختتام پر میں کچھ دیگر ضروری امور پایہ تکمیل تک پہنچانے میں مصروف رہا۔ کوئی دو تین گھنٹوں بعد گھر جانے کو نکل پڑا۔ سارے راستے میرے ذہن میں بس ایک یہی سوال گردش کرتا رہا۔

"آخر ابو نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا......!"

گھر پہنچا تو حسبِ معمول ابو کو اسٹڈی میں مطالعے میں مصروف پایا۔ انہیں اور امی کو سلام کر کے اپنے کمرے میں جا کر گرم شاور لیا۔ جس سے متین انکل والی بات سے شروع ہونے والی ذہنی کوفت میں کسی قدر افاقہ محسوس ہوا۔ البتہ ابو سے بات کرنے کی اب بھی خود میں ہمت نہ پاتا تھا۔ ابو کا معمول تھا کہ وہ شام کی چائے گھر کی بالکنی میں اپنی آرام کرسی میں بیٹھ کر پیا کرتے تھے۔ جیسے ہی شام کے پانچ بجتے وہ بالکنی میں اپنی آرام کرسی پر جا بیٹھتے۔ کبھی میری بیگم یا پھر امی ان کے لیے گرما گرم بھاپ اُڑاتی ہوئی چائے کا کپ وہیں لگی ایک چھوٹی گول سی میز پر رکھ دیتیں۔ جسے وہ

بڑے ہی اطمینان و سکون سے خوب مزے لے لے کر چھوٹی چھوٹی چسکیوں کے ساتھ دیر تک پیتے ہوئے بالکنی سے نظر آتے باہر کے دلکش مناظر کا لطف اُٹھاتے ہوئے ختم کرتے۔ ہر روز تو نہیں ہاں البتہ ہر ہفتے کی شام میں بھی چائے اُن ہی کے ساتھ پیتا ہوں۔

سواب میں اور ابو بالکنی میں لگی اپنی اپنی آرام کرسیوں میں نیم دراز چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ "اُبو، آپ ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ اپنے اُسکول اور کالج کے زمانے پر آپ ریاضی کے چیمپئن ہوا کرتے تھے۔ ویسے ہی مجھے خیال آیا کہ میں نے آج تک کبھی آپ کا ریاضی میں لیا ہوا کوئی میڈل، سرٹیفکیٹ حتیٰ کہ میڈل یا سرٹیفکیٹ وصول کرتے ہوئے کوئی تصویر تک نہیں دیکھی۔"

اُبو نے اپنے ہونٹ بہت سختی کے ساتھ بھینچے۔ کچھ دیر آسمان پر دور خلاؤں میں گھورتے رہے اور پھر ایک گہری سانس لے کر دھیرے دھیرے سانس خارج کرتے ہوئے اپنے بھینچے ہوئے ہونٹ کو آزاد چھوڑ دیا۔ اُن کے ہونٹوں پر اب ایک بہت چلبلی سی مسکراہٹ تھی۔ "کہیں تمھیں وہ بدمعاش متین تو نہیں مل گیا تھا......!"

اُبو کے منہ سے یہ بات سُن کر میں تو حیران ہی رہ گیا۔ "آپ کو کیسے پتہ چلا ابو؟"۔

"میرے سواء اس راز سے ایک وہی تو واقف ہے۔ کم بخت شروع سے ہی عورتوں کی طرح پیٹ کا ہلکا ہے۔ ایک اتنی سی بات بھی اپنے پیٹ میں نہ رکھ سکا" ابو کے لہجے میں بلا کی شوخی تھی۔ "تو......کیا......وہ سچ......؟" میں نے اتنا کہہ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ "دیکھو بیٹا، اب تو ماشاء اللہ تم خود بھی ایک دس گیارہ سالہ بچے کے باپ ہو، تم سے اب کیا چھپانا۔ ہاں وہ شیطان سچ کہہ رہا تھا۔"

"تو آپ نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا......! کیا ضرورت تھی بھلا اس کی......!" میرے لہجے میں احتجاج تھا۔

"تھی ضرورت......!" ابو کا شوخ لہجہ گمبھیر ہو چکا تھا۔ "جب میں چھوٹا تھا تو ریاضی کے مضمون سے بہت ڈرتا تھا۔ اُستاد تختۂ سیاہ پر یکے بعد دیگرے مشقیں کرواتے۔ ساری جماعت اُن مشقوں کو اپنی کاپیوں پر دہراتے ہوئے انہیں سمجھ لیتی۔ مگر مجھے وہ سارے ہندسے تختۂ سیاہ پر دوڑتے کیڑے مکوڑے لگتے جنھیں دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آجاتی اور میں خوف زدہ ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔ مگر تم جانتے ہو کہ ایسا کیوں ہوتا تھا؟ ہندسوں اور ریاضی سے میرے خوف کا ذمہ دار کون تھا؟" ابو کے خاموش ہوتے ہی میرے منہ سے فقط اِتنا ہی نکلا۔

"کون......؟"۔

"میرے ابو......!"

"کیا......دادا ابو......!!"

"ہاں......تمہارے دادا ابو......!"

وہ دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولے۔ "میرے ابو ایک شاعر اور کہانی نویس تھے۔ میں نے انہیں بچپن سے ہی کہتے سنا کہ مجھے ریاضی سے نفرت ہے۔ وہ کہتے کہ جب میں چھوٹا تھا تو اُستاد ہمیں ریاضی کی مشق کرواتے تو مجھے ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آتا اور بھلا آتا بھی کیسے؟ خدا نے مجھے ریاضی کی تنگ مشقیں حل کرنے کے لیے تھوڑا ہی پیدا کیا ہے۔ میں تو شاعری کرنے اور کہانیاں لکھنے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ یہ سُن سُن کر میں نے بھی اپنے ذہن میں یہ بات طے کر لی کہ جب میرے ابو کو ریاضی کی سمجھ نہ آسکی تو آخر کو ہوں تو میں بھی اُن کا ہی بیٹا نا۔ بھلا مجھے ریاضی کیا خاک سمجھ میں آنی ہے۔ لاشعوری طور پر میرا ذہن اس بات کو مان چکا تھا کہ ریاضی کا مضمون مجھے سمجھ آ ہی نہیں سکتا۔ اسی بات نے مجھے شعوری طور پر ریاضی کی کلاس میں اُن مشقوں کی طرف دھیان دینے ہی نہ دیا جو کلاس میں اُستاد حل کروایا کرتے تھے۔ یوں میں تمام عمر ریاضی سے خوفزدہ رہا"۔

"تو پھر آپ نے مجھے اتنی اچھی ریاضی کیسے پڑھائی؟"

"اُس کی وجہ بھی میرے لئو ہی تھے"

"وہ کیسے؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "جب میں بڑا ہوا اور عملی دنیا میں قدم رکھا تو دھیرے دھیرے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ پھر جب تم پیدا ہوئے تو میں نے تہیہ کر لیا کہ میں کبھی بھی تمھارے سامنے اپنی اُس کمزوری کا ذکر نہ کروں گا کہ کہیں تم بھی میری طرح یہ بات ذہن پر نہ سوار کر لو کہ جب میرے لئو کو ریاضی سمجھ میں نہ آئی تو بھلا مجھے کیوں کر آ سکتی ہے۔ میرے بچپن کے دوستوں میں متین ریاضی کے مضمون کا چمپئین مانا جاتا تھا۔ میں نے اُس سے مدد لی۔ ہر سال میں ریاضی کی درسی کتاب ایک کی بجائے دو خریدا کرتا۔ ایک تمھارے لیے اور ایک اپنے لیے۔ پھر دفتر کے بعد متین کے گھر جا جا کر اُس کتاب کی تمام تر مشقیں اُس کے ساتھ بیٹھ کر حل کرتا۔ کچھ ہی عرصے میں میری ریاضی کے مضمون میں دلچسپی بے حد بڑھ گئی۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ کاش میں نے اسکول کے زمانے میں لئو کی باتوں کی بجائے پڑھائی اور اساتذہ پر دھیان دیا ہوتا تو یقیناً میں بھی متین کی طرح ہی ریاضی کا چمپئین کہلاتا"۔ ابو کی بھیگی آنکھوں میں اُداسی کے گہرے سائے لہرائے رہے تھے۔

"لئو، آپ عظیم ہیں......!!!" میں نے لئو کا لرزتا ہاتھ تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ "مگر میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ مجھے اعتماد میں لے کر یہ ساری بات اُس وقت سمجھا دیتے تو آپ کو جھوٹ کا سہارا نہ لینا پڑتا"۔ لئو نے ابھی کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ اچانک بالکنی میں میرا دس سالہ بیٹا علی، لئو لئو کی صدائیں لگاتا آیا اور اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دی۔ علی کو یوں لاڈ کرتے دیکھ لئو کے چہرے پر ایک بھرپور سی مسکراہٹ آ گئی۔ کچھ دیر یونہی مسکراتے رہے پھر بولے۔

"کیا بات ہے آج علی کو اپنے لئو پر بہت پیار آ رہا ہے؟" ابو کی توجہ اپنی جانب پا کر علی شرما گیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "دادا لئو۔۔۔ دادا لئو۔ وہ نا......! میرے اِسکول میں کرکٹ ٹیم بنی ہے۔ مگر مجھے کرکٹ کھیلنا نہیں آتی نا، تو مجھے انہوں نے ٹیم میں نہیں لیا۔ لئو نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے ہر اتوار کو کرکٹ کھیلنا سکھایا کریں گے۔ دادا لئو......! دادا لئو......! اور وہ ہے نا......! لئو کہہ رہے تھے کہ وہ اپنے اسکول کی کرکٹ ٹیم کے کپتان رہ چکے ہیں اور انہیں بڑی زبردست کرکٹ کھیلنا آتی ہے" اتنا کہہ کر وہ شرماتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ ابو مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

"ارے یہ کب کی بات ہے بھئی! تمہیں تو کرکٹ کا کبھی شوق نہیں رہا اور یہ تم اسکول کی ٹیم کے کپتان کب بنے؟" میں اُن سے نظریں چراتا ہوا بولا۔

"جی لئو......! اُسی وقت جب آپ اپنے اِسکول میں ریاضی کے چمپئن بنے تھے۔!"

......☆☆......

عید

محمد شعیب

صبح ہوتے ہی خاور کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ اس کا چاند سا روشن چہرہ سیاہ بالوں کی اوٹ میں کہیں چھپ کر رہ گیا۔ آج یونیورسٹی سے بھی چھٹی تھی۔ اس لئے وہ وہاں جا کر اپنے دل کا بوجھ بھی ہلکا نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے بیڈ روم میں ہی لیٹے ہوئے اس نے دوپہر کر دی۔ نائٹ سوٹ میں ہی وہ آج کا دن گزار رہا تھا۔ کوئی نیا کپڑا اس نے زیب تن نہیں کیا۔ اس کے روم میٹ ڈان اور بین صبح ہوتے ہی سیر کو نکل گئے وہ آج کا دن کسی بھی قیمت پر گنوانا نہیں چاہتے تھے۔

دو ہفتوں کے پیپرز کے بعد ایک دن چھٹی کا ملنا کسی انعام سے کم نہیں ہوتا لیکن اس کو یہ انعام اندر ہی اندر سے گھائل کر رہا تھا۔ اپنوں کی یادیں اسے ستا رہی تھیں۔ آنکھوں میں آنسو اٹک کر رہ گئے تھے۔ وہ نہ جی بھر کے رو سکتا تھا اور نہ ہی جی بھر کے آج کے دن کو انجوائے کر سکتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے بیڈ پر لیٹا بیتے سالوں کو یاد کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ ڈھیلے قدموں کے ساتھ اپنے بیڈ سے اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

''ہیلو خاور۔۔تم ابھی تک سو رہے تھے کیا؟'' دروازے پر اس کی کلاس فیلو ڈائنا تھی۔ جو جینز اور شرٹ میں ملبوس تھی۔

''ڈائنا تم یہاں؟'' وہ اسے وہاں دیکھ کر چونک گیا۔

''ہاں۔۔کیوں بھئی؟ آج کا دن اس کالی کوٹھری میں ہی گزارنے کا ارادہ تھا کیا؟'' وہ بلا اجازت اندر آ گئی۔

''کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔۔۔'' اس نے بجھے دل سے جواب دیا۔

''لیکن میں ایسا نہیں کرنے دوں گی تمہیں۔۔چلو میرے ساتھ۔۔'' وہ اس کے قریب آئی اور خاور کو اس کے بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف لے جانے کی ناکام کوشش کی

''ڈائنا۔۔۔چھوڑو پلیز۔۔۔میرا کہیں جانے کا موڈ نہیں ہے۔۔'' اس کے چہرے سے بیزاریت واضح ہو رہی تھی۔

''میں تمہاری ایک نہیں سننے والی، تم میرے ساتھ چل رہے ہو تو بس چل رہے ہو۔۔'' ڈائنا نے اس کے موڈ کی ذرا پروا نہیں کی۔ وہ اپنی بات پر قائم تھی۔

''ڈائنا، سمجھنے کی کوشش کرو، میرا دل نہیں چاہ رہا۔۔'' وہ جھلا کر بولا تھا۔

''مگر کیوں؟'' اس نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔

''کیونکہ آج۔۔۔۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رک گیا'' اچھا ٹھیک ہے۔۔۔میں چینج کر کے آتا ہوں۔'' نا جانے اسے کیا سوجھی وہ جانے کے لئے رضامند ہو گیا۔ یہ سن کر ڈائنا کے چہرے پر تبسم ابھر آئی

☆ ☆ ☆ ☆

آسٹریلیا کے معروف شہر ایڈیلیڈ کے وسط میں میں واقع ایڈیلیڈ پارک لینڈز میں وہ پچھلے ایک گھنٹے سے گھوم رہے تھے۔ خاور کا موڈ بھی کافی حد تک بحال ہو چکا تھا لیکن ایک تاسف تھا جو دل کی دنیا سے اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا لیکن دل کی دنیا ابھی بھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''تم اتنے پریشان کیوں ہو، مجھے بتاؤ ناں پلیز۔'' پلے گراونڈ میں کھیلتے بچوں کو دیکھتے ہوئے اس نے خاور کا ہاتھ پکڑ کر وجہ دریافت کی۔ اس بار وہ سچ نہ چھپا سکا

''کیا بتاؤں ڈائنا؟ تم جانتی ہو آج میرے دیس میں عید کا دن ہے، خوشیوں کا تہوار ہے۔ ملن کا جشن ہے لیکن میں بالکل اکیلا ہوں بالکل اکیلا۔ میرے اپنوں میں سے کوئی بھی آج کے دن میرے ساتھ نہیں ہے۔ سب مجھ سے دور ہیں۔ تم جانتی ہو ڈائنا! انسان عام دن تو اپنوں کے بغیر کاٹ سکتا ہے مگر کوئی تہوار نہیں۔ جب بھی کوئی خوشی کا موقع آتا ہے تو انسان اپنے قرب و جوار میں نظر دوڑاتا ہے اگر اسے کوئی اپنا مل جائے تو اس کی خوشی دوگنی ہو جاتی ہے لیکن اگر اسے کوئی بھی چہرہ شناسا نہ ملے تو وہ خوشی ماتم میں بدل جاتی ہے۔ خوشی کا مزہ ہی اپنوں کے ساتھ آتا ہے'' وہ ایک پل کے لئے خاموش ہوا۔ ڈائنا اس کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ سکتی تھی

''تم اکیلے کب ہو خاور؟ ہم ہیں ناں تمہارے ساتھ۔ تم اپنی خوشی ہمارے ساتھ بانٹ سکتے ہو۔'' ڈائنا نے اس کا غم بانٹنے کی کوشش کی تھی

"نہیں بانٹ سکتا ڈائنا، یہ عام خوشی نہیں ہے اور نہ ہی اس خوشی کا تعلق ظاہر کے ساتھ ہے بلکہ یہ تو اندر کے ایک احساس کا نام ہے، اور وہ احساس میں تمہارے یا ڈان یا بین کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتا۔ تم میرے دوست ضرور ہو مگر ہمارے درمیان ایک اوٹ ہے۔ جس کے باعث تمہارا اس موقع پر ساتھ ہونا یا نہ ہونا بے معنی ہے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ بچے ہنستے ہوئے اس کے گرد چکر لگانے لگے

"تم جانتی ہو ڈائنا، آج وہاں سب خوش ہونگے، خوشیاں بانٹ رہے ہونگے، مزے مزے کے کھانے کھا رہے ہونگے۔ کہیں کھیر بن رہی ہوگی تو کہیں زردہ، کہیں شیر خورمہ تناول ہو رہا ہوگا تو کہیں سیویاں پک رہی ہونگی لیکن میں۔۔ میں یہاں سب سے دور۔۔ صرف تنہائی بانٹ رہا ہوں۔" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا تھا۔

"خاور۔۔۔ ایک تو تم دوست کہتے ہو ہمیں اور پھر اگلے ہی پل پرایا بھی کر دیتے ہو۔ یہ تو اچھی بات نہیں ہے ناں۔۔" وہ اس کے موڈ کو بحال کرنے کی اپنے تئیں پوری کوشش کر رہی تھی

"دوستوں میں اور اپنوں میں فرق ہوتا ہے ڈائنا، شائد تم نہ سمجھ سکو۔" ایک پل کے لئے اس نے توقف کیا۔

"تم جانتی ہو ڈائنا! میں پہلی بار ہی گھر سے باہر نہیں ہوں عید پر۔ ایک بار جب میں لاہور ایف۔ ایس۔ سی کرنے آیا ہوا تھا، تب بھی مجھے عید دوسرے شہر میں کرنی پڑی تھی لیکن اس وقت مجھے اتنی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ جتنی آج ہو رہی ہے۔ اُس وقت مجھے ایک پل کے لئے بھی ایسا نہیں لگا جیسے میں اپنے گھر میں نہیں ہوں۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ عید مبارک، عید مبارک کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ مگر آج میرے کان ترس گئے ہیں یہ الفاظ سننے کو۔ اس پرائے دیس میں کوئی بھی مجھے اپنا نہیں لگتا۔" بچے چکر لگاتے ہوئے اس سے دور چلے گئے اور وہ ایک بار پھر انہیں دیکھتا رہ گیا جبکہ ڈائنا اس کی باتوں کو پورے انہماک سے سن رہی تھی۔

"مجھے آج محسوس ہوا کہ اپنے دیس کی اہمیت کیا ہوتی ہے، اپنے دیس کی مٹی پرائے دیس کے سونے کے محلات سے بہتر ہوتی ہے۔ آج ویسے تو میرے ہر طرف رنگینیاں ہی رنگینیاں ہیں مگر دل میں صرف تاریکی نے ڈیرہ جمایا ہوا ہے۔" اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا

"کاش میری زندگی میں ہزاروں عام دن پرائے دیس میں لکھے ہوتے مگر آج عید کا دن نہ لکھا ہوتا۔۔۔ کاش آج عید کا دن میں اپنے دیس میں اپنوں کے درمیان گزارتا۔۔ کاش۔۔" امید بھرے لہجے میں اُس نے آسمان کی طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا تھا لیکن شاید اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

"تم اتنا مِس کر رہے ہو اپنوں کو تو ایک بار فون ہی کر لو۔۔" ڈائنا نے جیسے اپنی طرف سے مسئلے کا حل نکالا تھا۔

"میں بھی پہلے یہی سوچ رہا تھا لیکن ڈائنا میں ایسا نہیں کر سکتا۔۔" معنی خیز ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر ابھری تھی۔

"مگر کیوں؟" سوالیہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیونکہ میں اپنا غم بیان کر کے ان کی خوشیوں کا رنگ پھیکا نہیں کرنا چاہتا۔ بات کرنے سے شاید مجھے تو تسلی مل جائے مگر میری باتیں ان کو ایک غم میں مبتلا کر سکتی ہیں۔ جب انہیں پتا چلے گا کہ ان کا بیٹا پرائے دیس میں کتنا اداس ہے تو وہ سب دکھی ہو جائیں گے۔ ان کی ساری خوشیاں بکھر جائیں گی۔ بس اس لئے میں انہیں فون نہیں کر رہا۔" فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"تم کس مٹی کے بنے ہو خاور، ایک طرف تو تمہیں اپنوں کی یاد ستا رہی ہے اور دوسری طرف تم ان سے بات کر کے اپنے دل کا بوجھ بھی نہیں ہلکا کر رہے؟" اس نے اکتاہٹ والے لہجے میں کہا تھا

"اپنے دیس کی مٹی سے۔" ہلکے سے شریر لہجے میں اس نے جواب دیا۔

''تم جانتی ہو ڈائنا یہ ہمارے دیس کے رہنے والوں کی خصلت ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو چاہے کتنا ہی برا بھلا کہہ لیں مگر ایک دوسرے کی چھوٹی سے چھوٹی خوشی کا بھی خیال کرتے ہیں اور اگر کوئی اُس کے کسی اپنے کو تکلیف پہنچائے تو مرنے مارنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ خود تو زخم برداشت کر سکتے ہیں مگر برساتے ہمیشہ پھول ہیں۔ ایسے ہیں میری وطن کے لوگ۔'' اپنے دیس کا تذکرہ کر کے اس کے بے چین دل کو تھوڑا سا سکون ملا تھا۔ سورج بھی ڈھلنے کو تیار تھا۔ سرخی نے آسمان پر میک اپ کر دیا تھا۔ خوراک کی تلاش میں نکلے پرندے اب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ہر طرف ہجوم تھا۔ ایک شور تھا مگر وہ اس شور سے بے خبر اپنے دیس کی خوشبو کو یادوں میں محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اچھا اب ہمیں چلنا چاہئے۔۔ سورج بھی ڈھل رہا ہے اور ویسے بھی ڈان اور بین بھی آ گئے ہوں گے۔'' ڈائنا نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

......☆☆......

ملاقات

میر شاہد حسین

وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھی لیکن میرے پاس اس سے ملنے کا بالکل بھی وقت نہیں تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس سے ملنے کا کیا مطلب ہوگا؟ وہ مجھے حقیقت کی دنیا میں لے جانا چاہتی تھی اور مجھے اپنا خواب بہت عزیز تھا۔ ایسا خواب جس کے لیے میں نے اپنا تن من دھن سب کچھ لگا رکھا تھا۔

''عبداللہ اٹھو تم سے ملنے کے لیے کوئی باہر آیا ہے۔'' ایک آواز نے مجھے بیدار کر دیا۔

''کیا ہے؟ ٹھیک سے سونے بھی نہیں دیتے، ابھی تو خواب شروع ہی ہوا تھا کہ درمیان میں ہی توڑ دیا۔'' میں نے جھنجلا کر پہلے کروٹ بدلی اور پھر سونے کی کوشش کی لیکن خواب تو ٹوٹ چکا تھا اور ٹوٹے خواب کب دوبارہ جڑتے ہیں۔

''کون ہے باہر؟'' میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''خود ہی دیکھ لو، میں ابھی کچن میں مصروف ہوں۔ دروازے پر کسی نے دستک دی ہے۔'' کچن سے بیگم کی آواز آئی۔

''اچھا!'' بڑبڑاتے ہوئے میں نے جلدی سے منہ ہاتھ دھوئے اور جلدی سے دروازے کی طرف گیا۔ دروازہ کھولا تو باہر کوئی بھی نہیں تھا۔

''باہر تو کوئی بھی نہیں ہے۔'' میں نے جھنجلا کر آواز لگائی۔

''اچھا، لیکن دروازے پر دستک تو ہوئی تھی۔ خیر آؤ جلدی سے ناشتہ کر لو۔ آفس سے تمہیں آج بھی کہیں دیر نہ ہو جائے۔''

''بچے کہاں ہیں؟'' میں نے ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

''وہ تو کب کے اسکول چلے گئے، کب سے آپ کو جگانے کی کوشش کر رہی ہوں پتا نہیں کون سا خواب ہے جو تم روز دیکھنے کی کوشش کرتے ہو اور وہ مکمل بھی نہیں ہوتا۔'' بیگم نے مسکراتے ہوئے ناشتہ لا کر میرے سامنے رکھ دیا۔

''جو خواب ٹوٹ جائے اب اس کا کیا ذکر کرنا؟'' میں نے بے اعتنائی سے کہا اور ناشتہ کرنے لگا۔

''خواب تو ہوتے ہی ٹوٹنے کے لیے ہیں۔ تم بس یہ رات رات بھر کتابیں مت پڑھا کرو۔ یہ سب افسانے ہیں حقیقت نہیں۔'' بیگم بدستور مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تم میری بیگم ہو، اماں نہیں...... ہر وقت ایسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہو جیسے میں کوئی کاکا منا ہوں۔ سب پتا ہے مجھے کیا خواب ہے اور کیا حقیقت؟'' میں نے ہاتھ یوں ہوا میں لہرائے جیسے بے پر کی اڑائی ہو۔

''اچھا سنو...... اپنا خیال رکھا کرو۔'' بیگم کا محبت بھرا لہجہ جیسے کانوں میں شہد کی طرح رس گھول گیا۔

''کیوں کیا ہوا ہے مجھے۔'' میں نے بھی جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے کہا تا کہ محبت کی شرینی سے مزید اپنے کانوں میں رس گھول سکوں۔

''تم رات میں بہت بڑبڑ کرتے ہو۔'' بیگم نے اچانک ایسی بات کہی کہ میں تلملا اٹھا۔

''کیا؟؟...... میں بڑبڑ کرتا ہوں...... اور تم کیا کرتی ہو؟'' میں اب جذباتی موڈ میں تھا۔

''اچھا چھوڑو...... کام سے دیر ہو رہی ہے۔ جانے کی تیاری کرو۔'' بیگم کا ہمیشہ کا یہی انداز مجھے اچھا بھی لگتا تھا اور کبھی کبھار برا بھی کہ وہ ہر بات کے اختتام پر یہی کہہ کر بات ختم کر دیتی تھی کہ 'اچھا چھوڑو'۔

''تم کہتی ہو تو چھوڑ دیا ورنہ میرے پاس تمہارے بھی بہت سارے پول ہیں۔ بس کبھی کھول دیے تو لگ پتا جائے گا۔'' میں نے مصنوعی غصہ سے کہا اور پھر مسکراتے ہوئے کپڑے بدلے اور اپنے کام پر روانہ ہو گیا۔

☆......☆

زندگی ہنسی خوشی گزر رہی تھی اور شاید یونہی گزر جاتی اگر یہ حادثہ میری زندگی میں رونما نہ ہوتا۔ اس حادثہ نے میری زندگی کو یا بدل کر رکھ دی۔ وہ میری زندگی تھی اور میرا خواب بھی...... جس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ زندگی بھر میرا ساتھ نبھائے گی لیکن ایک پل میں وہ میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ میرے سامنے سو رہی تھی اور میں اسے جگانے کی بار بار کوشش کر رہا تھا۔

''مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔'' میں چلا رہا تھا اور سب مجھے دلاسہ دے رہے تھے کہ یہی حقیقت ہے لیکن میں حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھا۔ مجھے اپنا خواب اچھا لگتا تھا لیکن اس نے مجھے سو کر جگا دیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''اچھا چھوڑو...... اٹھو اپنے بچوں کو دیکھو۔ وہ میری نشانیاں ہیں ان کا خیال رکھنا...... اور سنو اپنا بھی خیال رکھنا تم رات کو بہت بڑبڑ کرتے ہو۔''

وہ تو چلی گئی لیکن جاتے ہوئے مجھے جگا گئی...... اب میں خواب سے بیدار ہو چکا تھا اور اس سے ملنا چاہتا تھا جو میری بیوی کی قاتل تھی۔ ہر وقت میرے قریب قریب رہتی تھی لیکن مجھ سے مل نہیں پائی تھی۔ شاید وہ بہت شرمیلی تھی...... یا شاید اسے میری محبت کا خیال تھا۔ لیکن اب میں اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اس سے وہ سب کچھ کہنا چاہتا تھا جو وہ سن نہیں سکتی تھی۔

''کہاں ہو تم؟...... مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔'' میں بڑبڑا کر کہتا۔

''مجھے تم سے ابھی نہیں ملنا۔'' آواز آتی۔

''تم قاتل ہو، تم میری محبت کی دشمن ہو۔ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔'' میں غصے سے بڑبڑاتا۔

''مجھے تم سے محبت ہے اور میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔'' پھر آواز آتی۔

''جھوٹ کہتی ہو تم...... تم نے مجھ سے ملنے کا جو راستہ اختیار کیا ہے، یہ درست نہیں۔'' میں غصہ میں تھا۔

''میں تمہیں خواب سے بیدار کرنا چاہتی ہوں۔ سنو...... سنو......'' وہ محبت بھرے لہجے میں پکارتی۔

''تم جھوٹی ہو، دھوکے باز ہو......!!'' میں چلایا۔

''ابو......انھیں کیا ہو گیا ہے آپ کو؟'' میری بچی میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ میں پسینہ سے شرابور تھا۔ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کاش یہ سب خواب ہوتا اور میری بیوی مجھ سے کبھی جدا نہ ہوتی۔ میں نے اپنی بچی کو گلے سے لگا لیا۔

''کوئی بات نہیں بیٹا......بس برا خواب دیکھ لیا تھا۔''

وقت گزرتا ہی چلا تھا اور میرا خواب کبھی حقیقت نہ بن سکا۔ پتا نہیں کیا یہ برا خواب کب میرا پیچھا چھوڑے گا۔ خواب ہے اور کیا حقیقت ہے؟ وہ اب تو میرے پیچھے پڑی تھی۔ نہ وہ مجھ سے ملتی تھی اور نہ میرا پیچھا چھوڑتی تھی۔ میں اس سے خواب میں رات رات بھر باتیں کرتا۔ صبح ہوتی تو وہ میرے سرہانے سے اٹھ کر چلی جاتی اور جاتے ہوئے کہتی میں پھر آؤں گی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ باوجود نفرت کے اب میں بھی اس سے محبت کرنے لگا تھا۔

''تم اتنی خوبصورت تو نہیں کہ میں تم سے محبت کروں۔'' میں دل ہی دل میں اکثر کہتا۔

''تم نے مجھے دیکھا ہی کب ہے......اور ہاں محبت کے لیے خوبصورت ہونا ضروری تو نہیں ہوتا۔ دیکھو میں تمہارے دل میں بستی ہوں۔'' وہ بڑے ناز سے کہتی۔

''اگر اتنی ہی محبت ہے تو حقیقت میں آ کر مل کیوں نہیں لیتیں۔'' میں سوال کرتا۔

''تمہارے بچے ابھی چھوٹے ہیں......مجھ سے ملنا ہے تو تمہیں اس سے پہلے ان کو چھوڑنا ہوگا۔'' وہ کہتی۔

''تمہیں اپنے اوپر اتنا غرور کیوں ہے؟'' میں غصہ سے کہتا۔

''میں جانتی ہوں کوئی مجھ سے خوشی سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن مجھ سے جو بھی ملتا ہے پھر وہ میرا دیوانہ ہو جاتا ہے۔''

''تم خواب ہو اور کچھ بھی نہیں۔'' میں کہتا۔

''نہیں میں اصل حقیقت ہوں اور تم خواب دیکھ رہے ہو۔ مجھ سے ملنے کے بعد تمہارا یہ خواب چکنا چور ہو جائے گا اور پھر تم کبھی بھی اس خواب میں واپس نہیں جا پاؤ گے۔''

''اور اگر میں تم سے نہ ملوں تو......'' میں کہتا۔

''تمہیں اک دن مجھ سے ملنا ہی ہوگا کیونکہ مجھے پیدا ہی تمہارے لیے کیا گیا ہے۔'' اس کا یہ جملہ ہر وقت میرے کانوں میں گونجتا رہتا۔

وقت کی تیز ہوا میں پتا ہی نہیں چلا کہ کب بچے جوان ہوئے اور اپنے اپنے گھروں کے بھی ہو گئے۔ میں اب خود کو اکیلا اکیلا محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے اب اس کی ضرورت تھی۔

''کہاں ہو......کب ملو گی......تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم مجھ سے ملو گی۔ دیکھو اب مجھے مزید نہ تڑپاؤ۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔''

''لیکن میں بوڑھی نہیں ہوئی کیونکہ میں حقیقت ہوں اور تم خواب دیکھ رہے ہو۔ میں تم سے اچانک مل کر تمہیں سرپرائز دینا چاہتی ہوں۔ اور ہاں......میں تمہیں تمہاری بیوی سے بھی ملواؤں گی۔ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوگی۔ مجھے لگتا ہے کہ تم اب خواب سے بیدار ہونے کے لیے بالکل تیار ہو۔''

''ہاں تیار ہوں......آ جاؤ اور میرے گلے لگ جاؤ۔'' میں نے یہ الفاظ کچھ اس انداز میں کہے کہ میں دل پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

''بس اب اور زیادہ نہیں......آؤ......تھوڑا سا جھٹکا لگے گا۔ پھر میں ہوں گی اور تم ہو گے۔'' وہ شاید میرے دل میں تھی یا میری روح میں لیکن موت نے مجھے گلے سے لگا لیا اور مجھے خواب سے نکال کر حقیقت میں پہنچا دیا جہاں مجھے

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا تھا۔باہر دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔

☆......☆

شہر خموشاں

وقار احمد ملک

ابھی رات نہیں ہوئی لیکن شب کا گماں ہونے لگا ہے۔صدیوں پرانا شہر دریا کے شرقی کنارے پر اپنی تاریخ و تمدن کی داستانیں اپنے سینے میں سموئے وقت کے گھومتے پہیے کو دلچسپی سے دیکھ رہا ہے۔شہر اور دریا کے بیچ دریا کا میلوں چوڑا دلدلی پاٹ انسان دشمن مخلوقات سے لبریز ہونے کے ناتے شہر اور دریا کے میٹھے پانیوں میں ایک ناقابلِ گزر رکاوٹ کے روپ میں حائل ہے۔اس کچے کے علاقے میں گوندر اور کانوں کے علاوہ بے شمار فصلیں، درخت اور پودے مختلف موسموں میں مختلف رنگ بکھیرتے رہتے ہیں۔اس علاقے کی زرخیزی شہر کے ان لوگوں کے لیے کشش کا باعث ہے جو بے گھر بھی ہیں اور دلیر اور محنت کش بھی۔یہی وجہ ہے کہ اب اِدھر اُدھر جا بجا آپ کو کوٹھے کچیرے نظر آجاتے ہیں۔

شہر کی طرف رُخ کریں تو کچے کے علاقے اور شہر کے بیچ ایک قدیم قبرستان موجود ہے۔یہ پرانا قبرستان بوسیدہ اور پرانی قبروں کو سنبھالے ان کے بے جان مکینوں کی مزید شکست و ریخت کیے جا رہا ہے۔قبروں کی دیکھ بھال کوئی کتنی کرے گا، یہی دس سال یا بیس سال۔پھر اس کی نشانیاں سنبھالنے والے خود قبروں میں اپنی پہچان کھو رہے ہوں گے۔یہی وجہ ہے کہ جب آندھیاں اور طوفان آتے ہیں تو کئی نامور ہستیوں کی ناتواں ہڈیاں ٹوٹی ہوئی قبروں کے بیچوں بیچ خزاں رسیدہ پتوں کی مانند بکھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔یہ اس شہر خموشاں کی وسعت ہے یا پھر زندوں کا مُردوں سے عدم التفات کہ یہ انسانی ہڈیاں بغیر کسی کی توجہ حاصل کیے آہستہ آہستہ زمانے کی خاموش چکی میں پس کر معدوم ہو جاتی ہیں۔

قبرستان کی حدوں سے نکلیں تو سفید لباس میں لپٹی وسیع و عریض عیدگاہ کے پار شہر کا آغاز ہو جاتا ہے۔ایک بڑی سڑک جو شاید کبھی گلی ہوا کرتی تھی شہر کو درمیان سے کاٹتی ہوئی گزر جاتی ہے۔دائیں بائیں چھوٹی بڑی گلیاں اور کوچے اس شہر کی تشکیل کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔دائیں طرف والی اسی ایک گلی میں داخل ہوں تو چند موڑ کاٹنے کے بعد ایک پرانا سا خاموش مکان افسردگی اور شکستگی کی مجسم صورت بنا دکھائی دیتا ہے۔دروازے کے سامنے پرانی بوریوں کو آپس میں گانٹھ کر پردے کی شکل میں لٹکا دیا گیا ہے۔عام طور پر ایسے پردے اُن گھروں کے سامنے لٹکائے جاتے ہیں جہاں نوخیز الھڑ دوشیزائیں قید ہوتی ہیں۔پٹ سن کے یہ چند دھاگے اُن کے حسن اور جوانی کی حفاظت کا کام کرتے ہیں۔یہ ان گھروں کی آمدورفت اور درآمد اور برآمد کو مقدور بھر محدود کر دیتے ہیں اور بصری احساسات و جذبات کا تبادلہ ممکن نہیں رہتا۔

ایسا ہی ایک پردہ زینب نامی ایک عمر رسیدہ ریٹائرڈ استانی کے دروازے پر بھی لٹکا ہوا ہے۔یہاں اس پردے کا کیا کام ہے اس کی وضاحت مشکل ہے۔دو کمروں پر مشتمل اِس گھر میں نہ تو الھڑپن کی گنجائش باقی ہے اور نہ ہی کسی کے نین مٹکا کرنے کا خدشہ ہے۔بوڑھے جسم کی اُبھری ہوئی رگوں میں رُک رُک کر چلتے ہوئے خون میں احساسات و جذبات کی حدت کب کی خاموش ہو چکی معلوم ہوتی ہے۔آنکھوں کی جگہ دو چھوٹے چھوٹے سیاہ رنگ کے تسبیح کے منکے

کبھی کبھی ہلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان آنکھ نما خانوں پہ ہلکے سفید بالوں سے سجا پلکوں کا شیڈ چہرے کی اُداسی کو اور بڑھا دیتا ہے۔ آنکھوں پر کبھی کبھار گول شیشوں والی چھوٹی سی عینک زینب کی عمر میں مزید اضافہ کر دیتی ہے۔ سونے کی تھلی پر پیتل کا گمان ہوتا ہے جس کی رنگت زمانے کی شکست و ریخت کی وجہ سے سیاہی مائل زرد ہو چکی ہے۔

بازار کی طرف جاتی ہوئی بڑی گلی کے بائیں جانب ایک چھوٹے سے بند کوچے میں موجود اِس خاموش گھر کی چوکھٹ عبور کریں تو دائیں طرف ایک ٹھگنے شہتوت کے درخت کے نیچے زنگ آلود نلکا آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔ نلکے کے پیچھے دو چھوٹے چھوٹے کمرے شاید غسل خانے یا اسٹور روم کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ نلکے کے پختہ احاطے کے علاوہ باقی سارا صحن کچی اینٹیں باندھ کر بنایا گیا ہے۔ صحن کے بائیں کونے میں ایک بیری کا چھتنا ور درخت صحن کو قدرے تاریک کیے ہوئے ہے۔ پست قامت محرابوں والے برآمدے کے پیچھے دو بڑے بڑے کمرے شکستہ مزاروں کی سی پراسرار، خاموش اور قدرے تقدیس کی حامل فضا پیدا کیے ہوئے ہیں۔

اپریل کا وسط چل رہا ہے۔ ہوا میں خنکی کئی دنوں سے غائب ہو چکی ہے۔ برقی پنکھوں نے بھی چلنا شروع کر دیا ہے۔ صحن میں موجود چند درختوں کے گھنے سبز رنگ نے بوگن بیلیا کی انتہائی سرخ رنگ کے حامل پھولوں والی بیل کے ساتھ رنگوں کے ایک حسین تال میل کو جنم دیا ہے۔ برآمدے کی دیوار کے ساتھ ایک پرانی لیکن انتہائی مضبوط چارپائی پر زینب کافی دیر سے لیٹی ہوئی ہے۔ اُس کو بیوگی کا داغ لگے دو دہائیاں ہو چکی ہیں۔ شاید اتنے ہی سال اس کو اسکول سے ریٹائر ہوئے ہو چکے ہیں۔ محلے والے زینب کو استانی زینب کے نام سے پکارتے ہیں۔ زینب نے مسلم بازار میں موجود لڑکیوں کے مڈل اسکول میں 34 سال پڑھایا ہے۔ اسکول سے فارغ ہوئے اُسے کوئی بیس سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے لیکن آج بھی بدلتے موسم اُس کو کبھی کبھی اسکول کے کمروں، بچوں اور اسٹاف یاد دلا دیتے ہیں۔ آخری چھ سال وہ کلاس انچارج بھی رہیں۔ کچی سے پانچویں تک زینب نے اپنے تین دہائیوں کے تجربے کو انڈیل دیا تھا۔ اسکول میں پانچویں تک لڑکے بھی پڑھا کرتے تھے۔ لڑکوں کا ٹاٹ آگے آگے ٹیچر کی کرسی کے ساتھ ہی ہوا کرتا تھا۔ زینب کو آج بھی اُس ٹاٹ پہ بیٹھے بچے یاد ہیں جو چھ سال اُس کے زیرِ سایہ پڑھتے رہے۔ ان بچوں کے نام بابر، ضیا، اکرام، سرفراز، افضل، عبدالرحمان اور وقار ہیں۔ لڑکوں کی قطار کے پیچھے طالبات کی قطاریں شور مچا رہی ہیں۔

ادھر کلاس نے پانچویں پاس کی اُدھر زینب نے ریٹائرمنٹ لے لی۔ اس کی اب ساری توجہ دو بیٹیوں کی پرورش پر تھی۔ اولادِ نرینہ کے نہ ہونے سے اس کی زندگی میں ایک غیر محسوس سا خلا رہ گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ زینب کو اپنے اسکول کے بچے خاص کر آخری کلاس کے لڑکے بہت یاد آتے۔ کچھ عرصہ تو کبھی کبھار گلی بازاروں میں یہاں وہاں کسی بچے سے ملاقات ہو جاتی یا درشن ہو جاتے تو زینب کو سکون سا نصیب ہو جاتا لیکن آہستہ آہستہ سب کچھ بدلتا گیا۔

ریٹائرمنٹ کے چند ماہ بعد زینب کا شوہر فوت ہو گیا۔ وہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ گھر میں اکیلی رہ گئی۔ پھر چند سالوں میں بیٹیوں کے ہاتھ بھی پیلے ہو گئے۔ اب تنہائی، خاموشی اور ویرانی کی حکومت تھی۔ پہلے تو وہ بھی کبھار کسی کے مرنے پر پرسہ دینے چلی بھی جاتی لیکن گزشتہ چند سالوں سے تو اُس کو ایک قسم کی چپ سی لگ گئی تھی۔ وہی زینب جو اسکول میں تقریبات اور محافل کی جان ہوا کرتی اب خاموشی اور زباں بندی کی مجسم تصویر بن گئی تھی۔ اُس کو اپنے سات بیٹے بہت یاد آیا کرتے۔ وہ بیٹے جن کی ظاہری حیثیت تو طالب علموں جیسی تھی لیکن زینب نے کبھی بھی اُن کو شاگردوں کے رُتبے تک محدود نہیں کیا تھا۔

کبھی کبھار موسموں کے تغیر و تبدل جب زینب کی طبیعت میں گدگدی کرتے تو وہ چارپائی پر لیٹے بدستور چھت کے شہتیروں کو گنتے ہوئے گنگنانے لگتی۔ بیر چننے کے لیے آئے بچے جب زینب کو خود کلامی کرتے سنتے تو حیرت کے ساتھ برآمدے کی چھت کو تکنے لگتے۔ وہ سمجھتے کہ زینب چھت میں موجود کسی ہستی کے ساتھ باتیں کر رہی ہے لیکن

چھت کی کڑیاں اور ٹنگ جو صدیوں سے خاموش تھے بدستور چپ کا روزہ رکھے گہری نیند سوئے ہوئے معلوم ہوتے۔
کچھ بڑے بچوں نے جب اُس کی خود کلامی میں دلچسپی لی تو وہ چند الفاظ سمجھنے میں کامیاب ہو گئے۔ زینب کے خشک ہونٹوں سے ببر، جیدی، کرمو، سرو، فجو، عبدو اور کارُو کے الفاظ نکلتے معلوم ہوئے۔ بچوں کو نہیں پتہ تھا کہ زینب کی یادوں میں گنگناتے ہوئے یہ نام کن لوگوں یا بچوں کے ہیں۔ اندر دائیں کمرے میں دو پرانے صندوق ایک طرف اور دوسری طرف چھ آرام کرسیاں اور ایک بڑی سی میز پڑی تھی۔ جب اُس کی طبیعت زیادہ خراب ہو جاتی تو اچانک کمرے کے اندر آ جاتی۔ اُس وقت زینب کی پھرتی دیکھنے والی ہوتی۔ یوں لگتا جیسے کسی نے اس کے بوڑھے جسم کے اندر بجلیاں بھر دی ہوں۔ وہ بستر پر بچھی صاف چادر اُٹھا کر کرسیوں کی گرد صاف کرتی اور ایک ایک کرسی کو نہایت احترام اور محبت سے چھوتے ہوئے ببر، جیدی، کرمو، فجو، سرو، فجو اور عبدو کی گردان پڑھنا شروع کر دیتی۔ کارو کے لیے کرسی نہ بچتی تو چادر کے ساتھ بڑی سی میز کو صاف کرتے ہوئے کارو، کارو پکار کی چیخنا شروع کر دیتی۔ یہ سارا منظر دیکھ کر بچے خوب محظوظ ہوا کرتے۔ یہ سارا عمل زینب کو ناتواں ہونے کی بنا پر تھکا دیا کرتا اور بعدازاں وہ کئی گھنٹوں تک چپ چاپ لیٹی رہتی۔ اب زینب اکثر بیمار رہنا شروع ہو گئی تھی۔ اس لیے ہمسائی خواتین اکثر اس کے پاس موجود رہتیں اور اس کی چھوٹی موٹی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کرتیں۔ دروازے پر دستک ہوتی تو وہ زور سے کہتی لو وہ میرے بیٹے آ گئے۔ میں نہ کہتی تھی کہ ایک روز میرے بچوں کو ضرور میری یاد آئے گی۔ جاؤ دروازہ کھولو ورنہ وہ واپس چلے جائیں گے۔ میں ذرا کرسیوں اور میز کو صاف کر دوں۔ لیکن ساتھ موجود خواتین اس کے وہم کو نظر انداز کر کے اس کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پھر لٹا دیتیں۔
زینب نے پانچ دنوں سے کچھ نہیں کھایا۔ کمزوری اور بڑھاپے کی ناتوانی اُس پر چھا چکی ہیں۔ اس کی کیفیت سونے اور جاگنے کے بیچ کی سی ہے۔ موت آتے آتے رک جاتی ہے۔ دو بیاہی بیٹیاں بھی آ چکی ہیں۔ ان کے بچے کھیل کھیل کر تھک چکے ہیں۔ موت کا انتظار طویل تر ہوا چلا جاتا ہے۔ حالتِ نزع کی بڑھتی ہوئی طوالت بیٹیوں کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔ بیٹیوں اور بچوں کی نظر جب زینب کے جسم پر پڑتی ہے تو ان پر خوف کی فضا طاری ہو جاتی ہے۔ لگتا ہے چمڑے اور ہڈیوں کے درمیان گوشت سوکھ چکا ہو۔
کومے کی سی کیفیت کو ساتواں دن ہے۔ جولائی کا وسط ہونے کے ناتے گرمی عروج پر ہے۔ زینب کو برآمدے سے اُٹھا کر دائیں کمرے میں پرانے پلنگ پر لٹا دیا گیا۔ کمرہ پرانا ہونے کی وجہ سے اور موٹے در و دیوار کے باعث قدرے ٹھنڈا ہے۔ اچانک دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ کچھ لوگ زینب سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ ایک بچی نے جب ان کا تعارف پوچھا تو وہ سن کر حیران رہ گئی ہے کہ یہ سارے دور دراز سے اُس کی ماں کو ملنے کے لیے آئے ہیں۔ ان لوگوں میں ایک وکیل، ایک ڈاکٹر، ایک تاجر، ایک صحافی، ایک بیوروکریٹ، ایک پروفیسر اور ایک رائٹر ہے۔
یہ تمام لوگ ایک پژمردہ بڑھیا کا دیدار کرنے آئے ہیں۔ سرفراز جو ساتھ والے ضلع کا ڈپٹی کمشنر ہے نے بوڑھی کا سر دبانا شروع کر دیا ہے۔ اچانک زینب کا نیم مردہ جسم ہلکی سی جھرجھری سی لیتا ہے۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی بے نور آنکھیں جھپکنا شروع کرتی ہیں۔ لیکن کچھ دیکھنے میں ناکام رہتی ہیں۔ نیلی رگوں کے گھنے جال سے پُر بڑھیا کا چھوٹا سا کمزور ہاتھ ڈپٹی کمشنر کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے۔ کئی سالوں کی خاموش زباں اور ایک ہفتے سے گنگ ہونٹ آہستہ آہستہ ہلتے ہیں۔ الفاظ باآسانی سمجھے جا سکتے ہیں
"اوئے سرو! کہاں مر گیا تھا؟ بیس سال سے اس بڈھی کا پتہ بھی نہیں کیا۔ میں نے تمہاری ننھی منی انگلیوں کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر الف انار، بے بکری تختی پر لکھنا سکھایا تھا۔ ان لفظوں نے تم کو کہاں پہنچا دیا کہ تو نے اپنی ماں کی خبر بھی نہ لی۔ یہ تیرے پیچھے کون بیٹھے ہیں؟ اوئے یہ تمہارے ناک والا فجو بھی آیا ہوا ہے اور اس کے ساتھ عبدو، کرمو، ببر، جیدی

اور موٹو کارو بھی آیا ہوا ہے۔ ہٹ ذرا مجھے کرسیاں صاف کرنے دے۔

چونکہ زینب بستر کی چادر پر خود لیٹی تھی اس لیے چادر نہ نکال سکی۔ جانے بجلی جیسی پھرتی بوڑھے جسم میں کہاں سے آ گئی تھی۔ سات مرد پلنگ کے قریب کھڑے بڑھیا کی حرکتوں کو عجیب وغریب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ بڑھیا نے اچانک سر سے چادر اتار لی اور کسی کے سنبھلنے سے پہلے ہی کرسیوں کو جھاڑنا شروع کر دیا۔ ساروں کو انتہائی محبت سے کرسیوں پر بٹھانے کے بعد وہ میز صاف کرنے لگیں اور ساتویں آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے بولیں، "کارو! تُو تو بہت موٹا ہو گیا ہے۔ شکر ہے تیرے لیے کرسی نہیں بچی، وگرنہ تُو تو بیٹھ کر اُس غریب کی لکڑیوں کو ہی توڑ ڈالتا۔ لے تُو اِس میز پہ بیٹھ جا۔ میں بھی تو کبھی کبھی میز پر بیٹھ کر تم کو سبق دیا کرتی تھی۔"

پانچ دس منٹ کی مشقت نے زینب کو تھکا دیا۔ اس کی سانس بے ترتیب ہو رہی تھی۔ لیکن یہ بے ترتیبی تھوڑی دیر بعد ختم ہو گئی جب تیسری کرسی پر بیٹھے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے زینب کی موت کی تصدیق کر دی۔ استانی زینب کا چہرا سکون اور اطمینان سے ڈھل رہا تھا۔ دریا کی طرف سے اُٹھتی ہوئی گیلی گوندر اور کانوں کی نم آلود ہوا صدیوں پرانے خاموش قبرستان سے ہو کر شہر کی گلیوں میں گردش کر رہی ہے۔ ابھی رات نہیں ہوئی لیکن شب کا گماں ہونے لگا ہے۔

کرسٹل

فاطمہ ایم اے خان

"یس۔" دروازے پر ہوتی دستک کا جواب اس نے بس ایک لفظ میں دیا تھا۔ جولی دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔

"بے بی ڈنر لگا دوں؟" اس نے گھڑی کی طرف دیکھا، ساڑھے نو بج رہے تھے۔

"مام کہاں ہیں؟"

"وہ کسی میٹنگ میں جانے کا کہہ رہی تھیں، ڈنر بھی کر کے آئیں گی۔" "آپ کیلئے ڈنر لگا دوں؟"

"نہیں مجھے بھوک نہیں لگی تم کچن سمیٹو اور کوارٹر چلی جاؤ۔" وہ اتنی ٹینشن میں تھی کہ بھوک بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" جولی اس کے چہرے پر پھیلی پریشانی پڑھ سکتی تھی۔

"جولی۔ میرے ماں باپ کون تھے؟" وہ ایسا سوال تھا جس کی جولی کو بالکل بھی امید نہیں تھی۔

"آپ کے ماں باپ تو مسٹر اینڈ مسز کرسٹو ہیں۔" اس نے غصے میں اسٹڈی ٹیبل کا لیمپ ہاتھ مار کر گرا دیا۔

"جھوٹ مت بولو۔ تم پچھلے 40 سال سے اِس گھر میں ہو اور تمہیں حقیقت پتا نہ ہو میں یہ مان ہی نہیں سکتی۔" وہ سخت غصہ میں چیخ رہی تھی۔

"وہ۔۔۔ بے بی۔۔۔ میڈم۔۔۔" جولی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

"شٹ اَپ جسٹ شٹ اَپ۔۔۔ گیٹ لاسٹ فرام ہیئر۔۔۔" جولی جو پہلے ہی کرسٹل کے غصہ سے ڈرا کرتی تھی فوراً کوارٹر چلی گئی۔

☆☆

"جولی۔۔۔ جولی۔۔۔ کہاں مر گئی ہو؟" مسز کرسٹو کرسٹل کے کمرہ کے باہر کھڑی چلا رہی تھیں۔ جولی فوراً کچن سے نکلی اور کرسٹل کے کمرے کی طرف دوڑی۔

"یس میڈم؟"

"یہ سب کیا ہے؟ اور کرسٹل کہاں ہے؟" پورا کمرہ اتھل پتھل تھا۔
"مجھے نہیں پتا بے بی کہاں ہے۔ میں نے رات ڈنر کا کہا تھا تو انہوں نے منع کر دیا پھر میں اپنے کوارٹر چلی گئی۔"
"اس نے منع کر دیا اور تم مان گئیں! اسی چیز کے پیسے ملتے ہیں تمہیں؟" جولی نے کبھی مسز کراسٹو کو اِس طرح اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔
"یہاں کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ رابرٹ کو بلاؤ۔"
"یس میڈم۔" مسز کراسٹو اس کی آواز پر پلٹی۔
"کرسٹل کہاں ہے؟" انہوں نے سیدھا سوال کیا۔
"میڈم وہ تو رات میں ہی بنگلور واپس چلی گئیں۔"
"وہاٹ؟"
"ہاں، میں نے ہی انہیں ائرپورٹ چھوڑا تھا۔ وہ بہت غصے میں تھیں۔ بہت رو رہی تھیں، میں نے کہا بھی کہ صبح چلی جائیں مگر وہ نہیں یا نیں تو میں انھیں ائرپورٹ چھوڑ آیا۔" رابرٹ نے ساری بات انہیں بتا دی۔
"وہ رو کیوں رہی تھی۔ کیا ہوا ہے اسے؟" وہ بے حد پریشان ہو گئیں۔
"انہوں نے کسی کو کال کی تھی اور صرف اتنا کہا کہ میں ممبئی سے نکل رہی ہوں مجھے لینے ائیرپورٹ آ جاؤ۔" رابرٹ نے فون کال کے بارے میں بتایا۔
"رابرٹ اچھی طرح یاد کرو، اس نے کچھ اور کہا تھا؟"
"نو میڈم۔ بس اتنا ہی کہا تھا۔ بلکہ فون پر انہوں نے ہیلو بھی نہیں کہا تھا اور فون پر بات کرتے ہوئے بھی وہ رو رہی تھیں۔"
"اچھا جاؤ تم۔" رابرٹ وہاں سے چلا گیا۔
"جولی تم سے کچھ کہا تھا اس نے؟" جولی نظریں جھکائے ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔
"وہ پوچھ رہی تھیں کہ میرے ماں باپ کون ہیں؟" جولی کی یہ بات مسز کراسٹو کیلئے نیوکلیئر بم سے کم نہیں تھی۔ انہوں نے اپنا سر صوفے کی پشت گاہ پر ڈال لیا۔
"میڈم۔" جولی آگے بڑھی۔ مسز کراسٹو نے اسے ہاتھ کے اشارہ سے روک دیا۔

.......☆☆.......

وہ ائرپورٹ پر کھڑا سوچوں میں الجھا تھا جبھی وہ سامنے سے آتی دکھائی دی۔ عکاشہ فوراً آگے بڑھا اور بیگ اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی اور بے حد سرخ تھیں، وہ شاید پورا راستہ روتے ہوئے آئی تھی۔
"تم ٹھیک ہو؟" گاڑی مین روڈ پر لاتے ہی اس نے سوال کیا تھا۔
"نہیں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔
"عکاشہ اسے ہارڈ کور کہتا تھا، اس کے اِس طرح رونے سے وہ ہڑبڑا گیا۔ گاڑی روڈ کی سائڈ پر کھڑی کی اور پانی کی بوتل اس کی طرف بڑھائی۔
"عکاشہ میں کون ہوں؟" اس نے پانی کی بوتل نظرانداز کر دی۔ کرسٹل کے اِس ایک سوال میں ہی عکاشہ کو اپنے

سارے جواب مل گئے۔

"سنو کرسٹل، تم رونا بند کرو اور یہ پانی پیو پہلے۔ میں تمھارے ہر سوال کا جواب دے دوں گا۔" اس نے کرسٹل کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے رونے لگی۔ عکاشہ بے بسی سے اسے دیکھ رہا تھا، اچانک اس کا سر ایک طرف لڑھک گیا۔

"کرسٹل۔۔۔ کرسٹل۔۔۔ کیا ہوا ہے تمھیں۔" اس نے فوراً پانی کے چھینٹے اس کے چہرے پر مارے مگر وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔

......☆☆......

"ماں۔ بھائی رات کسی لڑکی کو گھر لے آیا ہے۔" وہ روحان تھا، بغیر کسی کا لحاظ کئے بولنے والا۔ واصف صاحب نے اپنی

بیوی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"رضا کی بیٹی ہے۔ میں نے آپکو بتایا تو تھا۔"

"اوہ! یہ تو بہت اچھی بات ہے، کہاں ہے وہ۔ ناشتہ کرنے کیوں نہیں آئی؟ روحان حیرت سے اپنے ماں باپ کے خوشی سے دمکتے چہرے دیکھ رہا تھا۔" بھائی آدھی رات کو کسی غیر لڑکی کو گھر لے آیا ہے اور ماں بابا خوش ہو رہے ہیں۔"

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ڈاکٹر نے سکون آور انجکشن دیئے ہیں۔ انہیں کے زیر اثر سو رہی ہے۔ رات بھر میں اس کے پاس رہی ہوں ابھی ناشتہ بنانے آئی ہوں تو عکاشہ سے کہہ دیا کہ وہ خیال رکھے۔" صنوبر بیگم نے روحان کے بریڈ پر بٹر لگاتے ہوئے کہا۔

"بھائی کو ہاسپٹل نہیں جانا۔ آپ مجھ سے کہہ دیتی میں بیٹھ جاتا اس کے پاس۔" روحان کی زبان میں کھجلی ہوئی تھی۔

"آپی کہو، بہن ہے وہ تمھاری اور وہ بھی بڑی والی۔" واصف صاحب نے اپنے چھوٹے بیٹے کے کان کھینچے۔

"یہ تو بڑا ہی ظلم ہے، پتا نہیں اللہ میاں میرے ساتھ ہی ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ہر خوبصورت لڑکی یا تو میری بہن ہوتی ہے یا پھر مجھ سے بڑی ہوتی ہے۔" اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

"یہ تو اچھا ہے نا کہ خوبصورت لڑکیاں تمھاری بہنیں ہیں۔"

"ہاں، خوبصورت تو ہے، بالکل کانچ کی گڑیا جیسی۔" اس نے رات کرسٹل کو اس وقت دیکھا تھا جب عکاشہ اسے بانہوں میں اٹھائے اپنے کمرے میں لے گیا تھا۔ اور پھر یہ خبر صنوبر بیگم کو بھی اسی نے دی تھی۔

"مگر ماں بابا۔۔۔ وہ صرف میری بہن نہیں ہوگی، وہ بھائی کی بھی بہن ہی ہونی چاہئے۔ اوکے؟"

"نہیں۔ وہ میری بہن نہیں ہے، بلکہ وہ تمھاری بھابھی ہوگی۔" عکاشہ اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ صنوبر بیگم اور واصف صاحب اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے جبکہ روحان غصہ سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے جوس گلاس میں انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تم نے کیا کہا ہے؟" سوال واصف صاحب کی طرف سے آیا تھا۔

"بابا میں کرسٹل سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے صاف الفاظ میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"وہ مان جائیگی۔"

"کوشش تو کر سکتا ہوں نا۔ مگر پہلے آپ سب بتائیں......!"

"تیری طرف سے تو تم ناں ہی سمجھو۔" جواب سب سے پہلے روحان کی طرف سے آیا تھا۔
"تھینک یو۔ تم سے نہیں پوچھا گیا ہے۔" اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔
"ہم راضی ہیں۔" صنوبر بیگم نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا تھا، انہیں اپنی بیوی پر اعتبار تھا اور اندازہ بھی کہ رضا کے حوالے سے کرسٹل انہیں کتنی عزیز ہے۔
"تھینک یو ماں بابا۔ اینڈ تھینک یو مائی نان میٹرک لور بوائے۔" اس نے شرارت سے روحان کو گلے لگانے کی کوشش کی مگر روحان پیچھے ہٹ گیا۔
"اب زیادہ اتراؤ نہیں۔" روحان اس کے گلے لگ گیا۔ "میں تو مذاق کر رہا تھا بھائی۔"
"جانتا ہوں میں۔" عکاشہ نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

......☆☆......

"اوہ گاڈ۔ میں اتنا کیسے سوگئی۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور باتھ روم چلی گئی۔ کتنی ہی دیر تک شاور کے نیچے کھڑی آنسو بہاتی رہی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مسز کرسٹو نے اس سے یہ سب باتیں کیوں چھپائیں۔
وہ باتھ لے کر باہر نکلی تو وہ سامنے ہی بیڈ پر بیٹھا موبائل میں کچھ کر رہا تھا۔ گرے رنگ کی ٹی شرٹ اور جینز میں وہ ہمیشہ کی طرح بہت پیارا لگ رہا تھا۔ کرسٹل کی آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا، وہ بالکل سامنے کھڑی تھی۔ کرسٹل کو اپنا کل رات والا رویہ یاد آیا تو وہ شرمندہ ہوگئی مگر وہ کبھی بھی اپنے آپ کو عکاشہ کے سامنے کمزور نہیں ظاہر کرنا چاہتی تھی، اسی لئے چہرے پر ہمیشہ کی طرح سختی کا خول چڑھا لیا۔
"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"
"کتنا عجیب سوال ہے نا۔ میرا اپنا گھر، اپنا کمرہ، اپنا بیڈ ہے اور تم مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔"
"تمہارا کمرہ۔۔۔" کرسٹل نے حیرت سے سوال کیا۔
"جی میڈم، جو کہ مستقبل میں ہمارا کمرہ کہلائے گا اور یہ جو سامنے بڑی سی تصویر لگی ہے نا اس کی جگہ ہم اپنے نکاح کی تصویر لگوائیں گے۔" عکاشہ اس کے قریب آکر جھکا اس کے کان میں کہہ رہا تھا۔
"شٹ اپ۔" اس نے شہادت کی انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کی مگر عکاشہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"تم کب تک اپنے آپ پر یہ خول چڑھاؤ گی کرسٹل۔ تم مان کیوں نہیں لیتی کہ تم بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتی ہو جتنی میں تم سے کرتا ہوں۔" وہ اس کے قریب کھڑا کہہ رہا تھا۔
"نہیں کرتی میں تم سے محبت، تم تو میری نفرت کے بھی قابل نہیں ہو۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے عکاشہ کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔
عکاشہ نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی طرف کھینچا، وہ اس کے سینے سے آ ٹکرائی۔ "تم کب تک اپنے آپ کو میرے سامنے یوں پتھر بنا کر پیش کرتی رہو گی، میں تمہیں ہارڈ کور کہتا تھا مگر تم ویسی ہو نہیں جیسی خود کو ظاہر کرتی ہو۔ تم اگر سچ مچ مجھ سے نفرت کرتی تو میرے ایک بار کہنے پر تم دوڑی دوڑی اگروال ہاسپٹل نہیں چلی جاتیں۔"
"میں جانتا ہوں کہ تم ماریہ آنٹی سے ملی ہو اور اسی لئے تم کل سے اتنا زیادہ پریشان ہو۔"
"کون ماریہ۔۔۔ میں کسی ماریہ کو نہیں جانتی۔۔۔ میں ممبئی گئی تھی اپنی مام سے ملنے۔" اس نے عکاشہ کی تمام باتوں کو سرے سے رد کر دیا۔

"میں جانتا ہوں تم جھوٹ بول رہی ہو اور ایک بات۔۔۔ تم اگر مجھ سے اتنی ہی نفرت کرتی ہوتیں تو کبھی بھی مجھے کال نہ کرتیں، مجھے کبھی بھی ائرپورٹ نہیں بلاتیں، کبھی بھی میرے سامنے یوں نہ روتیں، کبھی بھی یوں پورے حق کے ساتھ میرا کمرہ اور میری دیگر ذاتی چیزیں نہیں استعمال کرتیں۔" عکاشہ نے شرارت سے کہا۔

وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔

"کتنی مرتبہ میں تم سے کہوں کہ مجھے تم سے کوئی محبت نہیں ہے اور اگر مجھے پتا ہوتا کہ یہ کمرہ تمھارا ہے تو اِسے استعمال کرنے سے پہلے میں مرجانا پسند کرتی۔۔۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں عکاشہ، بے انتہاء نفرت۔" اس کے الفاظ زہر میں بجھے ہوئے تیر تھے۔

"اور میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کرسٹل کہ تم ایک دن مجھ سے محبت کروگی۔۔۔ بے انتہا محبت۔۔ اور جب تک تم خود میرے پاس نہیں آؤگی میں تمھارے آس پاس بھی نظر نہیں آؤں گا۔" اس نے بیڈ پر رکھا اپنا فون اٹھایا اور وہاں سے چلا گیا۔ کرسٹل اب بھی شاک کے عالم میں کھڑی تھی، اس نے آج تک کبھی بھی عکاشہ کو اِس قدر غصہ میں نہیں دیکھا تھا۔

......☆☆......

"آنٹی آپ عکاشہ کی مدر ہیں؟" وہ صنوبر بیگم اور روحان کے ساتھ لان میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔

"جی بیٹا۔ میں عکاشہ اور روحان کی ماں ہوں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اور جلد ہی آپ کی بھی بن جائینگی۔" روحان نے دھڑ سے کہہ دیا۔

"وہاٹ؟" کرسٹل اس کی بات نہیں سمجھ پائی تھی۔

"کچھ نہیں بیٹا، اِس کی عادت ہے مذاق کرنے کی۔" صنوبر بیگم نے بات سنبھال لی۔

"آنٹی مجھے ہاسٹل واپس جانا ہے۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا آج رک جاؤ کل عکاشہ کے ساتھ چلی جانا۔" وہ اسے روکنا چاہتی تھیں۔

"میں نے ہاسٹل سے اتنی ہی چھٹی لی تھی۔ آپ پلیز ڈرائیور سے کہہ دیں۔"

"میں عکاشہ سے کہتی ہوں۔ روحان جاؤ بھائی سے کہو کہ میں بلا رہی ہوں۔"

"وہ تو کہیں چلا گیا، بہت غصے میں تھا، میں نے کئی آوازیں دی مگر وہ نہیں رکا۔" کرسٹل نے نظریں جھکالیں۔

"آنٹی آپ پلیز تکلف نہ کریں، میں ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

"اچھا نہیں لگتا بیٹا۔ یہ عکاشہ بھی پتا نہیں کہاں چلا گیا۔" وہ سخت شرمندہ ہو رہی تھیں۔

"ماں میں چلا جاتا ہوں آپی کے ساتھ۔" کرسٹل نے حیرانگی سے روحان کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے تم چلے جاؤ۔ ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کا کہو اور جا کر کرسٹل کا بیگ لے آؤ۔" روحان گھر کے اندر چلا گیا۔

"تم رک جاتی بیٹا تو عکاشہ کے بابا سے مل لیتی، وہ تمھارے لئے بیحد فکرمند تھے۔" صنوبر بیگم اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے کہہ رہی تھیں۔ "ویک اینڈ وغیرہ پر آتی رہنا، تمھارا اپنا گھر ہے بیٹا، کبھی بھی کوئی بھی پریشانی یا مسئلہ ہو تو ہم لوگ ہمیشہ تمھارے ساتھ ہیں۔ انہوں نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ کرسٹل کا دل بھر آیا۔ وہ ان سے مل کر گاڑی میں آبیٹھی۔

......☆☆......

"عکاشہ کہاں تھے تم؟"

"میں دوست کی طرف چلا گیا تھا۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔
"کرسٹل پہلی دفعہ یہاں آئی تھی، بجائے اِس کے کہ تم خود اسے ہاسٹل چھوڑنے جاتے تم دوست کی طرف نکل گئے۔ تمھیں اندازہ ہے کہ مجھے کتنی شرمندگی اٹھانی پڑی ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ روحان گھر میں ہی تھا۔" عکاشہ نے جھکا سرایک جھٹکے سے اٹھایا۔
"کرسٹل ہاسٹل چلی گئی۔۔۔ آپ نے اسے جانے کیوں دیا، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی ماں۔" عکاشہ نے فکرمندی سے سوال کیا۔
"ماں نے روکا تھا مگر وہ نہیں رکی تو میں انہیں ہاسٹل چھوڑ آیا۔"
اس نے اپنا سر ہاتھوں میں گرا لیا۔ "ماں آپ نے اسے روحان کے ساتھ بھیج دیا، اِس نے ضرور کوئی الٹی سیدھی بات کی ہوگی۔ آپ مجھے کال کر لیتیں۔" وہ بے بسی سے ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔
"ایڈیٹ لکھا ہے؟" روحان نے اپنی پیشانی پر انگلی پھیرتے ہوئے پوچھا۔
"اچھا اب تم دونوں ناراض نہ ہو۔ جلدی جلدی کھانا کھاؤ اور تراویح کیلئے جاؤ۔ آج پہلی تراویح ہے۔"

......☆☆......

نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ بیڈ سے اٹھی اور کھڑکی کے قریب آ بیٹھی۔ دور آسمان میں چمکتا چاند بھی اتنا ہی خاموش تھا جتنا کہ عکاشہ۔
"بیس دن گزر گئیا سے دیکھے ہوئے، کیا میں اسے یاد نہیں آتی۔ وہ تو مجھ سے محبت کا دعویدار ہے اور میرے اس طرح اس کے گھر سے چلے آنے پر وہ میرے پیچھے تک نہیں آیا، جبکہ وہ جانتا تھا کہ میری طبیعت خراب ہے، میں اندر سے کتنی ٹوٹی ہوئی ہوں۔۔۔ اور میرا قبولِ اسلام کا واقعہ۔۔۔ پورا کیمپس اس بات سے واقف ہے پھر وہ بے خبر کیسے ہوسکتا ہے۔۔۔ اور اگر اسے معلوم ہے تو وہ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آیا۔۔۔ وہ جو ہمیشہ میرا سایہ بنا رہتا تھا، جسے میرے پل پل کی خبر ہوتی تھی کیا وہ اب اِتنا بے خبر ہو گیا کہ اسے یہ تک نہیں پتا کہ میرا دل پگھل رہا ہے۔۔۔ میں اسے سوچنے لگی ہوں۔۔۔ وہ دھیرے دھیرے میرے حواسوں پر چھاتا جا رہا ہے۔۔۔ او ہ اللہ تعالیٰ۔۔۔ کیا مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے؟"
وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹی اور آئینہ کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ "ہاں۔ میں اس سے محبت کرنے لگی ہوں، وہ میرے چہرے پہ رقم ہے ایک حقیقت کی طرح۔۔۔" خود سے گھبرا کر وہ آئینہ کے سامنے سے ہٹی اور آ کر بستر پر لیٹ گئی۔

......☆☆......

"عکاشہ آج شب قدر ہے جاؤ جا کر کرسٹل کو لے آؤ۔ اس سے کہو کہ عید ہمارے ساتھ کرے۔" عکاشہ جو کہ اسٹڈی ٹیبل پر جھکا کچھ لکھنے میں مصروف تھا سر اٹھا کر صنوبر بیگم کو دیکھنے لگا۔
"میں نے تو گھر میں کسی کو بھی کرسٹل کے قبولِ اسلام کے بارے میں نہیں بتایا پھر ماں کیوں کہہ رہیں ہیں کہ میں اسے عید کیلئے یہاں لے آؤں۔" وہ پین ہونٹوں میں دبائے سوچ رہا تھا۔
"کیا ہوا۔ کیا سوچنے لگ گئے؟"
"میں بہت مصروف ہوں ماں۔ مجھے ایک سیمینار کیلئے جانا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ رات دیر ہو جائے آنے میں۔ آپ سو جایئے گا، میرے پاس دوسری چابی ہے۔" اس نے ٹیبل پر رکھی چابی اور موبائل اٹھایا اور چلا گیا۔ صنوبر بیگم حیرت سے دروازہ کی طرف دیکھتی رہ گئیں۔

"کیا ہوا ماں؟" روحان نے خاموش بیٹھی صنوبر بیگم سے سوال کیا۔
"یہ عکاشہ کو کیا ہوا ہے، کچھ عجیب سا برتاؤ کر رہا ہے۔" صنوبر بیگم اب تک عکاشہ کی حرکت پر پریشان تھیں۔
"مجھے تو کچھ نہیں پتا، ہو سکتا ہے کہ وہ۔۔۔۔" روحان کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ دستک کی آواز پر دونوں نے گردن موڑ کر دروازے کی سمت دیکھا۔ وہ کرسٹل تھی۔ صنوبر بیگم اور روحان دونوں حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے، حیرت اِس بات کی نہیں کہ کرسٹل وہاں آئی تھی بلکہ حیرت اِس بات کی تھی کہ اس نے اسکارف اوڑھ رکھا تھا، وہ کرسٹل جو کبھی اسٹول تک گلے میں ڈالنا پسند نہیں کرتی تھی، آج وہ اسکارف سے سر ڈھکے ہوئے تھی۔
"کیا میں غلط وقت پر آ گئی؟"
"ارے نہیں بیٹا۔ آؤ نا، تم بالکل صحیح وقت پر آئی ہو۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے عکاشہ سے کہہ رہی تھی کہ جا کر تمھیں لے آئے مگر وہ سیمینار کیلئے نکل گیا۔" صنوبر بیگم آگے بڑھ کر اس سے گلے ملیں۔
"آؤ بیٹھو۔ روحان جاؤ آپی کیلئے ناشتہ کا کہو۔"
"آج تو کوئی بھی سیمینار نہیں ہے پھر اس نے آنٹی سے جھوٹ کیوں بولا۔ کیا وہ جانتا تھا کہ میں آج یہاں آنے والی

ہوں۔۔۔ کیا تم مجھ سے نفرت کرنے لگے ہو عکاشہ۔ آخر کیوں بھاگ رہے ہو مجھ سے۔۔" وہ کرسی پر بیٹھی سوچوں میں گم ہو گئی۔
"کیا لو گی تم، کچھ ٹھنڈا منگواؤں یا پھر چائے؟" صنوبر بیگم نے اس سے پوچھا۔
"جی؟ سوری میں کچھ اور سوچنے لگی تھی۔ آپ غالباً کچھ کہہ رہی تھیں۔"
"میں یہ پوچھ رہی تھی کہ تم ناشتہ میں کیا لو گی؟" کرسٹل نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔
"عکاشہ نے اِنہیں نہیں بتایا کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے؟" اسے تکلیف ہوئی تھی۔ "کچھ بھی نہیں آنٹی، میرا روزہ ہے۔ میں آپ کے ساتھ افطار کروں گی۔" اس نے خوش مزاجی سے جواب دیا۔
"اوہ واؤ تو آپ نے بھائی سے شادی کیلئے اسلام قبول کیا ہے؟" روحان نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔
"عکاشہ سے شادی؟" وہ روحان کی بات سمجھ کر بھی نہیں سمجھ پائی تھی۔
"ہاں آپ کی مام۔۔۔" روحان اسے مسز کرسٹوفی کی آمد کے بارے میں بتانا چاہتا تھا، مگر صنوبر بیگم کی تنبیہی، گھورتی نگاہوں کی وجہ سے خاموش ہو گیا۔
آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" روحان اب بھی اس کے اسلام قبول کرنے کی وجہ جاننے کیلئے بے چین تھا۔
"نہیں میں نے عکاشہ کیلئے نہیں، بلکہ اللہ کی رضا اور اپنی آخرت سنوارنے کیلئے اسلام قبول کیا ہے۔" اس نے نہایت سکون سے جواب دیا تھا۔
"روحان جاؤ بابا کو کال کرو کہ وہ آج جلدی گھر آ جائیں۔" وہ نہیں چاہتی تھیں کہ روحان کرسٹل سے کوئی بھی الٹی سیدھی بات کرے، اسی لئے اسے وہاں سے اٹھا دیا۔

......☆☆......

"میڈم۔ آپ ٹھیک ہیں؟" جولی نے فکرمندی سے پوچھا۔
"ہاں میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کیا ہونا ہے بھلا؟" انہوں نے الٹا سوال داغا۔
"آپ جب سے بنگلور سے آئی ہیں کافی پریشان لگ رہی ہیں۔" اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"جولی تم نے صحیح کیا تھا کہ میں کرسٹل کو اس کے ددھیال والوں کے حوالے کر دوں، مگر میں نہیں مانی۔ میں نے اس پر ظلم کیا، میں نے اسے کبھی نہیں بتایا کہ اس کے والدین کون تھے، ان کا مذہب کیا تھا۔ مگر جو گاڈ ہے نا وہ بہت بڑا ہے۔۔۔ اس نے سارے سیکریٹ کھول دئے۔" جولی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مسز کراسٹو کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔

"اس نے اسلام قبول کرلیا ہے۔۔۔" جولی ہکا بکا منہ کھولے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"وہ جب پچھلے دنوں یہاں آئی تھی تب وہ اگروال ہاسپٹل گئی تھی۔ وہاں وہ ماریہ سے ملی تھی اور اسی لئے وہ اتنے غصے میں تھی۔۔۔ رضا کی بہن بنگلور میں رہتی ہے، کرسٹل اس کے بیٹے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔۔۔ عکاشہ نام ہے اس کا۔ بہت ہی اچھا لڑکا ہے۔" مسز کراسٹو ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہی تھیں۔

" آپ اسے ایسا کرنے دیں گی؟" جولی دماغ میں چل رہے سوال کو زبان پر لائی۔

"میں کون ہوتی ہوں اسے روکنے والی۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں اسے ماریہ اور رضا کی بہن سے ملنے نہیں دوں گی تو وہ عکاشہ سے شادی کر لیگی۔۔۔ میں نے رضا کی بہن سے بات کی ہے، وہ بہت اچھی عورت ہے۔۔۔ میں پتا نہیں کیوں انہیں برا سمجھتی رہی۔۔۔" جولی کو مسز کراسٹو کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگا تھا۔

"میڈم آپ سر کو کال کرلیں۔ وہ آکر بے بی کو سمجھائیں گے۔" جولی نے ڈرتے ڈرتے ایک مشورہ دیا۔

"مجھے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں، یہ مجھے تم سے جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔ ہمیں بنگلور بھی جانا ہے، عید کی شام اس کی شادی ہے۔" جولی نے ادب سے سر جھکایا اور واپس مڑ گئی۔

☆☆

"تم ابھی آ رہے ہو۔ یہ کونسا طریقہ ہے عکاشہ، تم کبھی دیر رات تک گھر سے باہر نہیں رہتے تھے اور آج پوری رات باہر گذار کر آ رہے ہو۔۔۔ 29 گھنٹے۔۔۔ پورے 29 گھنٹے بعد تم گھر لوٹ رہے ہو۔۔۔ ہو کیا گیا ہے تمہیں عکاشہ؟" صنوبر بیگم سخت غصہ میں تھیں۔

"سوری ماں، میں سیم کی طرف رک گیا تھا۔" اس نے اپنے چچازاد بھائی کا نام لیا۔

"ٹھیک ہے جاؤ جا کر فریش ہو جاؤ۔"

☆☆

انہوں نے کرسٹل کو گیلری میں بیٹھے دیکھا تو اس کے پاس آ گئیں۔ "تم نے آج ٹھیک سے افطاری بھی نہیں کی، طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟"

" آنٹی میں بہت بری ہوں پھر بھی آپ مجھ سے اتنی محبت کرتی ہیں، میری اتنی فکر کرتی ہیں۔ آپ جانتی ہیں کہ میں نے ہمیشہ عکاشہ سے کتنی بدتمیزی کی ہے اس کے باوجود آپ نے مجھے کچھ بھی نہیں کہا۔" وہ شرمندہ تھی۔ "میں ہمیشہ اس کا صبر اور برداشت دیکھ کر سوچتی تھی کہ وہ ڈرامہ کر رہا ہے مگر نہیں، وہ تو آپ کی طرح ہے۔ ہر کسی سے محبت کرنے والا، ہر بات پر صبر کرنے والا، میری بدتمیزیاں برداشت کرنے والا، ہر بات کو درگزر کرنے والا۔" وہ نظریں جھکائے اپنے ہاتھوں کو دیکھتی کہہ رہی تھی۔ "میں نے ہمیشہ عکاشہ کا دل دکھایا ہے اور اسی کی سزا اللہ تعالیٰ مجھے دے رہے ہیں، اسی لئے عکاشہ میرے سامنے بھی نہیں آتا۔ اسے پتا چل گیا ہوگا کہ میں یہاں آئی ہوئی ہوں اسی لئے وہ کل سے گھر نہیں لوٹا۔ میں بہت بری ہوں آنٹی، بہت ہی زیادہ بری۔" وہ ان کے گلے لگ کر رونے لگی۔

"ارے ارے کرسٹل۔ ایسے نہیں روتے بیٹا، وہ تم سے ناراض تھوڑی ہے وہ تو اپنے چچا کی طرف چلا گیا تھا۔" انہوں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"آنٹی آپ میرے ڈیڈ سے بہت محبت کرتی ہیں نا۔ مجھے ان کے بارے میں بتائیں، میں نے تو انھیں دیکھا ہی نہیں۔ میں تو مسٹر اینڈ مسز کراسٹو کو ہی اپنے ماں باپ سمجھتی رہی۔ وہ تو عکاشہ نے مجھے بتایا کہ میری مام اگروال ہاسپٹل میں ہیں۔

"ہاں۔ وہ وہاں اپنے ایک اسائنمنٹ کیلئے گیا ہوا تھا جب اس نے ماریہ کو وہاں دیکھا تھا اور تب سے ہر ماہ وہ اس سے ملنے جاتا ہے۔ اس نے جب فریشرس نائٹ پہ تمھیں دیکھا تو تمھیں فوراً پہچان لیا کیونکہ ماریہ جب تمھاری عمر کی تھی تو بالکل تمھاری طرح ہی تھی اور شاید اسی دن سے وہ تمھارے پیچھے پڑ گیا، تم سے محبت کرنے لگا۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کرسٹل کا گال تھپتھپایا۔ وہ بھی جواباً ہلکا سا مسکرا دی۔

"آنٹی میرے مام ڈیڈ کی شادی کیسے ہوئی تھی۔ میری مام تو مسز کراسٹو کی بہن تھی نا، ایک عیسائی عورت۔" اس نے تجسس سے سوال کیا۔

"ہاں ماریہ عیسائی تھی جبکہ رضا مسلم۔ رضا نوکری کے سلسلے میں ممبئی گیا تھا جب اس کی ملاقات ماریہ سے ہوئی۔ ماریہ دل ہی دل میں اسے پسند کرنے لگی، اس سے محبت کرنے لگی اور رضا اس سے نفرت کرتا تھا، اتنی نفرت جتنی تم عکاشہ سے کرتی ہو۔"

"نہیں آنٹی میں عکاشہ سے نفرت نہیں کرتی۔" اس نے جھٹ سے کہا۔ وہ مسکرانے لگیں تو کرسٹل نظریں چرا گئی۔

"تمھارا باپ ماریہ کے سایے سے بھی دور بھاگتا تھا جبکہ ماریہ اس سے شادی کی خواہش مند تھی، اور اس نے رضا سے شادی کیلئے اسلام قبول کرلیا۔ اس کی ثابت قدمی سے متاثر ہو کر رضا نے اس سے شادی کرلی اور دونوں ممبئی میں ہی رہنے لگے۔ شادی کے تین ماہ بعد ہی ڈاکٹر نے تمھاری آمد کی خبر دی۔ رضا بہت زیادہ خوش تھا مگر ایک ماہ بعد ہی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کی موت ہوگئی، مسز کراسٹو ماریہ کو اپنے ساتھ لے گئیں۔ ماریہ کی طبیعت خراب ہونے لگی تھی اور دھیرے دھیرے وہ الزائمر کا شکار ہوگئی۔ وہ تمھارا بالکل بھی خیال نہیں رکھتی تھی، بلکہ اس نے کئی دفعہ تمھیں مارنے کی کوشش بھی کی تھی، اسی لئے اسے اسپتال میں بھرتی کرا دیا گیا۔" انہوں نے دھیمے لہجے میں مختصراً اسے اس کے والدین کے بارے میں بتایا۔

"آپ مجھ سے ملنے آیا کرتی تھیں نا؟" صنوبر بیگم نے حیرت سے اسے دیکھا۔

انہیں معاف کر دیں، میں جانتی ہوں کہ انہوں نے آپ لوگوں کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ مجھے تو سوچ سوچ کر شرمندگی ہوتی ہے۔" وہ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے التجا کر رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں بیٹا۔ میں کسی سے ناراض نہیں ہوں۔ وہ تمھیں کھونا نہیں چاہتی تھیں۔"

"وہ مجھے کھو چکی ہیں آنٹی۔ وہ آخر کب تک مجھے آپ لوگوں سے چھپا کر رکھتیں، کب تک مجھے حقیقت سے بے خبر رکھتیں۔۔۔ اللہ بہت بڑا ہے آنٹی، اس نے آخر مجھے میرے اپنوں تک پہنچا ہی دیا۔" وہ اب بھی مسز کراسٹو سے ناراض تھی۔

"ایسے نہیں کہتے بیٹا۔ وہ سب ماضی ہوگیا، بھول جاؤ اسے۔ انشاء اللہ سب بہتر ہوگا۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر وہاں سے چلی گئیں۔

"کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوگا، عکاشہ مجھ سے نفرت کرنے لگا ہے۔" وہ تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

......☆☆......

کمرے میں بیٹھے بیٹھے گھبراہٹ بڑھنے لگی تو وہ چھت پر آگئی۔ وہ ریلنگ پر دونوں ہاتھ ٹکائے چاند کو تک رہی تھی جبھی وہ اس کے پیچھے آکر کھڑا ہوگیا۔

"یہاں کیوں آئی ہو تم؟" اس کا لہجہ برف کی طرح سرد تھا۔
"یہ گھر تمھارا تھوڑی ہے، میری آنٹی کا ہے۔ میں آؤں یا جاؤں تم کون ہوتے ہو وجہ پوچھنے والے۔" اس نے مڑے بغیر سخت لہجے میں جواب دیا۔
"ہاں یہ ٹھیک کہا تم نے، تم تو ہو ہی خودسر، اپنی مرضی کرنے والی۔"
"کیا مطلب ہے تمھارا؟"
"اوہ پلیز کرسٹل۔۔۔ اتنی بھولی بننے کی کوشش تو نہ کرو۔" عکاشہ نے تمسخر سے کہا۔ "کیا تم نے ماں سے یہ نہیں کہا کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو؟"
وہ شاک کے عالم میں عکاشہ کی طرف مڑی۔ "شادی۔"
"ہاں اور تمھاری خواہش پر ہی تمھاری سو کالڈ خالہ میری ماں سے بات کرنے آئی تھیں۔" اس کا لہجہ کافی ہتک آمیز تھا۔
"اللہ کی قسم عکاشہ میں نے کسی سے ایسی کوئی بھی بات نہیں کی۔ میں نے تو مسز کراسٹو سے یہ کہا تھا کہ وہ اگر مجھے آنٹی اور مام سے ملنے سے روکنے کی کوشش کریں گی تو میں تم سے شادی کرلوں گی۔" اس نے آخری بات کافی دیر سے کہی۔ "مگر وہ صرف میں نے انہیں دھمکانے کیلئے کہا تھا۔۔۔ قسم لے لو اس کے علاوہ میں نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔۔۔ یا اللہ یہ مسز کراسٹو کی مجھ سے کیا دشمنی ہے۔" وہ رونے لگی تھی۔
"ارے ارے کرسٹل تم رونے کیوں لگ گئی۔ تم تو انسان کو تھوڑی ایکٹنگ بھی نہیں کرنے دیتی۔ میں تو مذاق کر رہا تھا اور تم رونے لگی۔" وہ آنکھوں میں آنسو لئے بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"ایسے کیا دیکھ رہی ہو، سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے ہی ماں سے کہا تھا کہ وہ تمھاری خالہ سے ہماری شادی کی بات کریں اور خوشخبری یہ ہے کہ مسز کراسٹو مان گئی ہیں، عید کی شام ہمارا نکاح ہے۔" کرسٹل جواب تک شاک کی کیفیت میں کھڑی تھی، وہ آگے بڑھی اور عکاشہ کے سینے پر مکوں کی بارش کردی۔
"آہ۔۔۔ کتنی ظالم ہو یار۔ کوئی اپنے شوہر کو یوں مارتا ہے بھلا۔" اس نے کرسٹل کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگا لئے۔ "تم جانتی نہیں مگر میری آج تک کے عید کے تحفوں میں سب سے بہترین تحفہ تم ہو۔" کرسٹل روتے روتے ہنس دی۔
"اب بس بھی کردو رونا۔ ایک تو تم روتے ہوئے اتنی اچھی لگتی ہو کہ سامنے والے کی نیت خراب ہوجائے جبکہ میں نے اور دو دن صبر کرنا ہے۔" عکاشہ نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔
"بڑے ہی چھچھورے ہو تم۔" اس نے اپنے ہاتھ عکاشہ کے ہاتھوں سے چھڑانے کی کوشش کی۔
چھچھورا نہیں رومینٹک کہو لڑکی۔" وہ شرارت سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا۔ کرسٹل نے نظریں جھکالیں۔
"اوہ گاڈ۔ تم شرماتی بھی ہو۔" اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر عکاشہ نے مصنوعی حیرت سے کہا۔
"بہت برے ہو تم۔" کرسٹل نے غصہ سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔ عکاشہ نے ایک بلند بانگ قہقہہ لگایا۔ اسے اپنے صبر و برداشت کا صلہ مل گیا تھا، اپنی محبت مل گئی تھی۔ اور یہ قہقہہ اس کی خوشی کی ترجمانی کر رہا تھا۔

......☆☆......

مس ھیلمنٹ

پروفیسر شیخ محمد اقبال

اپریل کا مہینہ تھا' اچانک ٹھنڈی ہوا چل پڑی' ہلکے ہلکے بادل آسمان پر تیرنے لگے' بہار کی تمام رونقیں اور لطافتیں آسمان سے اترنے لگیں اور زمین بھی تازگی اور فرحت اگلنے لگی' پھولوں میں ایک نئی زندگی محسوس ہونے لگی ہر طرف بہاریں تھیں' تازگی' شگفتگی اور رعنائی تھی۔ سمیرا اپنے لان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت ہی خوش' ہر طرف ہریالی' رنگا رنگ پھول' تازہ شگوفے' خوشبو اور رنگ ہی رنگ۔

اس کے ہاتھ میں بیالوجی کی کتاب تھی اور وہ تخلیقی عمل کے بارے میں محو مطالعہ تھی' وہ کبھی سائنس کی طالبہ رہی تھی اس لیے بڑی حقیقت پسند تھی۔ وہ جانتی تھی کہ فطرت کی رعنائیوں اور رنگینیوں کا انسانی فطرت پر کیا اثر ہوتا ہے۔ لیکن وہ اتنی خوش اور اتنی شاداں نظر نہیں آتی تھی جتنے کہ شاخوں پر کھلے ہوئے پھول۔ اگرچہ حسن اور زیبائی سے وہ کسی پھول سے کم نہ تھی۔ لیکن اسے اپنی حقیقت اور زندگی کی ماہیت پر غور کرنے میں بڑا ہی لطف آتا تھا۔ قدرت کا اس پر اس قدر احسان تھا کہ وہ سوچ بھی سکتی تھی اور اپنے جذبات کا اظہار بھی کر سکتی تھی۔ وہ اشیا ظاہری کو دیکھ کر بیک وقت خوش ہوتی تھی اور ملول بھی' بالکل ایک خواندہ اور سمجھ دار فرد کی طرح۔

اس کی شادی کو چند ماہ گزرے تھے وہ بہت مطمئن دکھائی دیتی تھی اور کبھی کبھی سوچتی تھی کہ وہ کتنی خوش بخت ہے کہ اسے ایک ایسا ساتھی مل گیا ہے جو اسے سمجھتا ہے' اس سے پیار کرتا ہے' شوہر کے بارے میں جو خدشات اس کی سہیلیوں نے اس کے ذہن میں ڈال رکھے تھے وہ بہر حال موجود تھے لیکن اس کو یقین تھا کہ حسن سلوک اور طرز عمل بہت اہم ہوتا ہے۔ اگر کوئی بیوی اپنے شوہر کا خیال رکھتی ہے' اسے بھرپور پیار دیتی ہے اسے کمپنی دیتی ہے' اس کے دکھ سکھ میں شریک ہوتی ہے تو یقیناً اس کا دل جیت سکتی ہے اور اس کا دماغ بھی۔ اسی اثناء میں دروازے پر دستک ہوئی ہے اور اسے یوں لگتا ہے کہ جیسے اکمل آ گیا ہو۔

گھر کا دروازہ خاصا دور تھا لیکن اس نے اپنی ملازمہ کو کہہ رکھا تھا کہ وہ دروازہ کھولنے نہ جائے خاص طور پر اس وقت جب اکمل کے آنے کی توقع ہو۔ وہ چاہتی تھی کہ اکمل جب باہر سے آئے تو وہ ہی اسے خوش آمدید کہے۔ چنانچہ وہ گیٹ کی طرف لپکی' دروازہ کھولا اکمل داخل ہوا۔ اس نے مسکراہٹ سے اسے خوش آمدید کہا اور پھر دونوں لان کی طرف چلنے لگے۔

''آج فیکٹری سے جلدی کیوں آ گئے ہو؟''

''موسم اتنا اچھا تھا۔'' اس نے کہا۔

''ہاں مجھے بھی یہی توقع تھی کہ تم آ جاؤ گے۔ اتنا اچھا موسم روز روز تھوڑی آتا ہے۔ کتنی گرمی تھی' کتنا حبس تھا اور آج کتنا خوش گوار دن ہے۔'' سمیر نے کہا۔

اکمل نے اس کی تائید کی اور پھر دونوں کچھ دیر گپ شپ لگاتے رہے اور پھر پکنک ڈرائیو کے لیے نکل گئے' ایک گھنٹے کے بعد واپس آئے سمیرا نے خود چائے بنائی اور اسے پیش کی وہ چاہتی تھی کہ اکمل کو خود ہی چائے بنا کر پیش کرے۔ خود اس کا ہر کام کرے' سمیرا پڑھی لکھی لڑکی تھی اسے اکمل نے کئی بار کہا تھا وہ سارا دن گھر میں کم و بیش تنہا ہوتی ہے اسے کوئی جاب کر لینا چاہیے لیکن وہ جاب نہیں کرنا چاہتی تھی' اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ ایک اچھی بیوی ثابت نہیں ہو سکتی۔ اکمل نے سمجھایا تھا کہ ایسا نہیں ہے لیکن وہ کبھی جاب کرنے پر تیار نہیں ہوئی تھی۔ وہ کہتی تھی۔

''انتظار میں بڑا مزہ ہوتا ہے جانو! تمہارے آنے کا انتظار اور بھی زیادہ لطف دیتا ہے' جب تم تھکے ہارے آؤ تو گھر

میں انہیں سکون نہ دے سکوں۔ یہ کیسی محبت ہوئی کہ شوہر تھکا ہارا آئے اور گھر میں دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہو۔"
"پگلی زمانے بدل گئے ہیں' اب شوہروں کو سمجھ دار ہو جانا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر جاب کروگی تو تمہارے لیے ٹھیک ہوگا اور یہ قومی خدمت ہوگی میری جان' تم بور بھی نہیں ہوا کروگی۔" لیکن سمیرا کسی دلیل پر کان نہ دھرتی تھی۔
"اس کا خیال تھا کہ گھر بڑی جنت ہوتا ہے اگر گھر اچھا ہو اور شوہر بیوی میں اچھے مراسم ہوں' ذہنی اور قلبی ہم آہنگی ہو تو یہ بھی بڑی کامیابی ہوتی ہے بلکہ قومی خدمت بھی کہ اس طرح شوہر اپنے فرائض منصبی کو خوشی خوشی سرانجام دے گا اور خوامخواہ اپنے باس سے یا اپنے ماتحت سے نہیں الجھے گا۔"
اس کے یہ دلائل کبھی کبھی اکمل کو بے بنیاد لگتے تھے لیکن وہ اس کی خوشی میں خوش تھا۔ وہ فیکٹری میں اسسٹنٹ منیجر تھا' اچھی سیلری تھی اس کی' گاؤں میں کچھ زمین بھی تھی اور لاہور جیسے شہر میں اور وہ بھی ماڈل ٹاؤن جیسے علاقے میں ایک اچھا مکان۔ اسے پیسے کا لالچ تھا نہیں لیکن وہ بہت سمجھ دار اور روشن خیال انسان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سمیرا جاب کیوں نہیں کرتی اور کبھی کبھی یہ سوچنے لگتا کہ وہ اس کا اتنا خیال کیوں رکھتی ہے۔ اس طرح کئی ماہ گزر گئے۔
سمیرا نے گھر کو سچ مچ جنت بنا دیا تھا۔ اکمل بہت ہی خوش تھا' بہت ہی مطمئن۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ وہ سمیرا کو ہر طرح سکون دے' سمیرا خاصی سلجھی ہوئی لڑکی تھی لیکن کبھی کبھی اکمل کو اس کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ باتیں کرتی کرتی گم سی جاتی تھی اور اس کے فقروں میں ربط باقی نہیں رہتا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اس خیال کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔
سمیرا اور اکمل بچپن سے فیصل آباد کی ایک کالونی سمن آباد میں رہتے تھے اگرچہ ایک دوسرے کے رشتے دار نہ تھے لیکن یہ دور ایسا تھا جب لوگ ایک دوسرے پر اعتبار کرتے تھے اور ایک دوسرے کو سچ مچ قابل احترام اور قابل عزت سمجھتے تھے۔ سمیرا اور اکمل کی فیملی کے آپس میں اچھے مراسم تھے۔ اکمل کا باپ ایک کھاتا پیتا زمین دار تھا اور سمیرا کا والد بھی اچھی خاصی زمین کا مالک تھا۔ لیکن چونکہ ان کی تعلیم و تربیت اچھے اداروں میں ہوئی تھی اس لیے ان پر دیہاتی زندگی کے وہ اثرات جو دقیانوسی بنا دیتے ہیں' جو فرسودہ خیالات کو جنم دیتے ہیں نہ تھے۔ ان کی فیملیز بڑی روشن خیال تھیں۔ اس لیے اکمل اکثر و بیشتر سمیرا کے گھر چلا جاتا اور سمیرا اکمل کے گھر چلی آتی تھی۔
ان کی عمر کوئی چودہ' پندرہ سال کی تھی یہ آپس میں کھیلتے رہتے' مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال بھی کرتے رہتے اور آہستہ آہستہ لاشعوری طور پر ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے اور لاشعوری تعلق شعوری تعلق میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ان کے والدین کو ان کے بڑھتے ہوئے تعلقات پر کوئی خاص اعتراض بھی تو نہ تھا۔ چونکہ وہ خود بڑے روشن خیال اور کشادہ نظر تھے۔ اس لیے وہ اپنے بچوں پر غیر ضروری قدغن نہیں لگانا چاہتے تھے۔ چنانچہ یہ میل جول زیادہ بڑھ گیا یہاں تک کہ دونوں کی منگنی ہو گئی لیکن اکمل کے والد کا خیال تھا کہ اس کے بچے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر جانا چاہیے' وہاں سے کچھ سیکھنا چاہیے اور اسے زیادہ علم ہونا چاہیے کہ دنیا کے کیا رنگ روپ ہیں اور دنیا کیسے آگے بڑھ رہی ہے۔
اکمل کا بھی یہ خیال تھا کہ لیکن سمیرا کے لیے یہ بڑی تکلیف دہ بات تھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اکمل بیرون ملک جائے لیکن وہ اسے جانے سے روک بھی تو نہیں سکتی تھی اور پھر اکمل نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ بیرون ملک اس کا ہی ہو کر رہے گا۔ اسے ہی اپنی دلہن بنائے گا' اس نے جاتے وقت کہا تھا...... بہت ہی پیار سے کہا تھا۔
"دیکھو سمیرا تم بدل نہ جانا' یہ چاندنی راتیں' مسکراتے ہوئے دن' دلکش شامیں میری جان! میری معصوم سی محبت' کہیں تم بھول نہ جانا! میں بھی نہیں بھولوں گا' میں بھلا کیسے بھلا سکتا ہوں' کون اپنے پہلے پیار کو بھول سکتا ہے' بھلا سوچو تو!...... سوچو ناں۔"
سمیرا نے روتے روتے الوداع کہا اور اکمل اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن چلا گیا تھا اور سمیرا نے اپنی تعلیم جاری رکھی' اس

نے شہر کے کالج میں داخلہ لے لیا اور بڑی دل چسپی سے تعلیم حاصل کرنے لگی اس نے ایف ایس سی کا ارادہ کیا تھا وہ سمجھتی تھی کہ سائنسی علم ہی انسانی شعور کو جلا بخشتا ہے لیکن سائنس کے مضامین خاصے مشکل تھے۔ جیسے تیسے اس نے ایف ایس سی کر لی تھی لیکن اس کے بہت اچھے نمبرز نہیں آئے تھے۔ اس نے کئی سال پڑھائی چھوڑے رکھی' اکمل نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ اکمل کے والدین میں بھی کوئی جوش وخروش نہیں تھا۔

سمیرا حیران تھی کہ کیا اکمل بدل گیا ہوگا' وہ ایسا تو نہیں تھا' ان کی منگنی بھی ہو چکی تھی۔ اسے کچھ تو اپنی منگیتر کا خیال ہونا چاہیے تھا' اپنے پہلے پیار کی لاج رکھنی چاہیے تھی۔ ایک دو سال اور گزر گئے۔ اکمل اور اس کے والدین نے سمیرا اور اس کے والدین سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ سمیرا بہت پریشان رہنے لگی تھی۔ اپنی پریشانی کو دور کرنے کے لیے اس نے کتابوں کا سہارا لینا چاہا اور اپنی تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگرچہ پانچ سال میں بہت کچھ بھول چکی تھی لیکن اس نے ارادہ کیا کہ وہ بی ایس سی اور ایم سی ایس ہی ضرور کرے گی۔ اپنے ارادے کا ذکر اس نے اپنے والد سے کیا اور وہ بہت خوش ہوئے۔

''تم اپنی پڑھائی شروع کردو۔ وہ میرے دوست کا بیٹا ہے ناں شہزاد' وہ ایک کالج میں پڑھاتا ہے شاید وہ بیالوجی کا استاد ہے وہ تمہاری مدد کرے گا۔ بیالوجی ہی نہیں بلکہ سائنس کے ہر سبجیکٹ میں تم اس سے رہنمائی لینا شروع کردو وہ تمہاری اچھی خاصی رہنمائی کرسکتا ہے۔''

سمیرا کئی سال اس سے رہنمائی حاصل کرتی رہی۔ وہ بڑا خوش اخلاق' خوش طبع اور خوش مزاج نوجوان تھا اور وہ اس کے دکھ سکھ میں بھی شرکت کرنے لگا۔ سمیرا اس سے بہت متاثر ہوئی' اتنی متاثر کہ وہ اپنا ماضی بالکل بھول گئی' اکمل بھی اسے یاد نہ رہا' وہ بہت دور نکل چکی تھی اور اس معاملے میں اس کا کوئی رہنمائی کرنے والا بھی نہ تھا۔ وہ یہ جانتی تھی کہ وہ کسی طرح بھی شہزاد کو حاصل نہیں کرسکے گی کیونکہ یہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس کے والدین روشن خیال ہونے کے باوجود قول کے دھنی تھے چونکہ انہوں نے ایک دفعہ ہاں کردی تھی وہ بھی اس کی اپنی مرضی سے۔ اس لیے وہ جانتی تھی کہ وہ اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کریں گے اور نہ ہی سے کرنے دیں گے۔ سمیرا یہ بات خوب جانتی تھی۔

لیکن شہزاد کی ہوتی جا رہی تھی بلکہ بری طرح اس کی ہوگئی تھی۔ وہ محبت کے معاملے میں بڑی جذباتی سی تھی لیکن اتنا ضرور تھا کہ جب وہ نارمل ہوتی تو پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگتا' اسے یوں لگتا کہ وہ غلط رستوں پر چل پڑی ہے۔ لیکن اس کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اسے اپنے ماں باپ سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ معاشرے میں بھی دست وگریباں نہیں ہوسکتی تھی' وہ دو کشتیوں کی سوار تھی اور اسے یوں لگتا تھا کہ کوئی کشتی بھی اسے ساحل کی طرف نہیں لے جاسکے گی۔ بلکہ وہ دونوں کشتیوں میں اپنے ہاتھوں سے سوراخ کر رہی تھی۔ اپنی زندگی سے کھیل رہی تھی۔ اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا رہی تھی۔ اپنے ماضی کا خون بہا رہی تھی' اسے رات رات بھر نیند نہیں آتی' تڑپتی رہتی تھی لیکن سب کی یہ رائے تھی کہ اکمل سے دست کش نہ ہو وہ اس کا منگیتر ہے اور پہلی محبت ہے۔

تاہم اسے یہ ملال تھا کہ بلکہ شدید دکھ تھا کہ اکمل نے باہر جا کر اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا' کبھی نہیں پوچھا تھا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔ لیکن کبھی کبھی اسے بچپن کا اکمل اچھا لگنے لگتا تو بہت اسے اچھا لگنے لگتا تو اپنا سر دیوار سے ٹکرانے لگتی تھی اور بے ہوش ہو جاتی تھی' وہ کیا کرتی شہزاد بھی تو اس کے روئیں روئیں میں رچ بس گیا تھا۔ اس کی زندگی بن گیا تھا۔ اس کی سانسوں میں سما گیا تھا۔

سمیرا سائنس کی طالب علم تھی' اسے ادب سے کوئی زیادہ لگاؤ نہ تھا لیکن اب وہ ادیب اور شاعر بھی بنتی جا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ شاید اس کی زندگی یونہی گھل گھل کر ختم ہو جائے گی۔ وہ مر مٹ جائے گی۔ اس کی سہیلیاں اسے تسلی دیتی' اسے سمجھاتیں اور اپنی تنہائی اور شہزاد سے محفلوں کا ذکر اپنی فرینڈز سے بلاکم وکاست کردیا کرتی تھی۔ اس کی

فرینڈز اس سے بڑی محبت کرتی تھیں اور بظاہر انہوں نے اسے ٹوٹنے پھوٹنے سے بچانے کی کوشش کی اور اسے یوں لگا کہ شاید اس طرح وہ بچ جائے گی۔ وہ سنبھل جائے گی اور اس نے از خود ہی اکمل سے رابطے کم کرنا شروع کر دیئے اکمل نے اس کی بے اعتنائی پر افسوس تو نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس کا انداز کسی روایتی محبت کرنے والے جیسا تھا۔ وہ ہر بات عقل کے پیمانے پر پرکھنا چاہتا تھا۔

سمیرا نے اسے کبھی خط لکھے' ابھی وہ بیرون ملک میں ہی تھا' ادھر اس نے اپنے تعلقات' اپنا جذباتی رشتہ شہزاد سے بھی جاری رکھا' اسے یہ احساس کھائے جا رہا تھا کہ اگر وہ اکمل کی ہو گئی تو شہزاد کا کیا بنے گا۔ شاید شہزاد جی نہیں پائے گا۔ یہ کتنا ظلم ہو گا' لیکن وہ بے بس تھی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اکمل کی مانگ ہے اور اب یہ رشتہ ٹوٹنے والا نہیں ہے۔

خاندان کی روایات یہی تھیں' چنانچہ جذبہ بظاہر دم توڑنے لگا اور عقل کی فرمانروائی شروع ہو گئی اور وہ دن بھی آیا کہ وہ اکمل سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے والی تھی۔ ادھر شہزاد کو جب معلوم ہوا اس پر جو بیتی اس نے سمیرا کو کبھی نہیں بتایا اس کا خیال تھا کہ شاید اس طرح اس کی سمیرا مر جائے گی۔ ختم ہو جائے گی' اس نے سوچا کہ سمیرا کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے اس کے نزدیک محبت ایک بہت بڑی قربانی ہے اور کوئی محبت کرنے والا جس قدر قربانی دیتا ہے وہ اسی قدر عظیم ہوتا ہے۔ محبت اسے سلام کرتی ہے' عشق اسے گلے لگا لیتا ہے۔ زندگی اس کے پاؤں چومتی ہے' ضمیر مطمئن ہو جاتا ہے۔ بے شک ایک کسک باقی رہ جاتی ہے لیکن یہ کسک حاصل زندگی ہوتی ہے۔ اس کسک سے زندگی جنم لیتی ہے۔ شعر تخلیق ہوتے ہیں افسانے تحریر ہوتے ہیں اور زندگی میں ایک ایسا لطف آنے لگتا ہے جس کا اندازہ عقل کے پجاریوں کو نہیں ہو سکتا اور مادیت کے پرستار جس سے ناواقف ہوتے ہیں۔

شہزاد سمیرا کی شادی کی رسوم میں بھی شریک ہوا۔ اس نے اپنے آپ کو ٹوٹنے پھوٹنے نہیں دیا۔ مصنوعی مسکراہٹیں بھی اس کے ہونٹوں پر آئیں لیکن اندر ہی اندر وہ بڑا مضبوط ہو رہا تھا' بڑا توانا ہو رہا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ جسے بھی اپنا کہا وہ وہ اپنا ہی تو ہوتا ہے چاہے وہ کہیں بھی ہو۔ پھول کسی بھی شاخ پر کھلے حسین ہوتا ہے۔ ٹھنڈی ہوا جہاں بھی چلے تازگی عطا کرتی ہے۔ ٹھنڈا میٹھا پانی ہر ایک کے لیے آب حیات ہوتا ہے' اس نے اپنے آپ کو سمجھا لیا اور شاید وہ سمجھ بھی گیا۔

سمیرا بھی اپنے آپ کو سمجھا چکی تھی لیکن شاید وہ مکمل طور پر اپنے آپ کو نہیں سمجھا پائی تھی تاہم اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اکمل کو ہر طرح کی خوشی دے گی۔ وہ ایک مثالی شریک سفر بنے گی۔ وہ اکمل کو نظر انداز کیوں کرے گی؟ اکمل نے اس کا کیا نقصان کیا تھا؟ مانا کہ بیرون ملک جا کر اس نے اس سے کوئی رابطہ ہی نہیں رکھا تھا۔ شاید اس کی کوئی مجبوری ہو گی۔ شاید وہ بہت مصروف ہو گا۔ شاید اس کی خاندانی روایت کا تقاضا ہو گا۔ اس لیے وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ اکمل کو ہر خوشی دے گی۔ اکمل کو دل و جان سے چاہے گی اور جب دل و جان سے چاہے گی تو وہ بھی اس کا سہارا بنے گا۔ عقل نے اسے سمجھا دیا تھا کہ زندگی میں سب کچھ ممکن نہیں ہوتا اور اچھی بات یہی ہے کہ جب ملے اسے غنیمت تصور کیا جائے۔ غم دوش تو ہوش گنوا دیتا ہے اور زندگی یہی ہے کہ اسے برداشت کیا جائے۔ اسے خوبصورت بنانے کی ہر سبیل تلاش کی جائے۔ اس کی عقل اسے یہ سب کچھ سمجھا رہی تھی' سب کچھ بتا رہی تھی اور وہ اپنے شوہر کی ہر خوشی کو اپنا فرض سمجھ رہی تھی لیکن عقل راستہ تو دکھاتی ہے منزل نہیں بتاتی۔ جسم کے زخموں کو بھر دیتی ہے مگر روح کے زخموں کو نہیں بھر سکتی۔ عقل زندگی کی بڑی نعمت ضرور ہے لیکن سب کچھ نہیں ہے۔

یہ اسے معلوم تھا۔ سائنس کی طالب علم ہوتے ہوئے بھی معلوم تھا اور اب اسے یقین سا تھا کہ زندگی وہی ہے جو ہنس کھیل کر گزار دی جائے۔ بظاہر اس کی ذہنی کشمکش ختم ہو چکی تھی لیکن اکمل سے پیار کرتے ہوئے اکمل کو گلے لگاتے ہوئے وہ کبھی کبھی سہم سی جاتی تھی' تھم سی جاتی تھی۔ اکمل جب بھی اسے پیار سے پکارتا محبت سے بلاتا اور اسے چندا

کہتا تو اسے شہزاد کی یاد آ جاتی کیونکہ شہزاد بھی اسے چندا ہی کہا کرتا تھا۔ اسے ایسا لگتا کوئی آواز آ رہی ہے شہزاد دور سے یہ جملہ بول رہا ہے وہ ان آوازوں کو جھٹک دیتی اور دوڑ کر اکمل کے پاس جاتی۔ اسے ٹوٹ کر چاہتی۔ اس سے پیار کرتی لیکن اکمل کو اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید سمیرا ٹھیک نہیں ہے۔ اسے کوئی الجھن درپیش ہے اسے کوئی مسئلہ لاحق ہے لیکن وہ اس پر شک بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔ اسے کبھی کبھی یہ خیال ضرور آتا تھا کہ سمیرا نے وہ دس پندرہ سال کیسے گزارے ہوں گے جب وہ اس سے دور تھا لیکن اس نے مسئلے پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا اس کا خیال تھا کہ وہ چونکہ گھر میں تنہا رہتی ہے اس لیے شاید تنہائی اسے پریشان کر رہی ہو۔

گھر میں ایک ملازمہ تھی۔ لیکن ملازمہ تو ساتھی نہیں ہوتی چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی بہن کو یہاں بلا لے تا کہ سمیرا کا دل بہلتا رہے۔ اس نے اپنی بہن طاہرہ کو بلا بھیجا۔ اتفاق سے ان دنوں گرمیوں کی تعطیلات تھیں۔ طاہرہ کے لیے لاہور آنا آسان تھا بلکہ وہ خوش تھی کہ لاہور میں چھٹیاں گزارے گی اور پھر لاہور کے اپنے ہی مزے ہیں۔ کہتے ہیں ناں جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا اور پھر جو لاہور میں رہتا ہو اس کے کیا کہنے' طاہرہ فوراً لاہور پہنچ گئی۔ طاہرہ کی آمد سے گھر میں کچھ چہل پہل بڑھ گئی لیکن سمیرا کے لیے مسائل میں اضافہ ہو گیا۔ اب اس کے پاس چھپ چھپ کر رونے کی جگہ بھی نہیں رہی تھی وہ اپنے تکیے سے باتیں بھی نہیں کر سکتی تھی بلکہ خود کلامی بھی دشوار سی ہو گئی تھی اور اسے یوں لگا تھا کہ جیسے اس کا ذہنی تناؤ بڑھتا جا رہا ہو لیکن اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر ممکن کوشش کرے گی کہ وہ خوش رہے۔ طاہرہ آ کر اس کے پاس رہنے لگی چنانچہ وہ طاہرہ سے گپ شپ کرتی رہتی اس کا اور اپنا دل بہلاتی رہتی اور باتوں باتوں میں کچھ وقت کٹنے لگا۔ طاہرہ نے ایک دن باتوں ہی باتوں میں اسے بتایا کہ شہزاد سے پڑھنے جاتی ہے۔

"کیسے ہیں شہزاد! ٹھیک تو ہیں ناں! وہ کیسے پڑھاتے ہیں...... ان سے کون کون پڑھتا ہے...... تم کس وقت پڑھنے جاتی ہو...... تمہیں اچھے لگے ناں سر؟"

اس کے سوال تھے کہ ختم ہی نہیں ہو رہے تھے' طاہرہ ابھی بچی تھی اور تھی بھی بڑی ہی معصوم۔ اس نے اپنی بھابی کو بتایا کہ "سر شہزاد بہت اچھے استاد ہیں۔ پر بھابی کبھی کبھی وہ اداس ہو جاتے ہیں۔ بہت ہی اداس۔ پتا نہیں کیوں؟"

"اچھا طاہرہ تم نے پوچھا نہیں کہ کیوں؟"

"بھلا بھابی سر سے بھی کوئی ایسے سوال کرتا ہے؟"

بہت سی باتیں طاہرہ کرنا چاہتی تھی لیکن جان بوجھ کر سمیرا نے موضوع بدل دیا۔ شاید اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ شہزاد کے بارے میں زیادہ گفتگو کر سکتی لیکن اسے یہ جان کر کہ کبھی کبھی شہزاد بہت اداس ہو جاتا ہے۔ بہت دکھ ہوا۔ بہت ہی دکھ۔ اندر سے وہ پہلے ہی ٹوٹ پھوٹ گئی تھی اب اس کی ٹوٹ پھوٹ اور بڑھنے لگی تھی۔ اس نے اللہ سے دعا کی۔

"اے اللہ میری مدد کر...... مجھے حوصلہ دے...... میں جانتی ہوں کہ میں نے کسی کا دل توڑا ہے۔ پر میرا اپنا بھی تو دل ٹوٹا ہے تو دلوں کے راز جانتا ہے۔ تو ہی حوصلہ دینے والا ہے۔"

طاہرہ بڑی ہنس مکھ اور خوش باش لڑکی تھی۔ اسے اپنے بھائی سے بھی بہت پیار تھا اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنی بھابی کو خوش رکھے وہ یونہی چٹکلے چھوڑ دیا کرتی۔ بڑے مزے مزے کی باتیں کرتی تھی۔ سمیرا بے ساختہ ہنس دیا کرتی تھی لیکن ہنستے ہنستے یک دم رک جایا کرتی تھی جیسے ہنسی اس کا مقدر نہ ہو۔ جیسے مسکراہٹیں اس کے حصے میں نہ آئی ہوں۔ اس کی پوری خواہش ہوتی کہ دل کی بات زبان پر نہ آ جائے اسے معلوم تھا کہ دل کی بات زبان پر آ جانے سے کیا کیا قیامتیں ٹوٹتی ہیں۔ کیا کیا حشر بپا ہوتے ہیں۔ کیسے کیسے طوفان اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اکمل بڑا روشن خیال اور مثبت سوچ رکھنے والا نوجوان ہے اور اس سے بہت پیار کرتا ہے اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتا ہے۔ جب وہ فیکٹری سے واپس آتا تھا تو اس کا دل لگانے کی کوشش کرتا۔ لیکن بدقسمتی سے پیار کا جو اسلوب وہ تراشتا محبت کے جو بول وہ بولتا۔ چاہ کا جو طریقہ وہ اختیار کرتا وہ سمیرا کو شہزاد کی یاد دلاتا۔ شہزاد بھی تو ایسے ہی پیار کیا کرتا تھا یونہی چاہتا تھا یہی الفاظ ہوتے تھے اسکے یہی انداز ہوتا تھا اس کا۔ کیونکہ محبت کی زبان جو ایک ہوتی ہے۔ محبت کا رنگ جو ایک ہوتا ہے یوں اکمل کا پیار اسے سکون نہ دے پاتا' وہ اور بے قرار ہو جاتی۔ کبھی کبھی اسے اپنے آپ پر بڑا غصہ آنے لگتا۔

''میں کتنی بدقسمت ہوں۔ کتنی بدبخت! کہ مجھے پیار سازگار نہیں۔ کیا مجھ سے پیار چھن گیا؟ میرے حصے کا سبھی پیار لٹ گیا ہے؟ کیا ہوا اسے؟ اے خدا مجھے اتنی بڑی آزمائش میں نہ ڈال کہ میں برداشت نہ کرسکوں۔ ٹوٹ پھوٹ جاؤں۔ مٹ جاؤں اور تماشا بن جاؤ۔''

کبھی کبھی سمیرا یہ سوچتی کہ اس کی حالت تو شیکسپیئر کے کردار ہیملٹ جیسی ہے شاید ہیملٹ جیسے کردار سے اس کا کوئی لاشعوری رشتہ ہے تبھی تو وہ کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔ نہ اب کر پا رہی تھی گویا وہ ہیملٹ کی مجسم مونث صورت ہے۔ ''مس ہیملٹ'' کہہ لیجئے۔

کئی دن گزر گئے اچانک سمیرا کی ایک فرینڈ کا فیصل آباد سے ٹیلی فون آیا اس کی یہ فرینڈ اس کی مکمل صورت حال سے واقف تھی۔ سمیرا نے بھی اسے اپنا سب حال دل کہہ سنایا۔ تہمینہ نے اسے بتایا کہ شہزاد نے فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گا اور یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ وہ کبھی تمہارے لیے مشکل کا باعث نہیں بنے گا۔ تمہارے لیے دعائیں کرتا رہے گا۔ اس نے بتایا کہ شہزاد نے کئی بار اس سے بات چیت کی ہے وہ بہت دکھی ہے۔ وہ نہیں سمجھ پاتا کہ وہ کون سی مجبوری ہوتی ہے جب سب عہد و پیماں توڑ دیتی ہے۔ وہ کون سا جبر ہوتا ہے جو سب کچھ ملیامیٹ کردیتا ہے۔ راکھ کردیتا ہے۔ انسان اتنا مجبور کیوں ہے۔ ہمارا زمانہ ابھی قبائلی رسوم کے چنگل میں کیوں ہے؟

تہمینہ بہت دیر باتیں کرتی رہی اس نے دکھی سمیرا کو اور دکھی کردیا۔ کہتے ہیں نا جب مصیبتیں آتی ہیں اکیلی نہیں آتیں۔ ہجوم در ہجوم آتی ہیں۔ سمیرا کا ٹوٹا ہوا دل اور چور چور ہوگیا۔ اس کی روح کو اور کچوکے لگے۔ ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اے میرے خدا میری مدد فرما' مجھے اپنے پاس بلالے' میری ہمت کو اتنا نہ آزما کہ میں چیخ پڑوں' گلیوں کوچوں میں دیوانہ وار گھومنا شروع کردوں۔ دیواروں سے سر ٹکرانے لگوں اور رسوا اور بدنام ہو جاؤں۔ مجھے بچا۔ مجھے بچا' میں نے شہزاد سے کوئی خود غرضانہ محبت نہیں کی تھی۔ کوئی غرض پنہاں نہیں تھی وہ تھا ہی اتنا اچھا۔ اتنا ہمدرد اتنا دل آویز دکھ سکھ بانٹنے والا اور لطیف جذبات کا مالک کہ میں اس سے پیار نہ کرتی تو کیا کرتی؟'' وہ زور زور سے چیخ رہی تھی اور چلا رہی تھی کہ طاہرہ کمرے میں داخل ہوگئی۔

''بھابھی کیا ہوگیا ہے آپ کو؟ کیا ہوگیا ہے۔ میری اچھی بھابھی۔ مجھے تو بتائیں کیا بھیا تنگ کرتے ہیں یا امی یاد آرہی ہیں؟ آخر میں بھی آپ کی بہن ہوں۔ آپ کی اپنی بہن چھوٹی سی بہن؟''

''میری پیاری بہن۔ میری پیاری طاہرہ! تم کیا جانو کہ انسان کو کون کون سے روگ لگ جاتے ہیں کون کون سی بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ اللہ تمہیں بچائے تمہیں محفوظ رکھے۔''

طاہرہ نے یہ سارا واقعہ اکمل کو بتادیا اکمل پہلے ہی پریشان تھا اس کا خیال تھا کہ سمیرا کو کوئی ذہنی بیماری لاحق ہے کوئی نفسیاتی مسئلہ درپیش ہے۔ سمیرا نے اسے بتایا تھا کہ اسے کبھی کبھی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ دہری آوازیں۔ اکمل کا خیال تھا کہ شاید وہ سکنڈرز وفرینیا کی مریض ہے جس میں آوازیں دوہری سنائی دیتی ہیں۔ عجیب عجیب شکلیں دکھائی

دیتی ہیں عجیب عجیب خوشبوئیں اور ذائقے محسوس ہوتے ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ ڈاکٹر جواد بہت اچھے سائیکاٹرسٹ ہیں اس نے ان سے اپوائنٹمنٹ لے لی اور طاہرہ سے کہا کہ وہ اپنی بھابھی کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جائے۔ سمیرا پہلے تو چونک گئی۔

"نہیں اکمل میں نہیں جاؤں گی۔ میں نہیں جاؤں گی۔ میری جان! وہ میرا کچھ بھلا نہیں کر سکے گا۔ ہر گز نہیں کر سکے گا۔ مجھے معلوم ہے۔"

"نہیں سمیرا چندا تم جاؤ گی۔ جاؤ گی نا! دیکھو ضرور جاؤ۔ وہ تمہیں کوئی اچھا سا مشورہ دیں گے۔ بھلا چنگا کر دیں گے اور یوں سمیرا ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

سمیرا طاہرہ کے ساتھ کلینک پر پہنچ گئی ہے اور کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر نے سمیرا کو بلا لیا اور اس سے کچھ گفتگو کرنے لگا اور چند ٹیسٹ اپنے ہی کلینک سے کروائے اور طاہرہ کو باہر جانے کو کہا تا کہ وہ علیحدگی میں اس سے گفتگو کر سکے اور صورت حال کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

"جی آپ کا اصل مسئلہ کیا ہے؟"

"ڈاکٹر مسائل ہی مسائل ہیں اور سارے اصل مسائل ہیں اور ان میں سب سے بڑا مسئلہ میں خود ہوں۔ مجھے خود علم نہیں کہ میں صحت مند رہنا چاہتی ہوں یا بیمار۔ جینا چاہتی ہوں یا مرنا؟"

"دیکھیے میڈم یوں نہیں سوچتے۔ زندگی خدا کی بہت بڑی نعمت ہے اس کی اہمیت سے انکار کرنا کفر ہے اور پھر آپ جانتی ہیں کہ کوئی صرف اپنے لیے نہیں جیتا بلکہ دوسروں کے لیے بھی جیتا ہے۔"

"میں جانتی ہوں ڈاکٹر مگر میں جاننا نہیں چاہتی جاننے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔"

"کیا آپ اپنی روداد سنانا پسند کریں گی؟"

"ڈاکٹر میری کوئی روداد نہیں' میری کوئی کہانی نہیں۔ میں نے غلط کہا۔ میری کہانی تھی لیکن پھر میں کہانی بن گئی۔ میں شہزاد کے پاس پڑھنے گئی تھی لیکن جو پڑھا ہوا تھا وہ بھی بھول گئی۔ استاد کو اتنا دل آویز' جاذب نظر اور اتنی زیادہ سحر انگیز شخصیت کا مالک نہیں ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر میں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ کچھ کہنا چاہتی ہوں آپ ڈاکٹر ہیں آپ سے سب کچھ کہا جا سکتا ہے میں اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ پھر اور کہنے کی ضرورت نہ رہے۔ ڈاکٹر میں شہزاد کے پاس پڑھنے گئی تھی لیکن پھر کیا ہوا؟ معلوم نہیں کیا ہوا۔ میں صرف اور صرف اس کی ہو گئی اور اسے بھی اپنا بنا لیا اور اسے اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ وہ کسی اور کا بن سکے۔ کون سی قسم تھی جو میں نے نہیں کھائی تھی۔ کونسا وعدہ تھا جو میں نے نہیں کیا تھا۔ میں چیختی تھی۔ چلاتی تھی اور کئی کئی گھنٹے بلخصوص ہفتے کو میری چیخیں نکل جاتی تھیں۔ میں کہہ اٹھتی تھی۔ یہ ہفتہ کیوں آتا ہے اس کے بعد اتوار کیوں ہوتا ہے میں اتوار کو آپ سے کیوں نہیں مل سکتی۔ صرف صبح ہی کو کیوں ملتی ہوں۔ شام کو کیوں نہیں ملتی۔ رات کو تم کہاں ہوتے ہو۔

میں رات کو جائے نماز بچھا لیتی۔ دعا کرتی کہ خدا کرے اکمل کسی حادثے میں مارا جائے۔ وہ ختم ہو جائے میں کبھی کبھی تو کہہ اٹھتی۔ کتنی سنگ دل تھی میں...... کہ میرے ماں باپ مر جائیں جو میری راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں...... جانے کیا کیا کہہ اٹھتی ...... لیکن پھر ڈاکٹر جانے کیا ہوا...... کیسے ہوا؟ میں نے اپنے سارے وعدے ساری قسمیں بھلا ڈالیں۔ ہاں بھلا ڈالیں۔ میری فرینڈ نے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا۔ وہ کہتی تھیں شہزاد تمہارا نہیں ہو سکتا۔ اکمل تمہارا پہلا پیار ہے تمہارے دل کی پکار ہے دیکھو! اپنے حالات کی طرف دیکھو اپنی فیملی کی طرف دیکھو۔ چنانچہ میں نے شہزاد کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنا گلا دبا لیا۔ اکمل کو اپنا لیا۔ میں نے پوری کوشش کی کہ میں اکمل کو جو میرا اب شوہر تھا پورا پیار دے سکوں لیکن ڈاکٹر! میں ایسا نہیں کر پائی۔ میں پیار اکمل سے کرتی رہی ہوں لیکن لگتا یہ رہا ہے کہ میں شہزاد

کو پیار کر رہی ہوں۔ مجھے سب کچھ جھوٹا لگنے لگا ہے۔ میں فریب دے رہی ہوں اکمل کو۔ اپنے آپ کو جیسے میں شہزاد کو فریب دیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور بے ہوش ہوگئی۔ ڈاکٹر نے نرس کو بلایا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اپنا سارا علم بے کار نظر آنے لگا۔ اسے اتنا مشکل کیس پہلی بار ملا تھا۔ سمیرا ہوش میں آ گئی۔

"معاف کرنا ڈاکٹر میں نے جانے کیا کیا کہہ دیا۔"

"گھبرایئے نہیں! دنیا میں بڑے دکھی لوگ ہیں۔ آپ سے بھی زیادہ دکھی۔ میرے علم سے بھی زیادہ۔ زندگی برداشت کا نام ہے۔ حوصلے کا نام ہے۔ دوائیاں تو محض کھلونا ہوتی ہیں میڈم! علاج تو ہمیں اپنا خود کرنا ہوتا ہے۔ جب ہم میں حوصلہ ہی نہ ہو تو کوئی دوائی کارگر نہیں ہو سکتی۔"

"ڈاکٹر شاید آپ سچ ہی کہتے ہیں۔"

ڈاکٹر نے ادویہ کی ایک لمبی لسٹ اس کو تھمادی اور وہ گھر لوٹ آئی۔ ابھی اکمل فیکٹری سے نہیں آیا۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"طاہرہ مجھے ذرا آرام کرنے دو۔"

طاہرہ باہر آ گئی۔ اکمل کچھ دیر کے بعد فیکٹری سے واپس آیا۔ طاہرہ نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر کے پاس گئے تھے اور سمیرا اب آرام کر رہی ہے شاید ڈاکٹر نے آرام کرنے کو کہا ہے۔

گھنٹے گزر گئے۔ سمیرا باہر نہیں آئی۔ اکمل کو تشویش ہوئی اور اس نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ نہیں کھلا۔ دروازہ اندر سے بند تھا کوئی آواز بھی نہیں آئی۔ اکمل نے دروازہ بار بار کھٹکھٹایا۔ اکمل نے دروازہ توڑنے کی کوشش کی اور توڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب اندر گیا تو سمیرا بستر پر لیٹی ہوئی تھی اس نے اسے بلایا کوئی آواز نہیں آئی۔ وہ اس کے بہت قریب گیا۔ اسے چھوا لیکن وہ بے حس پڑی تھی۔ اس کے سرہانے ایک تحریر تھی۔ اکمل اسے اٹھا کر پڑھنے لگا۔

"اکمل میں نہ تمہاری ہو سکی...... نہ اپنی اور نہ اس کی...... مجھے معاف کر دینا۔

دل خستہ جو لہو ہو گیا کہ بھلا ہوا کہ کہاں تلک
کبھو سوز سینہ سے داغ تھا کبھو درد غم سے فگار تھا

......☆☆......

کوئی عید ایسی ہو

قرۃ العین سکندر

ماہ رمضان کی آمد آمد تھی۔ مگر اہل خانہ کے وہی معمولات زندگی تھے۔ جو گھر کا خاصہ ہوا کرتے تھے۔ کسی کو اس بات کی مطلق پرواہ نہ تھی کہ رمضان المبارک کی تیاری بھی کرنی ہوتی ہے۔ ہر سال یوں ہی ہوا کرتا تھا عدنان تو سارے روزے رکھا کرتے تھے مگر رمشا بی پی لو ہو جانے کا جواز تراش کر ایک روزہ بھی نہ رکھتی تھیں۔ گئے بندھے اوقات میں اٹھتیں آنا فانا پراٹھا تل کر عدنان کے سامنے لاکر رکھ دیتی تھی بے زاری سے نماز فجر کا انتظار کرتی جیسے ہی موذن اللہ اکبر کے نام کی صدا لگاتا جھٹ وضو کر کے نماز کے نام پر دو سجدے دے مارتیں اور ساتھ ہی سونے کے لیے چل پڑتیں نیند کا غلبہ ہر شے پر حاوی تر ہوا کرتا تھا۔ مگر اس مرتبہ رمشا پر تو جیسے کوئی مصیبت ٹوٹ پڑی تھی۔ کیونکہ اس
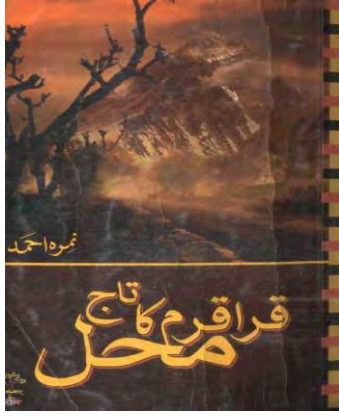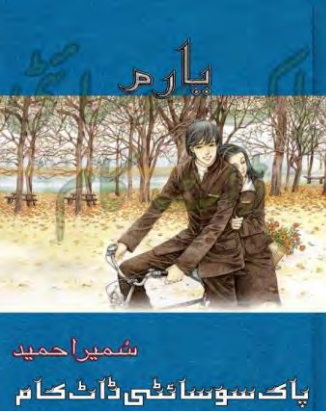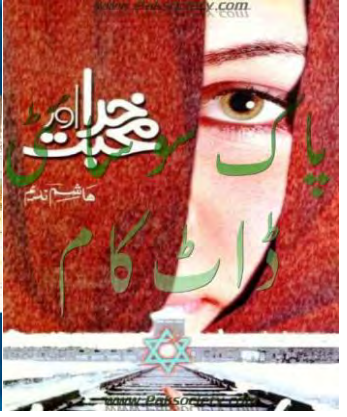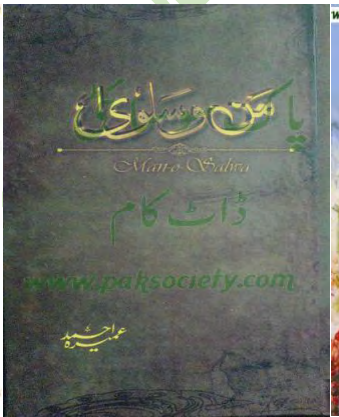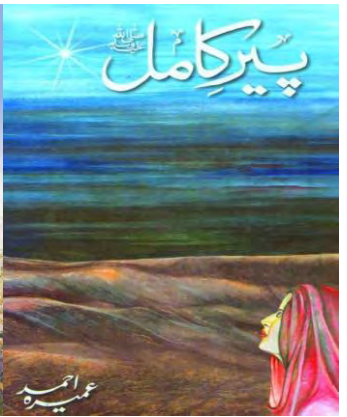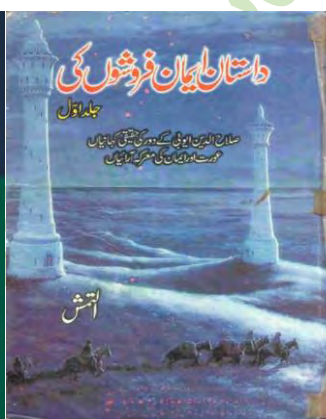
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

دفعہ رمضان میں راشدہ بیگم ساس نے یہاں عید منانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہر مرتبہ عید وہ اپنے بڑے بیٹے فرحان کے پاس مناتی تھیں۔ بہ ظاہر راشدہ بیگم ایک بے ضرر خاتون تھیں۔ بے حد عبادت گزار روایتی ساسوں سے الگ۔ مگر ان کی ایک ایسی صفت تھی جس کی بدولت ساس اور بہو کے درمیان وقتی چپقلش ہو جایا کرتی تھی۔ وہ تھی راشدہ بیگم کی اصول پسندی۔ جب وہ لغویات یا غیر اخلاقی حرکت دیکھتیں تو نصیحت کیے بنا نہ رہتی تھیں اور بہو کو نصیحت پسند نہ تھی۔

عدنان اور رمشا کے تین بچے تھے۔ نادیہ جو کالج میں پڑھتی تھی پھر احمر جو میٹرک میں تھا اور سب سے چھوٹا اشعر جو پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ یوں یہ ایک مکمل خوش حال گھرانہ تھا۔ مگر سب اپنی اپنی دنیا میں مگن اور مست تھے۔ تربیت کے فقدان کی بدولت دین سے دوری اختیار کیے ہوئے تھے۔ نادیہ کالج سے آنے کے بعد لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ جاتی تھی کبھی اسائن مینٹ بنانے کے بعد گھنٹوں دوستوں سے گپ شپ میں لگی رہتی۔ احمر سکول سے واپسی پر نزدیکی گراونڈ میں جا کر کرکٹ میچ کھیلنے چلا جاتا تھا شام ڈھلے واپسی ہوا کرتی تھی۔ چھوٹا اشعر سکول سے آتے ساتھ سکول بیگ ایک طرف پھینکتا اور کارٹون لگا کر بیٹھ جاتا ایک کے بعد دوسرا پھر تیسرا کارٹون کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے اشعر اپنے ہوم ورک کو پس پشت ڈال کر ٹی وی میں انہماک سے کارٹون دیکھتا رہتا تھا اس کے سکول سے مسلسل شکایات موصول ہو رہی تھیں۔ رمشا کی اپنی مصروفیات تھیں۔ فون پر گھنٹوں لگی رہتی تھی۔ وہاں سے فراغت نصیب ہوتی تو سونے کا پیریڈ اسٹارٹ ہو جاتا تھا جس کا دورانیہ خاصا طویل ہوا کرتا تھا یوں اہل خانہ کی عموی ملاقات رات کے کھانے پر ہوا کرتی تھی۔ یا ڈرامے پر۔ کیونکہ ماں کی دیکھا دیکھی نادیہ بھی رات کا ڈرامہ رغبت سے دیکھا کرتی تھی۔ ساس بہو کی لڑائی پر مبنی ڈرامے یا آزاد خیالی میں حد سے تجاوز کیے ہوتے۔ جو کم عمر بچیوں کے لحاظ سے ہرگز موزوں نہ تھے۔ بسا اوقات قبل از وقت چیزوں کو جاننا بہتر نہیں ہوا کرتا۔ رمشا کو اس بات کا احساس تک نہ تھا کہ نادیہ کے قلب و ذہن پر ان ڈراموں کے کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

ایک دن راشدہ بیگم نے ٹی وی پر ایک اصلاحی پروگرام لگا لیا تھا۔ وہ اصلاحی پروگرام شوق سے دیکھا کرتی تھیں۔ مگر دوسرے چینل پر بہو کے تفریحی ڈرامے کا وقت ہو چکا تھا۔ اور موڈ بے حد خراب ہو چکا تھا۔ راشدہ بیگم نے رمشا کی پریشانی بھانپ لی تھی۔ یوں بھی احمر اور نادیہ کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ اور تلاوت قرآن پاک کی بے حرمتی ہو رہی تھی انھوں نے یہ بے ادبی گوارا نہ کی ایک پل کو دل چاہا کچھ کہیں پھر بہو کا خراب موڈ دیکھ کر ارادہ ملتوی کر کے ٹھنڈی سانس بھری اور اپنے کمرے کی طرف چل دیں رمشا نے تیزی سے ریموٹ کنٹرول لیا اور چینل بدل ڈالا خاصی اونچی آواز میں۔ ماں بیٹی ٹک کر بیٹھ گئیں تھیں۔

ماما مجھے بھوک لگی ہے جلدی کھانا دیں۔ اشعر کو شدید بھوک لگ رہی تھی

بیٹا ابھی دیتی ہوں ذرا یہ سین ختم ہو جائے۔ تم ایسا کرو کچن سے چپس کا ایک پیکٹ لے کر کھا لو۔ رمشا نے اشعر کو پچکارتے ہوئے کہا تو وہ منہ بسورتا کچن کی جانب چل دیا۔ راشدہ بیگم نے یہ سارا منظر افسوس سے دیکھا ڈرامہ بچے کی بھوک سے زیادہ اہم تھا۔۔۔

اشعر بیٹا ٹی وی کی آواز کم کر دو مجھے نماز کی ادائیگی میں دقت ہو رہی ہے۔ راشدہ بیگم کا تسلسل بار بار ٹوٹ رہا تھا اس لیے وہ جائے نماز کا کنارہ موڑ کر باہر لاونج میں آگئیں تھیں انھوں نے تسبیحات بھی کرنا تھیں۔

دادو آپ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیں ناں سب کو ہی میرے کارٹون کے ساتھ مسلہ ہو جاتا ہے۔

اشعر کی بدتمیزی پر وہ اس کا منہ دیکھتی رہ گیں تھیں۔ بڑے بیٹے فرحان کے بچے بے حد سلجھے ہوئے اطاعت گزار تھے۔ بنا کہے ہر بات سمجھ جایا کرتے تھے ساری بات تو تربیت کی ہوا کرتی ہے۔ وہ دکھ اور صدمے کی کیفیت سے دوچار تھیں۔

الصلوٰۃ خیر من النوم

کی پاک صدا فضا میں گونج رہی تھی۔ نادیہ لحاف میں منہ چھپائے بیخبری سے گہری نیند سو رہی تھی۔ روزہ رکھنا تو در کنار نماز پڑھنا بھی ضروری خیال نہ کرتی تھی اٹھو بیٹا نماز فجر ادا کرو۔ راشدہ بیگم نے اسے جگاتے ہوئے کہا۔

سونے دیں ناں دادو اتنی اچھی نیند آ رہی ہے ساری نیند خراب کر دی کل سے کمرے کو بھی لاک لگا کر سونا پڑے گا۔

چھن سے کوئی چیز ان کے اندر ٹوٹی تھی جوان کے سارے وجود کو کرچی کرچی کر گئی تھی۔ یہی تو بات ہے کہ نماز نیند سے افضل ہے۔ کاش تمہیں اس بات کا۔ ادراک ہوتا۔

وہ دلگرفتہ سی مغموم دل کے ساتھ باہر آ گئیں۔

نادیہ بیٹا کل سے تم بھی روزہ رکھو گی تم پر روزہ فرض ہے۔ رات کے کھانے پر راشدہ نے کہا تو نادیہ سے پہلے رمشا بول پڑی نادیہ تو بھوک کی کچی ہے یوں بھی اسکی پڑھائی بہت سخت ہے سارا دن بھوکی رہے گی تو بیمار ہو جائے گی۔ راشدہ نے مدد طلب نظروں سے اپنے بیٹے۔ کی جانب دیکھا عدنان کی ساری توجہ کھانے پر مبذول تھی۔ راشدہ بیگم عمر کہ اس دور سے گزر رہی تھیں جہاں بسا اوقات سچ کی پاسداری کرنا مشکل ہو جاتی ہے۔ ان کی دلی آرزو تھی کہ ان کی اولاد دین پر کاربند ہو اللہ تبارک وتعالیٰ کی نام لیوا ہو۔ انھوں نے اضطراب کو نہاں خانوں میں جاگزیں ہوتے محسوس کیا۔ راشدہ بیگم کو ہر بات کے لیے بیٹے کو پریشان کرنا پسند نہ تھا۔ انھیں ایسی عورتیں سخت بری لگتی تھیں جو اپنے بیٹوں کو بہوؤں کے خلاف ورغلاتی تھیں۔ مگر یہ معاملہ ایسا نہ تھا جس پر وہ مزید خاموشی اختیار کیے رکھتیں۔

رات کے وقت حسب معمول سب افراد خانہ ڈرامے کے ڈراپ سین میں ڈوبے ہوئے پلک جھپکے بنا ڈرامہ کا لاسٹ ایپی سوڈ دیکھ رہے تھے تبھی عشا کی اذان موذن نے دینا شروع کی تھی۔ راشدہ بیگم کمرے سے باہر نمودار ہوئیں کسی پر اذان کی آواز کا مطلق اثر نہ ہوا تھا۔ انھوں نے بڑھ کر ٹی وی بند کر دیا۔ سب کا حیرت سے منہ کھلا کا کھلا رہ گیا کیونکہ آج سے پہلے انہوں نے کبھی کسی معاملے میں یوں دخل اندازی کر کے شدت اختیار نہ کی تھی۔ اذان کے ختم ہونے تک چہار سو گھمبیر خاموشی چھائی رہی۔ جیسے ہی اذان ختم ہوئی راشدہ سخت طیش میں بولیں۔۔ بہو اصلاحی پروگرام کے دوران تو تم بچوں کو خاموش کروانا بھی اپنی شان کے خلاف تصور کرتی ہو۔ خواہ کلام الٰہی کیوں نہ ہو۔ پرواہ تک نہیں ہوتی۔ اور جب تمہارے ڈرامے کا وقت ہوتا ہے تو پورے گھر پر سکوت چھا جاتا ہے۔ چاروں اطراف خاموشی کے بادل منڈلانے لگتے ہیں۔ یوں جیسے سر پر کوئی پرندہ بیٹھا ہے ذرا جو گردن گھومی اڑن چھو ہو جائے گا۔ نماز قضا ہوتی ہے ہو تمہاری بلا سے۔ بچوں کے کھانے تک کے اوقات تمہارے ڈرامے کی نذر ہو جاتے ہیں۔ جیسے تمہارے ڈرامے کے اوقات ویسے کھانے کے اوقات۔ یہاں اخلاقی صحت بگڑی سو بگڑی مادی صحت بھی بگڑی۔ تمہیں تو اپنی عیش و عشرت کی پڑی ہے بچوں کا تو حق ہی ادا نہیں کر رہی۔ کیا تمہیں احساس ہے یہ ننھے گلاب دین سے دوری اختیار کیے ہیں جسکی ذمہ دار سراسر تم ہو۔ روز محشر کیا منہ دیکھاؤ گی رب کو۔؟ میں یہ نہیں کہتی کہ تفریحی پروگرام نہ دیکھو مگر اعتدال کا دامن بھی ہاتھ سے جانے نہ دو۔ تمہارے ایک ایک نقش کی پیروی کرتے ہیں یہ بچے۔ انھیں اپنے نقش قدم پر چلاؤ مگر پہلا نمونہ خود بنو۔ میں نے بہت برداشت کیا مگر آج ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گیے۔

پیچھے کھڑے عدنان کی آنکھیں کھل چکی تھیں۔ اگلی صبح بہت روشن اور اجلی تھی سب نے روزہ رکھا تھا حتی کہ ننھے اشعر نے بھی۔ آج مسجد جاتے وقت عدنان اکیلے نہ تھے دو گلاب احمر اور اشعر بھی ان کے ساتھ تھے۔ یہ عید صحیح معنوں میں ایک یادگار عید ہوئی راشدہ بیگم نے فخر سے سوچا آج ان کا دل بے حد مطمئن اور خوش تھا ان کا یہاں عید منانے کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔

سباس گل

دعا

اے اللہ ہم عاجز بندے ہیں تیری پاکی بیان کرتے ہیں اور تیرے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ اے اللہ ہمارے صغیرہ کبیرہ چھوٹے بڑے ظاہر باطن اگلے پچھلے سارے گناہوں کو معاف فرما دے ہماری خطاؤں کو درگزر فرما' ہم سچے دل سے توبہ کرتے ہیں ہماری خطاؤں کو معاف فرما۔ اے اللہ جو جان کے گناہ کیے ہیں اور جو انجانے میں ہوئے ہیں سب کو اپنے حبیب پاک ﷺ اور قرآن پاک کے صدقے میں معاف فرما۔ اے اللہ ہمیں نجات عطا فرما تیری معافی بڑی چیز ہے۔ اے اللہ اگر تو نے معاف نہ کیا تو ہم کس کے در پر جائیں گے۔ اے اللہ تیرا در اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک ہمیں معافی نہ مل جائے اے اللہ اگر تو نے معاف نہ کیا تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ اے اللہ بے روزگار کو روزگار عطا فرما۔ اے اللہ ہمارے نگہبان ہمارے جان و مال عزت و آبرو مکان دکان سب چھوٹے بڑوں کی پوری طرح حفاظت فرما۔ اے اللہ ہمیں ہر قسم کی بلاؤں سے ناگہانی آفتوں اور مصیبتوں سے بچا اور اچانک موت سے بچا۔ ہمارے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ فرما۔ اے اللہ ہماری گھریلو مشکلات کو حل فرما ہمارے گھروں میں خیر و برکت عطا کر اے اللہ ہم سب کے گھر والوں میں سچی محبت اور پیار عطا فرما۔ اے اللہ! ماں باپ' بہن بھائیوں خاوندوں بیویوں میں سچی محبت دے اے اللہ بچھڑے ہوؤں کو ملا دے روٹھے ہوئے کو منا دے۔ اے اللہ ہماری دلی تمنائیں پوری فرما۔ اے اللہ ہمارے لڑکے لڑکیوں کو پاک دامنی نصیب فرما نیک ازواج نصیب فرما۔ ہم سب کا نصیب اچھا کر دے۔ اے قدرت والے ہماری ساری الجھنوں کو دور کر دے اور ہماری نیک مرادیں پوری کر دے اے اللہ ہم سب مسلمانوں کو دیس اور پردیس میں چین امن و سلامتی عطا کر۔ اے اللہ تنگ دستوں کی تنگدستی دور فرما۔ اے اللہ بے اولاد کو نیک اور صالح اولاد عطا فرما۔ اے اللہ حضرت آدمؑ جیسی توبہ نصیب فرما۔ اے اللہ ہمیں حضرت یعقوبؑ جیسی گریہ و زاری عطا فرما۔ اے اللہ حسن یوسفؑ جیسا حسن عطا فرما۔ اے اللہ حضرت ابراہیمؑ جیسی دوستی نصیب فرما۔ اے اللہ حضرت ایوبؑ جیسا صبر عطا فرما۔ اے اللہ حضرت داؤدؑ جیسا سجدہ شکر نصیب فرما۔ اے اللہ حضرت ابوبکر صدیقؓ جیسا سچا بنا۔ اے اللہ حضرت عمرؓ جیسی خدمت اسلام رعب و دبدبہ' شان و شوکت عطا فرما۔ اے اللہ حضرت عثمانؓ جیسی شرم و حیا اور خزانہ عطا کر۔ اے اللہ حضرت علیؓ جیسی شجاعت بہادری و سخاوت عطا فرما۔ اے اللہ حضرت محمد ﷺ جیسے تمام عمل نصیب فرما۔

آمین ثم آمین یارب العالمین

ملک یاسر...... گجرات

متوازن شخصیت

ایک روایت کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عقلمند شخص کے لیے لازم ہے کہ اس پر کچھ گھڑیاں گزریں۔

☆ ایسی گھڑیاں جبکہ وہ رب سے باتیں کرے۔
☆ ایسی گھڑی جبکہ وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔
☆ ایسی گھڑی جبکہ وہ خدا کی تخلیق پر غور کر رہا ہو۔
☆ اور ایسی گھڑی جبکہ وہ کھانے پینے کی ضرورتوں کے لیے وقت نکالے۔

گویا خدا کا وفادار بندہ وہ ہے۔ جس کے روز و شب کے لمحات اس طرح گزریں کہ کبھی اس کی بے قراریاں' اس کو خدا کے اتنا قریب کر دیں کہ وہ اپنے رب سے سرگوشیاں کرنے لگے کبھی یوم الحساب میں کھڑے ہونے کا خوف اس پر اس طرح طاری ہو کہ وہ دنیا ہی میں اپنا حساب کرنے لگے کبھی کائنات میں خدا کی کاریگری کو دیکھ کر وہ اس میں اتنا محو ہو کہ اس کے اندر اس کے خالق کے جلوے نظر آنے لگیں۔ اس طرح گویا خدا سے ملاقات میں اس کے لمحات گزر رہے ہوں۔

یہ الفاظ کسی انسان کا تعارف نہیں ہیں اس میں خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی شخصیت بول رہی ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے ظاہری جسم کے اندر جو پاک روح تھی اس میں ہر وقت اسی قسم کے ایمان افروز

احساسات جاری ہوتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص خود ان گھڑیوں کا تجربہ نہ کر رہا ہو وہ بھی اتنے اعلیٰ الفاظ میں اس بات کو بیان ہی نہیں کر سکتا۔ سبحان اللہ۔

جاوید احمد صدیقی......راولپنڈی

جوانی دیوانی

عالم جوانی مخلوق کے سر پر خالق کا وہ جواہرات سے بھرا ہوا تاج ہے جس کی چمک دمک سے ہر دیکھنے والے کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ یہ وہ ہرا بھرا گلشن ہے جس کے جاذب نظر پھولوں میں مسرت و شادمانی کا رنگ ہے، یہ وہ پر بہار وادی ہے جس میں حقیقی راحت و آرام کا سرچشمہ بہتا ہے۔ جب عالم شباب آیا تو جسم میں بجلی کی طرح رو دوڑنے لگی دل میں نت نئی تمناؤں کا ہجوم رہنے لگا، دماغ ہے کہ فلک پرواز تخیلات سے نت نئی راہیں بنا کر پیش کرتا ہے، آنکھیں ہیں کہ وہ دیدہ خون بن کر کسی غارت گر صبر و قرار کے جمال جہاں آرا کو دیکھنا چاہتی ہیں جس کی نگاہ تسکین سوز نے متاع دل پر ڈاکہ مارا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرت کے قریب اور ماحول کے مطابق بنایا ہے۔ لیکن آج کے انسان کا نہ صرف طرز زندگی غیر فطری ہے بلکہ یہ خود کو ماحول کے مطابق ڈھالنے کے بجائے اسے اپنی خواہشوں کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے کوشاں ہے یہی غیر دانشمندانہ سوچ انسان کو گناہوں کی گہری دلدل کی طرف دھکیل دیتی ہے، ان دونوں میں صبر و ضبط، تحمل برداشت پارسائی کا امتحان ہوتا ہے مبارک ہیں وہ لوگ جو اس پر خار راہ سے اپنے عفت و عصمت کے دامن کو بچا کر گزر جاتے ہیں اور اس جنت کی طرف دوڑتے ہیں جہاں ہمیشہ کی زندگی اور ہمیشہ کی جوانی ہے۔

عائشہ اعوان......رحیم یار خان

وطن

دل شکستہ و صد چاک کی قسم مجھ کو
ترے ہر اک خس و خاشاک کی قسم مجھ کو
پڑا جو وقت تو سب کچھ نثار کردوں گا
تیری زمین، تیری خاک کی قسم مجھ کو

راؤ تہذیب حسین تہذیب......رحیم یار خان

اقوال زریں

❁ لوگوں کو دعا کے لیے کہنے سے زیادہ بہتر ہے ایسے عمل کرو کہ لوگوں کے دل سے آپ کے لیے دعا نکلے۔

❁ دوست پھولوں کی طرح ہوتے ہیں انہیں گرم و سرد ہوا سے بچانا پڑتا ہے۔ کسی بھی دوست کے دل کو اس طرح نہیں توڑتے جیسا کہ شاخ سے پھول توڑا جاتا ہے۔

❁ کامیابی حوصلوں سے ملتی ہے اور حوصلے دوستوں سے ملتے ہیں، جبکہ دوست مقدروں سے ملتے ہیں اور مقدر انسان خود بناتا ہے۔

سیدہ طوبیٰ شاہ......کراچی

توبہ

یہ زلزلے شہر روشنی کے بدل گئے نالہ و فغاں میں
نوائے غم ہے ہر اک صدا میں
مہکتی شاموں کے پھول چہرے
دھوئیں کے بادل میں اٹ گئے ہیں
لہو میں رنگ تڑپ تڑپ کر گزر رہے ہیں
حیا کی پتلی جواں بیٹی سڑک پر بکھری
حریص نظروں سے منہ چھپائے
ردائے عصمت کو ڈھونڈتی ہے
سیاسی جلسوں میں حکمران ہمارے! نام اپنا نکھارتے ہیں
مگر یہ دعویٰ ہے ان کا یہ مملکت ہے عظیم جس میں
ہماری طاقت جمہوریت ہے اگر یہی وہ جمہوریت ہے
تو میری توبہ ہے ایسی زندگی سے

انتخاب: مہہ جبیں......کہروڑ پکا

جھوٹے انسان کی نشانیاں

جھوٹ بولنے والا نظر نہیں ملاتا۔
پلکیں زیادہ جھپکاتا ہے۔
اس کی آنکھوں کی پتلیاں ذرا پھیلی ہوتی ہیں۔
وہ اچانک بات شروع کرتا ہے اور جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سوالات سے کتراتا ہے۔
آپ کی توجہ ہٹانے کے لیے وہ آپ کے سوال کے جواب میں بھی ایک سوال کردے گا۔
اس کی آواز خواہ مخواہ تیز ہوجائے گی۔
بات کرتے وقت ہاتھ ملے گا انگلیاں چٹخائے گا۔
چہرے پر ہاتھ پھیرے گا یا کسی چیز کو کھٹکھٹائے گا۔

مسکان ظہور.....گھوکی

اقوال زریں

ہر لفظ میں مطلب ہوتا ہے اور ہر مطلب میں فرق ہوتا ہے۔

زندگی میں دو چیزیں ٹوٹنے کے لیے ہوتی ہیں سانس اور ساتھ۔ سانس ٹوٹنے سے انسان ایک بار مرتا ہے اور ساتھ ٹوٹنے سے بار بار مرتا ہے۔

وقت اور پیار دونوں زندگی میں اہم ہوتے ہیں وقت ہر کسی کے لیے نہیں ہوتا اور پیار ہر کسی سے نہیں ہوتا۔

نیند اور موت نیند آدھی موت ہے اور موت مکمل نیند۔

وقت اور سمجھ ایک ساتھ خوش نصیب لوگوں کو ملتے ہیں۔

وقت پر سمجھ نہیں آتی اور سمجھ آنے پر وقت نہیں رہتا۔

ریاض خان.....میر پور خاص

برائی اچھائی

برائی کی مثال ایسی ہے جیسے پہاڑ سے نیچے اترنا ایک قدم اٹھاؤ تو باقی قدم اٹھتے چلے جاتے ہیں اور اچھائی کی مثال ایسی ہے جیسے پہاڑ پر چڑھنا ہر قدم پچھلے قدم سے زیادہ مشکل، مگر ہر قدم پر بلندی ملتی ہے۔

نورین تبسم.....لاڑکانہ

دوست

دوست ایک ایسا درخت ہے جو صرف دل کی زمین پر اگتا ہے۔ اس کا پانی ''سچائی'' ہے اور اس کا بہترین ساتھی صبر ہے۔ اس کا سایہ ''اعتماد'' ہے۔ اس کے پتے ''امید'' ہے۔ اس کی ٹہنی ''چاہت'' ہے۔ اس کا تنا ''اتفاق'' ہے اور اس کا پھل ''وفا'' ہے۔

عبدالخالق.....کراچی

فلسفہ محبت

❖ عورت کی مٹی محبت سے گندھی ہے اور مرد اس مٹی کے زرخیز پن سے ناآشنا ہے۔

❖ عورت محبت نہ ملنے پر اکتفا کرلیتی ہے مگر مرد ایک عورت پر کبھی بھی اکتفا نہیں کرتا۔

❖ عورت بانٹی ہوئی محبت کبھی نہیں لیتی۔

❖ محبتوں کے کاروبار میں خسارے ہمیشہ عورتوں کے کھاتے میں آتے ہیں۔

❖ عورت مجسم وفا، خلوص پیار اور چاہت ہے۔

❖ عورت قربانی کا دوسرا نام ہے۔

❖ عورت قربانی دینا جانتی ہے قربانی لینا نہیں۔

رضوانہ اسحاق.....بلیر، کراچی

سمجھنے کی باتیں

■ زندگی انسان سے وفا نہیں کرتی لیکن انسان اس پر وفا کی آخری حد تک یقین رکھتا ہے۔

■ پھول جب کھلتا ہے تو آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتا ہے جب خوش بو دیتا ہے تو روح کو معطر کرتا ہے لیکن جب اپنے ساتھ لگے کانٹے چبھوتا ہے تو دل کے ٹکڑے کرتا ہے۔

■ دعا انسان کی خواہشات کی تکمیل کا سب سے بڑا ہتھیار ہے بشرطیکہ اس میں خلوص نیت ہو۔

■ پرخلوص دوستی دنیا کے تمام رشتوں سے بلند و بالاتر ہے۔

■ محبت ایک پاکیزہ رشتہ ہے جو انسان کو خدا کی بندگی سکھا دیتا ہے۔

فاطمہ بٹ.....جہلم

قیمتی موتی

انسان بھی کتنا نادان ہے زندہ رہنے کے لیے کتنے جتن کرتا ہے کتنوں کو فریب دیتا ہے لیکن اس حقیقت کو فراموش کردیتا ہے کہ ایک ہی لمحہ میں اس کو یہ ہنستی مسکراتی اور جگمگاتی دنیا کو چھوڑ دینا ہے۔ صرف ایک ہی سانس کا فاصلہ اس دنیا سے اس دنیا میں، انسان دنیا میں اکیلا آتا ہے اور اکیلا ہی مرتا ہے تو پھر زندگی اور موت کے درمیانی عرصہ کے لیے اس سہارے کا فریب کس لیے دیا جاتا ہے وہ اکیلا ہی کیوں نہیں جی لیتا۔

عبدالہادی.....کراچی

باتیں یاد رکھنے کی

○ لوگ بیماری کے خوف سے غذا چھوڑ دیتے ہیں لیکن عذاب الٰہی کے خوف سے گناہ نہیں چھوڑتے۔

○ جو شخص گناہ سے پاک ہو وہ نہایت دلیر ہوتا ہے اور جس میں کچھ عیب ہوں وہ سخت بزدل ہوجاتا ہے۔

○ برائیوں سے پرہیز کرنا نیکیاں کمانے سے بہتر ہے۔

○ مسافر خانہ ہے مگر بدبختوں نے اسے اپنا وطن بنا رکھا ہے۔

حسد نہ کرنے سے انسان کا بدن تندرست رہتا ہے۔

شائستہ جٹ......راولپنڈی

تلخ حقائق

☆اس دنیا میں انسان ہر چیز کے پیچھے بھاگتا ہے مگر دو چیزیں خود انسان کا پیچھا کریں گی ایک اس کا رزق اور دوسرا اس کی موت۔

☆انسان گناہ کرنے سے جہنم میں نہیں جاتا بلکہ گناہ کرنے کے بعد مطمئن رہنے اور توبہ نہ کرنے کی وجہ سے جہنم میں جاتا ہے۔

☆میں دنیا کو اپنی جوتوں کی نوک پر رکھتا ہوں۔

سکندر حیات......رحیم یار خان

خوب صورت زندگی

فجر کی نماز کو اپنا نصیب بنالو۔

ظہر کی نماز کو اپنا مقدر بنالو۔

عصر کی نماز کو اپنی تقدیر بنالو۔

مغرب کی نماز کو اپنا مستقبل بنالو۔

عشا کی نماز کو اپنی امید بنالو۔

پھر دیکھو زندگی کتنی خوب صورت لگتی ہے۔

انجم انصار...... کراچی

انمول

❀زندگی میں دو باتیں تکلیف دیتی ہیں' ایک جس کی خواہش ہو اس کا نہ ملنا اور دوسری جس کی خواہش نہ ہو اس کا مل جانا۔

❀کسی کی حوصلہ شکنی نہ کرو' کیا پتا وہ اپنی آخری امید لے کر آیا ہو۔

❀انسان دکھ نہیں دیتا' انسان سے وابستہ امیدیں دکھ دیتی ہیں۔

❀اگر آپ سب کچھ کھو چکے ہو تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ جو سب کچھ کھو دیتا ہے' اس کے پاس پانے کے لیے پوری دنیا ہوتی ہے۔

اسحاق جتوئی......میانوالی

اسلام میں سیکیورٹی کا تصور

ایک دفعہ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کسی کام سے جارہے تھے ایک سیاح کو پتا چلا کہ وہ مسلمانوں کے امیر ہیں تو وہ دیکھ کر بہت حیران ہوا' بھاگا بھاگا آپؓ کے پاس پہنچا اور پوچھا۔

''آپ مسلمانوں کے امیر ہیں؟''

''آپؓ نے جواب دیا۔''میں ان کا امیر نہیں بلکہ ان کا محافظ ہوں۔''

سیاح نے پوچھا۔''آپ اپنے ساتھ حفاظتی دستہ کیوں نہیں رکھتے؟''

آپ نے جواب دیا۔''عوام کا یہ کام نہیں کہ وہ میری حفاظت کریں یہ تو میرا کام ہے کہ میں ان کی حفاظت کروں۔''

عقیلہ راحیل......فیصل آباد

لطیفہ

ایک کالج میں رزلٹ کا دن تھا' ایک دوست دوسرے دوست سے ''یار میرے ساتھ میرے ابو کھڑے ہیں تو جلدی سے جا اور رزلٹ دیکھ کر آ۔ اگر میں ایک پیپر میں فیل ہوا تو کہنا ایک مسلمان بھائی سلام کہتا ہے' اگر دو میں فیل ہوا تو کہنا دو مسلمان بھائی تمہیں سلام کہتے ہیں۔''

دوست گیا اور تھوڑی دیر بعد آکر بولا۔''یار پوری امتِ مسلمہ تمہیں سلام کہتی ہے۔''

عشرت نور......کراچی

محبت کیا ہے؟

محبت کیا ہے؟ محبت کتاب ہے اخبار نہیں جو آج پڑھا اور کل باسی ہوجائے۔ محبت ٹشو پیپر کا باکس نہیں جسے استعمال کے بعد پھینک دیا جائے۔ محبت تو عطر میں بھیگا ہوا رومال ہے جو ہزار بار دھل جائے تو بھی عطر کی مہک دیتا رہتا ہے اور ہر وقت استعمال میں رہتا ہے۔ محبت کرنے والوں کے درمیان ذات کی نفی' وقت کی کمی' مالی مسائل اور ذاتی رکھ رکھاؤ حائل نہیں ہوتے۔ محبت تو شیئرنگ کا دوسرا نام ہے بیگانگی کا نہیں۔

عاصم بٹ......گوجرانوالہ

خوش بوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

حمد باری تعالیٰ

ایک مٹی سے بنایا ایک مٹی میں سمایا
یہ سب کرم میرے سچے رب نے فرمایا
تو، یا شاہ ہو گدا ہو حقیقت سب کی یہی
جو نظر گھمائے تو ایک ہی آسمان بنایا
آسمان کو سروں پر چھتری نما بنایا
آسمان کو سورج، چاند، ستاروں سے سجایا
مٹی کا پتلا بنا کر کہیں دل کہیں دماغ بنایا
حوا کو بنا کر آدم کی پسلی میں سمایا
پھر اسی سے آدم کی نسل کو چلایا
کبھی نوحؑ کبھی ابراہیمؑ کبھی موسیٰؑ کو بنایا
انسانوں کی بھلائی کے لیے کیا کیا اپنایا
ابراہیمؑ کو آگ اور عیسیٰؑ کو سولی چڑھایا
کبھی دے کر آنکھیں اس میں جہاں بسایا
کبھی نکال کر جان اس کو موت کا مزہ چکھایا

صغریٰ کوثر......

اجنبی

کتنا اچھا ہوتا
ہم اجنبی ہی رہتے
کتنا اچھا ہوگا
نگاہوں سے اوجھل ہی رہتے
دل بستگی میں سکوں بھی گنوا دیا
عجز ہمت میں خود کو بھی ہرا دیا
رنجور لمحوں میں وہ تیرا
آغوش وداع یاد آنا
سپاس میرا یوں کرنا
اک دم سرد یوں بھرنا
جب یاد کرنا مجھے
بوسہ پیار کا دینا مجھے
خفا جب مجھ کو کرنا
قرار نہ خود کو آنا
پھر
کہاں تھا وہ اک اجنبی
تھا وہ اپنا اپنا سا

عنبرین اختر......لاہور

غزل

کبھی تھک کر سو گئے ہم کبھی رات بھر نہ سوئے
کبھی ہنس کے غم چھپایا کبھی منہ چھپا کے روئے
میری داستان حسرت وہ سنا سنا کر روئے
میرے آزمانے والے مجھے آزما کر روئے
شب غم کی آپ بیتی جو سنائی انجمن میں
کوئی سن کے مسکرائے کوئی مسکرا کے روئے
میں ہوں بے وفا میرا نام بے بسی ہے
میرا کوئی بھی نہیں ہے جو گلے لگا کے روئے
میرے پاس سے گزر کر میرا حال تک نہ پوچھا
میں یہ کیسے مان جاؤں کہ وہ دور جا کے روئے
وہ ملے جو راستے میں تو بس اتنا اس سے کہنا
میں اداس ہوں اکیلا میرے پاس آ کے روئے

عائشہ اعوان......رحیم یار خان

عید

اجلی اجلی دھوپ کی چادر
عید کے دن بھی کیوں میلی ہے
دکھ کی کالی آندھی کیونکر
میرے دل میں پھیلی ہے
نہ کوئی سرخی میرے لب پر
نہ کوئی کاجل آنکھوں میں
نہ ہاتھوں میں کنگنا چوڑی
نہ ہے پائل پیروں میں
میرے گھر کے دروازے پر
دستک دینے آجاؤ ناں
پوری کر کے ساری رسمیں
میری عیدی دے جاؤ ناں

انتخاب: پرنس افضل شاہین......بہاولنگر

غزل

قید تنہائی سے ہمیں چھٹکارا نہیں ملتا

اب کسی سے بھی انداز ہمارا نہیں ملتا
قسمت میں ہی نہ ہو وفا تو کسی سے کیا گلہ
عشق میں ڈوبنے والوں کو گناہ نہیں ملتا
کیوں روتا ہے اکیلا بیٹھ کر کسی کی خاطر
جو ایک بار چھوڑ جائے دوبارہ نہیں ملتا
کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ مل جاتی ہے ہر چیز
لیکن جو آسمان سے ٹوٹ جائے وہ ستارہ نہیں ملتا
کیوں تلاش کرتے ہو وفا دنیا میں اے دوست
یہاں تو اپنوں سے بھی سہارا نہیں ملتا
انتخاب: شجاع بخاری......تلہ گنگ

غزل

اگرچہ دل نہیں چاہتا مگر جانا ضروری ہے
جدا ہو کر وفا کو آزمانا ضروری ہے
گر نہ سمجھایا اسے تم نے تو یہ رسوا کردے گا
یقین مانو اس دل کو سمجھانا ضروری ہے
بدنامیوں کے بوجھ سے محبت مرنے لگتی ہے
مگر دنیا سمجھتی ہے کہ فسانہ ضروری ہے
یہ سچ ہے تجھے پانے کو ہزاروں لوگ مرتے ہیں
مگر جان دینے کو مجھ سا دیوانہ ضروری ہے
اک تیرے نہ ہونے سے یہ محفل ویران لگتی ہے
تجھے کیسے بتاؤں میں تیرا آنا ضروری ہے
میری قربت کی نہیں چاہت تو کردے قتل خود مجھ کو
کیا میرے پہلو سے تیرا یوں سرک جانا ضروری ہے
میں بے گھر ہو کے بھی فاروق بہت مسرور ہوں لیکن
انا میری یہ کہتی ہے کوئی ٹھکانہ ضروری ہے
عمر فاروق ارشد......فورٹ عباس

غزل

محبت کے تقاضوں کو نبھانا کس کو آتا ہے
غم دل کو چھپا کر مسکرانا کس کو آتا ہے
کوئی تو ہوگی مجبوری کہ اٹھ کر ہم چلے آئے
تیری محفل سے ورنہ لوٹ آنا کس کو آتا ہے
یہ مے خانہ ہے یا ہر چیز سے مستی جھلکتی ہے
یہاں با ہوش پینا اور پلانا کس کو آتا ہے
یہاں پر نفرتیں پھیلانے والے بے حساب ہوں گے
دلوں میں پیار کی شمعیں جلانا کس کو آتا ہے
حسینوں کی کمی کوئی نہیں یہ بات پکی ہے
بجز ان کے یہاں نخرے دکھانا کس کو آتا ہے
خلوص دل سے تیرے چاہنے والوں کی ہمت ہے
تری محفل میں ورنہ آنا جانا کس کو آتا ہے
یہ فن حساس لوگوں کے قمر حصے میں آتا ہے
دلوں میں سوئے جذبوں کو جگانا کس کو آتا ہے
ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم

غزل

صبح کو باتیں کریں تصویر سے
شام کو ہم ہوئے تنویر سے
اب ہماری بزم کا حصہ بنو
راہ نکلے گی یہاں تدبیر سے
آؤ تم کو ساری خوشیاں سونپ دوں
لگ رہے ہو تم وہاں دلگیر سے
عشق کے جذبوں کو لکھا جب ظریف
بچھڑے رانجھے بھی ملے ہیں ہیر سے
سوز دل گر چاہیے اشعار میں
پڑھتے رہو، ملتے رہو تم میر سے
آؤ اپنی بزم میں لے کر چلوں
ہر گلا ہٹ جائے گا تقدیر سے
اپنی ہی آواز کو پہچان دو
شور سے بچتے رہو اور بھیڑ سے
بے کس و محتاج سب ہیں بے نوا
پہلے نوا مشروط تھی زنجیر سے
سود و زیاں اپنی جگہ لیکن ظریف
آؤ کچھ سیکھیں ذرا تسخیر سے
ظریف احسن

غزل

گرمی شوق نظارا کا اثر تو دیکھو
گل کھلے جاتے ہیں وہ سایہ در تو دیکھو
ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو، پندگرو، راہ گزر تو دیکھو
وہ تو وہ ہے تمہیں ہوجائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو
وہ جواب چاک گریباں بھی نہیں کرتے ہیں

دیکھنے والوں کبھی ان کا جگر تو دیکھو
دامن درد کو گلزار بنا رکھا ہے
آؤ اک دن پرخوں کا ہنر تو دیکھو
صبح کی طرح جھمکتا ہے شب غم کا افق
فیض تابندگی دیدہ تر تو دیکھو
انتخاب: عبدالجبار رومی انصاری...... لاہور

غزل

چرا کر لے گیا جام اور پیاس چھوڑ گیا
وہ اک شخص جو مجھ کو اداس چھوڑ گیا
جو میرے جسم کی چادر بنا رہا برسوں
نجانے کیوں مجھے وہ بے لباس چھوڑ گیا
دکھائی دیتا نہیں دور تک کوئی منظر
وہ اک دھند میرے آس پاس چھوڑ گیا
وہ ساتھ لے گیا ساری محبتیں اپنی
ذرا سا درد میرے دل کے پاس چھوڑ گیا
ساجدہ زید...... وریووالہ چیمہ

غزل

اشک گرتے ہیں میری سانس سنبھل جاتی ہے
دے کر ایک درد نیا شام نکل جاتی ہے
اس کو دیکھوں تو میرے درد کو ملتا ہے سکون
اس سے بچھڑوں تو میری جان نکل جاتی ہے
عشق کچھ ایسے مٹاتا ہے نشانِ ہستی
جیسے ہر رات اجالوں کو نگل جاتی ہے
زخم بھرتا ہی نہیں اس کی جدائی کا مگر
پھر اس کی یاد نیا درد اگل جاتی ہے
وہ اگر دل پہ میرے ہاتھ ہی رکھ دے
ٹوٹتی سانس بھی کچھ دیر سنبھل جاتی ہے
فریحہ شبیر...... شاہ نکڈر

غزل

یہ عید تیرے شہر میں بھی آئی ہوگی
تو نے بڑی خوشی سے منائی ہوگی
وہ گرم گرم سوئیاں بنائی ہوں گی
اپنے نازک ہاتھوں پر چوڑیاں کھنکائی ہوں گی
مجھے تو عید کا کچھ معلوم نہیں ہوتا
میں تو اس دن عید مناؤں گا

جس دن یہ تیری میری ختم جدائی ہوگی
نائمہ رحمان...... کراچی

غزل

میں کسی اور کا ہوں اتنا بتا کر روئی
وہ مجھے مہندی لگے ہاتھ دکھا کر روئی
عمر بھر کی جدائی کا خیال آیا تھا شاید
وہ مجھے پاس اپنے دیر تک بٹھا کر روئی
اب کے نہ سہی ضرور حشر میں ملیں گے
یکجا ہونے کا دلاسہ دلا کر روئی
مجھ سے زیادہ بچھڑنے کا غم اس کو تھا
وقتِ رخصت وہ مجھے سینے سے لگا کر روئی
میں بے قصور ہوں قدرت کا فیصلہ ہے یہ
لپٹ کے مجھ سے بس وہ اتنا بتا کر روئی
مجھ پر ایک قرب کا طوفان ہو گیا ہے
جب میرے سامنے میرے خط جلا کر روئی
میری نفرت اور عداوت پگھل گئی ایک پل میں
وہ بے وفا ہے تو کیوں مجھ کو رلا کر روئی
سب شکوے میرے ایک پل میں بدل گئے وصی
جھیل سی آنکھوں میں جب آنسو سجا کر روئی
کامران خان...... کوہاٹ

ابھی عمر باقی ہے

ابھی اک عمر باقی ہے
پچھلے موسم میں اترنے والی
گلاب رُت کا ہر اک دل ربا منظر
میری آنکھوں میں تازہ ہے
ابھی ہیں میری پلکوں پہ
دیے چاہت کے روشن
ابھی اس روزنِ دل پہ چاند کا عکس
کئی باتیں کیا کرتا ہے
ہے ابھی خوابوں کی فصل شاداب بہت
ابھی تو
میرے دل میں خواہشیں رقصاں ہیں
ابھی اس پل
کسی انہونی کا خدشہ نہیں مجھ کو
ابھی

ان بوجھل پلکوں کی منڈیروں پر
روشن چراغوں کو
کسی طوفان کا اندیشہ نہیں
میرے چاروں طرف
میرے خوابوں کا بسیرا ہے
سنو جاناں!
ابھی مجھ کو
اس خواب سے بیدار نہ کرنا
کسی خواہش کو بھی
اس طلسم بے خودی سے
آزاد نہ کرنا
ابھی کچھ دیر، بس کچھ اور پل
یہ کھیل چلنے دو
ذرا مجھ کو سنبھلنے دو
کہ
ابھی اک عمر باقی ہے
سسکنے کو، آنسو بہانے کو
گئے موسم کی گل رُت کے
حسین لمحوں کی راکھ
چننے کو
گزرتے وقت کے ہر پل کو
عذاب جان کہنے کو
ابھی اک عمر باقی

زرین صدیقی امبر......

غزل

دنیا سے مجھے پیار تھا، سب بھول چکا ہوں
اک شخص میرا پیار تھا سب بھول چکا ہوں
وہ ہجر کی راتوں کے سلگتے ہوئے لمحے
آنکھوں پر کوئی بار تھا سب بھول چکا ہوں
ہاں، میری خطا تھی کہ تجھے ٹوٹ کر چاہا
ہاں میں ہی گناہ گار تھا سب بھول چکا ہوں
بخشی ہے مجھے پیار کے بدلے میں جدائی
جو بھی تیرا کردار تھا سب بھول چکا ہوں
آنکھیں شب فرقت میں رہا کرتی تھیں پُرنم
میں تیرا طلب گار تھا سب بھول چکا ہوں
بس اتنا مجھے یاد ہے کہ وصل کی اک شب
اقرار تھا، انکار تھا، سب بھول چکا ہوں
اک شخص نے پاگل بنا رکھا تھا مجھے بھی
میں کتنا سمجھ دار تھا سب بھول چکا ہوں

شہزادی سعادت......ڈیرہ اسمٰعیل خان

غزل

مرحلے شوق کے دشوار ہوا کرتے ہیں
سائے بھی راہ کی دیوار ہوا کرتے ہیں
وہ جو سچ بولتے رہنے کی قسم کھاتے ہیں
وہ عدالت میں گناہ گار ہوا کرتے ہیں
صرف ہاتھوں کو نہ دیکھو کبھی آنکھیں بھی پڑھو
کچھ سوالی بڑے خود دار ہوا کرتے ہیں
وہ جو پتھر یونہی رستے میں پڑے رہتے ہیں
ان کے سینے میں بھی شاہکار ہوا کرتے ہیں
صبح کی پہلی کرن جن کو رلا دیتی ہے
وہ ستاروں کے عزادار ہوا کرتے ہیں
جن کی آنکھوں میں سدا پیاس کے صحرا چمکیں
در حقیقت وہی فنکار ہوا کرتے ہیں
شرم آتی ہے کہ دشمن کے سمجھیں محسن
دشمن کے بھی تو معیار ہوا کرتے ہیں

انتخاب: صفیہ سعدیہ......عثمان والہ

شب زاد

شہاب شیخ

سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے کہ انسان چاند کے بعد اب مریخ اور دیگر سیاروں کو چھو رہا ہے مغربی ممالک کی لیبارٹریوں میں جانوروں کے ساتھ اب انسان کی کلوننگ کی کوششیں کی جا رہی ہیں بلکہ اس میں سائنس دانوں نے کامیابی بھی حاصل کر لی ہے لیکن اس کے باوجود مغرب ہو یا مشرق شمال ہو یا جنوب ہر جگہ کے لوگوں کا ان دیکھی مخلوق پر یقین بڑھتا جا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ہالی ووڈ میں سب سے زیادہ بزنس پراسرار ہارر فلمیں ہی کرتی ہیں۔ مغربی ادب میں بھی پراسرار ناول اور کہانیاں زیادہ لکھی جاتی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں تو لوگ پراسرار واقعات پر ایمان کی حد تک یقین رکھتے ہیں۔

ڈائجسٹوں کی دنیا میں محترم شہاب شیخ پراسرار اور خوفناک تحریروں کے ماسٹر مانے جاتے ہیں رواں ماہ انہوں نے نئے افق کے قارئین کے بطور خاص پر اسرار ناول تحریر کیا ہے ہمیں یقین ہے کہ آپ اسے ایک ہی نشست میں پڑھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

یوم آزادی پر ایک پراسرار اور خوفناک ناول جسے آپ فراموش نہیں کر سکتے

مشاعرہ ختم ہوا تو سب لوگ چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔ میں نے بھی ایک کپ میں چائے لی اور لان میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ایکسکیوزمی! میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟" اک نوجوان اور خوب صورت لڑکی نے میرے برابر والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر مجھ سے پوچھا۔

"جی شوق سے!" میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ وہ میرے برابر والی ایک کرسی چھوڑ کر بیٹھ گئی اور بولی۔

"ارمان صاحب! آپ نے تو مشاعرہ لوٹ لیا' بہت پیاری اور دل کو چھو لینے والی غزل پڑھی۔"

"ذرہ نوازی ہے آپ کی۔" میں نے مسکراتے ہوئے عاجزی کے ساتھ کہا۔

"یہ پلیز یہاں آٹو گراف تو دے دیں۔" اس نے اپنے ہاتھوں میں دبی ڈائری کھول کر میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ میں نے وہ ڈائری لے لی اور اس پر اپنی غزل کا ایک مصرعہ لکھا اور اس کے نیچے اپنے دستخط کر کے ڈائری واپس کر دی۔ اس نے میری تحریر پڑھی اور مسکرا کر ڈائری بند کر لی۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔

"ارمان صاحب اور کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

"جی بس اپنا بزنس ہے امپورٹ ایکسپورٹ کا۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا اچھا۔" وہ مسکرا کر بولی اور کچھ سوچنے لگی۔

"آپ نے اپنا خوب صورت نام نہیں بتایا؟" میں نے کہا تو اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

"میرا نام شائستہ ہے۔"

"اور شائستگی بھی بہت ہے آپ میں۔" میں نے مسکرا کر کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میرے ڈیڈی کا کنسٹرکشن کا کام ہے میں پینٹنگز بناتی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"او..... تو آپ بھی تخلیق کار ہیں؟" میں نے کہا۔

"جی لیکن میرا سبجیکٹ ذرا الگ ہے۔" وہ بولی۔

"وہ کون سا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں بھیانک اور خوفناک تصویریں بناتی ہوں۔" اس نے جواب دیا جس پر مجھے حیرت ہوئی میں نے کہا۔

"بڑا عجیب سا موضوع پسند کیا ہے آپ نے۔ آپ جیسی لڑکیاں تو عموماً رومانوی یا قدرتی مناظر عکاسی کرتی ہوں۔"

"اس کی ایک خاص وجہ ہے۔" وہ بولی۔

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"سب باتیں ایک ہی ملاقات میں نہیں بتائی جاسکتیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"ہوں۔" میں نے بھی مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ "تو آپ سے دوسری ملاقات کی کب توقع رکھوں؟"

"میں تو آپ کی فین ہوں۔ آپ جب کہیں ملاقات ہو جائے گی۔ اس بہانے آپ کی مزید شاعری بھی سن لوں گی۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا تو پھر......" میں سوچنے لگا تو وہ بولی۔

"کل رات آپ بزی تو نہیں ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ کل آپ میرے ساتھ ڈنر کریں؟" اس نے جواب طلب نگاہیں مجھ پر مرکوز کر دیں۔ میں اس کے حسن سے بہت متاثر ہوا تھا ویسے میں کم ہی لڑکیوں میں دلچسپی لیتا تھا لیکن اس کے حسن میں عجیب سی کشش تھی' یوں اس سے ملاقات رکھنے کو جی چاہ رہا تھا اور اس کی پینٹنگز دیکھنے کا بھی اشتیاق ہو رہا تھا اس لیے میں نے مسکرا کر کہا۔

"اس شرط پر آپ کی دعوت قبول کی جاسکتی ہے کہ پھر آپ میرے ساتھ ڈنر کریں گی۔"

"تو آپ بدلہ چکا دینا چاہتے ہیں؟" وہ بھی مسکرائی۔

"نہیں آپ سے ملاقات کا ایک اور بہانہ ڈھونڈا ہے میں نے۔" میں نے جواب دیا۔ وہ دھیرے سے ہنس کر بولی۔

"یہ تو میری خوش قسمتی ہو گی۔"

"اور میں بھی یہی کہوں گا۔" میں نے کہا۔

"اچھا! مسکراہٹ اس کے لبوں پر تھی وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ایک عمر رسیدہ شخص ہمارے پاس آ گیا۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کا تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا اچھی صحت اور سرخ و سفید رنگت کا مالک تھا اسے دیکھ کر شائستہ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ڈیڈی!...... میں ان سے آٹو گراف لے رہی تھی۔"

"و بھئی ان سے تو آٹو گراف لینا چاہیے کیونکہ یہ بڑے

شاعر ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ہمارے درمیان بیٹھ گیا۔
''میں کہاں بڑا شاعر جناب' بس آپ لوگوں کی ذرہ نوازی ہے۔'' میں نے عاجزی کا مظاہرہ کیا۔
''آپ کے اشعار دل پر لگتے ہیں بھئی' بڑی گہرائی ہے آپ کے کلام میں۔'' اس نے تعریف کی۔
''جی بس' کچھ تھوڑا بہت لکھ لیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔
''ڈیڈی! کل رات میں نے انہیں ڈنر کی دعوت دے دی ہے۔'' شائستہ بولی۔
''بھئی یہ تو اچھی بات ہے۔'' وہ بولے اور میری طرف دیکھا۔ ''اچھا اب ہمیں اجازت دیں' کل آپ سے ڈنر پر ملاقات ہوگی۔'' شائستہ کے ڈیڈی بولے۔ شائستہ نے جلدی سے اپنے شولڈر بیگ سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔
''یہ لیجیے میرا وزیٹنگ کارڈ' کل کتنے بجے تک آئیں گے آپ؟''
''آٹھ بجے مناسب رہے گا'' میں نے جواب دیا۔
وہ دونوں الوداعی کلمات کہہ کر آڈیٹوریم کے بیرونی گیٹ کی طرف جانے لگے اور میں نے شائستہ کے وزیٹنگ کارڈ پر نظر ڈالی اور جیب میں رکھ لیا۔ اتنے میں ایک اور عمر رسیدہ شخص میرے پاس آ گیا۔ وہ بھی وضع قطع میں شائستہ کے ڈیڈی جیسا تھا۔ میرے برابر والی کرسی پر بیٹھ کر اس نے بنا کوئی تعارف کرائے کہا۔
''کیا کہہ رہے تھے یہ دونوں تم سے؟''
''جی؟'' میں نے انجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
''دیکھو نوجوان! ان سے بچ کر رہنا' یہ خطرناک لوگ ہیں۔''
''جی؟'' میں اس کی بات پر چونک گیا۔
''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اپنی سلامتی چاہتے ہو تو ان سے دور رہنا' کوئی تفصیل تمہیں بتا نہیں سکتا' تم یقین نہیں کرو گے بلکہ کسی کو بھی بتاؤں گا تو وہ یقین نہیں کرے گا' بس تم اچھے انسان ہو اس لیے تمہیں خبردار کر دیا ہے آگے تمہاری مرضی۔'' کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا وہ تیز تیز قدم اٹھاتا آڈیٹوریم کے دروازے کی طرف جانے لگا اور میری حیران نظریں اس پر مرکوز تھیں۔
میں گھر آ گیا۔ میں اب تک اس اجنبی عمر رسیدہ آدمی کی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے شائستہ اور اس کے ڈیڈی کے بارے میں جو کچھ کہا تھا اس کی وجہ سے میں الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔
میں سوتے وقت تک اس آدمی کی باتوں کے بارے میں سوچتا رہا اور جب صبح آنکھ کھلی تو پہلا خیال اس کا آیا۔ میں نے سوچا کہ نہ جانے وہ کون شخص تھا اس کی باتوں کا کیا مطلب ہے' مجھے شائستہ لوگوں سے ملنا چاہیے یا نہیں؟ پھر میں نے سوچا کہ اس شخص کی ان دونوں سے کوئی چپقلش ہوگی اور اسی وجہ سے اس نے ایسا کہا ہے۔ کیونکہ مجھے شائستہ اور اس کے ڈیڈی میں کوئی خطرناک بات نظر نہیں آئی تھی' دونوں تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور یوں میں نے اس شخص کے خیال کو ذہن سے نکال دیا۔
میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا دن کے تقریباً بارہ بج رہے تھے کہ میرے موبائل فون پر شائستہ کی کال آ گئی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میں نے تو اسے اپنا نمبر دیا نہیں تھا پھر کیسے اس کے پاس آ گیا؟
میں نے فون ریسیو کرتے ہوئے ''ہیلو؟'' کہا۔
''کیسے ہیں جناب؟'' شائستہ کی مترنم آواز آئی۔
''جی بالکل ٹھیک' آپ کیسی ہیں اور میرا نمبر آپ کے پاس کہاں سے آ گیا۔'' میں نے پوچھا۔
''جناب! جب دل میں کسی کے لیے چاہت ہو تو نمبر مل ہی جاتا ہے۔'' اس نے خوش گوار انداز میں کہا۔
''وہیں مشاعرے میں ایک شاعر صاحب سے لیا تھا۔''
''اچھا اچھا۔'' میں نے کہا۔
''تو آپ آ رہے ہیں نا آٹھ بجے؟'' اس نے پوچھا۔
''جی ضرور۔'' میں نے جواب دیا۔
''ابھی کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔
''اپنے آفس میں۔''
''آفس کہاں ہے آپ کا؟''
میں نے ایڈریس بتایا۔
''اچھا اچھا کافی مہنگی بلڈنگ میں لیا ہوا ہے آپ نے آفس۔''
''جی' کاروباری ضرورت ہے۔''

''ٹھیک ہے ارمان صاحب' آپ سے رات میں ملاقات ہوتی ہے۔ میں ذرا ناشتہ کرلوں کیونکہ میں ابھی سوکر اٹھی ہوں بڑی لیزی ہوں میں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے۔جی ملتے ہیں رات کو۔'' میں نے کہا۔

''گڈ لک!'' کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کردیا۔ میں بھی فون میز پر رکھ کر اس کے بارے میں سوچنے لگا۔

رات آٹھ بجے کے قریب میری کار اس کے بنگلے کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ میں نے ہارن دیا ذرا ہی دیر بعد ایک بوڑھے آدمی نے ذیلی گیٹ کھول دیا۔ وہ حلیے سے ملازم لگتا تھا اس نے اپنے ہاتھ میں موجود صفائی کا کپڑا اپنے کاندھے پر ڈالتے ہوئے ذیلی گیٹ بند کیا اور مین گیٹ کھول دیا۔ میں گاڑی بنگلے کے اندر لے آیا اور وہاں کھڑی دو گاڑیوں کے قریب اسے روک دیا۔ پھر میں کار سے اتر آیا۔ اتنے میں بوڑھا ملازم گیٹ بند کرکے میری طرف آنے لگا تھا پھر وہ میرے قریب پہنچ کر بولا۔

''آیئے ارمان صاحب مالکن آپ کا ہی انتظار کررہی ہیں۔''

مجھے کچھ حیرت ہوئی کہ اس نے یوں مجھ سے بات کی تھی جیسے پہلے سے مجھے جانتا ہو حالانکہ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ اس نے گیٹ پر یہ پوچھا تک نہیں کہ میں ارمان ہی ہوں یا کوئی اور ہوں؟ پھر میں نے سوچا ہو سکتا ہے شائستہ نے اسے میرا حلیہ بتا دیا ہو یا پھر اس نے بنگلے کے باہر کوئی کیمرہ لگا دیا ہو جس کے ذریعے وہ اندر بیٹھی دیکھ رہی ہو۔ بوڑھا اپنی بات کہنے کے بعد برآمدے کی طرف چل پڑا تھا میں بھی اس کے پیچھے چلنے لگا تھا۔

وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے کر آ گیا جہاں شائستہ اپنے حسن کی تمام سامانیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ آج اس نے خود کو نکھارنے کا زیادہ اہتمام کیا تھا اس لیے کل سے زیادہ حسین دکھائی دے رہی تھی وہ مسکرا کر اٹھی تو اس کے لباس میں لگے ستارے جھلملانے لگے۔ اس نے کہا۔ ''آیئے آیئے ارمان صاحب میں بڑی بے چینی سے آپ کا انتظار کررہی تھی۔''

''میں وقت پر آ گیا ہوں۔'' میں نے بھی مسکرا کر کہا۔

''واقعی۔'' وہ بولی۔ ''آپ وقت کے پابند ہیں۔''

''میں قول و قرار کا بھی پابند ہوں۔'' میں نے دھیرے سے ہنس کر کہا تو وہ بھی ہنس دی۔ اس دوران ہم دونوں بیٹھ چکے تھے میں اس کے سامنے بیٹھا تھا شائستہ نے بوڑھے آدمی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''بابا! کھانا لگادو۔''

''جی اچھا مالکن!'' اس نے کہا اور جانے کے لیے پلٹ گیا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ کسی روبوٹ کی طرح بول رہا ہے اس کے الفاظ و لہجے میں کوئی تاثرات نہیں تھے۔

''اور سنائیں' کیا ہمیں بھی دن میں یاد کیا یا ہم ہی آپ کو یاد کرتے رہے؟'' شائستہ نے مسکرا کر پوچھا۔

''سارا دن ذہن پر آپ ہی چھائی ہوئی تھیں۔'' میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور بولی۔

''یہ تو میری بڑی خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسے بڑے شاعر کے ذہن پر میں چھائی رہی۔''

''ایک بات پوچھوں؟'' میں نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''جی ضرور پوچھیے؟'' وہ بولی۔

''آپ......'' میں نے آپ کے لفظ کو کھینچا۔ ''اتنی حسین کیوں ہیں؟''

''او مائی گاڈ!'' وہ ہنس کر بولی۔

''یہ تو آج انکشاف ہوا ہے کہ میں حسین ہوں۔ ویسے یہ آپ کا حسن نظر ہے ورنہ میں کہاں اور حسن کہاں؟ حسین وجمیل اور ہینڈسم تو آپ ہیں ارمان صاحب۔'' اس کی بات میں زور سے ہنس کر بولا۔

''انکشاف تو اب ہوا ہے۔''

''اچھا جناب! یہ بتایئے کہ آپ کو کھانے میں کیا پسند ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کھانے میں؟ قورمہ' فش فرائی' پلاؤ' شامی کباب' چکن تکہ' ویسے آپ جو بھی کھلادیں گی وہی میرے لیے سب سے اچھی ڈش ہوگی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اور میٹھے میں؟'' اس نے پوچھا۔

''کھیر۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔ اس لیے کہ کھیر واقعی مجھے پسند تھی۔

''محبت کی ہے آپ نے کسی سے بھی؟'' اچانک اس کا موضوع بدل گیا۔

''ابھی تک ایسا موقع نہیں آیا زندگی میں۔'' میں نے جواب دیا۔

''شاعر ہو کر آپ نے کسی سے محبت نہیں کی' شاعر تو ایک ہی وقت میں کئی کئی محبتیں کر رہے ہوتے ہیں؟'' وہ خوش گوار انداز میں بولی۔

''ہاں' درست کہا آپ نے۔ بہر حال شاید مجھے اپنی مصروفیات کی وجہ سے فرصت ہی نہیں ملی۔'' میرا انداز بھی خوش گوار تھا۔

''دراصل بزنس اپنے اندر اتنا مصروف رکھتا ہے کہ بزنس میں ہی الجھا رہتا ہے اور پھر مجھے کچھ وقت اپنے ایک اور شوق کو دینا پڑتا ہے۔''

''وہ کیا شوق ہے؟'' اس نے فوراً پوچھا۔

''میں کراٹے کا شوق رکھتا ہوں اپنی فٹنس کے لیے بھی اور کبھی کبھی یہ فن بڑے آڑے وقت میں کام آجاتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''واؤ بڑی عجیب سی بات ہے۔ کہاں شاعری جیسا حساس شعبہ اور کہاں کراٹے؟'' وہ بولی۔

''دراصل میرے بچپن کے کچھ دوست کراٹے کے شوقین ہیں' بس ان کے اصرار پر میں اس فن کی طرف آیا اور پھر اس میں ذرا لطف آیا تو یہ میرا بھی شوق بن گیا۔'' میں نے کہا۔

اسی وقت بوڑھے ملازم نے آ کر حسب سابق روبوٹ جیسے انداز میں کہا۔ ''مالکن کھانا لگا دیا ہے۔''

''آیئے ارمان صاحب کھانے کے لیے چلتے ہیں۔'' شائستہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''آپ کے ڈیڈی کہاں ہیں؟'' میں نے بھی اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ آج اپنی کسی میٹنگ میں بزی ہو گئے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اچھا اچھا۔'' میں نے کہا۔

ہم دونوں ایک چھوٹے سے ہال میں لگی ڈائننگ ٹیبل پر آ گئے اور پھر جب میری نظر کھانوں پر پڑی تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔ کیونکہ وہاں وہی چیزیں موجود تھیں جن کے بارے میں' میں نے شائستہ کو کہا تھا۔

''لو جی! آج تو ہمارے ملازم نے ساری ہی آپ کی پسند کی چیزیں بنا دی ہیں' یہ بھی کیا اتفاق ہے کہ جو کچھ آپ نے کہا وہی سب کچھ موجود ہے۔'' شائستہ نے مسکرا کر مجھ سے کہا' میں کیا کہہ سکتا تھا بس مسکرا کر رہ گیا اور ہم نے کھانا شروع کر دیا۔ بوڑھا ملازم ایک طرف ہاتھ باندھے ادب سے کھڑا تھا۔

''ارمان صاحب! آپ جادو وغیرہ کے بارے میں کیسے خیالات رکھتے ہیں؟'' کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد شائستہ نے مجھ سے پوچھا۔

''جادو؟'' میں نے کہا۔

''ہوتا تو ہے یہ۔'' میں نے اپنی پینٹنگز میں جادو کو ہی زیادہ فوکس کیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا اچھا' ویسے میں اب بھی سوچ رہا ہوں کہ عجیب سبجیکٹ ہے آپ کا۔'' میں نے کہا۔

''دراصل یہ دنیا کی بہت بڑی حقیقت ہے لیکن کسی آرٹسٹ نے اس طرف کبھی کوئی توجہ نہیں دی۔ ہاں واشنگٹن کی آرٹسٹ ہے جولیا' وہ بھی اس سبجیکٹ پر کام کرتی ہے۔''

''اچھا۔'' میں نے کہا۔ ''کھانے کے بعد آپ مجھے اپنی پینٹنگز دکھایئے مجھے بڑا اشتیاق ہو رہا ہے انہیں دیکھنے کا۔''

''فکر نہ کریں' میرا بھی یہی ارادہ ہے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''ویسے سنا ہے کہ افریقہ کا جادو سب سے زوردار ہے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں' افریقہ کے علاوہ بھی دنیا کے کئی علاقے ہیں جہاں جادوگر موجود ہیں لیکن افریقہ کے جادوگر واقعی سب سے آگے ہیں۔ وہ پلک جھپکتے میں انسان کو کوئی پرندہ یا جانور وغیرہ بنا سکتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''بڑی حیرت کی بات ہے۔'' میں نے کہا

''جی ہاں' یہ سحر و اسرار کی دنیا ہے ہی بڑی حیرت ناک' یہاں آپ کو لوگ ہوا میں چلتے نظر آئیں گے' ہوا میں یوں مزے سے لیٹے ہوں گے جیسے کسی باغیچے میں لیٹے ہوں' نظروں کے سامنے سے اچانک غائب ہو جاتے ہیں اور

اچانک ظاہر ہوجاتے ہیں' کسی عام انسان کو حیرت زدہ کردینے کے بڑے سامان ہیں اس حیرت ناک دنیا میں۔'' وہ بولی پھر شامی کباب کی پلیٹ میرے سامنے رکھتے ہوئے اس نے کہا۔''ارے یہ لیں ناں' آپ تو تکلف کررہے ہیں۔''

''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں' میں سب ہی کچھ کھا رہا ہوں۔'' میں نے مسکرا کر کہا اور ایک شامی کباب اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھ لیا۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر پوچھا'...... آپ کو اس موضوع کی طرف آنے کا خیال کیسے آیا؟''

''بس ڈیڈی کے ایک دوست ہیں مسٹر مارٹن' وہ لندن میں رہتے ہیں' وہ اکثر ہمارے گھر آتے رہتے ہیں' بس ان کی وجہ سے یہ شوق ہوا کیونکہ وہ خود جادو جانتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا تو میں نے چونک کر کہا۔

''جادو جانتے ہیں؟''

''ہاں۔'' اس نے سر ہلایا۔

''پھر تو ان سے ملنا پڑے گا' ان کے جادو کے کچھ کمالات ہم بھی تو دیکھیں۔'' میں نے کہا۔

''ضرور! آپ کی یہ خواہش جلد ہی پوری ہوسکتی ہے کیونکہ وہ کچھ ہی دنوں میں آرہے ہیں۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''بہت خوب! میں نے کہا۔''مجھے ان سے ملاقات کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔''

''ضرور ملواؤں گی آپ کو ان سے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''ویسے اگر آپ چاہیں گے تو وہ آپ کو بیٹھے بیٹھے افریقہ کے جنگلات کی سیر کرادیں گے۔'' اس نے کہا۔

''افریقہ کے جنگلات کی سیر؟ وہ کیسے؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''آپ خود کو افریقہ کے ان جنگلات میں پائیں گے اور وہاں آپ جب تک چاہیں رہ سکتے ہیں اور جب واپس آنا چاہیں تو مسٹر مارٹن کو پکارنا' وہ آپ کو فوراً واپس لے آئیں گے۔'' اس نے جواب دیا۔

''یقیناً یہ سب تصوراتی طور پر ہی ہوگا؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں لیکن پھر بھی آپ کو جنگل میں محتاط رہنا ہوگا' اگر آپ کو وہاں کچھ ہوا تو یہاں آپ کے جسم پر وہی اثرات ہوں گے۔'' اس نے کہا۔

''بڑی عجیب سی بات ہے۔'' میں نے اس کی بات پر غور کرتے ہوئے کہا۔''اس کا مطلب ہے کہ اگر وہاں میں زخمی ہوگیا تو یہاں میرا جسم زخمی ہوجائے گا؟''

''جی ہاں اور اگر آپ کو کسی درندے نے پھاڑ ڈالا تو یہاں بھی آپ کے جسم کے ساتھ وہی حشر ہوگا۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوہ تو پھر میں وہاں جانے سے گریز کرنا پسند کروں گا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''جب ایک لڑکی وہاں سے ہوکر آسکتی ہے تو آپ جیسے توانا مرد کے لیے کیا مشکل ہے؟'' وہ مسکرا کر بولی۔ میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔

''تو کیا تم جاچکی ہو وہاں؟'' میرا انداز تکلم بے تکلفانہ ہوگیا۔

''جی ہاں' وہیں نہیں اس طرح دنیا میں نہ جانے کہاں سے کہاں بھیجا ہے مسٹر مارٹن نے مجھے۔'' اس نے جواب دیا۔

''چلو ٹھیک ہے اگر تم جاچکی ہو تو پھر میں بھی ضرور جاؤں گا کیونکہ میں کسی سے بزدلی کا طعنہ نہیں سن سکتا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

وہ مسکرا کر بولی۔''میں آپ کو طعنہ تو نہیں دے رہی۔''

''بہر حال کسی جی دار مرد کے لیے ایسی بات ہی طعنہ ہوتی ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ وہ بھی مسکرا کر کھانے کی طرف متوجہ ہوگئی اور میں اس کی حیرت ناک باتوں پر غور کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد ہم کھانے سے فارغ ہوگئے تو اٹھتے ہوئے اچانک میری نظر بوڑھے ملازم پر پڑی۔ اس کی آنکھیں زیرو واٹ کے سرخ بلب کی طرح روشن تھی لیکن پھر فوراً وہ اپنی عام حالت میں آگئیں میں اس صورت حال سے کچھ پریشان ہوگیا۔ شاید میری پریشانی کو شائستہ سمجھ گئی تھی اس لیے بولی۔

''کیا بات ہے ارمان صاحب' آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟''

میں نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔''پتہ نہیں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے......''

''جیسے......؟'' اس نے پوچھا۔
''جیسے آپ کے ملازم کی آنکھیں کسی سرخ بلب کی طرح تھیں۔'' میں نے جواب دیا۔
''ارے آپ کو غلط فہمی ہوگی۔'' وہ بولی۔
''آپ نے جادو کی باتوں کا اثر ذہن پر تو نہیں لے لیا؟''
''پتہ نہیں۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''شاید ایسا ہی ہو؟''
''ایسا ہی ہوا ہوگا' تمہاری غلط فہمی ہی تھی آؤ چلتے ہیں۔'' وہ بے تکلفانہ انداز میں بولی۔
ہم دونوں چل پڑے۔ میری نظر بوڑھے ملازم پر پڑی' اس کے چہرے پر بڑی معنی خیز ہلکی سی مسکراہٹ تھی اور وہ میری طرف گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا وہ کیوں اس طرح مجھے دیکھ رہا تھا اس کی وجہ مجھے سمجھ نہ آ سکی۔ میں اور شائستہ ڈائننگ روم سے نکل کر سنگ مرمر سے بنے برآمدے میں چلنے لگے بہت ہی سکوت تھا بس ہمارے کپڑوں کی سرسراہٹیں یا شائستہ کے سینڈلوں کی ٹک ٹک کی آواز فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔
وہ مجھے ایک چھوٹے سے ہال میں لے آئی۔ یہاں فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں پر خوفناک پراسرار اور خونی مناظر کی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ شائستہ مجھے ایک پینٹنگ کے سامنے لے آئی اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔
''یہ دیکھو! یہ افریقہ کے جنگل کا منظر ہے' اس میں تمہیں جو بوڑھا جنگلی نظر آ رہا ہے یہ اس علاقے کا سردار اور بہت بڑا جادوگر ہے اس کا نام شوکا تو ہے۔''
''یہ تو کسی آدمی کا نرخرہ ادھیڑے ہوئے ہے۔'' میں نے پینٹنگ پر نظر رکھتے ہوئے کہا۔
''ہاں انسانوں کا خون اس کی ضرورت اور پسندیدہ مشروب ہے۔'' اس نے بتایا۔
''ضرورت سے کیا مراد ہے تمہاری؟'' میں نے پوچھا۔
''دراصل افریقہ میں کچھ ایسے جنگلی قبائل ہیں جن کے لیے انسانی خون بہت ضروری ہوتا ہے لیکن یہ چاند کی خاص تاریخوں میں پیدا ہونے والے انسان ہوتے ہیں۔ ان کا خون پینے سے یہ جادوگر اپنے مختلف عملیات کے ذریعے اپنی پراسرار طاقتوں کو بڑھاتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔
''اس کا مطلب ہے کہ تم پراسرار معاملات کے حوالے سے اچھی معلومات بھی رکھتی ہو؟'' میں نے اس کی تعریف کی۔
''انسان جس فیلڈ میں کام کرے' اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر کے ہی اسے بڑی کامیابی مل سکتی ہے۔ میں ماسٹر مارٹن کے ذریعے خود ان جنگلات میں جا چکی ہوں اور دو مرتبہ میں ہوائی سفر کر کے بھی وہاں گئی ہوں۔'' اس نے بتایا۔
''ویری گڈ!'' میں نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا اور پھر وہ مجھے ایک اور پینٹنگ کے پاس لے آئی۔ اسی وقت ہمارے عقب سے اس کے ڈیڈی کی آواز آئی۔
''ارے بھئی تم لوگ یہاں ہو؟''
ہم دونوں نے پلٹ کر دیکھا اور اس وقت مجھے حیرت سے جھٹکا بھی لگا اور میں پریشان بھی ہوا کیونکہ شائستہ کے ڈیڈی کی آنکھیں بھی بوڑھے ملازم کی آنکھوں کی طرح سرخ اور روشن ہو رہی تھیں لیکن یہ کیفیت چند لمحے رہی اور پھر ان کی آنکھیں عام سی ہو گئیں۔ انہوں نے مسکرا کر مجھ سے پوچھا۔
''کیسے ہو نوجوان؟''
''جی ٹھیک ہوں۔'' میں نے اپنی پریشانی کو چھپاتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔
''سوری! میں تمہارے ساتھ ڈنر میں شریک نہیں ہو سکا' دراصل کچھ کاروباری مصروفیت تھی۔'' انہوں نے معذرت کی۔
''چلیں یہ تو مجبوری تھی۔'' میں نے کہا۔
''شائستہ بیٹی! آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے' میں آرام کرنا چاہوں گا۔'' شائستہ کی طرف دیکھ کر بولے۔
''اور اب کیا وہی بلڈ پریشر کا مسئلہ ہے؟'' شائستہ نے پریشان ہو کر ان سے پوچھا۔
''ہاں وہی لگتا ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔
''تو پھر آئیں میں آپ کو آپ کے بیڈروم میں لٹا دیتی ہوں۔'' وہ ان کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

ہم تینوں ہال سے باہر آ کر چل پڑے۔ شائستہ نے مجھ سے کہا۔

"ارمان صاحب! پلیز آپ مائنڈ نہ کریں' آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں' میں ڈیڈی کو لٹا کر آتی ہوں۔"

"جی بہتر ہے۔" میں نے کہا۔

میں ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا اور بوڑھے ملازم اور شائستہ کے ڈیڈی کی سرخ آنکھوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے بار بار بوڑھے ملازم کی پراسرار مسکراہٹ ہی یاد آ رہی تھی۔ مجھے کسی طور ان دونوں کی سرخ آنکھوں کے حوالے سے ذرا بھی غلط فہمی نہیں ہوئی تھی۔ وہ حقیقت تھی۔ میری آنکھیں بالکل درست تھیں۔ ان میں کوئی خرابی نہیں تھی کہ جس سے میں سوچتا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔

اسی وقت شائستہ آ گئی اور میرے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ڈیڈی کو اکثر ہائی بلڈ پریشر کی شکایت رہتی ہے۔"

"کیئر کرتے ہیں وہ؟" میں نے پوچھا۔

"کرتے تو ہیں لیکن کبھی کبھی بد پرہیزی کر جاتے ہیں۔ آج بھی دوستوں کے ساتھ کھانا کھایا ہوگا اور کوئی بد پرہیزی کی ہوگی۔" اس نے جواب دیا۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ کھانا کھانے کے بعد سے مجھے نیند آ رہی ہے اور اب شدید غنودگی آنے لگی تھی۔ حالانکہ میں رات رات بھر جاگنے والا انسان تھا۔

اور پھر مجھے نیند کا تیز جھونکا آیا۔ میں نے جھٹکا کھایا اور آنکھیں کھول دیں پھر سر کو جھٹکا۔

"کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" مجھے شائستہ کی آواز آئی۔

میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھی بوڑھے ملازم اور اپنے ڈیڈی کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور اسی وقت مجھ پر نیند کا شدید غلبہ ہوا۔ اور اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو بیڈ پر لیٹا ہوا پایا۔ میں نے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ میں کسی کمرے میں تھا اور وہاں کوئی نہیں تھا۔ مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر بیڈ سے اتر کر کمرے کے دروازے کی طرف چل پڑا۔

باہر آ کر میں نے پھر دائیں بائیں برآمدے میں دیکھا وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔

"شائستہ!" میں نے آوازیں دیں۔ کوئی جواب نہیں آیا تو میں برآمدے میں ان کمروں کی طرف چل پڑا جو آخر میں تھے اور ان میں روشنی ہو رہی تھی۔ باقی کمرے تاریک تھے۔

اچانک ایک کمرے سے شائستہ نکل آئی۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتی میری طرف آنے لگی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔ میرے قریب آ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

"آؤ ارمان!" ہم دونوں واپس کمرے میں آ کر بیڈ پر بیٹھ گئے۔ وہ بولی۔

"ارمان...... تمہیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں...... یہاں تمہاری زندگی کو شدید خطرہ ہے۔ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ یہ...... کوئی گھر نہیں ہے یہ...... یہ قبرستان ہے۔" اس کی بات نے مجھے ایک بار پھر چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے حیرت میں ڈوبی آواز میں کہا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"میں...... میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" وہ الجھن کے ساتھ بولی۔

"یہ قبرستان ہے اور وہ دونوں بوڑھے آج کی رات تمہیں مار ڈالنا چاہتے ہیں۔"

"کون؟" بے اختیار میں نے پوچھا۔

"وہ...... وہ جو ایک میرا ڈیڈی بنا ہوا ہے اور دوسرا بوڑھا ملازم۔" اس نے جواب دیا تو میں حیرتوں کے سمندر میں ڈوبنے لگا۔ اس انکشاف نے مجھے شدید پریشان کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا۔ اس نے کہا۔

"میں...... میں ابھی تمہیں اس جگہ کی حقیقت بتاتی ہوں۔" اس نے آنکھیں بند کر لیں اور زیر لب کچھ پڑھنے لگی۔ پھر اس نے ذرا منہ اوپر کر کے پھونک ماری اور اسی وقت سارا ماحول بدل گیا۔

ہم دونوں قبرستان میں بیٹھے تھے۔ ہر قبر پر صلیب لگی ہوئی تھی۔ چاند آسمان پر پورے آب و تاب سے چمک رہا

تھا۔ کافی دور ہماری گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہر چیز واضح نظر آرہی تھی۔ میں نے حیرت سے کہا۔

”یہ...... یہ سب کیا ہے شائستہ؟“

”یہی حقیقت ہے۔ بس اب تم جاؤ یہاں سے۔ اس سے پہلے وہ دونوں کوئی قدم اٹھائیں۔ فوراً اپنی گاڑی میں بیٹھو اور چلے جاؤ۔ میں تم سے بعد میں رابطہ کرکے تمام حقائق بتاؤں گی۔ فی الحال تم اپنی جان بچاؤ اور یہاں سے نکل جاؤ۔“ وہ بے چینی سے بولی۔

”لیکن یہ......“

”بس اب کوئی بات نہیں کرو' جیسا میں کہہ رہی ہوں وہی کرو۔ فوراً نکلو یہاں سے' بعد میں تم سے مل کر سب کچھ بتاؤں گی۔“ اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ٹھیک ہے' میں چلتا ہوں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے جلدی جاؤ۔“ وہ بولی۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتا چل پڑا۔ میرا ذہن بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟ میں نے اپنا ہاتھ دانتوں سے کاٹا تو احساس ہوا کہ جو کچھ ہورہا ہے وہ حقیقت ہے۔

میں نے چلتے چلتے پلٹ کر دیکھا۔ شائستہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے جلدی جانے کا اشارہ کیا اور میں نے قدموں کی رفتار مزید تیز کردی۔ میں گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ میں نے شائستہ کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی کھڑی میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

چابی میں نے اگنیشن میں ہی لگی رہنے دی تھی اور اس میں موجود تھی۔ میں نے کار اسٹارٹ کرکے چلادی۔ میں اس وقت تک بار بار شائستہ کی طرف دیکھتا رہا جب تک میں روڈ پر اپنی کار کو نہیں لے آیا۔ یہاں اکا دکا گاڑیاں سڑک پر نظر آرہی تھیں۔ میں نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔

بالآخر میں پریشانی اور الجھن کے ساتھ اپنے گھر پہنچ گیا۔ یہاں میرا ملازم چاچا میرا منتظر تھا۔ میں کار گھر میں ایک طرف کھڑی کرنے کے بعد اترا تو چاچا عبدل نے میرے پاس آکر سلام کرتے ہوئے کہا۔

”کیا بات ہے صاحب! آج آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی؟ اور صاحب! یہ...... یہ آپ کی آنکھوں کو کیا ہوا ہے' سرخ ہورہی ہیں بہت زیادہ؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے فوراً جھک کر کار کے سائڈ گلاس میں دیکھا۔ میری آنکھیں بالکل اسی طرح سرخ اور روشن ہورہی تھیں جیسی شائستہ کہ ڈیڈی اور بوڑھے ملازم کی تھی۔ لیکن یہ صورت حال چند لمحے رہی اور پھر میری آنکھیں ٹھیک ہوگئیں۔ میں نے عبدل چاچا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اب تو ٹھیک ہیں؟“

”ہاں صاحب! اب تو بالکل ٹھیک ہوگئی ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ میں سوچنے لگا کہ آخر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا ہے؟ لیکن میرے پاس اپنے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

”عبدل چاچا' تم کافی بنا کر میرے کمرے میں لے آؤ۔“ میں نے عبدل چاچا کی طرف دیکھے بغیر کہا اور اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھادیئے۔

کمرے میں آکر میں بیڈ پر ڈھیر ہوگیا۔ میں مسلسل سوچ رہا تھا کہ آخر میں کن حالات سے نکل کر آرہا ہوں اور میری آنکھوں پر کیا اثر ہوگیا ہے؟ شائستہ و نیزہ کون ہیں؟ میں بنگلے سے قبرستان میں کیسے پہنچ گیا؟ شائستہ نے میرے ساتھ کیوں ہمدردی کی؟ دونوں بوڑھے میرے ساتھ کیا کرنے والے تھے؟ یہ سب واقعات میرے ذہن میں گردش کررہے تھے اور ان میں سے کسی ایک کا جواب بھی نہیں تھا میرے پاس۔

چاچا عبدل نے کافی لاکر مجھے دے دی۔ میں نے اس سے کہا۔

”عبدل چاچا اب تم جاکر سو جاؤ کافی رات ہوگئی ہے۔“

”صاحب! آپ کی طبیعت خراب ہو اور عبدل چاچا کو نیند آجائے' یہ کیسے ہوسکتا ہے صاحب؟“ اس نے دکھی لہجے میں مجھ سے کہا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔

میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ”میں جلدی سو جاؤں گا۔“

”صاحب! ڈاکٹر جنید صاحب کو فون کرلیں۔“ وہ

بولا۔

"نہیں نہیں میں ٹھیک ہوں' تم جا کر بے فکر ہو کر سو جاؤ۔" میں نے کہا۔

"صاحب! میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں لیکن جاگ رہا ہوں۔ آپ جب چاہیں مجھے بلا سکتے ہیں۔" وہ بولا۔

"سو جاؤ تو اچھا ہے۔" میں نے کہا۔

"کوشش کرتا ہوں صاحب' مگر مشکل ہے' نیند نہیں آئے گی۔" وہ کہتے ہوئے پلٹا اور دروازے کی طرف چل دیا۔ میں اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک کہ وہ کمرے سے باہر نہ چلا گیا۔ مجھے پتہ تھا وہ آج سوئے گا نہیں۔ میں کافی کا مگ لبوں سے لگا کر ایک بار پھر اپنے ساتھ پیش آنے والے پراسرار واقعات میں کھو گیا۔

میں کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا' کبھی کھڑکی کے پاس آ کر باہر لان وغیرہ پر نظریں ڈالنے لگتا اور کبھی بیڈ پر بیٹھ جاتا۔ دماغ گویا ٹھکانے پر نہیں آ رہا تھا۔

آخر کار ساڑھے چار بجے میں بیڈ پر لیٹ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ معمہ اب اسی وقت حل ہو سکتا ہے جب شائستہ مجھے ملے گی۔ صبح تقریباً آٹھ بجے تک میں کروٹیں بدلتا رہا۔ تب نیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے کر میرے پریشان خیالوں سے نجات دلا دی۔

میری آنکھ کھلی تو سہ پہر کے تین بجنے والے تھے۔ رات میں دماغ پر جو دباؤ اور بوجھل پن تھا وہ اب نہیں تھا لیکن آنکھ کھلتے ہی مجھے پھر وہی پراسرار واقعات یاد آنے لگے۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بیڈ پر ہی بیٹھا سوچتا رہا اور پھر اٹھ کر آئینے میں اپنی آنکھیں دیکھیں جو اب عام حالت میں تھیں۔

میں نے اٹیچڈ باتھ روم میں غسل کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ قریب ہی برآمدے میں عبدل چاچا کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

"صاحب......! اب کیسی طبیعت ہے؟"

"اب بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ناشتہ کریں گے یا کھانا کھائیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"ناشتہ بنا دو۔" میں نے جواب دیا۔

"ابھی تیار کرتا ہوں صاحب!" کہہ کر وہ کچن کی طرف تیز تیز قدموں سے چل پڑا۔

میں لان میں آ کر وہاں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ موسم بڑا خوش گوار تھا۔

❁......❁......❁......❁

شام ہو گئی لیکن شائستہ نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ میں نے سوچا کہ نہ جانے وہ کب رابطہ کرے گی۔

میں اس وقت لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی کے پروگرامز سے دل بہلانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میرا دل کہیں نہیں لگ رہا تھا۔

اگلے روز دوپہر تک میری بے چینی بے انتہا بڑھ گئی۔ میں نے اس قبرستان کی طرف جانے کا فیصلہ کیا اور کار میں روانہ ہو گیا۔

میں نے قبرستان کے پاس کار روک کر ارد گرد کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہاں اس وقت لوگ جنازے دفنا رہے تھے۔

میں کار سے اتر آیا۔ اسے لاک کیا اور قدم بڑھا دیئے اور پھر میں قبرستان کے احاطے میں آ گیا۔ میں بڑھتا رہا اور اس جگہ پہنچ کر رکا جہاں میں اور شائستہ موجود تھے۔ میں نے ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔ اب وہاں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ عام سا ماحول تھا۔ میں کچھ دیر وہاں رکا اور پھر واپس روانہ ہو گیا۔

گھر آ کر میں لان میں بیٹھ گیا۔ اچانک میرے موبائل فون کی بیل بجی۔ میں نے موبائل فون جیب سے نکالا اس میں ایک اجنبی نمبر فلش کر رہا تھا۔ میں نے فون کان سے لگا کر کہا۔

"ہیلو؟"

"میں شائستہ بول رہی ہوں۔" شائستہ کی آواز آئی۔

"اوہ......تم......تم کہاں ہو' کب آؤ گی میرے پاس؟" میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"تمہیں قبرستان میں نہیں جانا چاہیے تھا۔" اس نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

"ہاں......آئندہ اس طرف نہ جانا' تمہاری جان کو

وہاں خطرہ ہے۔ میں کل شام کو تم سے ملوں گی۔‘‘ وہ بولی۔

’’اچھا..... ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’اور مجھے فون بھی نہ کرنا۔‘‘ اس نے ہدایت کی۔

’’اچھا۔‘‘ میں نے مایوسی سے کہا۔

’’او کے گڈ لک!‘‘ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے فون کان سے ہٹایا اور ایک گہرا سانس لے کر شائستہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ اب جیسے بے چینی سی ہو گئی کہ کل تک کا وقت کسی طرح گزرے اور وہ آ جائے۔

❁......❁......❁......❁
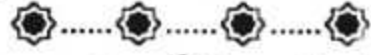
اگلے روز شام کے چار بج گئے۔ میں اپنے لان میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ مجھے شدت سے شائستہ کا انتظار تھا۔ میں بار بار اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتا جا رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت کی رفتار بہت کم ہو گئی ہے۔ ایک ایک لمحہ طویل محسوس ہو رہا تھا۔

چار بج کر چالیس منٹ پر کال بیل بجی۔ میں نے فوراً گیٹ کی طرف دیکھا اور اس جانب تیزی سے قدم بڑھا دیے۔

میں نے ذیلی گیٹ کھولا۔ سامنے شائستہ کھڑی تھی۔ اس کا حسن ماند پڑ چکا تھا۔ پریشانی اس کے چہرے پر عیاں تھی۔

’’آؤ آؤ اندر آؤ۔‘‘ میں نے گیٹ مزید کھولتے ہوئے کہا۔ وہ اندر آ گئی۔

میں نے گیٹ بند کر دیا۔ اور ہم لان کی طرف چل پڑے۔ تب میں نے دیکھا کہ عبدل چاچا برآمدے میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ وہ یقیناً کال بیل کی آواز پر کچن سے نکلا ہوگا اور مجھے گیٹ کی طرف جاتے دیکھ کر رک گیا ہوگا۔ میں نے بلند آواز میں اس سے کہا۔

’’عبدل چاچا! ذرا جلدی سے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔‘‘

’’جی اچھا۔‘‘ وہ بولا اور پلٹ گیا۔

ہم دونوں لان میں آ کر آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے سامنے میز پر پڑے جگ میں سے گلاس میں پانی انڈیلا اور اسے دے دیا۔ اس نے کچھ پانی پی کر گلاس میز پر رکھ دیا۔

’’شائستہ! مجھے بتاؤ کہ آخر یہ سب کیا چکر ہے؟‘‘ میں نے اس سے کہا۔

’’فوری خطرہ تو اب ٹل چکا ہے۔ لیکن آنے والے وقت میں ہمارے لیے بڑے خطرات ہیں۔ دراصل وہ دونوں بوڑھے جادوگر ہیں۔ میرے والد اس بوڑھے کے دوست تھے جو ابھی میرا ڈیڈی بنا ہوا تھا۔ پھر ڈیڈی کا پراسرار حالات میں انتقال ہو گیا تو یہ میرا سرپرست بن گیا۔ اس نے کہا کہ میں اسے ڈیڈی کہا کروں۔ یہ دس سال پرانی بات ہے۔‘‘

’’اس وقت میں تیرہ سال کی تھی۔ ڈیڈی کے علاوہ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ یوں میں اس بوڑھے جادوگر کے رحم و کرم پر آ گئی۔ اس نے زبردستی مجھے جادو سکھایا اور مجھے اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال کرتا رہا۔ مجھے شاعری اور تصویریں بنانے کا شوق تھا۔ یوں اس بوڑھے کے کہنے پر میں نے خوفناک تصویریں بنانا شروع کر دیں۔ یوں اسے تسکین ملتی تھی۔ تمہاری شاعری سے میں بڑی متاثر ہوئی اور تم سے ملی تو اس بوڑھے کو یہ بات پسند نہ آئی۔ اس نے اور اس کے دوست نے تمہیں رات قتل کر کے افریقی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھانے کا فیصلہ کیا لیکن میں درمیان میں آ گئی۔ تمہیں وہاں سے کسی نہ کسی طرح نکال دیا۔ اس بات پر وہ دونوں میری جان کے دشمن ہو گئے لیکن میں نے فوراً مسٹر مارٹن سے مدد لی۔ انہوں نے ان دونوں کو تین دن کے لیے سلا دیا ہے بس میں اسی بھاگ دوڑ میں لگی ہوئی تھی۔‘‘ اس نے تفصیل بتائی۔

’’اس کا مطلب ہے کہ مسٹر مارٹن تمہارے ہمدرد ہیں؟‘‘ میں نے کہا۔

’’ہاں۔‘‘ اس نے سر ہلایا۔ ’’دراصل وہی ہیں جو مجھے بیٹی کی طرح چاہتے ہیں۔ وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ پراسرار دنیا میں ان کا بڑا نام ہے۔‘‘

’’تو انہوں نے ان جیسے حبشیوں سے دوستی کیوں رکھی تھی؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’وہ بے ضرر آدمی ہیں۔ اس پراسرار دنیا میں تو لوگ نہ جانے کیا کیا کر رہے ہیں۔ ان کے سب سے تعلقات ہیں۔ ہاں اگر کوئی انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے تو وہ اس کے خلاف قدم اٹھاتے ہیں۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

اسی وقت عبدل چاچا نے ٹرے لا کر ہمارے سامنے

میز پر رکھ دی۔ پھر ایک کپ میں کیتلی سے چائے انڈیل کر شائستہ کو دی اور ایک کپ مجھے دے دیا۔ وہ خود وہاں سے چلا گیا۔

"لو کچھ کھاؤ۔" میں نے بسکٹوں اور پیٹس کی طرف اشارہ کر کے شائستہ سے کہا تو اس نے اس میں سے ایک بسکٹ اٹھالیا۔ میں نے چائے کی ایک چسکی لی اور اس کی طرف دیکھا۔

"شائستہ! تمہاری کہانی سن کر دکھ ہوا۔"

"بس اسی کا نام ہے زندگی۔" وہ ایک بڑا سانس لے کر اداسی سے بولی۔

"تمہارے والد کا بھی جادو وغیرہ سے تعلق رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، وہ تو بزنس مین تھے۔ بس ان کی کہیں اس بوڑھے جادوگر سے ملاقات ہو گئی تھی۔ اور یوں ان کی دوستی ہو گئی۔" اس نے جواب دیا۔

"دوسرے بوڑھے کا کیا نام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا نام آنند ہے۔" اس نے بتایا۔

"ہوں......" میں نے سر ہلایا۔

"تو کیا وہ بنگلہ انہوں نے جادو کے زور سے بنایا ہوا تھا؟"

"ہاں......ان کے پاس بڑی جادوئی طاقت ہے۔ ایسے کام ان کے لیے معمولی بات ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"تم بتا رہی تھیں کہ مسٹر مارٹن یہاں آنے والے ہیں تو کیا وہ آ گئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں......کل شام یہاں پہنچیں گے۔ انہوں نے وہیں لندن سے میری مدد کی تھی۔" اس نے چائے کا کپ لبوں سے ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ آنکھیں سرخ ہو جانے کا کیا چکر ہے؟ تم تینوں کی آنکھیں وہاں سرخ ہوئی تھیں اور جب میں گھر پہنچا تو میری آنکھیں بھی کچھ دیر کے لیے اسی طرح سرخ ہو گئی تھیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"دراصل یہ ان دونوں کے جادوئی اثرات تھے۔ اس جگہ جو بھی گھنٹہ بھر رہے گا اس کے ساتھ یہ عمل ہونے لگتا ہے۔ ویسے فکر نہ کرو اب تو تم پر سے وہ اثرات ہٹ چکے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"اب ان دونوں سے کیا خطرات ہیں ہمیں؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ ہماری جان لینے کی کئی طرح سے کوشش کریں گے۔ لیکن مسٹر مارٹن کے ہوتے ہوئے مجھے کوئی خاص فکر نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک......" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔

"اب تم کہاں رہ رہی ہو؟"

"ابھی تو اپنے گھر جانے کا ارادہ ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"کوئی خاص کام ہے وہاں؟"

"نہیں تو۔"

"تو پھر یہیں رک جاؤ......ایک کمرہ تمہارے لیے مخصوص کر دیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، یہ بہتر رہے گا۔" اس نے کہا۔

ہم دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم ہو گئے۔ پھر عبدل چاچا برآمدے سے جاتا نظر آیا تو میں نے اسے آواز دی۔ وہ رک گیا اور گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔

"یہاں آؤ۔" میں نے کہا۔ وہ میرے پاس آ کر بولا۔

"جی مالک؟"

"ایسا کرو کہ میرے برابر والا کمرہ کھول دو اور بی بی صاحبہ کے لیے سیٹ کر دو۔" میں نے کہا۔

"جی بہتر ہے۔" وہ بولا اور پلٹ کر چل دیا۔

"تم میری وجہ سے مصیبت میں آ گئے جس کا مجھے بہت افسوس ہے؟" وہ بولی۔

میں نے مسکرا کر کہا۔

"کوئی بات نہیں......تم نے جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کیا ناں۔" اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔

بس دل پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ تم سے محبت ہو گئی اور پھر جیسے میں اپنی محبت میں پاگل ہو گئی۔"

میں دھیرے سے مسکرا کر رہ گیا۔ کچھ دیر ہم دونوں خاموش رہے۔ پھر میں نے کہا۔

"تم کافی تھک چکی ہو۔ بہتر ہوگا کہ تم آرام کر لو۔

ڈنر کے وقت اٹھ جانا۔ اس وقت تک تم فریش ہو جاؤ گی۔"

"ہاں، میں بہت تھکن محسوس کر رہی ہوں۔" وہ بولی۔

"بس ذرا عبدل چاچا آ جائے کمرہ سیٹ کر کے، پھر ہم چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

ذرا دیر بعد عبدل چاچا نے آ کر مجھ سے کہا۔

صاحب، کمرہ سیٹ کر دیا ہے۔"

"آؤ شائستہ۔" میں نے شائستہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

ہم دونوں اٹھ کر چل دیئے۔

کمرے میں آ کر میں نے کہا۔

"یہ تمہارا کمرہ ہے اب تم آرام کرو۔"

"ٹھیک ہے، تمہارا بہت شکریہ۔" بولی۔

"کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم شکریہ جیسے الفاظ سے گریز کریں؟" میں نے مسکرا کر کہا۔ وہ بھی دھیرے سے مسکرا کر بولی۔

"ٹھیک ہے۔"

"اچھا تم آرام کرو، اگر تم سو گئیں تو میں آٹھ بجے تک تمہیں جگا دوں گا۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بولی۔

میں کمرے سے باہر آ گیا اور ایک بار پھر آ کر لان میں بیٹھ گیا۔ میں حالات پر غور کرنے لگا۔

رات آٹھ بجے کے قریب میں نے شائستہ کے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔

"شائستہ!" میں نے آوازیں دیں لیکن اس کا جواب نہیں آیا۔ پھر میں نے دو تین بار آوازیں دیں لیکن نہ آنے پر میں نے دروازے پر دستک دی۔ تب بھی دروازہ نہ کھلا۔ تب میں کھڑکی کے پاس آ گیا جس کی اندرونی جانب پردہ لٹکا ہوا تھا۔ میں نے تھوڑا سا پردہ ہٹایا تو شائستہ بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے ذرا زور سے اسے تین چار بار پکارا تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور پھر میری طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے کہا۔

"میں بڑی بے خبر سوتی ہوں۔"

"ہاں واقعی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"بس میں فریش ہو کر آتی ہوں۔" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور پردہ برابر کر دیا۔ پھر میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

کچھ دیر میں وہ کمرے سے باہر آ گئی اور میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ اب میری کافی تھکن اتر چکی ہے۔"

"ہاں اب چہرہ فریش ہے تمہارا۔" میں نے کہا۔ پھر ڈائننگ روم کی طرف اشارہ کیا جہاں عبدل چاچا کھانا لگا رہا تھا۔

ہم دونوں ڈائننگ روم میں آ کر آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اتنی دیر میں عبدل چاچا کھانا لگا چکے تھے۔

"شروع کرو۔" میں نے کھانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر شائستہ سے کہا۔

وہ بھی مسکرائی اور ایک پلیٹ اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لی۔

میں نے ایک پلیٹ اٹھائی اور اس میں سالن ڈالنے لگا۔

کچھ دیر بعد میں نے کہا۔

"مجھے تو ان سب حالات نے حیرت میں ڈال کر رکھ دیا ہے۔"

"ہاں یہ حالات ہیں ہی ایسے کہ کسی بھی نئے آنے والے کو حیرت میں ڈال سکتے ہیں۔ لیکن میں تو عادی ہو گئی ہوں۔" وہ بولی۔

"ہوں۔" میں نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ پھر کچھ دیر بعد بولا۔

"میں نے اب تک ایسے واقعات کے بارے میں بہت سنا یا پھر پڑھا ہی تھا یا پھر کچھ فلمیں دیکھی تھیں لیکن میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں خود ایسے پراسرار حالات کا ایک کردار بن جاؤں گا۔"

"بس یہ پراسرار دنیا ہے ہی ایسی کہ اگر کوئی نیا انسان اس میں اتفاق سے آ جائے تو اس کا زندہ رہنا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی موڑ پر موت کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور موت اس پراسرار دنیا میں قدم قدم پر کھڑی ملتی ہے۔" اس نے کہا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں کافی خوش نصیب ہوں جو بچ گیا۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں تم نے ٹھیک کہا۔ اس نے سر ہلایا۔

"اور یہ سب تمہاری مہربانی ہے کہ تم نے مجھے ان خونی

بوڑھوں سے بچایا۔'' میں نے کہا۔
''مہربانی کی بات نہیں ہے۔ یہ میری تم سے محبت کا ثبوت ہے۔'' اس نے کھل کر وضاحت کر دی۔
''دیکھو! .... یہ جو محبت ہوتی ہے ناں۔ یہ بڑی قربانیاں مانگتی ہے۔'' میں نے دھیرے سے مسکرا کر کہا۔
''میں ہر قربانی دوں گی۔'' اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔
''ایک بات کہوں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔
''ہاں کہو؟'' وہ بولی۔
''تم بھی مجھے اچھی لگنے لگی ہو۔'' میں نے کہا۔ تو اس کے چہرے پر بہار آ گئی۔ وہ دھیرے سے مسکرا کر بولی۔
''کبھی نہ کبھی تو تم بھی مجھے اسی طرح چاہنے لگو گے جیسے میں تمہیں چاہتی ہوں۔''
''شاید ایسا مستقبل قریب میں ہوتا نظر آ رہا ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا تو وہ بھی ہنس دی اور بولی۔
''مجھے اس وقت کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔''
''میں چاہوں گا کہ تم کھانے کے بعد کچھ دیر میرے ساتھ ٹہل لو اس کے بعد جا کر سو جاؤ کیونکہ تمہاری تھکن ابھی اتری نہیں ہوگی۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ ابھی بھی تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔
''ہاں...... میرا بھی یہی خیال ہے۔'' وہ بولی۔
''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔
کھانے کے بعد ہم دونوں لان میں آ کر ٹہلنے لگے۔ وہ مضطرب تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ جن حالات سے گزر کر آ رہی ہے اور مستقبل میں جو خطرات لاحق ہیں وہ ان ہی کے بارے میں سوچ سوچ کر مضطرب ہو رہی ہوگی۔
''میں نے اس کی تسلی کی خاطر کہا۔
''شائستہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ پریشان ہو اور میرا خیال ہے کہ جو صورت حال ہے اور جو خطرات مستقبل میں آ سکتے ہیں تم ان کی وجہ سے الجھی ہوئی ہو؟'' وہ بولی۔
''دیکھو! ...... پریشان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا بہتر یہ ہوتا ہے کہ مسئلے کا کوئی حل سوچا جائے۔''
''پرسکون دماغ سے مسائل کے حل نکل سکتے ہیں۔ میں نے کہا۔
''ہاں ...... یہ بات تو تم نے ٹھیک کہی۔'' اس نے سر ہلا کر کہا۔ قدرے توقف کے بعد وہ بولی۔
''میں کافی تھکن محسوس کر رہی ہوں۔''
''بہتر ہوگا کہ تم آرام کرو' میرا خیال ہے کہ جب تم صبح سو کر اٹھو گی تو فریش ہو گی۔'' میں نے کہا۔
''ہاں میں بھی یہ سمجھتی ہوں کہ مجھے سو جانا چاہیے۔ ابھی سر میں ہلکا سا درد ہے جو زیادہ بڑھ جائے گا۔'' وہ بولی۔
''سر درد کی ٹیبلٹ لینا چاہو گی؟'' میں نے پوچھا۔
''نہیں' ایسا اکثر ہو جاتا ہے اور پھر نیند لینے سے درد غائب ہو جاتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔
''ٹھیک ہے تو پھر جاؤ۔'' میں نے کہا۔
''آؤ تمہارے کمرے تک چھوڑ آؤں۔''
ہم دونوں اپنے اپنے کمروں کی طرف چل پڑے۔
اس کے کمرے میں آ کر میں نے کہا۔
''اب تم بالکل بے فکر ہو کر سو جاؤ اور ہر طرح کے دباؤ سے ذہن کو آزاد کر لو' یہ مت سوچو کہ آئندہ کیا ہوگا۔ جو ہوگا دیکھ لیں گے۔ اور ویسے بھی اب مسٹر مارٹن تو آنے ہی والے ہیں۔ ان کا سن کر تو مجھے بھی حوصلہ ملا ہے۔''
''دراصل میں ان کے بارے میں زیادہ سوچ رہی ہوں' مجھے ان کا بے چینی سے انتظار ہے۔'' اس نے کہا۔
''اچھا چلو چھوڑو سب سوچوں کو' بس اب بیڈ پر لیٹو اور بالکل بے فکر ہو کر سو جاؤ' وہ بھی آ ہی جائیں گے۔'' میں نے تسلی دی۔ وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔
''شب بخیر۔'' میں نے کہا۔
''شب بخیر۔'' وہ مسکرا کر بولی جیسے جبراً مسکرائی ہو۔
''ریلیکس ریلیکس...... اوکے؟'' میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔
''اوکے!'' وہ بھی مسکرا دی میں اس کے کمرے سے باہر آ گیا اور ان کی طرف چل پڑا۔ لان میں آنے کے بعد ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرا ذہن پراسرار حالات میں الجھ گیا۔
میں کافی دیر وہاں بیٹھا رہا اور پھر میں نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ بارہ بجنے والے تھے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور پھر برآمدے کی طرف چل پڑا۔ برآمدے میں پہنچا تو عبدل چاچا کچن سے نکل کر میرے پاس آ گیا اور بولا۔

''مالک دودھ رکھ دیا ہے میں نے آپ کے کمرے میں۔''

''ٹھیک ہے عبدل چاچا' اب تم بھی سو جاؤ۔'' میں نے کہا۔

''جی بہتر ہے۔'' وہ بولا۔

میں اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں شائستہ کا کمرہ پڑتا تھا۔ اس نے دروازہ بند کرلیا تھا۔ میں اس دروازے کے سامنے سے گزر کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

بیڈ پر لیٹنے کے بعد سارے واقعات کسی فلم کی طرح میری نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ میں اگر کسی سے ان واقعات کا تذکرہ کرتا تو وہ یقیناً انہیں کسی فلم کے مناظر ہی کہتا لیکن یہ سب کچھ میرے ساتھ حقیقت میں گزر چکا تھا۔ ان ہی خیالات میں گم میں کسی وقت نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب میری آنکھ شائستہ کی چیخ سے کھل گئی۔ میں فوراً بیڈ سے اترا اور پھر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ میں نے شائستہ کے کمرے کی طرف دیکھا۔ وہ وہاں کھڑی لرز رہی تھی۔

میں بھاگ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ ''کیا ہوا شائستہ؟''

وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات تھے۔ اس نے اپنے کمرے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔

''کیا ہوا ہے؟ کون ہے اندر؟'' میں نے اس سے پوچھا اور دروازے کی طرف جانا چاہا۔ وہ مجھ سے الگ ہوگئی۔ میں نے بڑھ کر دروازے کو دھکیلا اندر کا منظر دیکھ کر میں پریشان ہوگیا۔ وہاں ایک اجنبی کھڑا تھا۔ وہ عام سا انسان تھا لیکن اس کے آگے کے چاروں دانت نوکیلے اور چمک دار تھے۔ وہ مضبوط جسم کا مالک تھا اور میری طرف گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کرخت لہجے میں اس سے پوچھا۔

''کون ہو تم؟''

''تم درمیان میں نہ آؤ۔'' اس نے کسی درندے کی طرح غراتی آواز میں کہا۔

''میں پوچھتا ہوں کون ہو تم؟'' میرا لہجہ پہلے کی طرح کرخت تھا۔

''ارمان! یہ اسے ان بدروحوں نے بھیجا ہے۔'' میرے عقب سے شائستہ کی آواز آئی۔ میں نے گردن موڑ کر اس سے پوچھا۔

''کیوں؟''

''تاکہ ...... یہ...... میرا خاتمہ کرسکے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تو اب اس کا خاتمہ کیسے ممکن ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ...... یہ بے بس لگتا ہے۔'' وہ بولی۔

''بے بس لگتا ہے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں......'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میرا خیال ہے کہ انکل مارٹن نے اسے بے بس کیا ہے۔''

''او..... تو اب اس کا ہمیں کچھ کرنا ہے۔ یا انکل مارٹن خود ہی یہ معاملہ سنبھال لیں گے؟'' میں نے کہا۔

''وہ سنبھال لیں گے۔'' اس نے جواب دیا تو میں مطمئن ہوگیا۔ وہ خون خوار آدمی اپنی جگہ پڑا اب بھی مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں بغور اس کا جائزہ لینے لگا۔ ایک عام سا انسان تھا بس دانت بڑے بڑے اور نوکیلے اگر اس کے دانت ٹھیک ہوتے تو وہ پرکشش لوگوں میں شمار کیا جاسکتا تھا۔

آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر تکلیف کے تاثرات ابھرنے لگے۔ پھر وہ اپنا سر پکڑ کر کراہنے لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی تکلیف بڑھتی جارہی ہے۔ پھر وہ اپنا سر پکڑ کر لڑکھڑاتا ہوا چل پڑا۔ وہ کمرے سے نکل گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ ڈگمگاتا ہوا دیوار کی طرف بڑھا اور پھر وہ اس نے اچھل کر دیوار کے اوپر اپنے دونوں پیر جما دیئے۔ وہ مسلسل کراہ رہا تھا۔ اس نے اپنے جسم کو اوپر اٹھایا اور دیوار پر چڑھنے کے بعد باہر کود گیا۔

میں نے گردن موڑ کر شائستہ کی طرف دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔

''کیا اس نے تم پر حملہ کیا تھا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''ہاں...... اس کے دانت لمبے اپنی گردن پر چبھتے محسوس ہوئے تھے۔ میری آنکھ کھلی تو اس نے مجھے جکڑ رکھا

تھا۔ میں نے اسے دھکیلا اور چیخ مار کر بھاگی تو وہ میرے پیچھے لپکا لیکن پھر اپنی جگہ ٹھہر گیا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اسے روک دیا گیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کل تو مسٹر مارٹن آرہے ہیں ناں؟'' میں نے کہا۔

''ہاں وہ کل آرہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہوں......'' میں نے سر ہلایا۔

''آؤ کمرے میں بیٹھتے ہیں۔''

ہم دونوں اس کے کمرے میں آ کر بیڈ پر بیٹھ گئے۔ میں نے شائستہ سے کہا۔

''کیا اب اس درندے سے خطرہ ہے؟''

''نہیں، وہ جس تکلیف میں گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انکل مارٹن نے اسے پوری طرح گرفت میں لے لیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تو کیا تم اب بے فکر ہو کر سو سکتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بے فکر؟'' وہ بے بسی سے بولی۔

''ابھی تو بس فکریں ہی فکریں ہیں۔''

''تو پھر ایک کام کرو۔ تم آرام کرو میں اپنے کمرے میں جاتا ہوں اور میں جاگتا رہوں گا۔'' میں نے کہا۔

''تم کیوں میرے لیے اتنے بے آرام ہوتے ہو؟'' اس کے لہجے میں اپنائیت کے ساتھ قدرے دکھ بھی تھا۔

''کیا مجھے تمہارے لیے بے آرام نہیں ہونا چاہیے؟'' بے اختیار میں نے کہا تو اس نے چونکتے ہوئے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنائیت اور محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ الجھن کے ساتھ بولی۔

''ارمان!......میں سوچتی ہوں کہ......''

''کہ......؟'' میں نے مسکراتے ہوئے اس کے الفاظ دہرائے۔

''کہ میری زندگی تو خطرات کے بھنور میں دھنس ہی چکی ہے، میں......میں تمہیں اس بھنور سے دور رکھنا چاہتی ہوں۔''

''اچھا......وہ کیسے؟''

''میں انکل مارٹن سے کہہ کر تمہارے سارے خطرات اور مسائل ختم کروا دوں گی۔''

''اور پھر تم کیا کرو گی؟''

''میرے تو بہت سے دشمن ہیں۔ نہ جانے کس نے کیا کیا جال بچھائے ہوں گے میرے لیے۔ مجھے ان سے نمٹنا پڑے گا۔''

''اور وہ محبت؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔ پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''وہ......وہ تو رہے گی۔''

''تو پھر کیا میں تمہیں تنہا چھوڑ دوں؟'' میں نے پیار بھرے انداز میں کہا۔

''ارمان!'' وہ الجھ گئی۔

''میں......میں نہیں چاہتی کہ......تمہاری زندگی میں کوئی پریشانی رہے۔''

''اور میں بھی اب یہی چاہتا ہوں کہ تمہاری زندگی میں بھی کوئی پریشانی نہ رہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

''شائستہ!......میں نے کبھی کسی لڑکی کو نہیں چاہا۔ کسی سے محبت نہیں کی لیکن......اتنے مختصر سے وقت میں تم میرے دل میں سما گئی ہو......ایک بات کہوں؟''

''ہاں کہو؟'' وہ آہستہ سے بولی۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' میں نے کہا تو اس نے نظریں نیچی کر لیں اور آہستہ سے بولی۔

''یہ میری خوش قسمتی ہے۔''

''مجھے خود سے کبھی الگ نہ سمجھنا۔'' میں نے کہا۔

''بس میں چاہتی ہوں کہ تمہیں کوئی پریشانی کوئی تکلیف نہ ہو۔ کبھی بھی نہیں۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اور میں بھی تمہارے لیے ایسا ہی چاہتا ہوں۔'' میں نے بھی پیار بھرے لہجے میں کہا۔ اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر میں نے کہا۔

''چلو، تم چل کر میرے کمرے میں سو جاؤ، میں وہاں جاگتا رہوں گا۔''

''جی ٹھیک ہے، چلیں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

میں نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر اس کمرے سے نکل کر میرے

کمرے میں آ گئے۔ اس نے بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ سو جائیں میں جاگتی رہوں گی؟''

''کیوں مجھ پر اعتماد نہیں ہے کیا؟'' میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ وہ بھی اسی طرح مسکرا کر بولی۔

''بہت اعتماد ہے۔''

''تو پھر تم سو جاؤ ناں۔'' میں نے کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپ کو تکلیف دوں؟'' وہ بولی۔

''اور میں یہ کیسے گوارا کرلوں کہ میں آرام سے سو جاؤں اور تم جاگتی رہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ نظریں نیچی کر کے بولی۔

''اس طرح تو ہم دونوں ہی الجھن میں پڑ گئے ہیں۔''

''ہوں......'' میں نے سر ہلایا۔

''ویسے مجھے اب نیند نہیں آئے گی۔'' وہ بولی۔

''اچھا بہانہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''اگر تم جاگو گی تو میں بھی جاگ رہا ہوں۔ ویسے کیا خیال ہے ایک ایک کپ کافی ہو جائے؟''

''یہ مناسب رہے گا۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''تو پھر ٹھیک ہے' آؤ کچن میں چلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے چلیں۔'' وہ مسکرائی۔

ہم دونوں کمرے سے نکل آئے۔ میں نے اس دیوار کی طرف دیکھا۔ جہاں سے وہ درندہ گیا تھا۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا۔

ہم کچن میں آ گئے۔ اس نے کیتلی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''اوں ہوں......کافی میں بناؤں گا۔''

''چلیں ٹھیک ہے۔'' وہ دھیرے سے ہنس دی۔ ذرا دیر میں' میں نے کافی بنالی اور دو کپ ٹرے میں رکھ دیئے۔

''لائیں......کم سے کم مجھے بھی تو کچھ کام کرنے دیں۔'' اس نے مسکرا کر ٹرے کی طرف ہاتھ بڑھا دیئے۔

''چلو ٹھیک ہے۔'' میں نے بھی مسکرا کر کہا۔ اس نے ٹرے پکڑ لی۔ ہم کچن سے نکل آئے۔

کمرے میں آ کر اس نے ٹرے اسٹول پر رکھ دی۔ ایک کپ اٹھا کر مجھے تھما دیا اور دوسرا کپ خود پکڑ کر مجھ سے ذرا دور میرے بیڈ پر ہی بیٹھ گئی۔

میں نے کافی کے چند گھونٹ لے کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ اگر انکل مارٹن نہ ہوتے تو نہ جانے وہ خوں آشام تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتے؟''

''نیک اور بدی کی جنگ ازل سے ہے۔ جن کا کوئی نہیں ہوتا خدا ان کے لیے کوئی نہ کوئی سہارا بنا ہی دیتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہوں......'' میں نے سر ہلایا۔

''یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا۔''

کافی پینے کے بعد میں نے بہت اصرار کر کے اسے سلا دیا اور جب صبح کا اجالا پھیلنے لگا تو میں بھی صوفے پر سو گیا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو میں نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ دن کے بارہ بجنے والے تھے۔ شائستہ کمرے میں نہیں تھی۔ میں نے اٹیچڈ باتھ میں آ کر ہاتھ منہ دھویا اور پھر کمرے سے نکل آیا۔ شائستہ لان میں بیٹھی ایک رسالہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی کرسی پر عبدل چاچا بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر شائستہ نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ میں ان کے پاس پہنچ گیا۔

''صاحب!......ناشتہ لگا دوں؟''

''ہاں عبدل چاچا۔'' میں نے جواب دیا تو وہ برآمدے کی طرف چل پڑا۔ میں نے شائستہ کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''تمہیں نیند سکون سے آئی تھی؟''

''ہاں......آپ کب سوئے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں صبح اجالا پھیلنے پر سویا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ پہلے ہی سو جاتے تو اچھا تھا۔'' وہ بولی۔

''ڈونٹ وری۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''میں ویسے بھی اکثر شاعری کرنے کے لیے رات بھر جاگتا ہوں۔''

وہ مسکرا کر رہ گئی۔

''ناشتہ کیا تم نے؟'' میں نے پوچھا۔

"نہیں...... آپ کے اٹھنے کا انتظار کر رہی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"اوہ...... تم ناشتہ کرلیتیں۔"

"بس میں نے سوچا ساتھ ہی کریں گے۔"

میں نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ ذرا دیر بعد میں نے پوچھا۔

"انکل مارٹن کی آمد آج کس وقت تک متوقع ہے؟"

"شام تک ہی آئیں گے وہ۔" اس نے جواب دیا۔

"ہوں......" میں نے سر ہلایا۔ مجھے ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے۔"

"آج ملاقات کرلینا۔" وہ مسکرائی۔

"ہاں...... آج ملاقات ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔

اسی وقت عبدل چاچا نے آواز لگائی۔

"صاحب!...... ناشتہ لگا دیا ہے۔"

"اچھا!" میں نے اس کی طرف دیکھ کر بلند آواز میں کہا۔ پھر شائستہ کی طرف دیکھا۔

"آؤ ناشتہ کرلیں۔"

ہم دونوں ڈائننگ ٹیبل پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ اس نے سلائس پر مکھن لگا کر سلائس پلیٹ میں رکھنا شروع کر دیے۔ پھر پلیٹ میری طرف کھسکا دی۔ میں نے ایک سلائس اٹھا کر مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بھی مسکرا کر وہ لے لیا۔

ناشتے کے بعد ہم دوبارہ لان میں آکر بیٹھ گئے۔ ذرا ہی دیر بعد عبدل چاچا نے آکر مجھ سے کہا۔

"صاحب! دوپہر کا کھانا کب تک کھائیں گے؟"

"کیا خیال ہے کب تک کھاؤ گی؟" میں نے شائستہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"چار بجے سے پہلے تو مجھے بھوک نہیں لگے گی۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے عبدل چاچا' چار بجے تک تیار کرلو۔" میں نے عبدل چاچا کی طرف دیکھ کر کہا۔

"صاحب!...... کوئی خاص ڈش بناؤں؟" اس نے پوچھا۔

"تم کیا پسند کرو گی؟" میں نے شائستہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میری کوئی خاص پسند نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کوئی نہ کوئی چیز تو ہر کسی کو پسند ہوتی ہے۔ بتاؤ تکلف نہ کرو؟" میں نے مسکرا کر کہا۔

"کچھ بھی بنا لو عبدل چاچا!...... جو تمہارے صاحب کو پسند ہو وہی بنا لو۔" شائستہ نے عبدل چاچا کی طرف دیکھ کر کہا۔ عبدل چاچا نے یوں میری طرف دیکھا جیسے میری رائے چاہتا ہو۔

"میں نے کہا' ٹھیک ہے عبدل چاچا کچھ اچھی چیزیں بنا لو۔"

"بہتر ہے صاحب!" کہہ کر وہ پلٹ کر چل پڑا۔

جب وہ چلا گیا تو میں نے شائستہ سے کہا۔

"ویسے یہ اچھا ہوا کہ رات والے واقعے کا عبدل چاچا کو علم نہیں ہو سکا۔"

"ہاں...... وہ نیند میں ہوگا اس لیے میری آواز سن نہ سکا۔" وہ بولی۔

"ہاں وہ بوڑھا آدمی ہے۔ دن بھر کام کرتے کرتے تھک بھی جاتا ہے اس لیے اکثر گہری نیند سوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ کے ساتھ کب سے ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کافی سال ہو گئے ہیں۔ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میں بھی سوچتا ہوں کہ اب کہاں جائے گا؟ ہر کام خوش اسلوبی سے کرتا ہے۔ میرا بڑا خیال رکھتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھ سے محبت بھی کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ اچھی بات ہے۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے آج کا اخبار اٹھایا اور شہ سرخیاں پڑھنے لگا۔

شائستہ نے ایک بار پھر وہی رسالہ اٹھا لیا جو پہلے پڑھ رہی تھی۔

شام پانچ بجے کے قریب شائستہ نے مجھ سے کہا۔

"پانچ بجنے والے ہیں۔ انکل مارٹن کسی بھی وقت آئے گے۔"

"اوہ بڑی اچھی بات ہے۔ مجھے ان کا بڑی شدت سے انتظار ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"بس اب آ ہی جائیں گے کچھ دیر میں۔" وہ بھی

مسکرائی۔

چھ بجنے میں دس منٹ تھے کہ کال بیل بج اٹھی۔ میں اور شائستہ لان میں ہی بیٹھے تھے۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

''شاید انکل مارٹن آ گئے ہیں۔''

اسی دوران عبدل چاچا برآمدے میں آنے کے بعد مین گیٹ کی طرف جانے لگا تھا۔

''آؤ اگر وہ آئے ہیں تو ہم انہیں خوش آمدید کہیں۔'' میں نے شائستہ کی طرف دیکھ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہم ابھی مین گیٹ سے کچھ دور ہی تھے کہ عبدل چاچا نے ذیلی گیٹ کھول دیا۔ سامنے ایک عمر رسیدہ شخص کھڑا تھا۔ جس نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی شائستہ بولی۔

''اوہ انکل مارٹن!'' ہم دونوں تیزی سے گیٹ کے پاس پہنچ گئے۔

انکل مارٹن نے مسکرا کر مجھ سے کہا۔

''مسٹر!...... کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟''

''آیئے آیئے جناب!'' میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

وہ اندر آ گئے۔ انہوں نے شائستہ اور مجھ سے مسکرا کر ہاتھ ملایا۔ اور بولے۔

''کیسے ہو تم لوگ؟''

''بس کیا بتاؤں انکل، پریشان کر رکھا ہے ان سب نے۔'' شائستہ نے جواب دیا۔

''ڈونٹ وری، ڈونٹ وری' میں انہیں ان کے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔''

''انکل!...... کل رات انہوں نے مجھ پر حملہ کروایا تھا۔'' شائستہ بولی۔

''میں تمہاری طرف سے پوری طرح محتاط ہوں بیٹی!...... انہوں نے جب حملہ کروایا تو میں نے اسے ناکام بنا دیا تھا۔'' انکل مارٹن نے کہا۔

''جی ہاں...... لیکن انکل میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ اس درندے نے اپنے نوکیلے دانت میری گردن پر رکھ دیئے تھے۔'' شائستہ بولی۔

''لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ مارٹن کی بیٹی کو نقصان پہنچانا آسان نہیں ہے۔'' انہوں نے مسکرا کر شائستہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مسکرا کر بولی۔

''یہ بات تو آپ نے ٹھیک کہی انکل۔'' ہم ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔

''انکل!...... آپ سے ملنے کا مجھے بہت اشتیاق تھا۔ میں بڑی بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔'' میں نے انکل مارٹن سے مسکرا کر کہا تو وہ بھی مسکرا کر بولا۔

''اچھا بھئی!...... یہ تو میرے لیے خوشی کی بات ہے کہ کسی کو مجھ سے ملنے کا اشتیاق ہے۔''

''شائستہ نے آپ کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''بھئی اپنے انکل کی تعریفیں نہیں کرے گی تو کس کی کرے گی؟'' وہ دھیرے سے ہنس کر بولے۔ میں اور شائستہ بھی ہنس دیئے۔

''انکل! اب جلدی سے مجھے بتائیں کہ وہ سب ہمارے خلاف کیا ارادے رکھتے ہیں؟'' شائستہ نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''بھئی ان کے ارادے تو بڑے خطرناک ہیں۔ لیکن ہم انہیں کسی ارادے میں کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ اور مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ اشوک بھی ہمارے سامنے آ چکا ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''اشوک؟'' شائستہ پریشان ہو کر بولی۔

''ہاں اور اس سلسلے میں وہ پرسوں رات ناگ دیوتا کی پوجا کرے گا۔'' وہ بولے۔

''اوہ نو...... تو پھر کیا ہوگا انکل؟'' شائستہ اب زیادہ پریشان ہو چکی تھی۔

''بس فیصلہ ہوگا کہ ہم زندہ رہیں گے یا وہ؟'' انکل مارٹن نے پرخیال انداز میں جواب دیا۔ شائستہ نے اپنا سر پکڑ لیا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ اشوک کون ہے؟ وہ کیا کرنے والا ہے۔ جس سے ہماری یا اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہوگا؟

''پریشان نہ ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' انکل مارٹن نے تسلی آمیز لہجے میں کہا تو شائستہ نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور بولی۔

''انکل!......کیا ہماری کامیابی کے امکانات ہیں؟''

''ہاں بالکل!'' وہ مسکرا کر بولے۔

''انسان کو ہر حال میں کامیابی کا یقین رکھنا چاہیے اور مجھے بھی پورا یقین ہے کہ یہ جنگ ہم ہی جیتیں گے۔''

شائستہ کے چہرے پر قدرے اطمینان نظر آ رہا تھا۔ میں نے انکل مارٹن کی طرف دیکھ کر کہا۔

''انکل!......میرا خیال ہے کہ آپ کچھ کھا پی لیں، آرام کرلیں تاکہ فریش ہو جائیں۔''

''اوہ بوائے!'' وہ مسکراتے ہوئے خوش گوار لہجے میں مجھ سے بولے۔

''تم نے بڑے پتے کی بات کی ہے میں اس وقت ایک کپ کافی پینے کے موڈ میں ہوں۔''

شائستہ ان سے بولی۔ ''کھانا کھالیں ناں؟''

''نہیں نہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''میں کھا چکا ہوں ایک کپ کافی پینے کے بعد چاہوں گا کہ تم لوگ مجھے کوئی الگ تھلگ کمرا دے دو تاکہ میں اپنے عملیات شروع کرسکوں۔''

''جی بہتر ہے۔'' شائستہ نے کہا۔

''میں عبدل چاچا کو کافی کا کہہ کر آتا ہوں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور ڈرائنگ روم سے باہر آنے کے بعد تیز تیز قدموں سے کچن کی طرف چل دیا۔

میں کچن میں پہنچا تو عبدل چاچا چائے بنا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

''چاچا!......میرے اور شائستہ کے لیے چائے لے آؤ اور انکل مارٹن کے لیے کافی بنا لاؤ۔''

''بہتر ہے صاحب!'' اس نے کہا۔

میں واپس ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ انکل مارٹن مزے سے سگار پی رہے تھے اور گہری سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔

کچھ دیر بعد عبدل چاچا ہمیں چائے اور کافی وغیرہ دے گیا۔

کافی پینے کے بعد انکل مارٹن نے میری اور شائستہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں اپنے کمرے میں جانا چاہوں گا۔''

''آیئے انکل!'' میں نے ان سے کہا۔

ہم تیزی سے ڈرائنگ روم سے باہر آ گئے۔ میں ان دونوں کو ایک کمرے میں لے آیا۔ یہ دیگر کمروں کی طرح آراستہ تھا۔ میں نے انکل مارٹن سے کہا۔

''انکل یہ کمرہ مناسب رہے گا؟''

''ہاں بالکل۔'' انہوں نے ادھر ادھر کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے انکل۔'' میں نے کہا اور پھر شائستہ کی طرف دیکھا۔ ''آؤ شائستہ!''

ہم دونوں کمرے سے باہر آ گئے اور پھر ذرا ہی دیر بعد آ کر لان میں بیٹھ گئے۔ میں نے شائستہ سے پوچھا۔

''یہ اشوک کون ہے؟''

''یہ ایک طاقت ور عامل ہے۔ اس کے پاس بڑی پراسرار قوتیں ہیں اور یہ چاہتا ہے کہ مجھے اور انکل مارٹن کو ختم کر ڈالے۔'' اس نے جواب دیا۔

''آخر کیوں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''اس کی انکل مارٹن سے کوئی پرانی دشمنی ہے۔ اور اس وقت انکل مارٹن کو الجھا ہوا دیکھ کر وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔'' وہ بولی۔

''انکل مارٹن نے مجھے بیٹی بنایا ہوا ہے اس لیے وہ میرا بھی دشمن بنا ہوا ہے۔ کئی بار ہم پر حملے کر چکا ہے۔ لیکن ہر بار اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔''

''کیا ہم لوگ کسی طرح انکل مارٹن کی مدد کرسکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تو شاید کچھ مدد کرسکوں کیونکہ کچھ عملیات میں جانتی ہوں۔ تم ایک عام انسان ہو اس لیے اس پراسرار جنگ میں انکل مارٹن کی کوئی مدد نہیں کرسکو گے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کاش میں بھی ان کی کوئی مدد کرسکتا۔'' میں نے حسرت سے کہا۔

''دیکھو، شاید انکل مارٹن تم سے کوئی کام لینا چاہیں، یہ ان سے پوچھنا پڑے گا۔'' وہ بولی۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ذرا سوچنے کے بعد میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''انکل مارٹن کے عملیات کب تک ختم ہوں گے؟''

''مجھے اندازہ نہیں ہے کہ وہ کون سا عمل کر رہے ہیں۔

کچھ زیادہ لمبے ہوتے ہیں۔ ان میں کئی کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’ہوں......‘‘ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد انکل مارٹن آ گئے۔ صوفے پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے شائستہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

’’میں نے فی الحال اشوک کے راستے دشوار کر دیئے ہیں۔ وہ فوری طور پر ہمارے خلاف کچھ نہیں کر سکے گا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آج رات یہ کھیل ختم کر دیں۔‘‘

’’وہ کیسے انکل؟‘‘ شائستہ نے پوچھا۔

’’آج رات ہم قبرستان چلیں گے اور یہ سارا معاملہ ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ انہوں نے پر خیال انداز میں جواب دیا۔

’’ٹھیک ہے انکل!‘‘ شائستہ بولی۔

’’میں نہیں چاہتا کہ یہ معاملات طول پکڑیں اور ہمارے لیے خطرات پیدا ہوں۔‘‘ انہوں نے کہا۔

’’آپ بہتر سمجھتے ہیں۔‘‘ شائستہ بولی۔

’’کب چلنا ہوگا قبرستان؟‘‘

’’رات بارہ بجے کے قریب۔‘‘ انہوں نے جواب دیا۔

’’جی بہتر ہے۔‘‘ شائستہ نے کہا۔

’’انکل...... میں چاہتا ہوں کہ میں بھی اس جنگ میں کچھ حصہ لوں۔‘‘ میں نے ان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ مسکرا کر بولے۔

’’مائی سن!...... یہ پراسرار طاقتوں کی جنگ ہے۔ لیکن پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ تم سے کوئی نہ کوئی کام لے لیا جائے۔‘‘

’’جی بہتر ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ شائستہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

’’بیٹی!...... میں دیکھ رہا ہوں تم تفکرات کا شکار ہو۔ ریلیکس رہو، ریلیکس۔ ہم ضرور یہ جنگ جیتیں گے۔ انکل مارٹن کسی سے کمزور نہیں ہے۔‘‘

’’جی بہتر ہے انکل۔‘‘ شائستہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

’’اچھا...... اب ایسا ہے کہ ڈنر میں بریانی لینا پسند کروں گا۔ وہاں لندن میں تو ایسی چیزیں ملتی ہی نہیں اگر ملتی بھی ہیں تو بس نام کی ہوتی ہیں، کوئی ذائقہ ہی نہیں ہوتا۔‘‘ انکل مارٹن نے مسکرا کر یوں اطمینان سے کہا جیسے انہیں کوئی فکر ہی نہ ہو۔

’’ارے انکل، آپ فکر ہی نہ کریں جو ڈش آپ چاہیں گے وہ مل جائے گی۔ ہمارا عبدل چاچا ہر ڈش بناتا ہے۔‘‘ میں نے مسکرا کر ان سے کہا۔

’’ویری گڈ ویری گڈ۔‘‘ وہ بھی مسکرائے۔

’’فی الحال تو میں بریانی ہی کھانا پسند کروں گا۔‘‘

’’اوکے میں عبدل چاچا کو بتا دیتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا اور اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ کچن میں عبدل چاچا کے پاس آنے کے بعد میں نے اسے بریانی اور قورمہ بنانے کے لیے کہہ دیا۔ اور میں واپس ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔

انکل مارٹن نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی اور ہماری طرف دیکھ کر بولے۔

’’میں اب کچھ دیر آرام کرنا چاہوں گا۔‘‘

’’جی بہتر۔‘‘ میں نے کہا۔

’’کیا وہی کمرہ آپ کے لیے مناسب رہے گا؟‘‘

’’ہاں بالکل۔‘‘ وہ بولے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر ہم پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

’’ڈنر کتنے بجے کرتے ہو تم لوگ؟‘‘

’’کوئی خاص وقت نہیں ہے ویسے ہمیں آج ڈنر کا وقت آپ طے کریں گے۔‘‘ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

’’اوکے!‘‘ وہ بھی مسکرائے۔

’’آٹھ بجے مناسب رہے گا۔‘‘

’’بہتر ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’اوکے!...... تم لوگ گپ شپ کرو، میں جا کر آرام کرتا ہوں۔‘‘ انہوں نے کہا اور ڈرائنگ روم سے باہر چلے گئے۔

’’ویسے انکل مارٹن کافی جولی قسم کے آدمی ہیں۔‘‘ شائستہ نے مسکرا کر مجھ سے کہا۔

’’ہاں وہ تو ہیں، اندازہ کر لیا ہے۔‘‘ میں مسکرا دیا۔

’’یہ خود بھی ہنستے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی ہنساتے رہتے ہیں۔‘‘ وہ بولی۔

’’ہوں۔‘‘ میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر

ہلایا۔

''ویسے اس عمر میں اتنی اچھی صحت کا راز بھی یہی لگتا ہے۔''

''ہاں اس کے علاوہ کھانے پینے کے بھی شوقین ہیں' اعتدال سے کھاتے ہیں لیکن من پسند چیزیں کھاتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''ہاں تب ہی اسمارٹ بھی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ویسے اگر انکل مارٹن نہ ہوتے تو نہ جانے میں کب کی موت کے بھنور میں جا چکی ہوتی۔ انکل مارٹن نے میری بڑی حفاظت کی ہے۔'' وہ بولی۔

''ہاں وہ محبت کرنے والے انسان ہیں اور پھر تمہیں بیٹی بنایا ہے یہ رشتہ تو ویسے ہی بڑا احساس ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں...... میری ذرا سی تکلیف پر تڑپ جاتے ہیں۔'' وہ بولی۔

''بس جب ہر طرف دشمن ہو تو کوئی نہ کوئی فرشتہ مل ہی جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں واقعی وہ میرے لیے فرشتے کی طرح ہیں۔'' وہ بولی۔

''ایک بات اور میں نے محسوس کی ہے کہ وہ کسی بھی قسم کے حالات میں گھبراتے نہیں ہیں۔ بڑے مزے سے بریانی کی فرمائش کر رہے تھے جیسے ان کے ساتھ کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔'' میں نے مسکرا کر کہا تو وہ بھی مسکرا کر بولی۔

''ہاں یہ خوبی بھی ہے ان میں' وہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی ریلیکس رہتے ہیں۔'' کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر میں نے شائستہ سے کہا۔

''آج رات قبرستان میں کس طرح کے حالات سامنے آ سکتے ہیں؟''

''جیسا کہ تم یہ جان چکے ہو کہ یہ پراسرار طاقتوں کی جنگ ہو گی تو اس میں تمہیں کئی حیرت ناک مناظر دیکھنے کو مل سکتے ہیں۔ میرے لیے تو وہ مناظر حیرت ناک نہیں ہوں گے لیکن تمہارے لیے یقیناً ہوں گے۔'' اس نے جواب دیا۔

''مثلاً کیسے مناظر؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''مثلاً یہ کہ تم بدروحوں کو دیکھ سکو گے' ماورائی مخلوق کو دیکھ سکتے ہو' انکل مارٹن یا کسی اور ماورائی شخص کو ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھ سکتے ہو۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہ سب باتیں کیسی غیر حقیقی سی معلوم ہوتی ہیں ناں؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں' کسی عام انسان سے ان کا تذکرہ کرو تو وہ ہنس دے گا یا یہ کہہ دے گا کہ کسی ہارر فلم کی بات ہو رہی ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر میں ماورائی مخلوقات پھیلی ہوئی ہیں۔ بدروحیں' چڑیلیں' سر کٹے جادوگر' یہ سب ٹھوس حقائق ہیں۔'' اس نے کہا۔

''ہوں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اکثر لوگوں کو ایسی مخلوقات سے واسطہ بھی پڑتا ہے ویران جگہوں کو ایسی مخلوقات زیادہ پسند کرتی ہیں۔'' وہ بولی۔

''ہوں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

ہم خاموش ہو کر اپنی اپنی سوچوں میں گم ہو گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے آج رات کیا ہو گا؟ انکل مارٹن ویسے تو حوصلہ دے چکے تھے کہ جیت ہماری ہو گی لیکن وہ یہ بھی کہہ چکے تھے کہ یہ جنگ ہماری یا ہمارے دشمنوں کی موت اور زندگی کا فیصلہ کرے گی۔

کچھ دیر بعد شائستہ نے ایک میگزین اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی جب کہ میں بھی مختلف اخبارات اور میگزین دیکھنے لگا۔ پونے آٹھ بجے کے قریب انکل مارٹن ہمارے پاس آ گئے۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر بولے۔

''ہاں بھئی کیا ہو رہا ہے؟''

''انکل میگزین اور اخبارات دیکھ رہے ہیں۔'' شائستہ نے جواب دیا۔

انکل مارٹن ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے ان سے کہا۔

''انکل آٹھ بجنے والے ہیں' کھانا لگوا دیا جائے؟''

''ضرور ضرور' میں بریانی کھانے کے لیے بے چین ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولے۔

''ٹھیک ہے انکل!'' میں نے بھی مسکرا کر کہا اور عبدل چاچا کو آواز لگائی۔

''عبدل چاچا! کھانا لگا دو۔''

"جی اچھا صاحب۔" کہتا ہوا وہ وہیں سے پلٹ گیا۔
کچھ دیر بعد اس نے آ کر مجھ سے کہا۔ "صاحب کھانا لگا دیا ہے۔"
"ٹھیک ہے۔" کہہ کر میں نے انکل مارٹن کی طرف دیکھا۔
"آیئے انکل۔"
ہم تینوں اٹھ کر ڈائننگ روم میں آ گئے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے اسی وقت چاچا عبدل نے بریانی کی ڈش لا کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ ڈش کی طرف دیکھ کر انکل مارٹن نے خوشگوار انداز میں کہا۔ "واہ اسے تو دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ ذائقہ دار ہے۔"
کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم چائے پینے لگے انکل مارٹن نے اپنی رسٹ واچ کی طرف دیکھ کر کہا۔
"اب میں اپنے کمرے میں جا کر ایک اور عمل کرنا چاہوں گا۔ اس کے بعد ہم قبرستان کے لیے روانہ ہوں گے۔"
چائے پینے کے بعد انہوں نے شائستہ اور مجھ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
"او کے میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔"
"ٹھیک ہے انکل!" شائستہ بولی۔
انکل مارٹن اٹھ کر چلے گئے۔ چاچا عبدل برتن سمیٹنے لگا۔ پھر اس نے سارے برتن سمیٹ لیے اور انہیں لے کر چلا گیا۔
"شائستہ! میرا خیال ہے کہ میں اپنا ریوالور بھی ساتھ رکھ لوں؟" میں نے شائستہ کی طرف دیکھ کر کہا۔
"ویسے تو ایسی چیزوں کی ضرورت ماورائی معاملات میں نہیں پڑتی لیکن پھر بھی رکھ لو شاید کسی وقت اس کی ضرورت پڑ جائے۔" اس نے جواب دیا۔
"ہوں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔
"آؤ چلو ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں۔" ہم دونوں اٹھ کر ڈائننگ روم سے باہر آ گئے اور ذرا سی دیر بعد ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ میں آنے والے وقت کا سوچ سوچ کر بے چین ہو رہا تھا لیکن اپنی بے چینی کو کسی طور شائستہ پر ظاہر نہیں ہونے دے رہا تھا۔ ہم عام امور پر بات چیت کرتے رہے کیونکہ میں پراسرار معاملات کی ساری ہی معلومات شائستہ اور انکل مارٹن سے لے چکا تھا۔ جب کہ شائستہ نے بھی مزید کوئی ایسی بات بتانا ضروری نہ سمجھا اور یوں ساڑھے گیارہ بج گئے۔ انکل مارٹن آ گئے انہوں نے شائستہ اور مجھ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
"لو بھئی! فی الحال جو اہم عمل تھا وہ بھی میں نے کر لیا ہے۔" وہ صوفے پر بیٹھ گئے انہوں نے اپنی رسٹ واچ کی طرف نظر ڈالی اور بولے۔
"ٹھیک پندرہ منٹ بعد ہم روانہ ہو جائیں گے۔"
"ٹھیک ہے انکل۔" شائستہ نے کہا۔
"تب تک میں ذرا ایک سگار پی لوں۔" انکل مارٹن نے کہتے ہوئے جیب سے سگار اور لائٹر نکال لیا۔ سگار سلگا کر وہ کسی سوچ میں گم ہو گئے۔
"میں ابھی آتا ہوں۔" کہہ کر میں اٹھ گیا۔ ڈرائنگ روم سے نکل کر میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ الماری سے اپنا ریوالور نکال کر میں نے قمیض کے اندر رکھ لیا۔ یہ ریوالور میں ہر وقت لوڈ رکھتا تھا۔
ذرا دیر بعد میں واپس ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ انکل مارٹن نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔
"مائی سن! کیا تمہاری گاڑی بالکل ریڈی ہے؟ اگر نہیں ہے تو میں گاڑی منگوا سکتا ہوں۔"
"بالکل ریڈی ہے انکل!" میں نے جواب دیا۔
"گڈ!" انہوں نے کہا اور اپنی رسٹ واچ کی طرف دیکھا۔
"ٹھیک ہے اب ہم روانہ ہوتے ہیں۔"
"بہتر ہے انکل!" میں نے کہا۔
ہم تینوں ڈرائنگ روم سے نکل کر چل پڑے اور میری کار کے پاس آ گئے۔ اتنی دیر میں عبدل چاچا بھی ہمارے پاس آ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔
"صاحب کہیں جا رہے ہیں؟"
"ہاں عبدل چاچا۔" میں نے جواب دیا۔
"کب تک واپس آئیں گے؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔ جس پر میں نے بے اختیار انکل مارٹن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ عبدل چاچا کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔
"مسٹر عبدل! میرا خیال ہے کہ تم اپنے صاحب سے

بہت زیادہ پیار کرتے ہو؟"
"آپ نے ٹھیک کہا صاحب۔" وہ بولا۔
"تو پھر ایسا کرو کہ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔" انکل مارٹن نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔
"میں تو تیار ہوں صاحب۔" عبدل چاچا نے جلدی سے کہا۔
"تو پھر ٹھیک ہے چلو۔" انکل مارٹن نے کہا۔
"عبدل چاچا تم۔" میں نے کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ عبدل چاچا قبرستان جائے کیونکہ اس طرح وہ پریشان ہو سکتا تھا۔
"جی حکم کریں صاحب۔" اس نے میری طرف دیکھا۔
"میرا خیال ہے کہ تم نہ جاؤ ہمارے ساتھ۔" میں نے کہہ دیا۔
"ٹھیک ہے صاحب۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے مایوس لہجے میں کہا۔
"اوہ!" انکل مارٹن نے مسکرا کر مجھ سے کہا۔ "کوئی مسئلہ نہیں ہے وہاں تم سب محفوظ ہو گے۔" میں نے لمحاتی طور پر سوچ کر کہا۔
"ٹھیک ہے تو پھر لے چلتے ہیں عبدل چاچا کو۔"
"ہاں ٹھیک ہے۔" انکل مارٹن کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ تھی انہوں نے عبدل چاچا کی طرف دیکھا۔ "چلو مسٹر عبدل! دل چھوٹا نہ کرو۔"
"ٹھیک ہے صاحب۔" عبدل چاچا نے کہا۔
"میں گیٹ کھولتا ہوں۔" وہ گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔
ہم تینوں کار میں بیٹھ گئے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر تھا کار اسٹارٹ کر کے میں نے ریورس کی اور گھر سے باہر لے آیا۔ چاچا عبدل نے گیٹ لاک کیا اور پچھلی نشست پر انکل مارٹن کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں نے کار چلا دی۔
اسی قبرستان کے سامنے پہنچ کر میں نے کار روک دی جہاں میرے ساتھ پراسرار واقعات گزر چکے تھے۔ ہم کار سے اتر کر قبرستان کے جنگلے والے گیٹ کے پاس پہنچ گئے۔ جہاں سے قبرستان کے اندر پھیلی تاریکی دیکھی جا سکتی تھی۔
"یہ ہم کہاں جا رہے ہیں صاحب؟" عبدل چاچا نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"قبرستان میں عبدل چاچا۔" میں نے جواب دیا۔
"کیوں خیریت تو ہے اتنی رات کو قبرستان میں کیا کرنا ہے صاحب؟" اس نے پوچھا۔
"اے مسٹر عبدل! ہم تمہیں تمہاری فرمائش پر لے تو آئے ہیں لیکن یہ سوالات مناسب نہیں ہیں۔" انکل مارٹن نے اس سے کہا۔
"اچھا صاحب۔" عبدل چاچا بے بسی سے بولا۔
"ویسے اتنا ضرور بتاؤں گا کہ تمہارے صاحب کی جان خطرے میں ہے اور میں اس کے دشمنوں سے مقابلہ کرنے یہاں آیا ہوں۔" انکل مارٹن نے کہا۔
"صاحب! یہ ...... یہ خطرے والی کیا بات ہے؟" عبدل چاچا بہت پریشان ہو کر مجھ سے بولا۔
"عبدل چاچا! میں کچھ پراسرار معاملات میں گھر گیا ہوں تم فکر نہ کرو آج سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے نرمی سے جواب دیا۔
"صاحب! مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ آپ اس طرح کی مشکلات میں ہیں۔" وہ بولا۔
"دراصل میں اسی لیے تمہیں اپنے ساتھ نہیں لا رہا تھا لیکن انکل مارٹن کا کہنا تھا کہ تمہیں بھی لے چلیں۔ اب دیکھو تم پریشان ہو رہے ہو۔" میں نے چھپے انداز میں انکل مارٹن سے شکایت کر دی۔
"یہ گھر میں پریشان ہوتا رہتا اس لیے میں نے سوچا کہ اسے ساتھ ہی لے چلتے ہیں۔"
انکل مارٹن نے میری شکایت کا جواب دیا پھر عبدل چاچا سے مخاطب ہوئے۔
"مسٹر عبدل! اب بس تم خاموش رہو اور ہمیں ہمارا کام کرنے دو۔"
"ٹھیک ہے صاحب لیکن کامیاب ہی جانا ہے یہاں سے۔" عبدل چاچا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس دوران ہم قبرستان کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ انکل مارٹن سب سے آگے تھے ان کے بعد شائستہ تھی۔ اس کے پیچھے میں اور عبدل چاچا ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ تاریکی میں غیر واضح طور پر قبریں نظر آ رہی تھیں۔
ہم اسی قبر کے پاس آ کر رک گئے جہاں میں اور شائستہ پہلے بیٹھے تھے۔ اندھیرے میں کچھ دیر گزر جانے کی

وجہ سے مجھے کچھ اور بہتر نظر آنے لگا تھا۔ انکل مارٹن نے کہا۔

"اب ہماری جنگ کا آغاز ہوتا ہے۔" انہوں نے اپنا دائیاں ہاتھ بلند کیا اور اپنے سامنے موجود قبر کی طرف جھٹکے سے نیچے کر دیا۔ حیرت ناک منظر ہمارے سامنے تھا۔ قبر دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ اس میں روشنی تھی اور نیچے کی طرف سیڑھیاں جاتی نظر آ رہی تھی۔

"آ جاؤ میرے پیچھے پیچھے۔" انکل مارٹن نے کہا اور ان سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگے۔ ہم سب بھی ان کے پیچھے چل پڑے اب سب سے آخر میں، میں تھا مجھ سے آگے عبدل چاچا تھا۔

ہم تقریباً بیس سیڑھیاں اتر کر دائیں طرف مڑ گئے۔ سامنے بڑا دلکش منظر تھا۔ پھولوں سے مہکتا ایک باغ تھا جس کے درمیان میں سنگ مرمر کا چھوٹا سا راستہ بنا ہوا تھا۔ ادھر ادھر خوب صورت کھمبوں پر بلب جگمگا رہے تھے جن کی وجہ سے سارا منظر منور تھا۔ دونوں اطراف کے باغوں کے درمیان میں گول تالاب تھے جن میں فواروں سے پانی پھوٹ رہا تھا۔ مسحور کن ہوا چل رہی تھی سنگ مرمر کے راستے کے اختتام پر روشن برآمدہ تھا اور کمرے بنے ہوئے تھے یہ سب سفید سنگ مرمر کے تھے۔

ہم راستہ عبور کر کے برآمدے میں آ گئے۔ انکل مارٹن نے ایک دروازے کا ہینڈل گھما کر اسے دھکیلا۔ دروازہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔ وہاں زمین پر خوب صورت رنگین قالین بچھا ہوا تھا۔ سامنے دیوار تھی۔

ہم سب کمرے میں داخل ہو گئے۔ دائیں جانب ایک چبوترہ تھا جس پر قالین بچھا ہوا تھا۔ وہاں تین شاندار کرسیاں رکھی تھیں تینوں میں جگمگاتے بلب لگے تھے درمیان والی کرسی ذرا بڑی تھی۔ ہم سب چبوترے کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ ذرا سی دیر بعد چبوترے کے قریب موجود دروازہ کھلا اور وہاں سے شائستہ کے ڈیڈی شاہانہ لباس زیب تن کیے کمرے میں آ گئے۔ اسے دیکھ کر مجھے حیرت سے جھٹکا سا لگا تھا اور میں نے بے اختیار گردن موڑ کر شائستہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی حیرت اور پریشانی عیاں تھی۔ اس کے ڈیڈی کے پیچھے ایک اور آدمی تھا۔ ان دونوں کے عقب میں ایک خوب صورت عورت تھی۔ وہ آدمی اور عورت بھی زرق برق لباس میں تھے۔ ان تینوں نے چبوترے کے ساتھ بنی سیڑھیاں چڑھیں اور چبوترے پر آ گئے۔

شائستہ کے ڈیڈی کسی شہنشاہ کی طرح درمیان والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جب کہ دائیں طرف والی کرسی پر عورت اور بائیں طرف والی کرسی پر وہ آدمی بیٹھ گیا۔

انکل مارٹن نے ذرا جھک کر ان سے کہا۔

"میں حاضر ہوں۔"

"مجھے تمہاری کارکردگی دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی مارٹن!" شائستہ کا ڈیڈی بولا۔

"آپ ہی کا خدمت گزار ہوں راج کمار جی۔" مارٹن نے عاجزی سے کہا۔

"انکل!...... یہ...... یہ سب کیا ہے؟" شائستہ نے کہا۔ اس کا لہجہ حیرت و خوف سے لبریز تھا۔ انکل مارٹن نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولے۔

"میں نے کہا تھا ناں کہ آج ان معاملات کا اختتام ہونا ہے۔"

"لیکن...... یہ...... سب میری سمجھ میں نہیں آ رہا؟" شائستہ نے کہا۔

"یہ ہمارے آقا ہیں۔" انکل مارٹن نے راج کمار پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ شائستہ بھی حیرت زدہ تھی۔ وہ یہ دیکھ کر بولی۔

"انکل!...... یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" انکل مارٹن کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

"میں کچھ بھی نہیں انکل؟" شائستہ نے کہا۔

"سب سمجھ آ جائے گی جب تمہیں اور ارمان کو دیوی جی بھینٹ چڑھایا جائے گا۔"

"انکل!...... آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" شائستہ بے یقینی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تب میں نے کہا۔

"تم بڑی نادان ہو شائستہ!...... کچھ بھی نہیں؟...... ارے یہ مارٹن خود بڑا شیطان ہے' میں سمجھ گیا ہوں۔"

مارٹن نے فوراً گردن موڑ کر خون خوار نظروں سے

میری طرف دیکھا اور اسی لمحے اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ ملائم لہجے میں بولا۔

"گڈ!...... ویری گڈ!...... تم ذہین آدمی ہو۔"

"اب بتاؤ کہ یہ سب کیا ڈرامہ ہے؟" میں نے تلخی سے پوچھا۔

"کوئی خاص نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ راج کمار ہیں' ہمارے آقا' ہمارے گرو اس کے ساتھ راج کماری جی بیٹھی ہیں اور ساتھ ہی اشوک جی ہیں راج کمار کے دوست۔"

"ہمیں کیوں بھینٹ چڑھانا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ تم چاند کی خاص تاریخوں خاص گھڑیوں میں پیدا ہوئے ہو اور شائستہ کو سزا کے طور پر بھینٹ چڑھایا جائے گا۔ اگر تم دونوں کی بھینٹ دیوی جی کو چڑھادی جائے تو دیوی جی کی طرف سے ہمیں ناقابل تسخیر ماورائی قوتیں ملیں گی۔" مارٹن نے جواب دیا۔

"تو...... تو کیا آپ ان کے ساتھ ہیں؟" شائستہ نے بے یقینی سے مارٹن کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر اب شیطانی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"مم...... مجھے یقین نہیں آ رہا۔" شائستہ نے کہا۔

"آپ...... آپ تو میرے محافظ بنے ہوئے تھے؟"

"ہاں تم نے ٹھیک کہا' میں نے محافظ بن کر ہی تمہاری حفاظت کی ہے۔ تاکہ تم مجھ پر اعتبار کرو۔" وہ بولا۔

"تو...... تو آپ نے میرے ساتھ دھوکا کیا؟" شائستہ نے کہا۔

"ہاں...... تمہیں اعتماد میں لینے کے لیے سب کرنا ضروری تھا۔" وہ بولا۔

شائستہ بے بسی سے ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ اسی وقت میں نے اپنا ریوالور نکال کر اس کا رخ مارٹن کی طرف کر دیا اور تلخ لہجے میں بولا۔

"میں اس کی گولی تمہاری کھوپڑی میں اتار دوں گا۔"

"ہماری ماورائی دنیا میں ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے مسٹر۔" مارٹن نے بے فکری سے کہا۔

"اگر میری بات پر یقین نہیں آ رہا تو ٹریگر دبا کر دیکھ لو۔"

میں بھی اس بات کو سمجھ رہا تھا کہ واقعی اس ماورائی دنیا میں ریوالور اور ان جیسی چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی پھر بھی میں نے ٹریگر پر دباؤ ڈالا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ میں نے پورا دباؤ ڈال دیا لیکن ٹریگر نہیں دبا۔

"کیوں...... کیا ہوا؟" مارٹن نے تمسخرانہ انداز میں مجھ سے کہا۔ "چلا دنا گولی!"

میں نے کئی بار ٹریگر کو دبایا لیکن وہ ذرا بھی نہیں ہلا۔ تب مارٹن نے ہلکا قہقہہ لگایا اور مجھ سے بولا۔

"اسے پھینک دو۔"

میں نے ریوالوار کھینچ کر اسے مارنے کے لیے ہاتھ بلند کیا۔ اسی وقت کسی غیبی قوت نے میرا بازو پکڑ لیا۔ ہاتھ سے ریوالور چھین لیا گیا اور میرے منہ پر طمانچہ مارا گیا۔

"اب تمہیں پتا چل گیا ہوگا کہ یہاں وہ مخلوق موجود ہے جسے تم دیکھ نہیں سکتے۔ ہاں ہم اسے ضرور دیکھ سکتے ہیں۔" مارٹن نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"تم جیسا دھوکے باز شخص آج تک میں نے نہیں دیکھا۔" میں نے غصے سے کہا۔

"چلو اب دیکھ لیا۔" وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔ پھر اس نے راج کمار کی طرف دیکھ۔

"راج کمار جی!...... اب ان لوگوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟"

"فی الحال تم آرام کرو اور ان لوگوں کو قید خانے میں ڈلوا دو۔ میں آج رات ان کی بلی نہیں چڑھاؤں گا۔" راج کمار نے جواب دیا۔

"کیوں خیریت؟" مارٹن نے پوچھا۔

"پرسوں کی رات زیادہ موزوں رہے گی۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے جیسی آپ کی مرضی۔" مارٹن بولا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" راج کمار بولا۔

"بہتر ہے جناب!" مارٹن نے جھک کر کہا اور پلٹ کر چل دیا۔

"ان تینوں کو قید خانے میں ڈال دو۔" راج کمار نے فضا میں دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا تو کسی نادیدہ قوت نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ عبدل چاچا اور

شائستہ کے چہروں کے تاثرات اور جسمانی حرکات سے مجھے اندازہ ہوا کہ انہیں بھی نادیدہ قوتوں نے گرفت میں لے لیا ہے۔ گرفت بڑی سخت اور طاقت ور تھی۔ وہ قوتیں ہمیں لے کر چل پڑیں۔

کمرے سے نکلنے کے بعد ہم برآمدے میں چلنے لگے اور برآمدے کے آخر میں نیچے سیڑھیوں سے اتار کر ہمیں ایک تہ خانے میں لایا گیا۔ یہاں ان قوتوں نے ہمیں چھوڑ دیا۔ چند ہی لمحوں بعد تہ خانے کا مضبوط دروازہ بند ہو گیا۔

''یہ سب کیا ہو گیا ہے؟'' شائستہ نے میری طرف دیکھ کر پریشان ہو کر کہا۔

''حوصلہ رکھو' ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے' بہتری کی کوئی صورت نکالتے ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''یہاں بہتری کی کوئی صورت نکلنا مشکل ہے۔'' وہ بے چارگی سے بولی۔

''کچھ بھی ہو ہمیں حوصلہ رکھنا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

وہ بے بسی سے سوچنے لگی۔

میں دروازے کے پاس آ گیا اور اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ دروازہ مضبوطی سے بند تھا۔ میں بے بس ہو کر مڑا' ایک گہرا سانس لیا' ادھر ادھر کا جائزہ لینے کے بعد بولا۔

''یہاں تو کوئی کھڑکی وغیرہ بھی نہیں ہے۔''

''اس تہ خانے میں بھلا کھڑکی یا روشن دان کیسے ہو سکتا ہے؟'' شائستہ بولی۔

''ٹھیک کہتی ہو تم۔'' میں نے کہا اور مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ بھلا تہ خانے میں کھڑکی یا روشن دان کب ہوتے ہیں؟ میں نے شائستہ کی جانب دیکھ کر کہا۔

''تم بتا رہی تھیں کہ تم کچھ عملیات جانتی ہو؟ کیا ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا؟''

''وہ ان جیسے گرو لوگوں کے سامنے کہاں چل سکتے ہیں؟ میں راستے میں اپنی سی کوشش کر کے دیکھ چکی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہوں۔'' میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سوچنے لگا۔

''مالک!..... آپ لوگ۔ بیٹھ جائیں۔ میرا خیال ہے کہ یہاں سے نکلنے کی کوشش بے سود ہوگی۔'' عبدل چاچا نے مجھ سے کہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو عبدل چاچا!۔ کاش' تم ہمارے ساتھ نہ آتے تو اچھا تھا کہ کم سے کم تم تو یہاں پھنسنے سے محفوظ رہتے۔'' میں نے کہا۔

''چلیں چھوڑیں مالک' اب افسوس نہ کریں' جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔'' وہ بولا۔

ہم تینوں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

❁.....❁.....❁.....❁
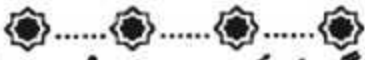
وہ رات گزر گئی۔ کوئی ہمارے پاس نہیں آیا۔ صبح ہمیں ناشتہ دینے کے لیے آدمی آ گیا۔ اسے دیکھ کر میں چونک گیا۔ کیونکہ یہ وہی آدمی تھا جو مجھے مشاعرے میں ملا تھا اور اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں شائستہ اور اس کے ڈیڈی سے بچ کر رہوں۔ میں نے بے اختیار اس سے کہا۔

''تم..... تم وہی ہو ناں جو مشاعرے میں مجھے ملے تھے؟''

''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''غلط فہمی.....؟'' میں اس کی صورت کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

''یہ..... یہ کیسے ممکن ہے؟..... تم ہو ہو بہو وہی ہو۔''

''دنیا میں کئی لوگوں کی شکلیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔'' اس نے جواب دیا اور عبدل چاچا کی طرف بڑی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا خیال ہے آپ کا؟''

''ہاں۔'' عبدل چاچا کے چہرے پر بھی ویسی ہی معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔

''تم نے ٹھیک کہا۔'' آج پہلی مرتبہ میں نے عبدل چاچا کا یہ انداز دیکھا تھا جس پر میں حیران تھا۔

''اب تم لوگ ناشتہ کر لو..... اس کے بعد تمہیں کچھ دیر کی آزادی دی جائے گی تاکہ تم غسل وغیرہ کر سکو۔'' اس آدمی نے کہا اور پلٹ کر چل پڑا۔

وہ تہ خانے سے باہر نکل گیا۔ دروازہ ایک بار پھر بند ہو گیا۔

''عبدل چاچا!..... یہ آدمی مجھے پہلے بھی ملا تھا۔ اس حد تک کسی کی صورت نہیں مل سکتی حتیٰ کہ جڑواں لوگوں میں بھی کچھ فرق ہوتا ہے۔'' میں نے عبدل چاچا کی طرف

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر 5-L / 79 ڈاکخانہ 5.L / 78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

دیکھ کر کہا۔

"جب کہ وہ اس بات سے انکار کر رہا ہے تو ہم اس سے زبردستی تو اقرار نہیں کروا سکتے صاحب!" عبدل چاچا نے کہا۔

"ہاں یہ بات تو ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مالک!...... ناشتہ کر لیں۔" عبدل چاچا نے کہا۔

"چلو شائستہ آ جاؤ' ناشتہ تو کرو' جو ہونا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔" میں نے شائستہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بہتر ہی ہوگا مالک بہتر ہی ہوگا۔" عبدل چاچا نے بڑے عجیب سے انداز میں کہا تو میں نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب تاثرات تھے۔ لیکن پھر فوراً وہ تاثرات غائب ہو گئے۔ عبدل چاچا نے کہا۔

"مالک!...... میرا مطلب ہے کہ بہتری کی امید رکھنی چاہیے۔"

"ہاں عبدل چاچا' یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے تائید کی۔

ہم تینوں ناشتہ کرنے لگے۔

ناشتے کے کچھ دیر بعد وہی آدمی آ گیا اور ہم سے بولا۔

"چلو اب تم لوگ چل کر کھلی فضا میں چہل قدمی کرو۔" تمہیں شام تک آزاد رکھا جائے گا۔"

"حیرت ہے قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"دراصل دیوی جی کی بھینٹ ہر طرح سے صحت مند اور ٹھیک ہونی چاہیے۔" اس نے جواب دیا۔

"او...... تو یہ وجہ ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں...... اب تم لوگ آ جاؤ۔" وہ بولا اور ہم سب قید خانے سے باہر آ گئے۔

کچھ دیر بعد غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر پھر سب باغ میں بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد راج کمار اپنے کمرے سے نکل کر ہماری طرف آنے لگا۔ اس کی چال شاہانہ ہی تھی۔ اب بھی اس نے زرق برق لباس پہن رکھا تھا۔

ہمارے پاس آنے کے بعد اس نے شائستہ کی طرف بغور دیکھا اور بولا۔

"تم نے ہمارے ساتھ غداری کیوں کی؟" جب کہ ہم نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ تمہارا کام صرف ارمان کو پھانسنا تھا لیکن تم نے اسے اس رات فرار کروا دیا۔ ورنہ ہم اس رات دیوی جی کی بھینٹ چڑھا دیتے اور اس کے گرم و تازہ خون سے اپنی پیاس بجھاتے۔"

"مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی۔" شائستہ نے بے باکی سے جواب دیا۔

"محبت؟" راج کمار نے قہر آلود لہجے میں کہا۔

"یہ بکواس ہوتی ہے دنیا میں محبت کا کوئی وجود نہیں ہے۔"

شائستہ کے کچھ کہنے سے پہلے عبدل چاچا نے بڑے عجیب سے انداز میں راج کمار سے کہا۔

"وجود ہوتا ہے محبت کا۔"

"تم خاموش رہو۔" راج کمار عبدل چاچا کی طرف دیکھ کر غرایا اور عبدل چاچا نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ راج کمار ایک بار پھر شائستہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"تمہاری غداری کی سزا کل رات تمہیں مل جائے گی۔ ارمان کے ساتھ تم بھی دیوی جی کی بھینٹ چڑھا دی جاؤ گی۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ ویسے بھی میں ارمان کے بغیر زندہ رہنا پسند نہیں کروں گی۔" شائستہ بے باکی سے بولی۔

"ٹھیک ہے' کل اس کے ساتھ ہی موت کی وادی میں چلی جانا۔" راج کمار پھنکارتے ہوئے بولا اور پلٹ کر چل پڑا۔

✿......✿......✿......✿

اگلا دن بھی گزر گیا۔ شام کے وقت ہمیں قید خانے میں بند کر دیا گیا اور پھر تقریباً تین گھنٹے بعد ایک آدمی ہمارے پاس آ گیا۔ اس کا قد لمبا اور رنگ بالکل سیاہ تھا۔ اس نے ہم سے کہا۔

"چلو تمہیں بلایا گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے چلو۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ہم سب قید خانے سے نکل کر چل پڑے۔ وہ آدمی

ہمیں ایک بڑے ہال میں لے آیا۔ یہاں ایک جانب سنگ مرمر کا چبوترہ بنا تھا۔ جس پر ایک بڑی مورتی رکھی تھی جو کسی عورت سے مشابہ تھی۔ مجھے خیال آیا کہ یہی ان کی دیوی کی مورتی ہوگی۔

کچھ دیر بعد راج کمار، راج کماری اور اشوک وہاں آ گئے۔ انہوں نے اچٹتی سی نگاہیں ہم پر ڈالیں اور سیدھے چبوترے کے سامنے جانے کے بعد مورتی کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ وہ تینوں بڑبڑا رہے تھے۔

ذرا دیر بعد وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان تینوں نے مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ لیے۔ راج کمار مورتی کی طرف دیکھ کر عاجزانہ انداز میں بولا۔

''دیوی جی!...... آج آپ کے چرنوں میں تین انسانوں کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔ یقیناً آپ خوش ہوں گی اور ہمیں اپنی قوتوں سے نوازیں گی۔ اس نے آہستہ آواز میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر بولا۔

''جے ہو، دیوی جی کی جے ہو۔''

''جے ہو، جے ہو۔'' راج کمار اور اشوک ایک ساتھ بولے۔

وہ تینوں پلٹ گئے۔ ان کی نظریں ہماری طرف تھیں۔ راج کمار بڑے زہریلے انداز میں بولا۔

''چلو بھئی، اب زندگی کے آخری لمحات دیکھ لو۔'' اس نے بلند آواز میں کہا۔

''آ جاؤ سریندر۔''

وہی آدمی اندر آ گیا جس نے مجھے مشاعرے میں خبردار کیا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں چمکتا ہوا تیز دھار خنجر تھا۔ وہ راج کمار کے سامنے پہنچ کر احتراماً ذرا سا جھکا اور بولا۔

''راج کمار!...... حکم کیجیے، پہلے کس کو بھینٹ چڑھایا جائے؟''

''پہلے اس ناری کو بھینٹ چڑھاؤ، اس نے ہمارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا تھا۔'' راج کمار نے شائستہ کی طرف دیکھتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔

''جو حکم گرو جی۔'' کہتا ہوا سریندر شائستہ کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ میرا خون جوش مارنے لگا۔ سریندر جیسے ہی شائستہ کے قریب پہنچا، میں فضا میں اچھلا اور سریندر کے سینے پر ایک فلائنگ کک ماری وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوا دور جا گرا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اسی وقت کسی نادیدہ قوت نے میرے گال پر اتنی زور کا طمانچہ مارا کہ سارے ہال میں اس کی آواز گونج گئی۔ پھر نادیدہ قوت نے مجھے گرفت میں لے لیا۔ راج کمار غضب ناک نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا۔

''تمہاری اتنی جرات؟''

''ہمت ہے تو مجھ سے مردوں کی طرح لڑو۔'' میں نے جوش سے کہا۔

''میں نے تم لوگوں کو یہاں مقابلے کے لیے نہیں بھینٹ چڑھانے کے لیے بلایا ہے۔'' وہ غراتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے سریندر کی طرف دیکھا جو اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ راج کمار نے اس سے کہا۔

''اٹھاؤ اپنا خنجر اور ناری کو ذبح کر ڈالو۔''

سریندر نے تیزی سے بڑھ کر خنجر اٹھایا اور فوراً شائستہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے شائستہ کے بازو پکڑے۔ میں تلملا اٹھا۔ نادیدہ قوت کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

سریندر، شائستہ کو لے کر چبوترے کی طرف چل پڑا۔ شائستہ بے خوف تھی۔ اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں نے ایک بار پھر نادیدہ قوت کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی لیکن میری کوشش بے سود ثابت ہوئی۔

شائستہ اور سریندر چبوترے کے پاس پہنچ گئے۔ سریندر نے شائستہ کو چبوترے پر لٹا دیا۔ اسی وقت راج کمار سریندر سے بولا۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اس ناری کے ساتھ بڑی نرمی کر رہے ہو؟''

''ایسی بات نہیں ہے گرو جی۔'' سریندر نے کہا۔

''بس اب چلا دو اس کی گردن پر چھری۔'' راج کمار نے حکم دیا۔

سریندر نے خنجر شائستہ کی گردن پر رکھ دیا۔

''بس، بس، اب چھوڑ دو ہماری بیٹی کو۔ یہاں راج کمار کا کھیل ختم اور ہمارا شروع ہوتا ہے۔'' عبدل چاچا نے سریندر کی طرف دیکھ کر کہا تو میں نے چونک کر عبدل چاچا کی طرف دیکھا۔ ان کی نظریں سریندر کی طرف تھیں۔

سریندر نے شائستہ کو چھوڑ دیا۔ میں اچانک تبدیل ہو جانے والی صورت حال سے حیران تھا۔

"یہ...... یہ کیا کیا سریندر تم نے؟" راج کمار سریندر کی طرف دیکھ کر دہاڑا۔

"وہی کیا جس کا مجھے حکم دیا گیا تھا۔" سریندر نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"لیکن میں نے تمہیں ناری کو ذبح کر دینے کا حکم دیا تھا۔" راج کمار نے غضب ناک لہجے میں کہا۔

"میں تمہارے نہیں ان کے حکم کی بات کر رہا ہوں۔" سریندر نے سابقہ مسکراہٹ کے ساتھ عبدل چاچا کی طرف اشارہ کیا تو راج کمار نے گردن موڑ کر مشکوک اور حیرت زدہ نظروں سے عبدل چاچا کی طرف دیکھا اور زہریلے لہجے میں بولا۔

"کون ہو تم؟"

"یہ ان سے نہیں مجھ سے پوچھ مسٹر راج کمار!" انکل مارٹن نے ہال کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا تو راج کمار نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور بولا۔

"مارٹن!...... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں راج کمار جی!" انکل مارٹن طنزیہ انداز میں بولے۔

"تمہارا کھیل اب اختتام کو ہے۔"

"کیا؟" راج کمار یوں اچھلا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"ہاں۔" انکل مارٹن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ میرے خلاف سازش ہوئی ہے۔" راج کمار بولا۔

"ہاں تم نے درست اندازہ لگایا۔"

"راج کمار" انکل مارٹن بولے۔ پھر انہوں نے عبدل چاچا کی طرف دیکھا۔

مسٹر عبدالرحمن اب کیا کرنا ہے؟"

"ان کی دیوی کے سامنے ان کو ذبح کر دیا جائے یہ بہت مناسب ہے۔" عبدل چاچا نے جواب دیا۔

"ویری گڈ ویری گڈ...... یہ اچھا فیصلہ ہے۔" انکل مارٹن نے خوش گوار انداز میں کہا۔

راج کمار نے جلدی جلدی عبدل چاچا اور انکل مارٹن پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ مجھے تم کمزور نہیں سمجھو۔"

"ٹھیک ہے تو پھر اپنی طاقت دکھاؤ۔" انکل مارٹن کال گھماتے ہوئے اس سے بولے۔

راج کمار نے پھنکارنے کے انداز میں ایک تیز سانس خارج کی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک کالے عقاب کی شکل اختیار کر لی۔ وہ تیزی سے اڑا اور دیوار میں سے نکلتا چلا گیا۔ اسی وقت انکل مارٹن بھی ایک عقاب کی شکل اختیار کر کے اس کی طرح دیوار سے نکل گئے۔ اتنی دیر میں اشوک اور راج کماری نے ہال کے دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ لیکن سریندر نے چبوترے سے چھلانگ لگائی۔ میرا خیال تھا کہ وہ فرش پر آ جائے گا۔ لیکن وہ ہوا میں اڑتا ہوا ان دونوں کے پاس پہنچ گیا اور ان کی گردنیں دبوچ کر فرش پر اتر گیا۔ پھر وہ انہیں لے کر پلٹا اور چبوترے کے قریب لا کر دھکیل دیا۔ اس نے کہا۔

"تم دونوں بھی راج کمار کے ساتھ ذبح کیے جاؤ گے۔"

راج کماری خوف سے لرز رہی تھی۔ اور اشوک کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھی۔

"یہ...... یہ سب کیا ہے۔ عبدل چاچا؟" میں نے عبدل چاچا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ بولے۔

"بیٹا!...... یہ بڑا گہرا کھیل تھا جس کا آج اختتام ہو گا۔"

اسی وقت باہر سے ایسے دھماکوں کی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی بڑی عمارت گر رہی ہو۔

"آؤ دیکھتے ہیں۔" عبدل چاچا نے مجھ سے کہا اور پھر گردن موڑ کر سریندر کی طرف دیکھا۔

"تم یہیں رہو گے۔"

"بہتر ہے جناب!" وہ بولا۔

میں چاچا عبدل کے ساتھ ہال سے باہر آ گیا۔ وہاں عجب منظر تھا۔ راج کمار اور انکل مارٹن اپنی اصل شکل میں آ چکے تھے۔ وہ باغ میں ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر

کھڑے تھے۔ دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کی طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں سے سانپ نکلے اور ان دونوں کی طرف بڑھے اور پھر وہ سانپ ان تک پہنچنے سے پہلے ہی ٹکرائے۔ ان کے ٹکرانے کی وجہ سے شدید دھماکے ہوئے۔

اچانک راج کمار نے ایک بار پھر عقاب کی شکل اختیار کی اور ایک طرف کو اڑتا چلا گیا۔ اس دوران انکل مارٹن نے بھی عقاب کا روپ دھارا اور تیز رفتاری سے راج کمار کا تعاقب کیا۔ چند لمحوں میں وہ اس کے پاس پہنچ گئے۔ ان کا دایاں پر لمبا ہو کر زور سے راج کمار کو لگا جس کی وجہ سے راج کمار نے جھٹکا کھایا۔ انکل مارٹن نے اپنا پر تین بار اسے مارا اور وہ وہیں گر گیا۔ وہ دیوار کی دوسری جانب تھا اس لیے نظر نہیں آسکا کہ کہاں گرا ہے۔ انکل مارٹن بھی وہاں اتر تے چلے گئے۔ یوں وہ بھی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

عبدل چاچا نے ایک گہرا سانس لیا اور بولے۔

''آؤ بیٹا' ذرا انہیں باہر دیکھیں۔'' ہم دونوں چل پڑے۔

سنگ مرمر کا راستہ عبور کر کے ہم انہی سیڑھیوں پر چڑھنے لگے جن سے اتر کر ہم یہاں آئے تھے۔

ہم سیڑھیاں چڑھ کر باہر آئے تو یہاں کا منظر میری توقع کے برعکس تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہم واپس قبرستان میں پہنچیں گے لیکن وہاں وسیع عریض میدان تھا۔ جہاں روشنی تھی...... وہاں ایک طرف انکل مارٹن کھڑے تھے۔ وہ اپنی شکل میں تھے۔ جب کہ راج کمار ابھی بھی عقاب کی صورت میں تھا۔ وہ زمین پر پھڑک رہا تھا۔

ذرا دیر بعد اس نے اپنی اصلی شکل اختیار کر لی اور کراہتے ہوئے انکل مارٹن سے غصیلے لہجے میں بولا۔

''تم سب نے میرے ساتھ دھوکا کیا' میں تم میں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ تم سب کو جلا کر بھسم کر دوں گا۔''

''اب تم کچھ نہیں کر سکتے۔'' انکل مارٹن نے اطمینان سے کہا۔

''میں اب بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں۔'' راج کمار تلملا کر بولا۔

''تو ٹھیک ہے جو کر سکتے ہو کر لو۔ ہم بھی تو دیکھیں کہ اب تم کیا کر سکتے ہو؟'' انکل مارٹن نے کہا۔

''ایک داؤ اب بھی میرے پاس ہے۔'' راج کمار بولا۔

''اچھا!......وہ کیا؟'' انکل مارٹن نے پوچھا۔

''وہ دیکھو!'' راج کمار نے ایک جانب آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے بھی اسی جانب دیکھا۔ وہاں دور سے بہت سے کالے عقاب اڑتے ہوئے آرہے تھے۔ انکل مارٹن نے ان عقابوں کی طرف اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ ان کی انگلیوں سے چھوٹے چھوٹے سانپ نکلنے لگے۔ جو چند لمحوں میں عقاب کی شکل اختیار کرتے چلے جارہے تھے۔ ان سب کا رخ آنے والے عقابوں کی طرف تھا اور وہ تیزی سے پرواز کر رہے تھے۔

''ہاہاہاہا۔'' راج کمار نے قہقہہ لگایا۔

''تم لوگ کیا سمجھتے ہو کہ تم نے مجھے گھیر لیا ہے۔ یہ ہزاروں بدروحیں ہیں اور ان کی ایک خاصیت ابھی تم دیکھو گے۔''

میں نے سوچا کہ نہ جانے وہ کس خاصیت کی بات کر رہا ہے۔

کچھ ہی دیر میں وہ عقاب ہمارے کافی قریب آگئے۔ جب کہ انکل مارٹن کے چھوڑے ہوئے عقاب ان عقابوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اور پھر دونوں طرف کے عقاب ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے لگے۔ ان کے حملوں سے اس قدر رزوردار دھماکے ہونے لگے کہ مجھے اپنے کانوں کے پردے پھٹ جانے کا خدشہ ہوا۔ میں نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ دیئے۔ اسی وقت میں نے دیکھا کہ آنے والے عقاب انکل مارٹن کے جس عقاب کو مارتے وہ عقاب نیچے گر کر تڑپنے لگتا۔ جب کہ انکل مارٹن کا کوئی عقاب مخالف عقاب کو مارتا اور وہ نیچے گرتا تو اس ایک کی جگہ دو عقاب بن جاتے اور وہ دونوں اڑنے لگتے۔

''دیکھا مارٹن! ...... یہ ہے میری بد روحوں کی خاصیت۔ انہیں ختم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ گرنے کے بعد دو ہو جاتی ہیں۔''

انکل مارٹن نے کوئی جواب نہ دیا ان کی نظریں مسلسل عقابوں پر تھیں۔

یہ جنگ کافی دیر تک جاری رہی۔ جس کا اختتام یہ ہوا

کہ راج کمار کے عقابوں نے انکل مارٹن کے عقابوں کو مار ڈالا۔ جب کہ راج کمار کے عقاب اب ہمارے سروں پر منڈلا رہے تھے۔ میں نے کانوں پر سے ہاتھ ہٹا لیے۔ اب فضاء پرسکون تھی۔

راج کمار نے انکل مارٹن کی طرف دیکھ کر کہا۔

"دیکھا تم نے؟ کیا تم اب بھی مجھ سے مقابلہ کرنا چاہو گے؟"

اس سے پہلے کہ انکل مارٹن کوئی جواب دیتے عبدل چاچا نے بلند آواز میں کہا۔

"ہاں، ہم مقابلہ کرنا چاہیں گے۔"

راج کمار نے گردن موڑ کر چبھتی ہوئی نگاؤں سے عبدل چاچا کی طرف دیکھا اور بولا۔

"تو پھر کر کے دیکھ لو مقابلہ اور اس کے بعد تم سب کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتارنا پسند کروں گا۔"

عبدل چاچا نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی میں پہنی انگوٹھی میں جڑے نگینے کو اپنے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر رگڑا تو پلک جھپکتے ہی فضا میں بے شمار سفید عقاب ظاہر ہو گئے۔

عبدل چاچا نے ان سے کہا۔

"اب تم سب ان کا صفایا کرو۔"

عبدل چاچا کا حکم سنتے ہی وہ سب عقاب راج کمار کے عقابوں کی طرف بڑھنے لگے۔ انہوں نے ان کالے عقابوں کے پاس پہنچ کر اپنے پر لمبے کر کے انہیں مارنا شروع کر دیا۔ جس بھی کالے عقاب پر سفید عقاب کا پر لگتا اس کالے عقاب کو آگ لگ جاتی اور وہ جلتا ہوا زمین پر گر جاتا۔

یہ سلسلہ ذرا دیر جاری رہا۔ سارے کالے عقاب جل کر گر گئے۔ راج کمار کی حالت بری ہو چکی تھی۔ وہ متوحش نظروں سے اپنے عقابوں کو دیکھ رہا تھا۔

"لو بھئی راج کمار!...... تمہارا آخری داؤ جسے تم بے حد خطرناک کہہ رہے تھے وہ بھی نہ چل سکا۔ اب کہو کیا کہتے ہو؟" عبدل چاچا نے بڑے مطمئن لہجے میں راج کمار سے کہا جو پریشان نظروں سے عبدل چاچا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ذرا دیر دونوں ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتے رہے اور پھر عبدل چاچا نے اس سے کہا۔

"تمہاری ماورائی طاقتیں ختم ہو چکی ہیں۔ یعنی اب تم کسی قابل نہیں رہے۔ اب سیدھی طرح اپنی دیوی کی طرف چلو ورنہ ہم تمہیں مار مار کر وہاں تک لے جائیں گے۔" اپنی بات کے اختتام پر عبدل چاچا کے لہجے میں کافی سختی آ گئی تھی۔

اچانک راج کمار نے پلٹ کر ایک طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ میں یہ تو سن ہی چکا تھا کہ اب اس کے پاس ماورائی طاقتیں نہیں ہیں اس لیے میں نے فوراً راج کمار کے تعاقب میں دوڑ لگائی۔ اور ذرا دیر میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے دوڑتے ہوئے پلٹ کر مجھے دیکھا اور اپنے دوڑنے کی رفتار کچھ تیز کر دی۔

میں اس کے قریب پہنچ گیا اور پھر میں نے اس پر جست لگائی۔ میں اسے لیتا ہوا زمین پر گر گیا۔ اس نے میرے پیٹ پر گھونسہ مارا جو کافی جاندار تھا۔ لیکن کراٹے کی پریکٹس کی وجہ سے میرے لیے یہ گھونسہ کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ البتہ میرے ایک ہی گھونسے نے اس کا جبڑا توڑ کر رکھ دیا۔ وہ تکلیف سے چیخ اٹھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا گریبان پکڑ کر میں نے اسے اٹھایا اور عبدل چاچا کی طرف لے کر چل پڑا۔ میں نے عبدل چاچا کے قدموں میں اسے پھینک دیا۔ وہ اب بھی کراہ رہا تھا۔ اتنی دیر میں انکل مارٹن بھی ہمارے پاس پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے میرا شانہ تھپ تھپاتے ہوئے خوش گوار انداز میں کہا

"ویل ڈن مائی سن ویل ڈن!" پھر وہ عبدل چاچا سے مخاطب ہوئے۔

"مسٹر عبدالرحمٰن! میرا خیال ہے کہ اب معاملے کو ختم کر کے ہمیں جلد از جلد یہاں سے چلنا چاہیے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" عبدل چاچا نے کہا۔

انکل مارٹن نے مجھ سے کہا۔

"مائی سن!...... اس خبیث کو لے کر چلو۔"

میں نے جھک کر ایک بار پھر راج کمار کا گریبان پکڑا اور اسے کھینچ کر اٹھایا۔ ہم سب چل پڑے۔

ہال میں آنے کے بعد انکل مارٹن نے مجھ سے کہا۔

"ینگ مین!...... اس خبیث کو اس کی دیوی کے سامنے چبوترے پر لٹا دو۔"

میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ پھر انکل مارٹن نے

سریندر کی طرف دیکھ کر کہا۔
"مسٹر! اب تم اسے ذبح کر ڈالو۔"
سریندر نے میری اور راج کمار کی طرف دیکھا۔ میں نے راج کمار کو مضبوطی سے گرفت میں لے رکھا تھا۔ سریندر چبوترے پر آ گیا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔
"مم...... مم...... مجھے معاف کردو...... مجھے معاف کردو۔ راج کمار گڑگڑانے لگا۔
لیکن سریندر نے اس کی گردن پر خنجر رکھ دیا اور گردن موڑ کر عبدل چاچا کی طرف دیکھ کر بولا۔
"جناب!...... آپ کا حکم ہے؟"
"ہاں اسے ذبح کر ڈالو۔" عبدل چاچا نے اطمینان سے جواب دیا۔ اور اسی وقت سریندر نے راج کمار کی گردن پر خنجر چلا دیا۔ راج کمار کی گردن سے خون بہنے لگا۔ وہ تڑپنے لگا لیکن حیرت ناک بات تھی کہ اس کا خون دھواں بن کر اڑتا جا رہا تھا۔
کچھ دیر بعد راج کمار ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔
انکل مارٹن نے عبدل چاچا کی طرف دیکھ کر راج کماری اور اشوک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"مسٹر عبدالرحمٰن اب ان کا کیا کرنا ہے؟"
اسی وقت راج کماری بری طرح رونے لگی۔ وہ بولی۔
"میں اس خبیث کے ہاتھوں پھنسی ہوئی تھی۔ میں ایک عام گھرانے کی عورت ہوں۔ یہ خبیث مجھ پر عاشق ہو گیا تھا اور اس نے مجھے اغواء کرایا تھا۔ اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے مجھے اپنے قابو میں رکھا۔"
"فکر نہ کرو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ تم اپنے گھر جا سکتی ہو۔" عبدل چاچا نے نرم لہجے میں فیصلہ سنایا۔ راج کماری نے فوراً ان کی طرف دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔
"مہاراج!...... میں زندگی بھر آپ کی احسان مند رہوں گی۔"
عبدل چاچا نے کہا۔
"میں کوئی مہاراج نہیں ہوں۔ اللہ کا عاجز بندہ ہوں۔ یہ اس کی کرم نوازی ہے کہ اپنے خزانے میں سے کچھ توفیق مجھے عطا کر دی ہے۔" پھر انہوں نے میری طرف دیکھا۔
"بیٹا!...... اس عورت کو عزت سے اس کے گھر پہنچانا ہے۔"
"ایسا ہی ہوگا عبدل چاچا۔" میں نے کہا۔ انہوں نے اشوک کی طرف دیکھا اور بولے۔
"تم اس خبیث کے آلۂ کار بنے رہے اس لیے تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جا سکتی۔"
"مم...... مجھے بھی معاف کر دیں میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا۔" وہ عبدل چاچا کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔ عبدل چاچا نے میری طرف دیکھ کر کہا۔
"بیٹا!...... اس خبیث سے آئندہ بھی کوئی بھلائی کی امید نہیں ہے۔ یہ زندہ رہا تو خلق خدا کے لیے مصیبت بنا رہے گا۔ اس لیے اسے بھی چبوترے پر لٹا دو۔"
میں نے فوراً بڑھ کر اشوک کا بازو پکڑا اور اسے مروڑ دیا۔ وہ پلٹ گیا میں نے اسے دھکیلا۔ اس نے قدم نہ بڑھایا تو میں نے اس کی کمر پر گھٹنا مارا جس سے وہ کراہ اٹھا۔ میں اسے دھکیل کر چبوترے کے پاس لے آیا اور اسے وہاں لٹا دیا۔
"اس کی گردن پر بھی خنجر پھیر دو۔" عبدل چاچا نے ملائم لہجے میں سریندر کو حکم جاری کیا۔ سریندر بجلی کی طرح حرکت میں آیا اور پھر اشوک کی گردن پر بھی خنجر پھیر دیا۔ گردن کٹ گئی' خون بہنے لگا اور وہ تڑپنے لگا۔ اس کا خون دھواں بن کر نہیں اڑ رہا تھا۔ بلکہ چبوترے سے نیچے آ رہا تھا۔
کچھ دیر بعد وہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔
"چلو اب یہاں سے چلتے ہیں۔" عبدل چاچا نے ہم سب پر نظر ڈالتے ہوئے کہا اور ہم چل پڑے۔
ہال سے نکلنے کے بعد ہم نے برآمدہ اور پھر سنگ مرمر کا راستہ عبور کیا اور پھر سیڑھیاں چڑھنے کے بعد اوپر آ گئے۔ اب یہاں وہی قبرستان ہمارا منتظر تھا۔ ہم گیٹ کی طرف چل پڑے۔
اچانک ہمارے عقب سے کچھ آوازیں آئیں۔ میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ وہ قبر بند ہو رہی تھی جس میں سے ہم نکل کر آ رہے تھے۔
میں بار بار گردن موڑ کر قبر کو دیکھتا رہا۔ بالآخر وہ بند

ہوگئی۔

ہم قبرستان سے باہر آگئے اور اپنی کار کی طرف بڑھے۔ میں ایک حیرت کدے سے نکل کر آیا تھا اور ذہن ابھی تک اس کے زیر اثر تھا۔

ہم کار کے پاس آگئے۔ پچھلی نشست پر شائستہ، راج کماری، اور انکل مارٹن بیٹھ گئے۔ جب کہ عبدل چاچا اور نریندر میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ اگنیشن میں چابی گھما کر میں نے گاڑی اسٹارٹ کی، ایک نظر ویران قبرستان پر ڈالی جس کی ویرانی اپنے اندر ایک تہلکہ خیز داستان سموئے ہوئے تھی۔ میں نے کار چلا دی۔

ہم اپنے گھر کے سامنے پہنچ گئے۔ عبدل چاچا نے جلدی سے دروازہ کھول کر نیچے اترنا چاہا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ گیٹ کھولنے کے لیے اتر رہے ہیں۔ میں نے کہا۔

''عبدل چاچا!''

وہ رک گئے اور پلٹ کر میری طرف دیکھا۔

''آپ بیٹھیں میں گیٹ کھولتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، کوئی فرق نہیں پڑتا بیٹے!'' ان کے لہجے میں جو اپنائیت اور محبت تھی وہ میرے دل میں اترتی چلی گئی۔ میں مزید کچھ نہ بولا۔

وہ کار سے اتر کر چلے گئے۔ انہوں نے گیٹ کھول دیا۔ میں نے کار گھر میں لا کر روک دی۔ ہم سب کار سے اتر آئے۔ اس دوران عبدل چاچا گیٹ بند کر کے ہماری طرف آرہے تھے۔ وہ ہمارے پاس پہنچ کر رک گئے۔ میں نے ان سے کہا۔

''عبدل چاچا!...... یہ سب کیا چکر تھا؟''

''میں اپنے بیٹے کو سب کچھ تسلی سے بتاؤں گا۔'' انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ لیکن پہلے میں سب کے لیے کافی بناؤں گا۔''

''عبدل چاچا آپ کی حیثیت معلوم ہونے کے بعد میرا دل گوارہ نہیں کرتا کہ میں آپ سے کوئی کام لوں۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''کیا میں اپنے بیٹے کے کام نہیں کر سکتا؟'' انہوں نے سوالیہ نظریں مجھ پر مرکوز کر دیں۔ میں لاجواب ہو گیا سر جھکا کر میں نے کہا۔

''عبدل چاچا!...... جس رشتے کی آپ بات کر رہے ہیں تو میرے لیے خاموشی اختیار کرنا ہی بہتر ہے۔''

''شاباش!'' وہ خوش ہو کر بولے۔

''اور دیکھو!...... آج سے تم مجھے عبدل چاچا نہیں کہو گے۔''

''جی؟'' میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''آج سے میں تمہیں اپنا بیٹا بنانا چاہتا ہوں۔ تم مجھے بابا کہو گے۔'' انہوں نے بڑے دکھی انداز میں جواب دیا۔

''یہ تو میرے لیے خوشی کی بات ہے۔ بابا۔'' میں نے کہا تو وہ روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئے۔

''بیٹا! تم نے مجھے آج تک جو بھی سمجھا ہو میں تمہیں ہمیشہ اپنا بیٹا ہی سمجھتا رہا ہوں۔ میری بڑی خواہش تھی کہ تم مجھے بابا کہو لیکن سوچتا تھا کہ یہ بات تم سے کیسے کہوں، آج کہہ ہی دی۔''

''میں نے آپ کو کچھ اور نہیں اپنے باپ ہی سمجھا ہے بابا۔'' میں بھی جذباتی ہو کر رونے لگا تھا۔

''او کے او کے مسٹر عبدالرحمن آج ہمیں پتہ چل گیا کہ تم دونوں باپ بیٹے ہو۔ لیکن ہمیں یہاں کیوں کھڑا کیا ہوا ہے۔ چلو میں تو اس خبیث کو مار مار کر تھکن سے چور ہو رہا ہوں۔'' انکل مارٹن نے اپنے مخصوص خوش گوار انداز میں کہا تو بے اختیار میرے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ میں نے دیکھا کہ بابا، شائستہ، راج کماری اور نریندر بھی مسکرا رہے تھے۔

''ہاں ہاں چلو، مجھے اپنے بیٹے کے لیے کافی بھی بنانی ہے۔ کیونکہ جب یہ تھک کر آتا ہے تو کافی مانگتا ہے۔'' بابا نے کہا۔

''تو کیا ہم سب اپنے اپنے لیے کافی خود بنائیں گے۔ مسٹر عبدالرحمن؟'' انکل مارٹن نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

''فکر نہ کرو، میں ہی بناؤں گا تم سب کے لیے کافی۔'' بابا نے مسکرا کر جواب دیا۔

اسی وقت شائستہ بابا سے بولی۔

''بابا!...... کیا یہ اچھا لگے گا کہ بیٹی کے ہوتے ہوئے آپ کافی بنائیں؟''

بابا نے مسکرا کر پیار بھری نظروں سے اسے دیکھا اور

اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

"اب بیٹی نے اعتراض کر دیا ہے تو میں کافی بنانے سے دستبردار ہوتا ہوں۔" ان کی بات پر انکل مارٹن نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔

"اے مسٹر عبدالرحمن!...... میں اتنی آسانی سے تمہیں اپنی بیٹی دینے والا نہیں۔"

"اچھا بیٹی!" بابا مسکرا کر بولے۔ "تو پھر مشکل سے ہی دے دینا' بہرحال بیٹی دینی تو پڑے گی۔"

"ہوں۔" انکل مارٹن نے مسکراتے اور کان کھجاتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"چلو اگر ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ فی الحال تو سب بیٹی کے ہاتھ کی کافی پیتے ہیں۔"

"ہاں یہ ہوئی نا بات۔" بابا نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔

"آپ لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں میں کافی لے کر آتی ہوں۔" شائستہ بولی۔

"ہاں بیٹی ہاں۔" بابا نے مسکرا کر شفقت بھرے لہجے میں کہا اور انکل مارٹن کی طرف دیکھا۔

"آؤ بھئی مارٹن' چل کر بیٹھتے ہیں۔"

"آجاؤ آجاؤ مجھے کب اعتراض ہے۔" انکل مارٹن نے خوش گوار انداز میں کہا اور ہم سب چل پڑے۔

شائستہ کچن کی طرف چلی گئی۔ ہم چاروں ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔

"بابا!...... اب سب سے پہلے تو مجھے یہ بتائیں کہ آخر یہ سب کیا چکر تھا؟" میں نے بابا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ انہوں نے چند لمحے سوچا' ایک گہرا سانس لیا اور گویا ہوئے۔

"بیٹا!...... دراصل میری اور تمہارے والد احسان کی بچپن کی دوستی تھی اور دوستی بھی مثالی پھر میٹرک کے بعد میں اپنے والدین کے ساتھ لندن چلا گیا۔ لیکن ہماری دوستی ختم نہ ہوئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے خطوط کے ذریعے رابطے میں رہتے تھے۔ یوں ایک دوسرے کے حالات کی خبر رہتی تھی۔ احسان نے مجھے بتایا کہ اس کے پیچھے کچھ پراسرار لوگ لگے ہیں۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ احسان اپنے بیٹے کو یعنی تمہیں ان کے حوالے کر دے۔ لیکن احسان کی سمجھ میں ان کی باتیں نہیں آتی تھیں اور یوں ایک روز تمہاری والدہ اور احسان کے ایکسیڈنٹ اور موت کی خبر آ گئی۔ تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ صدمے سے میرا کیا حال ہوا۔ میں بچپن ہی سے وظائف اور عملیات میں دلچسپی لیتا تھا۔ نماز روزے کا پابند تھا۔ بس اسی وجہ سے شادی نہیں کی۔ سوچتا تھا بعد میں کرلوں گا۔ لیکن پھر عمر نکل گئی۔ یوں میں نے شادی نہیں کی۔ وہیں لندن میں مارٹن سے میری ملاقات ہوئی۔ ہم نے مذاہب پر بات نہیں کی اور نہ ہی ایک دوسرے سے نفرت کی۔"

"مارٹن بھی ماورائی دنیا کا آدمی ہے۔ یہ اپنی ڈگر پر چلتا رہا اور میں اپنی ڈگر پر۔ وہیں مجھے ایک مسلم بزرگ ملے۔ اور میں نے ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ ان کے پاس بڑی روحانی طاقتیں تھیں۔ انہوں نے مجھے بڑی ریاضتیں کرائیں اور طاقتیں مجھے بھی مل گئیں۔ اس دوران مجھے یہ پتہ چل گیا کہ احسان کو مارنے والا وہ راج کمار ہے جو تمہیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جب احسان نے اس کی بات نہ مانی تو اس نے تمہارے والدین کا ایکسیڈنٹ کروا کر انہیں مار ڈالا۔ تب میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنے دوست کا انتقام ضرور لوں گا۔ یوں میں لندن سے یہاں آ گیا اور تمہارا ملازم بن گیا۔ میں نے آہستہ آہستہ راج کمار کے خلاف کام کرنا شروع کیا۔ اس کام میں سریندر اور مارٹن میرے ساتھی تھے۔ میں نے سریندر اور مارٹن کو راج کمار کے قریب کر دیا۔ اور خود پس پردہ رہا۔ چاند کی خاص تاریخیں آنے والی تھیں جب راج کمار نے تمہیں اپنی دیوی کی بھینٹ چڑھانا تھا۔ میں اس موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ اور پھر اس موقع کے آنے پر میں نے راج کمار کو اس کے انجام تک پہنچا دیا۔ سریندر کو میں نے ہی کہا تھا تم پر نظر رکھے۔ اسی لیے اس نے تمہیں خطرے سے آگاہ کیا تھا۔ وہ بھی ہمارے دوستوں میں سے ہے۔ میں ان دنوں راج کمار سے جنگ کے لیے خاص ریاضتیں کر رہا تھا۔ ویسے میں نے بھی تم پر بھرپور نظر رکھی ہوئی تھی۔ پھر مارٹن نے بتایا کہ بیٹی شائستہ تم سے محبت کرنے لگی ہے تو ہمیں اپنے لائحہ عمل میں کچھ تبدیلی کرنی پڑی۔ راج کمار خطرناک ترین آدمی تھا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اس لیے ہم بہت سنبھل کر چل رہے تھے اور تمہیں کسی بات سے آگاہ نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ اس طرح ہمارے منصوبے میں کچھ گڑبڑ ہو جانے کا امکان تھا اس لیے ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ راج کمار کے ساتھ کھیل کھیلتے رہیں گے اور اسے گھیر کر ختم کر ڈالیں گے۔''

بابا نے بات ختم کی اور کافی کے کپ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کی بات چیت کے دوران شائستہ کافی لا کر ہمیں دے چکی تھی۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر انکل مارٹن نے کہا۔

''اے مسٹر عبدالرحمٰن!...... میں نے کافی پی لی ہے اور فریش ہو چکا ہوں۔ اب بات کرو، تم کیا مجھے بیٹی لے لینے کی دھمکی دے رہے تھے؟'' ان کے چہرے پر مسکراہٹ رقصاں تھی اور وہ سوالیہ نگاہوں سے بابا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بابا مسکرا کر بولے۔

''ارے دھمکی کون دے رہا تھا مارٹن! میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ میرے بیٹے کے لیے اپنی بیٹی دے دو۔''

''تو کیا رشتے دھمکیوں سے ہوتے ہیں؟'' انکل مارٹن مسکرا کر بولے۔

''اچھا بابا!...... معاف کر دو، تمہیں غلط فہمی ہوئی کہ میں نے دھمکی دی، اب یہ بتاؤ کہ بیٹی کی رخصتی کب کر رہے ہو؟''

''ہاں اب ٹھیک طرح سے بات کی ناں تم نے۔ بس اگلے ماہ کی کوئی تاریخ رکھ لو مجھے بیٹی کی شادی کی تیاری بھی کرنا ہو گی۔'' انکل مارٹن نے کہا۔

''ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔'' بابا بولے۔ میں نے دیکھا کہ شائستہ نے سر جھکا لیا تھا۔

''سریندر!......'' بابا نے سریندر کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کیا تم لوگ ہمارے بچوں کی شادی میں شامل ہونے کے لیے رکو گے یا جانا چاہو گے؟''

''جناب!...... اب اس شب زاد سے تو جان چھوٹ چکی ہے جو رات میں اپنی کارروائیاں کرتا تھا، اندھیروں اور قبروں میں رہتا تھا۔ بے گناہ لوگوں کے لیے عذاب بنا ہوا تھا۔ اب مجھے کوئی ڈر نہیں ہے اور نہ ہی کہیں جانے کی جلدی ہے۔ میں تو اس شادی میں شرکت کے بعد ہی جاؤں گا۔'' نرملا سے پوچھ لیں اس کا کیا ارادہ ہے؟'' اس نے راج کماری کی طرف دیکھا۔

''میں جانا چاہوں گی اس لیے کہ میرے والدین میری وجہ سے بہت پریشان ہوں گے۔ لیکن میں اس شادی میں شرکت کے لیے ضرور واپس آؤں گی۔ اکیلی نہیں اپنے والدین کے ساتھ۔'' نرملا نے جواب دیا۔

''یہ اچھی بات ہے۔'' بابا بولے۔

''تمہیں ضرور فوری طور پر اپنے والدین سے ملنا چاہیے۔'' انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''بیٹا!...... نرملا کے لیے جلد از جلد دہلی جانے کا بندوبست کرنا ہے۔''

''جی بہت اچھا بابا۔'' میں نے کہا اور نرملا کی طرف دیکھا۔

''میں جلد ہی تمہارے جانے کا بندوبست کر دوں گا۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔

※ ...... ※ ...... ※ ...... ※

نرملا دہلی چلی گئی لیکن ہم سے رابطے میں رہی۔ اور پھر شائستہ اور میری شادی دھوم دھام سے ہو گئی۔ نرملا اپنے والدین کے ساتھ شادی میں شرکت کے لیے آئی۔ اس کے والدین نے ہم سب کا شکریہ ادا کیا۔ شادی کے بعد وہ لوگ واپس چلے گئے۔ سریندر ہمارے شہر میں ہی رہتا تھا اس لیے اکثر ملنے آتا ہے۔ انکل مارٹن لندن جا چکے ہیں لیکن وہ بھی اکثر آتے رہتے ہیں۔ میں اپنے بابا اور شائستہ کے ساتھ خوش گوار زندگی گزار رہا ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ انہیں لمبی عمر اور صحت دے۔ کیونکہ وہ میرے والد کے دوست، میرے عبدل چاچا اور میرے بابا ہیں۔